فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

خادم الافتاء و الحدیث جامعہ قاسمیہ

مدرسہ شاہی مرادآباد، الہند

(جلد ۸)

المجلد الثامن

بقية الصلوٰة، من الذكر و الدعاء بعد الصلوٰة،

الوتر، ادراک الفريضة السنن والنوافل،

التراويح، صلواة المسافر

۲۹۶۵ ——— ۳۴۲۳

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، الہند

01336-223082

فتاویٰ قاسمیہ

صاحب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، الہند

01336-223082

ASHRAFI BOOK DEPOT

DEOBAND, SAHARANPUR, INDIA

Phone: 01336-223082

Mob. : 09358001571،08810383186

مکمل اجمالی فہرست ایک نظر میں

❖❖ ❍❖❍

فہرست مضامین

۹/ بقية كتاب الصلاة

☐	۲۱/ باب الدعاء والذكر بعد الصلوة	۲۹

□	۲۲/ باب الوتر	۱۱۱

الفصل الأول: في الوتر

۲۴/ باب السنن والنوافل　۱۸۵

الفصل الأول في صلاة التراويح

الفصل الثاني: في أجرة التراويح ۴۲۲

۲۶/ باب صلاۃ المسافر ۵۷۸

۹/ بقية كتاب الصلاة

۲۱/ باب الدعاء والذکر بعد الصلوۃ

نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف رخ کر کے تسبیح پڑھنا

سوال [۲۹۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک صاحب فجر اور عصر کے فرضوں کے بعد لگاتار قریب ایک سال سے شمال سمت کو مخصوص کر کے اور ایک دوسرے صاحب مقتدیوں کی طرف منہ کر کے تسبیح پڑھتے ہیں، جب کہ دوصفوں کے بعد اکثر مسبوق اپنی نماز مکمل کرتے ہوئے ہوتے ہیں، تکبیرات اور تسبیح سے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیا معمولات یا ہدایات ہیں؟

المستفتی: ماسٹر عبدالحق لائن ۱آزادنگر ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فجر اور عصر کی نماز میں سلام پھیرنے کے بعد امام کا دائیں طرف مڑ کر مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھنا افضل ہے؛ البتہ کبھی کبھار بائیں طرف بھی بیٹھنا چاہئے؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرف بیٹھنا ثابت ہے، مگر اکثر معمول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائیں طرف مڑ کر بیٹھنے کا تھا؛ اس لئے دائیں طرف مڑ کر مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھنا اولی وافضل ہے؛ لہٰذا مذکورہ سوال میں دونوں اماموں میں سے کسی کے عمل پر نکیر کی ضرورت نہیں۔

عن أنس –رضي الله عنه– قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم أحيانا ينصرف عن يمينه، وفي شرح السنة: روى عن علي أنه قال: إذا كانت

حاجته عن يمينه أخذ عن يمنيه، وإن كانت عن يساره أخذ عن يساره، فإن استوى الجانبان، فينصرف إلى أي جانب شاء، واليمين أولى؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم كان يحب التيامن في كل شيء، وكان يقبل على الناس إذا لم يرد الخروج من المسجد بوجهه من جانب يمينه. (مرقاة المفاتيح، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، الكلام على أن السلام ليس بركن للصلاة، إمداديه ملتان ۲/ ۳۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۷۸۶/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۴/۲۷ھ

فجر وعصر کے بعد امام کس طرف رخ کر کے بیٹھے؟

سوال [۲۹۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فجر وعصر کی تسبیح وغیرہ پڑھنے کے لئے امام کس طرف منہ کر کے بیٹھے؟ اس سلسلے میں صریح عبارت بھی تحریر فرمائیں۔ اور کیا دائیں بائیں جب بیٹھیں تو تھوڑا ترچھا بیٹھنا چاہئے؟ یہ کہیں سے ثابت ہے؟

المستفتی: سید محمد حذیفہ علی گڑھ اے ایم یو، علیگڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حدیث شریف میں بائیں طرف مڑ کر بیٹھنا اور دائیں طرف مڑ کر بیٹھنا دونوں طرح سے ثابت ہے۔ اور مڑنے کے بعد مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھنا زیادہ افضل شکل ہے، نیز بغیر ترچھا ہوئے سیدھا مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھنا ہی سید الکونین ﷺ سے کثرت کے ساتھ ثابت ہے۔

عن سمرة بن جندب قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا صلى صلوة أقبل علينا بوجهه. (بخاري شريف، الصلاة، باب يستقبل الإمام الناس إذا سلم،

النسخة الهندية ١/ ١١٧، رقم: ٨٤٥، باب ما قيل في أولاد المشركين، النسخة الهندية ١/ ١٨٥، رقم: ١٣٧٠، ف: ١٣٨٦)

و كان أنس بن مالك، ينفتل عن يمينه، وعن يساره ويعيب على من يتوخى، أو من تعمد الانفتال عن يمينه. (بخاري شريف، الصلاة، باب الانتقال والإنصراف عن اليمين والشمال، تحت ترجمة الباب ١/ ١١٨)

قال عبدالله بن مسعود: لقد رأيت النبي صلى الله عليه وسلم كثيرا ينصرف عن يساره. (بخاري شريف، الصلاة، باب انتقال والإنصراف عن اليمين والشمال، النسخة الهندية ١/ ١١٨، رقم: ٨٤٤، ف: ٨٥٢، مسند الدارمي، دارالمغني ٢/ ٨٥١، رقم: ١٣٩٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/ ۶/ ۱۲ھ

عصر و فجر کے بعد دائیں یا بائیں رخ کر کے بیٹھنے کی حکمت

سوال [۲۹۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عصر اور فجر کے بعد دائیں اور بائیں بیٹھنے کی حکمت اور اس کا ثبوت۔

المستفتی: شہاب الدین بستوی، متعلم مدرسہ ہٰذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عصر اور فجر کے بعد دائیں یا بائیں رخ بدل کر بیٹھنا حضور ﷺ سے ثابت ہے۔ اور اس مضمون کی روایتیں کتب حدیث میں موجود ہیں۔

عن البراء، قال: كنا إذا صلينا خلف النبى عليه السلام أحببنا أن نكون عن يمينه يقبل علينا بوجهه. (مسلم، الصلاة، باب استحباب يمين الإمام، النسخة الهندية ١/ ٢٤٧، بيت الأفكار، رقم: ٧٠٩)

فإذا تمت صلوة الإمام، فهو مخير إن شاء انحرف عن يساره، وإن شاء انحرف عن يمينه ...... هذا الذي ذكرناه من التخيير بين الانحراف والانصراف والجلوس مستقبلا إذا لم يكن بعد الصلاة المكتوبة تطوع، كالفجر والعصر. (كبيري، صفة الصلاة، أشرفيه ديوبند ٣٤٠، ٣٤١، قديم، ص: ٣٣٠، ٣٣١، صغيري، ص: ١٧٩، ١٨٠، مطبع مجتبائي دهلى، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، زكريا ١/ ٥٨٥، كوئٹه ١/ ٣٣٥، درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، قبيل فصل في القراءة، كراچى ١/ ٥٣١، زكريا ٢/ ٢٤٨، حاشية الطحطاوى على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، فصل في صفة الأذكار، دارالكتاب ديوبند، جديد ص: ٣١٤)

اوراس تحول الی الیمین اوالشمال کی ایک وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس پر مواظبت فرمائی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسا نہ کرنا مکروہ اور بدعت ہے۔

يكره المكث قاعدا في مكانه مستقبل القبلة، ووجه الكراهة مخالفة فعله الذي كان عليه الصلاة والسلام يداوم عليه. (كبيري، صفة الصلاة، قديم، ص: ٣٣١، حلبي كبير، أشرفيه، ص: ٣٤١، صغيري مع حاشية مجتبائي دهلى، ص: ١٨٠)

وروى جلوس الإمام فى مصلاه بعد الفراغ مستقبل القبلة بدعة.
(بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في بيان مايستحب للإمام، زكريا ١/ ٣٩٣، بيروت ١/ ٦٨٠، كراچى ١/ ١٥٩)

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ فجر کی نماز کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف رخ کر کے معلوم کرتے تھے کہ آج کس نے خواب دیکھا ہے؟ پھر آپ اس کی تعبیر بیان کرتے تھے۔

عن سمرة بن جندب، قال: كان النبي ﷺ إذا صلى صلاة أقبل علينا بوجهه، فقال: من رأى منكم الليلة رؤيا؟ قال: فإن رأى أحد قصها. الحديث
(صحيح البخاري، كتاب الجنائز، النسخة الهندية ١/ ١٨٥، رقم: ١٣٧٠، ف: ١٣٨٦)

لما روى أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا فرغ من صلاة الفجر

استقبل بوجهه أصحابه، وقال: هل رأى أحد منكم رؤيا كأنه كان يطلب رؤيا فيها بشرى بفتح مكة. (بدائع، كتاب الصلاة، فصل في بيان ما يستحب للإمام، قديم کراچی ۱/ ۱۵۹، زکریا ۱/ ۳۹۳، بیروت ۱/ ۶۸۰)

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر امام قبلہ رخ کرکے بیٹھا رہے گا تو بعد میں آنے والے دھوکہ میں پڑ سکتے ہیں کہ ابھی جماعت ختم نہیں ہوئی اور نیت باندھ کر جماعت میں شریک ہو سکتے ہیں، تو اس اشتباہ کو ختم کرنے کے لئے تحول الی الیمین او الشمال کا حکم دیا گیا ہے۔

ولأن مكثه يوهم الداخل أنه في الصلاة، فيقتدى به، فيفسد اقتداءه، فكان المكث تعريضا لفساد اقتداء غيره به فلا يمكث. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في بيان ما يستحب للإمام، قدیم کراچی ۱/ ۱۵۹، زکریا ۱/ ۳۹۳، بیروت ۱/ ۶۷۹، ۶۸۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۲۴ھ

امام صاحب کا بعد نماز عصر ہمیشہ قبلہ رو بیٹھنا

سوال [۲۹۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مسجد میں امامت کرتا ہے، عصر کی نماز کے بعد قبلہ رو ہمیشہ بیٹھا رہتا ہے، اگر کبھی کبھی قبلہ رو بیٹھے اور کبھی دائیں بائیں گھوم جائے تو اس کا یہ فعل درست ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: نسیم احمد غازی پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عصر اور فجر کی نماز کے بعد امام کا مستقل قبلہ رو ہو کر بیٹھنا حضور سے ثابت نہیں، ہاں البتہ دائیں یا بائیں طرف مڑ کر یا مقتدیوں کی طرف مکمل سیدھے ہو کر بیٹھنا حدیث سے ثابت ہے۔

عن سمرة بن جندب، قال: كان النبي ﷺ إذا صلى صلاة أقبل علينا بوجهه. (صحيح البخاري، كتاب الجنائز، النسخة الهندية ١/ ١٨٥، رقم: ١٣٧٠، ف: ١٣٨٦)

عن الأسود قال: قال عبدالله: لا يجعل أحدكم للشيطان شيئا من صلاته يرى أن حقا عليه أن لاينصرف إلا عن يمينه، لقد رأيت النبي صلى الله عليه وسلم كثيرا ينصرف عن يساره. (صحيح البخاري، الصلاة، باب الانفتال والإنصراف عن اليمين والشمال، النسخة الهندية ١/ ١١٨، رقم: ٨٤٤، ف: ٨٥٢، مسند الدارمي، دار المغني ٢/ ٨٥١، رقم: ١٣٩٠)

إن كان في صلاة لا تطوع بعدها، فإن شاء انحرف عن يمينه، أو يساره، أو ذهب إلى حوائجه، أو استقبل الناس بوجهه. (شامي، كتاب الصلاة، قبيل فصل في القراءة، كراچی ١/ ٥٣١، زكريا ٢/ ٢٤٨، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، فصل في صفة الأذكار، دارالكتاب ديوبند، جديد، ص: ٣١٤، الموسوعة الفقهية ٤١/ ١١٣)

يكره المكث على هيئته مستقبل القبلة. (بدائع، كتاب الصلاة، فصل في بيان ما يستحب للإمام، قديم، كراچی ١/ ١٥٩، زكريا ١/ ٣٩٣) **فقط اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۴۲۸/۳/۲۰ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۲۰)

امام صاحب کا مکمل طور پر مقتدیوں کی طرف گھوم جانا

سوال [۲۹۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک امام صاحب عصر اور فجر کے بعد مقتدیوں کی جانب پورا گھوم جاتے ہیں، کیا اس طرح سے گھومنا سرکار مدنی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امام صاحب کا مقتدیوں کی طرف پورے طور پر گھوم جانا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

عن سمرة بن جندب –رضي الله عنه– قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا صلى صلاة، أقبل علينا بوجهه. (صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين؟ النسخة الهندية ١/ ١٨٥، رقم: ١٣٧٠، ف: ١٣٨٦)

يستقبل القوم بوجهه إن شاء ...... لما روى أن النبي ﷺ كان إذا فرغ من صلوة الفجر استقبل بوجهه أصحابه. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل فيما يستحب للإمام أن يفعله، كراچى ١/ ١٥٩، بيروت ١/ ٦٨٠، زكريا ١/ ٣٩٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/۵/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۵/۱۴۱۵ھ

امام کا بعد نماز فجر وعصر کس طرح بیٹھنا افضل ہے؟

سوال [۲۹۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فجر اور عصر کی نماز کے بعد امام کا دائیں بائیں نیز مقتدیوں کی طرف مڑ کر بیٹھنا تو ثابت ہے، مگر ان میں کونسی صورت زیادہ صحیح ہے؟ مدلل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: شعیب احمد میرٹھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ تینوں صورتوں میں سے ہر ایک صورت مسنون ہے، مگر تیسری صورت یعنی فجر اور عصر کی نماز کے بعد امام کا مقتدیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھنا زیادہ افضل اور بہتر ہے، جب کہ اس کے سامنے قریب میں کوئی مسبوق نماز نہ پڑھ رہا ہو۔

عن سمرة بن جندب –رضي الله عنه– قال: كان النبي صلى الله عليه وسـلم إذا صلى صلاة، أقبل علينا بوجهه. (صحيح البخاري، الأذان، باب يستقبل الإمام الناس، النسخة الهندية ١/ ١١٧، رقم: ٨٣٧، ف: ٨٤٥)

عـن أنـس بن مالك قال: أخر رسول الله ﷺ الصلاة ذات ليلة إلى شطر الليل، ثم خرج علينا، فلما صلى أقبل علينا بوجهه، فقال: إن الناس قد صـلـوا ورقدوا، وإنكم لن تزالوا في صلاة ما انتظرتم الصلاة. (بخاري شريف، الأذان، باب يستقبل الإمام الناس إذا سلم، النسخة الهندية ١/ ١١٧، رقم: ٨٣٩، ف: ٨٤٧)

عـن قبيـصة بـن هـلـب عـن أبيـه، قـال: كـان رسول الله ﷺ يؤمنـا، فيـنـصرف على جانبيه جميعا على يمينه، وعلى شماله. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في الإنصراف عن يمينه وعن شماله، النسخة الهندية ١/ ٦٦، دارالسلام، رقم: ٣٠١)

الـحكـمة في استقبال المامومين أن يعلمهم ما كانوا يحتاجون إليه. (عـمـدة القاري، باب يستقبل الإمام الناس إذا سلم، زكريا ٤/ ٦١٨، رقم: ٨٤٥، دار احياء التراث العربي ٦/ ١٣٦)

إن كان صلاة لا تطوع بعدها يتخير إن شاء انحرف عن يمينه، أو عن يسـاره، وإن شـاء ذهـب فـي حوائجه، وإن شاء استقبل الناس بوجهه إذا لم يكن بحذائه رجل يصلي. (الـفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثالث كيفية الصلاة، مكتبه زكريا ٢/ ١٩٢، رقم: ٢١١٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۶/۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۵۵۶)

نماز کے بعد اذکار کی فضیلت

سـوال [۲۹۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: پانچوں وقت نماز پڑھنے کے بعد ''سبحان الله، الحمدلله اور الله اکبر'' ذکر کریں، سوسو بار، تو اس کی کیا فضیلت ہے؟ اور پانچوں نمازوں میں سوسو بار درود شریف پڑھنے پر کیا فضیلت ہے؟ اور اگر عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سو دفعہ درود شریف اور سوسو بار ''اللہ اکبر'' اور سو بار ''الحمدللہ'' اور ''سبحان اللہ'' پڑھ کر سو جائیں، تو اس کی کیا فضیلت ہے؟ اور اگر اس سے کسی کام کا ارادہ کرتا ہوں تو کیا اس کے کرنے سے وہ مجھے حاصل ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: گلاب بابو بھوڑے کا چوراہہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال میں ذکر کردہ اذکار کی کتب احادیث میں بڑی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ جو شخص ہر نماز کے بعد دس بار ''سبحان الله'' دس بار ''الحمدلله'' اور دس بار ''الله اکبر'' پڑھے، تو پانچوں نماز میں ایک سو پچاس بار ہوں گے؛ لیکن میزان عمل میں پندرہ سو شمار ہوں گے، اس تناسب سے اگر کوئی ہر نماز کے بعد سوسو بار مذکورہ اذکار کو پڑھے تو تعداد میں تو پندرہ سو ہوں گے؛ لیکن میزان عمل میں پندرہ ہزار شمار ہوں گے، اسی طرح سونے سے پہلے ۳۳ر بار ''سبحان الله''، ۳۳ر بار ''الحمدلله'' اور ۳۴ر بار ''الله اکبر'' پڑھنے کی صراحت ہے، جو تعداد میں سو ہیں، مگر میزان عمل میں ایک ہزار شمار ہوتے ہیں؛ لیکن اگر کوئی سو بار ''سبحان الله'' سو بار ''الحمدلله'' اور سو بار ''الله أكبر'' پڑھے، تو یہ تعداد میں تین سو ہوں گے، مگر میزان عمل میں تین ہزار شمار ہوں گے۔ حدیث شریف ملاحظ فرمایئے:

عن عبدالله بن عمر –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: خلتان لا يحصيهما رجل مسلم إلا دخل الجنة، ألا وهما يسير، ومن يعمل بهما قليل يسبح الله في دبر كل صلاة عشرا، ويحمده عشرا، ويكبره عشرا، قال: فأنا رأيت رسول الله ﷺ يعقدها بيده، قال: فتلك خمسون ومائة باللسان وألف وخمس مائة في الميزان، وإذا أخذت مضجعك

تسبحه وتكبره وتحمده مائة، فتلك مائة باللسان، والألف في الميزان.

(ترمذي شريف، أبواب الدعوات، النسخة الهندية ٢/ ١٧٨، دارالسلام، رقم: ٣٤١٠)

اسی طرح درود شریف کی بھی بے شمار فضیلتیں وارد ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی مجھ پر ایک بار درود شریف بھیجے گا، تو اس پر اللہ کی طرف سے دس رحمتیں نازل ہوں گی۔ اور جو دس بار بھیجے گا، اس پر سو رحمتیں نازل ہوں گی۔ اور جو سو بار بھیجے گا تو اسے اللہ تعالیٰ نفاق اور جہنم سے برأت کا پروانہ عطا فرما دے گا اور جنت میں اس کا ٹھکانہ شہداء کے ساتھ ہوگا۔ حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن أنس بن مالك –رضي الله عنهما– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى علي واحدة، صلى الله عليه عشرا، ومن صلى علي عشرا، صلى الله عليه مائة، ومن صلى علي مائة، كتب الله بين عينيه براءة من النفاق، وبراءة من النار، وأسكنه الله يوم القيامة مع الشهداء. (المعجم الأوسط، دارالفكر ٨/ ١١٥، رقم: ٧٢٣١)

ان تسبیحات کو دنیوی اغراض کے لئے پڑھنے سے متعلق اور اس سے دنیوی فائدہ ہونے سے متعلق ہم کو علم نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍رجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۲۵ھ

نماز کے بعد دعا

سوال [۲۹۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز کے بعد دعا مانگنے کا ثبوت ہے یا نہیں؟ جیسا کہ غیر مقلدین کا عمل ہے، وہ کہاں تک درست ہے؟

المستفتی: مطلوب احمد سیوہارہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز کے بعد دعا مانگنے کا ثبوت بہت سی احادیث میں ہے، حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کا نماز کے بعد دعا مانگنا اور نماز کے بعد دعا کی قبولیت سے متعلق ارشاد فرمانا، حدیث کی کتابوں میں وارد ہے؛ البتہ نماز کے بعد دعا مانگنے کو لازم سمجھنا درست نہیں، کوئی اگر نماز کے بعد اپنی ضرورت سے چلا جائے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اور ہمیں غیر مقلدین سے تعارض کی ضرورت نہیں، وہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔ اور نماز کے بعد دعا کے ثبوت سے متعلق چار حدیثیں درج کردیتے ہیں، جوحسب ذیل ہیں:

(۱) **عن أبي أمامة –رضي الله عنه– قال: قيل: يا رسول الله! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر ودبر الصلوات المكتوبات.** (ترمذي، أبواب الدعوات، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۷، دارالسلام، رقم: ۳٤۹۹، السنن الكبرى للنسائي، باب ما يستحب من الدعاء دبر الصلوات المكتوبات، دارالكتب العلمية، بيروت ٦/ ۳۲، رقم: ۹۹۳٦)

(۲) **عن فضالة بن عبيد قال: بينا رسول الله صلى الله عليه وسلم قاعد** ...... **عجلت أيها المصلي إذا صليت فقعدت فاحمد الله بما هو أهله، وصل علي، ثم ادعه، قال: ثم صلى رجل آخر بعد ذلک، فحمد الله وصلى على النبي صلى الله عليه وسلم، فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: أيها المصلي أدع تجب.** (ترمذي، ابواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۵، ۱۸٦، دارالسلام، رقم: ۳٤۷٦، سنن النسائي، الصلاة، باب التحميد والصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم في الصلاة النسخة الهندية ۱/ ۱٤۳، دارالسلام، رقم: ۱۲۸۵، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ۱/ ۳۷۳، رقم: ۷۰۹، المعجم الكبير للطبراني دار إحياء التراث العربي ۱۸/ ۳۰۹، رقم: ۷۹۵)

(۳) **أن عمرو بن مالک الجنبي، أخبره أنه سمع فضالة بن عبيد يقول: سمع النبي صلى الله عليه وسلم رجلا يدعو في صلاته، فلم يصل على النبي صلى الله عليه وسلم**

فقال النبي ﷺ: عجل هذا، ثم دعاه، فقال له أو لغيره: إذا صلى أحدكم فليبدأ بتحميد الله والثناء عليه، ثم ليصل على النبي صلى الله عليه وسلم، ثم ليدع بعد ماشاء. (ترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢/ ١٨٦، دارالسلام، رقم: ٣٤٧٧، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٩/ ٢٠٣، رقم: ٣٧٤٨، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي، بيروت ١/ ٣٧٣، رقم: ٧١٠، سنن أبي داؤد، باب الدعاء، النسخة الهندية ١/ ٢٠٨، دارالسلام، رقم: ١٤٨١، صحيح ابن حبان، دارالفكر ٣/ ١٦٣، رقم: ١٥٦)

(٤) **عن معاذ بن جبل أن رسول الله ﷺ أخذ بيده وقال: يا معاذ! والله إني لأحبك، فقال: أوصيك يا معاذ لاتدعن في دبر كل صلاة تقول: أللهم أعني على ذكرك وشكرك وحسن عبادتك.** (سنن أبي داؤد، باب في الاستغفار، النسخة الهندية ١/ ٢١٣، دارالسلام، رقم: ١٥٢٢، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٧/ ١٠٤، رقم: ٢٦٦١، السنن الكبرى للنسائي، كتاب عمل اليوم والليلة، دارالكتب العلمية بيروت ٦/ ٣٢، رقم: ٩٩٣٧، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ١/ ٣٩١، رقم: ٧٥١، صحيح ابن حبان، دارالفكر ٣/ ١٨٣، رقم: ٢٠١٧، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٢٠/ ٦٠، رقم: ١١٠، ٢٠/ ١٢٥، رقم: ٢٥٠، المستدرك مكتبه نزار مصطفى الباز ١/ ٣٩٩، رقم: ١٠١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ صفر ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۲/۲۶ھ

فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنا

سوال [۲۹۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید کہتا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد دعا کا ثبوت حدیث میں نہیں ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

المستفتی: حبیب اللہ کردم پوری، مسجد محمدی، نئی دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فرض نمازوں کے بعد دعائیں کرنا حدیث پاک سے ثابت ہے۔

عن أبي أمامة قال: قیل: یا رسول اللّٰہ! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف اللیل الآخر، ودبر الصلوات المکتوبات. (ترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندیة ۲/ ۱۸۷، دارالسلام، رقم: ۳٤۹۹، السنن الکبری للنسائي، باب ما یستحب من الدعاء دبر الصلوات المکتوبات، دارالکتب العلمیة، بیروت ٦/ ۳۲، رقم: ۹۹۳٦)

إن رسول اللّٰہ ﷺ کان یقول: في دبر کل صلاة مکتوبة إذا سلم: لا إله إلا اللّٰہ وحده لا شریک له، له الملک، وله الحمد، وهو علی کل شيء قدیر، اللهم لا مانع لما أعطیت ولا معطی لما منعت، ولا ینفع ذا الجد منک الجد. (بخاري ۱/ ۱۱۷، رقم: ۸۳٦، ف: ۸٤٤، مسند الدارمي، دارالمغني الریاض ۲/ ۸٥۰، رقم: ۱۳۸۹ صحیح ابن خزیمة، المکتب الإسلامي ۱/ ۳۸۷، رقم: ۷٤۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۸٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۵/۴ھ

فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت

سوال (الف) [۲۹۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ

ذیل کے بارے میں: فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا شارع علیہ السلام سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہے تو آیا التزام بھی ثابت ہے؟ اگر التزام ثابت نہیں ہے، تو التزام اور اجتماعی ہیئت کے ساتھ دعا کرنا اور اس پر اصرار کرنا کیا حکم رکھتا ہے؟ اور دعا کا التزام نہ کرنے والوں پر نکیر درست ہے یا نہیں؟ براہ کرام تفصیلی جواب سے نوازیں۔ فجزاکم الله أحسن الجزاء.

المستفتی: کلیم احمد، اعظم گڑھ، بدست عبدالحلیم، متعلم جامعہ ہذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: فرض نمازوں کے بعد دعا کرنا حدیث پاک سے ثابت ہے۔

عن أنس –رضي الله عنه– قال: ما صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاة مكتوبة، إلا أقبل بوجهه علينا، فقال: اللهم إني أعوذبک من كل عمل يخزيني. (عمل اليوم والليلة، لابن السني، باب ما يقول في دبر الصبح نوع آخر، مؤسسة علوم القرآن، بيروت، ص: ۱۰۷، رقم: ۱۲۰، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم، مدينة المنورة ۱۴/ ۳۲، رقم: ۷۴۴۹)

عن أبي أمامة –رضي الله عنه– ما دنوت من رسول الله صلى الله عليه وسلم في دبر صلاة مكتوبة، ولا تطوع، إلا سمعته يقول: اللهم اغفرلي ذنوبي وخطاياي كلها. (عمل اليوم والليلة لابن السني، باب ما يقول في دبر صلاة الصبح، نوع آخر، مؤسسة علوم القرآن، بيروت، ص: ۱۰۴، رقم: ۱۱۶، كذا في مجمع الزوائد، دار الكتب العلمية بيروت ۱۰/ ۱۱۱)

اسی طرح حدیث میں اس کا بھی ثبوت ہے کہ اجتماعی طور پر دعا کی جائے، ایک آدمی زور زور سے دعا کے الفاظ کہے، باقی لوگ آمین کہتے رہیں۔

عن قيس بن مخرمة حدثه أن رجلا جاء زيد بن ثابت، فسأله عن شيء، فقال له زيد: عليک بأبي هريرة، فإنه بينا أنا، وأبوهريرة، وفلان في

المسجد ذات يوم، ندعو الله، ونذكر ربنا خرج علينا رسول الله ﷺ حتى جلس إلينا، قال:فجلس وسكتنا، فقال: عودوا للذي كنتم فيه، قال زيد: فدعوت أنا وصاحبي قبل أبي هريرة، وجعل رسول الله ﷺ يؤمن على دعائنا، ثم دعا أبوهريرة. (المستدرك، كتاب معرفة الصحابة، مكتبه نزار مصطفى الباز ٦/ ٢٢١٨، رقم: ٦١٥٨، المعجم الأوسط، دارالفكر ١/ ٣٣٨، رقم: ١٢٢٨، مجمع الزوائد، بيروت ٩/ ٣٦١، حياة الصحابة ٣/ ٤٧٨، السنن الكبرى للنسائي، كتاب العلم، دارالكتب العلمية، بيروت ٣/ ٤٤٠، رقم: ٦١٥٨)

عن حبيب بن مسلمة الفهري، وكان مجاب الدعوة، أنه أمر على جيش فدرب الدروب، فلما أتى العدو، قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا يجتمع ملأ فيدعو بعضهم ويؤمن البعض، إلا أجابهم الله. وفي رواية الطبراني: فيدعو بعضهم ويؤمن سائرهم، إلا أجابهم الله. (المستدرك، كتاب معرفة الصحابة، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت، جديد ٦/ ٢٠٢٣، رقم: ٥٤٧٨، المعجم الكبير للطبراني، داراحياء التراث العربي ٤/ ٢١/ رقم: ٣٥٣٦)

نیز حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بوقت دعا ہاتھوں کو اٹھایا کرتے تھے۔ اور دعا کے اختتام پر چہرہ پر ہاتھ پھیر لیا کرتے تھے۔

عن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله ﷺ إذا رفع يديه في الدعاء، لم يحطهما حتى يمسح بهما وجهه، قال محمد بن المثنى في حديثه: لم يردهما حتى يمسح بهما وجهه. (ترمذي، أبواب الدعوات، باب ماجاء في رفع الأيدي عند الدعاء، النسخة الهندية ٢/ ١٧٦، دارالسلام، رقم: ٣٣٨٦، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ١/ ٢٤٣، رقم: ١٢٩)

عن السائب بن يزيد عن أبيه، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا دعا فرفع يديه، مسح وجهه بيديه. (أبوداؤد، الصلاة، باب الدعاء، النسخة الهندية ١/ ٢٠٩، دارالسلام، رقم: ١٤٩٢، مسند أحمد بن حنبل ٣/ ٢٢١، رقم: ١٨٠٧، المعجم

الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٢٢/ ٢٤١، رقم: ٦٣١، بخاري، باب رفع الأيدي في الدعاء تعليقا ٢/ ٩٣٨)

ان تینوں طرح کی حدیثوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا ثبوت ملتا ہے۔

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه– قال: قال النبي ﷺ: ما من عبد يبسط كفيه في دبر كل صلاة، ثم يقول: إلى آخر الدعاء، إلا كان حقا على الله عز وجل أن لا يرد يديه خائبين. (عمل اليوم والليلة لابن السني، باب ما يقول في دبر صلاة الصبح، مؤسسة علوم القرآن، رقم الحديث: ١٣٨، ص: ١٢١)

لیکن اس پر التزام اور اصرار مشروع نہیں، اسی طرح فرض نمازوں کے سلام پھیرنے کے بعد دعا سے پہلے چلے جانے والوں پر نکیر کرنا بھی درست نہیں؛ اس لئے کہ دعا نماز کا جزو نہیں ہے۔

قال الطيبي: وفيه من أصر على أمر مندوب وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال. (مرقاة المفاتيح، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، إمداديه ملتان ٢/ ٣٥٣، شرح الطيبي، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد كراچى ٣/ ٣٧٤، رقم: ٩٤٢)

الإصرار على أمر مندوب يبلغه حد الكراهة. (سعايه ٢/ ٢٦٥، مستفاد: از فتاوی محموديه ٥/ ٦٨٢-٦٨٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۹۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۸ھ

کیا فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا میں امام کی اقتدا ضروری ہے؟

سوال (ب) [۲۹۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: (۱) ہر فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کی کیا اصل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کن مواقع پر اجتماعی دعا کی ہے؟ یا اجتماعی دعا کی تلقین فرمائی ہے؟

(۲) کیا دعا میں امام صاحب کی اقتدا کرنا ضروری ہے؟ جو لوگ اجتماعی دعا میں شریک نہ ہوں اور اپنی دعا مانگ کر چلے جائیں ان پر نکیر کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: ماسٹر عبدالحق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) فرض نمازوں کے بعد جو دعائیں ہوتی ہیں، وہ نماز کا جزو نہیں ہوتیں، سلام پر نماز ختم ہو جاتی ہے، دعا میں امام کی اقتدا کرنا ضروری نہیں، ہاں البتہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ فرض نماز کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔ اسی طرح حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اجتماعی دعا بہت زیادہ پسندیدہ ہے کہ ایک آدمی دعا کے الفاظ کہے اور باقی لوگ اس کی دعا پر آمین کہیں، یہ اجتماعی دعا فرض نماز کے بعد زیادہ بہتر ہے، اس لئے کہ فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا وقت ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن أبي أمامة –رضي الله عنه– قال: قيل يا رسول الله! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر ودبر الصلاة المكتوبة. (سنن ترمذي ۲/ ۱۸۷)

وعن معاذ بن جبل –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أخذ بيدي قال: يا معاذ! والله أني لأحبك، فقال: أوصيك يا معاذ لا تدعن في دبر كل صلاة تقول: ’’أللهم أعني على ذلك وشكرك وحسن عبادتك‘‘. (سنن أبي داؤد، الصلاة، باب في الاستغفار ۱/ ۲۱۳)

عن قيس المدني أن رجلا جاء زيد بن ثابتؓ، فسأل عن شيء، فقال له زيد: عليك بأبي هريرة، أنا وأبو هريرة وفلان في المسجد ندعو

ونذكر ربنا عز وجل إذ خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى جلس إلينا فسكتنا، فقال: عودوا الذي كنتم فيه، فقال زيد: فدعوت أنا وصاحبي قبل أبي هريرة، وجعل رسول الله ﷺ يؤمن على دعائنا. (طبراني في الأوسط ۹/ ۲٦۱)

عن حبيب بن مسلمة الفهري ...... وكان مستجابا ...... أنه أمر على جيش فدرب الدروب، فلما لقى العدو قال للناس: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا يجتمع ملأ فيدعو بعضه ويؤمن سائرهم إلا أجابهم الله.
(المعجم الكبير للطبراني ٤/ ٢٢، رقم: ٣٥٣٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۲۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۱۱/۸ھ

فرائض پنج گانہ کے بعد دعا مانگنے کا شرعی حکم

سوال [۲۹۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنا شرعاً کیسا ہے؟ حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کیا معمول تھا؟ ہمارے ہندوستان میں عام طور سے ائمہ حضرات دعا مانگتے ہیں، کیا یہ عمل درست ہے یا قابل نکیر ہے؟

المستفتی: احسان احمد قاسمی، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حدیث میں وارد ہوا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد جو دعا کی جاتی ہے، وہ قبول ہوتی ہے اور دوسری حدیث شریف میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جو بھی دعا لوگوں کے اجتماع میں مانگی جائے اور جو بھی دعا ایک جگہ جمع ہوکر مانگی جائے اور ایک شخص دعا

کے الفاظ بولے اور دوسرے لوگ اس پر آمین کہیں، تو ایسی دعا بھی قبول ہوتی ہے؛ لہٰذا دونوں قسموں کی دعا کو جمع کرنے کے بعد فرض نمازوں کے بعد حدیث سے اجتماعی دعا کا جواز ثابت ہوتا ہے؛ لیکن اس کو لازم نہ سمجھا جائے، اگر سلام کے بعد کوئی شخص بغیر دعا کے اٹھ کر چلا جائے تو اس کے اوپر کوئی نکیر نہ کی جائے۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ دعا نماز کا جزو ہے اور بغیر دعا کے اٹھ کر چلا جانا جائز نہیں ہے، ہمارے مغربی اتر پردیش میں یہی معمول ہے کہ نہ کوئی اس کو لازم سمجھتا ہے نہ نماز کا جزو سمجھتا ہے۔ اور اگر بغیر دعا کے اٹھ کر چلا جاتا ہے، تو اس پر کوئی نکیر بھی نہیں کرتا ہے۔

عن أمامة -رضي الله عنه- قال: قيل: يا رسول الله! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر ودبر الصلوات المكتوبات. (ترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۷، دارالسلام، رقم: ۳۴۹۹، السنن الكبرى للنسائي، باب ما يستحب من الدعاء دبر الصلوات المكتوبات، دارالكتب العلمية، بيروت ٦/ ۳۲، رقم: ۹۹۳٦)

عن حبيب بن مسلمة الفهري، وكان مستجابا أنه أمر على جيش، فدرب الدروب، فلما لقى العدو قال للناس: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا يجتمع ملأ فيدعو بعضهم، ويؤمن سائرهم إلا أجابهم الله. (المعجم الكبير، دار إحياء التراث العربي ٤/ ۲۱، رقم: ۳٥۳٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۹۴)

فرائض کے بعد دعا مانگنے کا طریقہ

سوال [۲۹۷٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ نمازوں کے بعد دعا مانگنے کا احناف کے نزدیک مسنون طریقہ کیا ہے؟ اگر دعا ایسی آواز میں بالجہر مانگی جائے، جس کو شرکاء سن سکیں تو جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن موسیٰ لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فرض نماز کے بعد دعا میں مسنون طریقہ یہ ہے کہ قبلہ رو دوزانوں با ادب بیٹھ کر آہستہ خشوع وخضوع سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے، پھر درود شریف، پھر اپنے لئے، پھر والدین کے لئے، پھر تمام مؤمنین ومؤمنات کے لئے دعا کرے اور اپنے ہاتھوں کا رخ آسمان کی طرف رکھے۔ ''درمختار'' میں ہے:

فيبسط يديه حذاء صدره نحو السماء؛ لأنها قبلة الدعاء، ويكون بينهما فرجة، والإشارة بمسبحته لعذر كبرد يكفي والمسح بعده على وجهه سنة في الأصح. (الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، مطلب في إطالة الركوع للجائي، كراچی ۵۰۷، زكريا ۲/ ۲۱۵، ۱/ ٤٧٤، كوئٹه ۱/ ۳۷۵، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، فصل في بيان سننها، دارالكتاب ديوبند، جديد، ص: ۲۵۷)

دعا آہستہ کرنا افضل ہے۔ اور اگر دوسرے نمازیوں کو خلل نہ ہوتو جہرا دعا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۲/۳/۱۷، جدید ڈابھیل ۵/۶۹۲، فتاوی رحیمیہ قدیم ۱/ ۱۸۳، جدید زکریا ۶/ ۵۵)

ومنها: أن يدعو وهو مستقبل القبلة، ومنها: أن يدعو في دبر صلواته، ومنها: أن يرفع اليدين حتى يحاذي بهما المنكبين إذا دعا، ومنها: أن يخفض صوته بالدعاء، ومنها: أن يمسح وجهه بيديه إذا فرغ من الدعاء. (شعب الإيمان للبيهقي، دارالكتب العلمية، بيروت ۲/ ٤٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۶۱)

دعا کی ابتدا ''بسم اللہ'' سے کرنا

سوال [۲۹۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: امام صاحب نماز کے بعد جو دعا کرتے ہیں، اس میں ابتدائی کلمات میں بسم اللہ پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ ایک عالم صاحب کا کہنا ہے کہ حدیث سے ثابت نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ دعا کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ شروع میں اللہ کا ذکر، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود آخر میں بھی یہی حالت ہو اس کے متعلق آپ جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد منصور مفتاحی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: ''بسم اللہ'' شریف سے بھی دعا کی ابتدا کرنا درست ہے؛ اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ ہر اہم کام بسم اللہ شریف سے شروع کیا جائے اور دعا بھی ایک اہم کام ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: كل أمر ذي بال لا يبدأ فيه ببسم الله الرحمن الرحيم، أقطع. (كنز العمال، حاشية مسند أحمد/ ۳۷۱)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كل كلام أو أمر ذي بال لا يفتح بذكر الله عز وجل فهو أبتر، أو قال: أقطع. (مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۳۵۹، رقم: ۸۶۹۷، ابن ماجة، النكاح، باب خطبة النكاح، النسخة الهندية ۱/ ۱۳۶، دارالسلام، رقم: ۱۸۹٤، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب الهدي في الكلام، النسخة الهندية ۲/ ٦٦٥، دارالسلام، رقم: ٤٨٤٠، السنن الكبرى للنسائي، باب ما يستحب من الكلام عند الحاجة، دارالكتب العلمية، بيروت

٦/ ١٢٧، رقم: ١٠٣٢٨، صحيح ابن حبان، دارالفكر ١/ ٧٤، رقم: ١-٢، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٩/ ٧٢، رقم: ١٤١، سنن الدار قطني، كتاب الصلاة، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٢٣٥، رقم: ٨٧٢، ٨٧٣)

اورآداب دعا میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور درود پاک کے ساتھ شروع کی جائے، ایسی دعا کی قبولیت کی زیادہ امید ہوتی ہے؛ اس لئے ’’بسم اللہ‘‘ سے شروع کرنا بھی درست ہے۔ اور حمد وثناء سے شروع کرنا بھی درست ہے۔ اسی طرح بسم اللہ اور حمد وثناء اور درود شریف تینوں کے ساتھ شروع کرنا بھی صحیح ہے؛ اس لئے کوئی قابل اشکال چیز نہیں ہے۔

عن فضالة بن عبيد يقول: سمع النبي صلى الله عليه وسلم رجلا يدعو في صلاته فلم يصل على النبي صلى الله عليه وسلم، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: عجل هذا، ثم دعاه، فقال له أو لغيره: إذا صلى أحدكم فليبدأ بتحيمد الله و الثناء عليه، ثم ليصل على النبي صلى الله عليه وسلم، ثم ليدع بعد ما شاء، هذا حديث حسن صحيح. (ترمذي شريف، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢/ ١٨٦، دارالسلام، رقم: ٣٤٧٧، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة ٩/ ٢٠٣، رقم: ٣٧٤٨، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ١/ ٣٧٣، رقم: ٧١٠، مسند أحمد بن حنبل ٦/ ١٨، رقم: ٢٤٤٣٤، سنن أبي داؤد، الصلاة، باب الدعاء، النسخة الهندية ١/ ٢٠٨، دارالسلام، رقم: ١٤٨١، صحيح ابن حبان دارالفكر، بيروت ٣/ ١٦٣، رقم: ١٩٥٦، المستدرك، كتاب الصلاة، مكتبه نزار مصطفى مكة المكرمه الرياض ١/ ٣٤٣، رقم: ٨٤٠، مشكل الآثار، دارالكتب العلمية، بيروت ٣/ ٥٤-٥٥، رقم: ٢٣٨٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۲۵ھ

دعا کے شروع میں ''تحمید'' اور اختتام پر ''برحمتک'' بلند آواز سے کہنا

سوال [۲۹۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فرائض کے بعد جب سراً دعا کی جائے تو دعا کی ابتداء میں ''**الحمدلله رب العالمين**'' اور ختم پر ''**برحمتک يا أرحم الراحمين**'' وغیرہ جیسے الفاظ کہنا، تاکہ مقتدیوں کو دعا کی ابتداء اور ختم معلوم ہوجائے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

المستفتی: فہیم احمد نگینوی، مدرسہ اشرف المدارس، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دعا کو حمد وثناء سے شروع کرنا آداب دعا میں سے ہے، جس کا اعلیٰ مصداق ''**الحمدلله رب العالمين**'' ہے، نیز دعا کے اختتام کو بتلانے کے لئے ''**برحمتک يا أرحم الراحمين**'' یا اس جیسے دوسرے دعائیہ کلمات بآواز بلند کہنا شرعاً جائز ہے۔ اور تفسیر ''روح المعانی'' میں: ''**سبحان ربک رب العزة عما يصفون الخ**'' پر دعا کو ختم کرنا مشہور اور متعارف نقل فرمایا ہے۔

المشهور اليوم بين الناس أنهم يقرؤن عند ختم مجلس القراء ة، أو الذكر، أو نحوهما الآية المذكورة. (روح المعاني، سورة الصافات، آيت: ۱۸۲، مكتبه زكريا ۱۳/ ۲۳۳، قديم مصري ۲۳/ ۱۵۹)

إن الذكر بعد الصلاة كان يختم بالتكبير، ويرفع به الصوت شيئًا ليقف الناس على أن الإمام قد فرغ من توابع الصلاة، فيذهبوا إلى حوائجهم كما أن الجهر بالتسليم لكي يعرف القوم أن الصلاة بأصلها قد تمت، وإن بقيت توابعها من الدعاء والذكر. الخ (إعلاء السنن، كتاب

الصلاة، باب في بعض آداب الدعاء، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۲۱۳-۲۱۲، کراچی ۳/ ۱۷۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۳ ۶۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲۲ھ

امام صاحب کا دعا کے شروع وآخر میں جہر کرنا

سوال [۲۹۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں امام صاحب جمعہ کی نماز میں بھی اور جمعہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں بھی صرف اس لئے کہ نمازی زیادہ ہوتے ہیں، سلام پھیر کر دعا مانگتے وقت ''**الحمد للّٰہ رب العالمین**'' ہلکی بلند آواز سے اور اختتام پر ''**برحمتک یا أرحم الراحمین**'' کہہ دیتے ہیں، امام اور مقتدی سراً اپنی اپنی دعائیں مانگتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا امام صاحب کا دعا مانگتے وقت جہراً یہ کلمات کہہ دینا شرعاً مکروہ تو نہیں ہے۔

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امام کے لئے دعا کے شروع میں ''**الحمد للّٰہ رب العالمین**'' زور سے کہنا اور آخر میں ''**برحمتک یا أرحم الراحمین**'' زور سے کہنا، تاکہ مقتدیوں کو پتہ چل جائے جائز اور درست ہے۔

ویمکن أن یقال: إن الذکر بعد الصلاۃ کان یختم بالتکبیر، ویرفع به الصوت شیئا؛ لیقف الناس علی أن الإمام قد فرغ من توابع الصلاۃ، فیذهبوا إلی حوائجهم، کما أن الجهر بالتسلیم؛ لکی یعرف القوم أن الصلاۃ بأصلها قد تمت، وإن بقیت توابعها من الدعاء، والذکر. (إعلاء

السنن، كتاب الصلاة، باب في بعض آداب الدعاء، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۱۳، ۲۱۲، کراچی ۳/ ۱۷۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۲ھ

فرض نماز کے بعد دعا مانگنا کیسا ہے؟

سوال (الف) [۲۹۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فرض نماز کے بعد دعا مانگنا کیا حضور ﷺ سے ثابت ہے؟ اگر ثابت ہے تو اتنی طویل دعا مانگنا کہ نمازی اکتا جائیں یا سنت ونوافل کے پڑھنے میں تاخیر ہوتی رہے، کیسا ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر ایم اسلام خان، سرائے خیر نگر میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حضور ﷺ نے فرض نماز کے بعد دعا کی ترغیب دی ہے اور فرمایا کہ فرض نماز کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔

عن العرباض بن سارية -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من صلى صلاة فريضة فله دعوة مستجابة. (المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ۱۸/ ۲۵۹، رقم: ۶۴۷، الفية الحديث، ص: ۱۶۸)

ہاں البتہ اتنی طویل دعا نہیں ہونی چاہئے کہ اس کی وجہ سے لوگ اکتاہٹ میں مبتلا ہوجائیں، بلکہ اس وقت تک جاری رکھنی چاہئے جب تک پوری طرح توجہ اور رغبت باقی رہے۔

عن أنس -رضى الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا دعا أحدكم فليعزم المسألة. الحديث (صحيح البخاري، باب ليعزم المسألة؛ فإنه لا مستكره له، النسخة الهندية ۲/ ۹۳۸، رقم: ۶۰۹۳، ف: ۶۳۳۸)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ادعوا الله وأنتم موقنون بالإجابة، واعلموا أن الله لا يستجيب دعاء من قلب غافل لاه. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۶، دار السلام، رقم: ۳۴۷۹، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ۱۷/ ۳۰۷، رقم: ۱۰۰۵۹، المستدرك، كتاب الدعاء والتكبير، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ۲/ ۶۹۴، رقم: ۱۸۱۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍شوال ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۴۷۳)

نماز کے بعد دعا نماز کا جزو نہیں

سوال (ب) [۲۹۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جن فرضوں کے بعد سنت ونوافل نہیں ہیں، ان میں نماز سے بھی لمبی اجتماعی دعا کرنا، جب کہ دعا کو عبادت کا مغز کہا گیا ہے اور ہر مغز اپنے پھل یا پھول سے بہت چھوٹا ہوتا ہے، مسنون کیا ہے؟

المستفتی: ماسٹر عبدالحق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز کے بعد دعا نماز کا جزو نہیں، امام کے سلام کے بعد نماز ختم ہوجاتی ہے، اس کے بعد جس کی مرضی چلا جائے اور جس کی مرضی بیٹھ جائے، جس کی مرضی امام کے ساتھ دعا میں شریک ہونا ہے وہ شریک ہوجائے اور جس کی مرضی امام کے ساتھ دعا میں شریک نہ ہونا ہے وہ چلا جائے، کسی کو کسی پر نکیر اور دارو گیر کا حق نہیں۔ اور امام کو چاہئے کہ اجتماعی دعا اتنی لمبی نہ کرے جس سے دعا میں شریک ہونے والے مقتدیوں کو گرانی

ہواور امام کو اختیار ہے کہ کبھی مختصر دعا کرے اور کبھی لمبی ،مقتدیوں میں سے جس کا دل چاہے شریک ہو اور جس کا دل چاہے شریک نہ ہو۔ اور جن نمازوں کے بعد سنن ونوافل نہیں ہیں ان نمازوں کے بعد لمبی دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں اور جن نمازوں کے بعد سنن ونوافل ہوں ان نمازوں کے بعد مختصر دعا کریں اور اجتماعی دعا حدیث سے ثابت ہے۔(مستفاد: فتاوی رحیمیہ جدید ۶/ ۸۰، امداد الاحکام ۱/ ۳۲۲)

یسن للإمام أن یقتصر في الذکر و الدعاء لحضرة المأمومین.
(إمداد الفتاوی ۱/ ۸۰٤)

عن حبیب بن مسلمة الفهري قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: لا یجتمع ملأ فیدعو بعضهم ویؤمن سائرهم إلا أجابهم الله.
(المعجم الکبیر للطبراني ٤/ ۲۲، رقم: ۳٥۳٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۲۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۱۱/۸ھ

فرائض کے بعد اجتماعی دعا

سوال [۲۹۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارا یہ علاقہ فضلائے دارالعلوم دیوبند کا علاقہ ہے، اپنے اکابر کے طرز عمل پر فرض نمازوں کے بعد امام صاحب اجتماعی دعا کا اہتمام کرتے رہے ہیں، سراً وجہراً دونوں حسب موقع دعا ہوتی رہتی ہے، مگر اب کچھ فضلائے کرام اس پر بضد ہیں کہ اجتماعی دعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے؛ اس لئے یہ بدعت ہے؛ اس لئے آپ حضرات سے تفصیلی جواب مع حوالہ مطلوب ہے، تاکہ مسئلہ کی پوری وضاحت ہوجائے۔ اور اسی کے مطابق عمل کیا جائے اور عوام میں اسی کی دعوت دی جائے، نیز میری یہ بھی درخواست ہے کہ بشکل

مضمون ندائے شاہی میں شائع کیا جائے ،تاکہ عمومی شکل میں بات واضح ہوجائے، جولوگ فرض نمازوں کے بعد دعا کو بدعت کہتے ہیں،وہ ندائے شاہی کے خریدار بھی ہیں۔ امید ہے کہ ضرور توجہ فرمائیں گے۔

المستفتی: مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم فرقانیہ،مقام وپوسٹ اکسرڑ وا،مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احادیث شریفہ میں فرض نمازوں کے بعد دعائیں مانگنا اور دعاؤں کا قبول ہونا ثابت ہے۔ اور فقہاء کرام کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد امام اور مقتدی سب مل کر دعا مانگیں اور امام زور سے دعا کرے اور مقتدی آمین کہیں، یا امام دعا کرائے اور سب لوگ اپنی اپنی سری دعا کرتے رہیں، دونوں طرح جائز ہے؛ لیکن یہ یاد رکھیں کہ فرض نمازوں کے بعد اس اجتماعی دعا کو نہ نمازوں کا جزو سمجھا جائے اور نہ ہی لازم سمجھا جائے ، کسی کو نماز کے بعد دعا سے پہلے ضرورت پیش آجائے تو وہ بلا تکلف دعا سے پہلے چلا جائے یا کوئی اس دعا میں شریک نہ ہو تو اس پر کوئی الزام اور طعن وتشنیع نہ ہو، یا خود امام صاحب کسی دن دعا نہ کرائیں اور دعا کرائے بغیر اٹھ کر چلے جائیں،تو امام صاحب پر کوئی الزام یا کوئی تبصرہ بھی نہ ہو،ان شرائط کے ساتھ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا بلا تردد جائز اور درست ہے؛ لیکن اگر نمازوں کا جزو سمجھا جائے یا نماز کے بعد دعا کو لازم سمجھا جائے تو یہ عقیدہ بدعت ہے۔اور جن علماء کرام نے بدعت کہا ہے،اگر اس نقطہ نظر سے بدعت کہا ہے، تو درست ہے۔ اور اگر یہ نقطہ نظر پیش نظر نہیں ہے؛ بلکہ فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کو علی الاطلاق بدعت کہا جارہا ہے،تو ان کی بات درست نہیں ہے۔(مستفاد: کفایت المفتی ۳/ ۲۹۱ تا۲۹۷، ۳/ ۲۸۰،زکریا مطول ۴/ ۳۴۳،۳۴۳، ۴۴،احسن الفتاوی ۳/ ۶۰ تا ۶۸ ،امداد الفتاوی ۱/ ۷۹۵ تا ۸۱۶)

عن أبي أمامة –رضی اللہ عنہ– قال: قیل: یا رسول اللہ ! أی الدعاء أسمع؟ قال: جوف اللیل الآخر، ودبر الصلوات المتکوبات. (ترمذي شریف،

أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۷، دارالسلام، رقم: ۳٤۹۹، السنن الكبرى للنسائي، باب ما يستحب من الدعاء دبر الصلوات المكتوبات، دارالكتب العلمية، بيروت ٦/ ۳۲، رقم: ۹۹۳٦)

ثم يدعون لأنفسهم وللمسلمين بالأدعية الماثورة الجامعة رافعي أيديهم حذاء الصدر وبطونها مما يلي الوجه بخشوع وسكون إلى قوله: ثم يمسحون بها وجوههم في آخره. (حاشية الطحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، فصل في صفة الأذكار، دارالكتاب ديوبند، جديد ۳۱٦-۳۱۸)

عن عائشة –رضي الله عنها– زعم أنه سمعه منها أنها رأت النبي صلى الله عليه وسلم يدعوه رافعا يديه، يقول: إنما أنا بشر، فلا تعاقبني، أيما رجل من المؤمنين آذيته أو شتمته فلا تعاقبني فيه. (الأدب المفرد، باب رفع الأيدي في الدعاء، دارالكتب العلمية، بيروت، ص: ۱۸٤-۱۸۵، رقم: ٦۱۰-٦۱۳، مسند أحمد بن حنبل ٦/ ۲۵۸، رقم: ۲٦۷٤۸)

عن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا رفع يديه فى الدعاء لم يحطهما حتى يمسح بهما وجهه. (ترمذي شريف، أبواب الدعوات، باب ما جاء في رفع الأيدي عند الدعاء، النسخة الهندية ۲/ ۱۷٦، دارالسلام، رقم: ۳۳۸٦)

عن عمر –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ كان إذا رفع يديه في الدعاء لم يردهما حتى يمسح بهما وجهه. (مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ۱/ ۲٤۳، رقم: ۱۲۹، الدعاء للطبراني ۱/ ۸۷، رقم: ۲۱۲، المستدرك، كتاب الدعاء والتكبير، مكتبه نزار مصطفى، جديد ۲/ ۷٤۸، رقم: ۱۹٦۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	**الجواب صحیح:**
۱۵/ صفر ۱۴۲۸ھ	**احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ**
(الف فتویٰ نمبر: ۹۱۷۲/۳۸)	**۱۴۲۸/۲/۱۴ھ**

کیا اجتماعی دعائیں قبولیت کا درجہ زیادہ رکھتی ہیں؟

سوال [۲۹۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حضورا کرم ﷺ سے کیا اجتماعی دعائیں اکثر ثابت ہیں، یا اجتماعی دعائیں قبولیت کا درجہ زیادہ رکھتی ہیں؟ کیوں کہ فرض یا کچھ واجب نمازیں اجتماعی طور پر ہوتی ہیں، ان کے علاوہ بھی کیا اجتماعی عبادات ہیں؟ اوران میں دعا بھی شامل ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر ایم اسلام خان، سرائے خیر نگر، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حضور ﷺ نے فرمایا کہ فرض نماز کے بعد دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور جب آپ ﷺ دعا مانگتے تھے تو دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر مانگا کرتے تھے، اور جب آپ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہے ہوں گے تو کیا صحابہ دیکھتے رہ گئے ہوں گے؟ ظاہر بات ہے کہ صحابہ بھی آپ کے ساتھ دعا میں شریک ہوتے رہے ہوں گے؛ اس لئے اجتماعی دعا پر نکیر درست نہیں، ہاں البتہ اجتماعی دعا کو لازم نہ سمجھا جائے اوراس علاقہ میں اجتماعی دعا کو لازم نہیں سمجھا جاتا، اجتماعی عبادت کے ساتھ اجتماعی دعا کر لی جائے تو قبولیت کی زیادہ امید ہے۔

عن العرباض بن سارية -رَضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى صلاة فريضة فله دعوة مستجابة. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٨ / ٢٥٩، رقم: ٦٤٧)

عن أبي أمامة -رضى الله عنه- قال: قيل: يا رسول الله! أى الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر، ودبر الصلوات المتكوبات. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢ / ١٨٧، دارالسلام، رقم: ٣٤٩٩)

عن سلمان –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: ما رفع قوم أكفهم إلى الله عز وجل يسألونه شيئا إلا كان حقا على الله أن يضع في أيديهم الذي سألوا. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٦/ ٢٥٤، رقم: ٦١٤٢)

عن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا رفع يديه فى الدعاء لم يحطهما حتى يمسح بهما وجهه. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب ما جاء في رفع الأيدي عند الدعاء، النسخة الهندية ٢/ ١٧٦، دار السلام، رقم: ٣٣٨٦، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ١/ ٢٤٣، رقم: ١٢٩، المستدرك، كتاب الدعاء والتكبير، مكتبه نزار مصطفى، جديد ٢/ ٧٤٨، رقم: ١٩٦٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍شوال ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۴۷۳/۳۳)

فرض نماز کے بعد مداومت کے ساتھ اجتماعی دعا

سوال [۲۹۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فرض نماز کے بعد امام کا جہراً اجتماعی دعا کرانا اور اس کے اوپر مداومت کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد نواب اختر بجنوری، متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اس طرح دعا کو اگر سنت صلوۃ اور مستحبات صلوۃ میں سے نہیں سمجھا جاتا ہے؛ بلکہ محض دعا الگ سے ایک امر مستحب ہونے کے عقیدہ سے اس طرح دعا کی جاتی ہے، تو اس کی گنجائش ہے، مگر اس کو لازم سمجھنا بدعت ہے؛ البتہ اگر اس طرح دعا کو نماز کا جزو اور سنت صلوۃ میں سے سمجھا جائے تو جائز نہیں۔ (مستفاد: حاشیہ امداد الفتاوی ۱/۸۰۴)

من أصر على أمر مندوب وجعله عزما ولم يعمل بالرخصة، فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال. (شرح الطيبي، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، كراچی ٣/ ٣٧٤، رقم: ٩٤٢، مرقاة شرح مشكوة، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، إمداديه ملتان ٢/ ٣٥٣)

وكل مباح يؤدي إليه فمكروه. (تحته في الشامية:) الظاهر أنها تحريمية؛ لأنه يدخل في الدين ما ليس منه. (شامي، كتاب الصلاة، قبيل باب صلاة المسافر، كراچی ٢/ ١٢٠، زكريا ٢/ ٥٩٨)

وأما إذا سجد بغير سبب، فليس بقربة، ولا مكروه، وما يفعل عقيب الصلاة، مكروه؛ لأن الجهال يعتقدونها سنة، أو واجبة، وكل مباح يؤدي إليه فمكروه. (هندية، كتاب الصلاة، قبيل الباب الرابع عشر فی صلاة المريض، زكريا قديم ١/ ١٣٧، جديد ١/ ١٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۵/۱/۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۸۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱/۱۶ھ

نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی کیفیت

سوال [۲۹۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دعا مانگتے وقت دونوں ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں اور دونوں ہاتھ ملا کر رکھے جائیں یا دونوں کے درمیان فاصلہ رکھنا بہتر ہے؟ دعا مانگنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

المستفتی: غفران احمد، خوشحال گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث شریف میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا مسنون طریقہ اس طرح مروی ہے کہ دونوں ہاتھوں کو اتنا اٹھایا جائے کہ نگاہ آسانی کے ساتھ ہتھیلیوں

پر رہے اور یہ جبھی ہوسکتا ہے، جب کہ دونوں ہاتھ سینے کے برابر اٹھائے جائیں؛ لہٰذا دعا کا مسنون طریقہ یہ ہوگا کہ دونوں ہاتھوں کو سینے تک اٹھایا جائے اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے درمیان قدرے فاصلہ رہے۔

عن الفضل بن عباس –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: الصلاة مثنى مثنى تشهد في كل ركعتين، وتخشع وتضرع وتمسكن وتقنع يديك، يقول ترفعهما إلى ربك مستقبلا ببطونهما وجهك، وتقول: يا رب! ومن لم يفعل ذلك، فهو كذا وكذا. (ترمذي، الصلاة، باب ماجاء في التخشع في الصلاة، النسخة الهندية ١/ ٨٧، دارالسلام، رقم: ٣٨٥، مسند أحمد بن حنبل ١/ ٢١١، رقم: ١٧٩٩، ٤/ ١٦٧، رقم: ١٧٦٦٦، السنن الكبرى للنسائي، كتاب السهو، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٢١٢، رقم: ٦١٥، ومثله في مشكوة المصابيح، ص: ١٩٦)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: المسألة أن ترفع يديك حذو منكبيك أو نحوهما. (سنن أبي داؤد، الصلاة، باب الدعاء، النسخة الهندية ١/ ٢٠٩، دارالسلام، رقم: ١٤٨٩)

عن الزهري قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يرفع يديه عند صدره في الدعاء، ثم يمسح بهما وجهه. (مصنف عبدالرزاق،المجلس العلمي ٢/ ٢٤٧، رقم: ٣٢٣٤، ٣/ ١٢٢، رقم: ٥٠٠٣)

والمستحب أن يرفع يديه عند الدعاء بحذاء صدره، والأفضل في الدعاء أن يسبط كفيه، ويكون بينهما فرجة. (هندية، كتاب الكراهية، قبيل الباب الخامس في آداب المسجد، زكريا قديم ٥/ ٣١٨، جديد ٥/ ٣٦٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٥/ ربیع الثانی ١٤٢١ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٥/ ٦٥٨٥)

نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا

سوال [۲۹۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے نماز پڑھائی، نماز پڑھنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کی یا کسی اور نے کی، ان لوگوں کا نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا حدیث وقرآن سے ثابت ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالسلام، منی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنا احادیث شریفہ سے ثابت ہے، ہاتھ اٹھانے کے آداب دعا میں سے ہونے کی صراحت بھی احادیث میں موجود ہے؛ لہٰذا فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا حدیث رسول کے مطابق ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۶۸ و۶۶، کفایت المفتی ۳/ ۲۹۷، ۲۹۶، زکریا مطول ۴/ ۷۰، امداد الفتاوی ۱/ ۸۰۷)

عن أبي أمامة –رضی اللہ عنہ– قال: قيل: يا رسول اللہ! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر، ودبر الصلاة المكتوبة. (ترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۷، دارالسلام، رقم: ۳۴۹۹، السنن الكبرى للنسائي، باب ما يستحب من الدعاء دبر الصلوات المكتوبات، دارالكتب العلمية، بيروت ٦/ ٣٢، رقم: ٩٩٣٦)

عن سلمان –رضي اللہ عنہ– قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: إن ربكم حيي كريم يستحيي من عبده إذا رفع يديه إليه أن يردهما صفرا. (أبوداؤد، الصلاة، باب الدعاء، النسخة الهندية ١/ ٢٠٩، دارالسلام، رقم: ١٤٨٨، سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢/ ١٩٦، دارالسلام، رقم: ٣٥٥٦، صحيح ابن حبان، دارالفكر ٢/ ٩٢-٩٣، رقم: ٨٧٣-٨٧٧، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٦/ ٢٥٦، رقم: ٦١٤٨، مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي ٢/ ٢٥١، رقم: ٣٢٥٠)

وإذا ثبت رفع اليدين في الدعاء، فالإنكار عليه وعده في البدعات غلو وإفراط لا محل له. (هامش عمل اليوم والليلة، مؤسسة علوم القرآن، بيروت ١/ ١٢٢)

فثبت أن الدعاء مستحب بعد كل صلاة مكتوبة متصلا بها برفع اليدين كما هو شائع في ديارنا، وديار المسلمين قاطبة. (إعلاء السنن، باب الإنحراف بعد السلام و كيفيته وسنية الدعاء والذكر بعد الصلاة، دارالكتب العلمية، بيروت ٣/ ٢٠٥، رقم: ٩٣٨، کراچی ٣/ ١٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍رجب ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۳۹۲)

پنجوقتہ نمازوں کے بعد دعا مانگنا

سوال [۲۹۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پنجوقتہ نمازوں کے بعد دعا مانگنا حدیث سے ثابت ہے کہ نہیں؟ بعض مسلک کے لوگ بدعت بتاتے ہیں؛ لہٰذا احادیث کے حوالوں سے تحریر فرمائیں۔

المستفتی: ملک عبدالماجد مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پنجوقتہ نمازوں کے بعد دعا مانگنا حدیث سے ثابت ہے، اس کو بدعت کہنا درست نہیں ہے۔ اور ہر فرض نماز کے بعد دعا مانگنے کی بڑی فضیلت آئی ہے، بطور مثال چند احادیث یہاں لکھی جارہی ہیں ملاحظہ فرمائیں:

عن مسلم بن أبي بكرة، عن أبيه، عن النبي ﷺ أنه كان يدعو في دبر الصلاة، يقول: اللهم إني أعوذ بک من الكفر، والفقر، وعذاب القبر.

(مصنف ابن أبي شيبة، كتاب الدعاء، مؤسسة علوم القرآن ١٥/ ٧٥، رقم: ٢٩٧٤٨،

٧/ ٤٥١، رقم: ١٢١٥٥، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٣٩، رقم: ٢٠٦٨٠، ٥/ ٤٤، رقم: ٢٠٧٢٠، سنن النسائي، الصلاة، باب التعوذ في دبر الصلاة، النسخة الهندية ١/ ١٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٤٨، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ١/ ٣٨٩، رقم: ٧٤٦،صحيح ابن حبان، دارالفكر ٢/ ١٤٢، رقم: ١٠٢٤، المستدرك، مكتبة نزار مصطفى ١/ ٣٧٤، رقم: ٩٣٧)

عن أبي أمامة –رضى الله عنه– قال: قيل: يا رسول الله ! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر، ودبر الصلاة المكتوبة. هذا حديث حسن. (ترمذي شريف، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢/ ١٨٧، دارالسلام، رقم: ٣٤٩٩، السنن الكبرى للنسائي، باب ما يستحب من الدعاء دبر الصلوات المكتوبات، دارالكتب العلمية، بيروت ٦/ ٣٢، رقم: ٩٩٣٦)

أملى على المغيرة بن شعبة في كتاب إلى معاوية أن النبي ﷺ كان يقول في دبر كل صلاة مكتوبة: لا إله إلا الله وحده لا شريک له، له الملک، وله الحمد، وهو على كل شيء قدير، اللهم لا مانع لما أعطيت، ولا معطي لما منعت، ولا ينفع ذا الجد منک الجد. (بخاري شريف، الصلاة، باب الذكر بعد الصلاة، النسخة الهندية ١/ ١١٧، رقم: ٨٣٦، ف: ٨٤٤، مسند الدارمي، دارالمغني الرياض ٢/ ٨٥٠، رقم: ١٣٨٩، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ١/ ٣٨٧، رقم: ٧٤٢)

عن أنس بن مالک –رضي الله عنهما– عن النبي ﷺ أنه قال: ما من عبد يبسط كفيه في دبر كل صلاة، ثم يقول: اللهم الهي وإله إبراهيم وإسحاق ويعقوب، وإله جبرئيل وميكائل وإسرافيل عليهم السلام، أسئلک أن تستجيب دعوتي وتعصمني في ديني، فإني مبتلا، وتنالني برحمتک، فإنى مذنب، وتنفى عني الفقر، فإني متمسكن إلا كان حقا على

الله عز وجل أن لا يرد عليه خائبين. (عمل اليوم والليلة لابن السني، باب ما يقول في دبر صلاة الصبح؟ مؤسسة علوم القرآن، بيروت/ ۱۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۱۰۹)

نماز کے بعد لمبی دعا کرنا کیسا ہے؟

سوال [۲۹۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: امام صاحب نے عشاء کی نماز پڑھائی، پہلی رکعت میں سورۂ ''والشّمس'' اور دوسری رکعت میں سورۂ ''والضحیٰ'' تلاوت کی گئی، آپ یہ بتائیں کہ اس میں کتنی منٹ لگنی چاہئے؟ جماعت میں تکبیر سے لے کر دعا کے اختتام تک کل نو منٹ لگے، آیا اتنی دیر لگنا درست ہے یانہیں؟ معترض نے اعتراض کیا ہے کہ کسی بھی امام کے نزدیک اتنی لمبی دعا جائز نہیں ہے، شرعی فیصلہ سے روشناس کرائیں۔

المستفتی: نیاز محمد علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اعتبار منٹوں کا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اعتبار صحت الفاظ اور صحیح پڑھنے کا ہوتا ہے، اگر نو منٹ میں صحت الفاظ کے ساتھ نماز پڑھی گئی ہے، تو نماز مسنون طریقہ سے ادا ہوچکی ہے، دعا بہت لمبی نہیں ہونی چاہئے جس سے حاضرین کو اکتاہٹ اور قلق ہوتا ہو، دعا کا جامع اور مختصر ہونا مسنون ہے۔

عن عائشة -رضي الله عنها- قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا سلم لم يقعد إلا مقدار ما يقول: أللهم أنت السلام ومنك السلام تباركت يا ذاالجلال والإكرام. (صحيح مسلم، الصلاة، باب استحباب الذكر بعد

الصلاة، و بيان صفته، النسخة الهندية ١/ ٢١٨، بيت الأفكار، رقم: ٥٩٢، مسند الدارمي، مكتبه دارالمغني ٢/ ٨٥٠، رقم: ١٣٨٧)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: ادعوا الله وأنتم موقنون بالإجابة، واعلموا أن الله لا يستجيب دعاء من قلب غافل لاه. (سنن الترمذي، أبواب الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢/ ١٨٦، دارالسلام، رقم: ٣٤٧٩، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ١٧/ ٣٠٧، رقم: ١٠٠٥٩، المستدرك، كتاب الدعاء و التكبير، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ٢/ ٦٩٤، رقم: ١٨١٧)

الإمام إذا فرغ من الظهر والعصر والمغرب والعشاء يشرع في السنة ولا يشتغل بأدعية طويلة لما روى عن عائشة –رضى الله عنها– أن النبي ﷺ كان يمكث بعد السلام قدر مايقول: أللهم أنت السلام منك السلام تباركت يا ذاالجلال والإكرام. (تاتار خانية، كتاب الصلاة، الفصل الثالث في كيفية الصلاة، زكريا ٢/ ١٩٤، رقم: ٢١١٩، كوئٹه ١/ ٥٥٧، هندية، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، زكريا قديم ١/ ٧٧، جديد ١/) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۳/۲/۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۰۳۳)

نماز مختصر اور دعا لمبی کرانا

سوال [۲۹۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز جلدی یعنی مختصر وقت میں پڑھ لینا اور دعا میں طویل وقت لگانا کیسا ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر ایم اسلام خان، سرائے خیر نگر، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جیسی اہم عبادت کا دعا سے مقابلہ کرکے اہمیت گھٹانا

صحیح نہیں ہے، نماز اپنی جگہ فرض اور لازم ہے، جس کو دین کا ستون کہا گیا ہے اور دعا اپنی جگہ الگ سے عبادت ہے، جس کو ''مخ العبادۃ'' بھی کہا گیا ہے۔

عن أنس –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الدعاء مخ العبادة. وفي رواية: قال: الدعاء هو العبادة. الحديث (ترمذي ٢/ ١٧٥)

دونوں میں مقابلہ کر کے دعا کی وجہ سے نماز میں تخفیف کرنا سخت ناواقفیت کی دلیل ہے، علمائے کرام کے ذریعہ سے وہاں کے لوگوں اور ماحول کی اصلاح کی کوشش کی جائے، ہاں البتہ اجتماع کے موقع پر لمبی دعا کی جاتی ہے، تو یہ مقابلہ نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ کبھی کبھی ہوتی ہے۔

عن عمر –رضى الله عنه– قال: جاء رجل فقال: يا رسول الله! أي شيء أحب الإسلام؟ قال: الصلاة لوقتها، ومن ترك الصلاة فلا دين له، والصلاة عماد الدين. (شعب الإيمان بيروت ٣/ ٣٩، رقم: ٢٨٠٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر شوال ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۴۷۳)

نماز، تسبیحات اور تلاوت کو مختصر کر کے لمبی دعا کرنا

سوال [۲۹۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز، روزہ، تسبیحات، قرآن کی تلاوت، قرآن وحدیث کا بیان، کیا ان عبادات سے زیادہ بہتر ہے دعا مانگنا، ان عبادات کو روک کر کے کہ ٹائم کم ہے اور اس کے بعد طویل دعائیں مانگنا یعنی ان عبادات سے بہتر دعا کو سمجھنا کیسا ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر ایم اسلام خان ماسٹر جنرل اسٹور، سرائے خیر نگر، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز، روزہ تسبیحات اور تلاوت وغیرہ اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں اوردعا بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے، آپ کا تقابل درست نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ﴾ [قٓ: ۳۹]

الدعاء هو العبادة. الحديث (ترمذي، كتاب الصلاة ۲/ ۱۲۷) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ شوال ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۷۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۱۰/ ۱۴۱۸ھ

فرض کے بعد دعا بالجہر کو لازم سمجھنا

سوال [۲۹۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے شہر میں فرض نمازوں کے بعد اجتماعی طور پر دعا بالجہر کا رواج چل پڑا ہے، اور اس رواج سے متعلق مصلیان مسجد وجوب ولزوم کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس کے تارک کو لعنت وملامت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اور اس عقیدہ کی بیخ کنی کے جذبہ سے سرشار ایک صحیح العقیدہ مفتی صاحب کو موردالزام ٹھہراتے ہیں، جیسا کہ چند دن قبل شہر کی مسجد اقصیٰ میں مفتی، خطیب نے اس پر نکیر کی اور دعا بالسر کی ترغیب دی، تو محلّہ کے معدود چند افراد اس کی کھلی مخالفت پر تل گئے، جب کہ بہت بڑا طبقہ خطیب صاحب کی بات کی حمایت میں پیش پیش ہے؛ لیکن دیگر محلوں کے کچھ دیندار احباب جن کا تعلق جماعت، دعوت وتبلیغ سے ہے، انہیں آئندہ کسی دینی مصلحت کے آگے رکاوٹ ہونے کے صرف وہم وخیال نے پریشان کررکھا ہے (جب کہ اس قسم کی کوئی بات انشاء اللہ نہیں ہوگی) بنابریں یہ دیندار احباب مفتی صاحب کو اپنا موقف

بدلنے اور اس موقف پر کار بند امام صاحب کو مفتی صاحب کی اس بات کی اتباع سے سختی کے ساتھ منع کر رہے ہیں؛ لہٰذا مفتی محترم سے عاجزانہ ومؤدبانہ درخواست ہے کہ اولین فرصت میں اس مسئلہ کا حل قرآن وحدیث، نیز عبارات وقواعد فقہیہ کی روشنی میں فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں، ذرہ نوازی ہوگی۔

المستفتی: امام مسجد اقصیٰ، کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: دعا آہستہ مانگنا افضل ہے؛ البتہ دعا کی تعلیم مقصود ہو تو بلند آواز سے بھی مضائقہ نہیں؛ لیکن دعا بالجہر کو لازم واجب سمجھنا مکروہ اور بدعت ہے؛ اس لئے کبھی کبھی جہر کرلیا جائے، نیز جو لوگ دعا میں شرکت کئے بغیر چلے جائیں، ان کو برا نہ کہا جائے اور نہ ان پر نکیر کی جائے۔ اور مفتی صاحب کا قول اپنی جگہ درست ہے؛ لہٰذا نکیر کرنے والوں کو اپنی بات پر بضد نہ رہنا چاہئے؛ بلکہ کبھی کبھی جہراً اور کبھی کبھی سراً دعا کریں اور سال میں کبھی دعا ترک بھی کردیں، تو بہتر ہے، تاکہ لوگوں کا عقیدہ یہ نہ ہو کہ نماز کے بعد دعا لازم ہے۔

إذا دعا بالدعاء الماثور جهرا، ومعه القوم أيضا ليتعلموا الدعاء لا بأس به، وإذا تعلموا حينئذ يكون جهر القوم بدعة. (هندية، كتاب الكراهية، قبيل الباب الخامس في آداب المسجد والقبلة، زكريا قديم ٥/ ٣١٨، جديد ٥/ ٣٦٨)

وكل مباح يؤدي إليه (إلى الوجوب) فمكروه الظاهر أنها تحريمية؛ لأنه يدخل في الدين ما ليس منه. (شامي، كتاب الصلاة، قبيل باب صلاة المريض، كراچی ٢/ ١٢٠، زكريا ٢/ ٥٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۳۸۹/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/۵ھ

نمازوں کے بعد سراً یا جہراً دعا کرنا

سوال [۲۹۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) آپ کا مبارک فتویٰ جو مورخہ ۲۳/۱۲/۱۴۲۳ھ کو لکھا گیا ملا، آپ نے دو ماہ کے بعد جواب دیا ہے، تسلی بخش جواب ملنے کے لئے دوبارہ آپ کی طرف متوجہ ہوا ہوں، آپ نے امام کی دعا جہراً اور سراً کا جواب لکھا ہے، وہ آپ اپنے رجسٹر میں چیک فرمایئے کہ عیدین اور جمعہ میں دعا کو جہراً ثابت کیا ہے؟ یہاں اختلاف ہونے کی وجہ سے آپ کی خدمت اقدس میں یہ دو کتابوں کے حوالے بھیج رہا ہوں۔ (فتاوی بزازیہ ۴/۴۲، روح المعانی ۸/۱۳۹)

ان دونوں کتابوں میں جہراً کو بدعت بتایا ہے اور آپ نے فتویٰ میں جہراً ثابت کیا ہے اور جہراً پڑھنے پر آپ نے دلیل نہیں دی؛ اس لئے برائے مہربانی نظر ثانی فرمایئے اور آپ کا جواب آنے کے بعد اس کا زیرِ عکس کرا کر مسجدوں میں لگانا ہے۔ انشاء اللہ

(۲) امام کا دعا میں پابندی سے جہر کرنا کبھی بھی بھول سے سراً نہ کرنا۔

(۳) دعا میں ''اِنّ اللہ وملائکتہ'' کہنا۔

(۴) مسجد میں دعا میں امام کا رونا مسلمانوں کے حالات پر۔

(۵) امام کا جہراً دعا میں ہمیشہ کے لئے جم جانا، آپ سے گزارش ہے کہ یہ چیزیں صحیح ہیں یا غلط؟ بدعت ہیں یا مکروہ؟ جو بھی آپ بتائیں گے ہم اس پر عمل کریں گے۔

المستفتی: آپ کا بھائی حاجی سردار خان سنگ میر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ہم نے جہری اور سری دونوں قسم کی دعا کو جائز لکھا ہے، موقع محل کے اعتبار سے جہری دعا بھی کی جاسکتی ہے اور سری دعا بھی کی جاسکتی ہے؛ لیکن سری دعا زیادہ افضل ہے اور اس پر دلائل بھی پیش کئے گئے، پھر اس کے بعد یہ بھی لکھا تھا کہ

کبھی کبھی بڑے مجمع میں جہراً دعا کرنا بہتر ہے، تاکہ حاضرین کو آمین کہنے کا موقع ملے اور دعا کے الفاظ کی طرف توجہ ہونے کی وجہ سے دعا میں زیادہ رغبت پیدا ہوجائے اور رغبت کے ساتھ آمین کہنے کی صورت میں دعا زیادہ قبول ہونے کی امید ہے، پھر اس پر یہ لکھا تھا کہ جمعہ میں امام صاحب موقع محل کے اعتبار سے کبھی سری دعا کیا کریں اور کبھی جہری دعا کیا کریں۔ اور عیدین کی نماز سال بھر میں ایک مرتبہ ہوتی ہے؛ اس لئے اس میں بھی موقع کو دیکھ کر جہر کرنے کی اجازت ہے، اسمیں کسی قسم کی قباحت نہیں ہے۔ اور یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ جمعہ یا عیدین میں جہراً دعا کرنا افضل ہے اور یہ بھی نہیں لکھا ہے کہ جمعہ یا عیدین میں جہراً ہی دعا کرنا ثابت ہے؛ بلکہ یہ لکھا ہے کہ سراً دعا کرنا زیادہ افضل ہے، موقع بموقع کبھی کبھی جہر کرنے میں کوئی حرج نہیں اور جمعہ کی نمازوں میں بھی مستقل جہراً دعا کرنے کو ثابت نہیں کیا ہے؛ بلکہ کبھی جہراً اور کبھی سراً دعا کی ترغیب دی گئی ہے، اسی طرح عیدین کے بارے میں بھی کبھی جہراً کبھی سراً دعا کی بات لکھی ہے۔ اور تفسیر ''روح المعانی'' اور ''فتاوی بزازیہ'' دونوں کی عبارتیں لکھ لی گئی ہیں۔ ''روح المعانی'' کی عبارت میں تفصیل ہے اور ''بزازیہ'' کی عبارت تشنہ ہے، ''تفسیر روح المعانی'' میں صاحب تفسیر آیت کریمہ ''**ادعوا ربکم تضرعا و خفية**'' سورہ اعراف، آیت: ۵۵ر کی تفسیر کرتے ہوئے ''تضرعا'' کے معنی ''ادعوہ علانیۃ'' کے بیان کیا ہے، یعنی جہری دعا کرنا جس میں عاجزی وانکساری اور تذلل وخاکساری کا اظہار بھی ہو اور ''**خـــفية**'' کے معنی سراً کے بیان کیا ہے، اس آیت کریمہ سے دونوں طرح کی دعا کا ثبوت ہوا۔ صاحب تفسیر نے آگے چل کر بلند آواز سے دعا کو بدعت لکھا ہے اور پھر اس بلند آواز کے ساتھ دعا کا کیا مطلب ہے؟ اس کو بھی واضح کیا ہے کہ کس صورت میں بدعت ہے اور کس صورت میں جائز ہے؟ بدعت کی صورت یہ بیان کی ہے کہ چیخنے اور چلانے میں حد سے تجاوز کرجائے حتی کہ ''**إنـه لا يـحـب الـمعتدين**'' میں شامل ہوجائے۔ اور مزید اس میں بلند آواز میں ایسے ایسے الفاظ سے دعائیں کی جائیں جو داعی کے لئے کسی طرح مناسب نہیں، جیسا کہ مرتبہ انبیاء کو پہنچنے کے لئے دعا کی جائے اور ابلیس وابوجہل کے جنت میں داخل

ہونے کی دعا کی جائے اور نزول وحی اور مقام نبوت کے لئے دعا کی جائے، تو صاحب روح المعانی کے بدعت کہنے کا مقصد مختلف اقوال کے ذریعہ خود انہوں نے ہی واضح کردیا ہے، پھر آگے چل کر ''وفصل آخرون'' سے دعا سری کس وقت افضل اور دعا جہری کس وقت افضل ہے، اس کو واضح فرمایا ہے۔ اور ''فتاوی بزازیہ'' کی عبارت چونکہ تشنہ ہے، مفصل نہیں ہے، ورنہ وہاں بھی یہ ہی مقصد ہے، چنانچہ انہوں نے اسی طرح بعض مقاصد کو ذکر بھی کیا ہے کہ اگر قوم کو تعلیم اور تنبیہ مقصود ہے تو جہر کیا جائے اور اگر کوئی مقصد نہیں ہے تو جہر کو بدعت کہا ہے۔ اب ''تفسیر روح المعانی'' کی عبارات میں سے ایک عبارت آپ کے سامنے پیش کردیتے ہیں، جس میں بعض حالات میں جہری دعا کو افضل کہا ہے۔ اور بعض حالات میں سری کو افضل کہا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وفصل آخرون، فقالوا: الإخفاء أفضل عند خوف الريا، والإظهار أفضل عند عدم خوفه، وأولىٰ منه القول بتقديم الإخفاء على الجهر فيما إذا خيف الرياء، أو كان في الجهر تشويش على نحو مصل، أو نائم، أو قارئ، أو مشتغل بعلم شرعي، وبتقديم الجهر على الإخفاء فيما إذا خلا عن ذلك، وكان فيه قصد تعليم جاهل أو نحو إزالة وحشة عن مستوحش، أو طرد نحو نعاس، أو كسل عن الداعي نفسه، أو إدخال سرور على قلب مؤمن، أو تنفير مبتدع عن بدعة، أو نحو ذلك. (روح المعاني، سورة الأعراف، آيت: ٥٥، زكريا ٨/ ١٤٠، قديم مصري ٥/ ٢٠٨، جديد زكريا ٥/ ٢٠٨)

ہم نے اپنے جواب کے رجسٹر سے مراجعت کر کے نظر ثانی کر لی ہے، ہر طرف سے غور وخوض کے بعد نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ دونوں طرح کی دعاؤں کی اجازت ہے، کبھی سری، کبھی جہری اور سری دعا بہر حال جہری کے مقابلہ میں افضل ہے، مگر موقع محل کے اعتبار سے کبھی کبھی جہری دعا بھی افضل ہو جاتی ہے، جیسا کہ اوپر کی عبارت سے واضح ہوتا ہے، ہاں اگر کوئی شخص جہری دعا ہی کو عملاً لازم کر لیتا ہے کہ پانچوں نمازوں میں تسلسل کے ساتھ جہری دعا کرتا ہے اور سری

دعا کو کوئی حیثیت نہیں دیتا تو اس شخص کے لئے جہری دعا کا یہ سلسلہ بدعت ہے یا نامناسب الفاظ میں دعا کرتا ہے اور آواز کو بلند کرنے میں اور زور لگانے میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے، تب بھی بدعت ہے، جیسا کہ ''تفسیر روح المعانی'' میں ان باتوں کی وضاحت موجود ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا پہلا لکھا ہوا جواب اپنی جگہ درست ہے۔

(۲-۵) دعا میں پابندی سے جہر کرنا کبھی بھی بھولے سے سرنہ کرنا التزام مالا یلزم کی وجہ سے مکروہ اور بدعت ہے، جیسا کہ ابھی ہم نے اوپر لکھا ہے، نیز ہمارے پہلے فتوی میں بھی یہی بات لکھی ہوئی ہے، جس کو آپ نے دوبارہ معلوم کیا ہے۔

قال الطيبي: وفيه أن من أصر على مندوب وجعله عزما ولم يعمل بالرخصة، فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال، فكيف من أصر على بدعة أو منكر. (مرقاة، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، إمداديه ملتان ٢/ ٣٥٣، طيبى كراچى ٣/ ٣٧٤، رقم: ٩٤٢)

وكل مباح يؤدي إليه، فمكروه، قال الشامي: الظاهر أنها تحريمية؛ لأنه يدخل في الدين ما ليس منه. (شامي، كتاب الصلاة، قبيل باب صلاة المسافر، كراچى ٢/ ١٢٠، زكريا ٢/ ٥٩٨)

(۳) دعا میں **''ان الله وملائكته''** کہنا ثابت نہیں ہے؛ اس لئے کہ فقہاء جہاں دعا کے اول آخر اور وسط میں درود شریف پڑھنے کو مستحب لکھتے ہیں، وہاں اس آیت کریمہ کے پڑھنے کو ذکر نہیں کرتے؛ بلکہ درود شریف پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

ونص العلماء على استحبابها في مواضع إلى ما قال: وأول الدعاء وأوسطه وآخره. (شامي، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، كراچى ١/ ٥١٨، زكريا ٢/ ٢٣٠)

(۴) امام صاحب کا دعا کے اندر مسجد میں مسلمانوں کے حالات پررونے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لئے غائبانہ دعا کرنا ہے، جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ یہ دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

عن عبدالله بن عمرو -رضي الله عنه- عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ما دعوة أسرع إجابة من دعوة غائب لغائب. (ترمذي، باب ماجاء في دعوة الأخ لأخيه بظهر الغيب، النسخة الهندية ۲/ ۱۹، دارالسلام، رقم: ۱۹۸۰، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ۱۳/ ۳۳، رقم: ۷۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍صفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۳/۲ھ

بعد نماز امام جہراً دعا کرے یا سراً؟

سوال [۲۹۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کہتا ہے بعد جماعت نماز دعا بالکل آہستہ مانگی جائے۔اور باقی مقتدیوں کا کہنا ہے کہ امام صاحب دعا زور سے مانگیں، زید کے علاوہ جو مقتدی حضرات ہیں وہ لوگ بہار شریعت کے حصہ سوم کے ص: ۹۲، حدیث: ۴؍کا حوالہ پیش کرکے زید کے قول کو رد کر رہے ہیں، زید یہ کہتا ہے کہ امام صاحب کے زور سے دعا مانگنے سے جو مسبوق ہوتے ہیں، ان کی نماز میں خلل پہنچتا ہے، باقی مقتدی حضرات کہتے ہیں کہ بعد نماز جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زور سے دعا مانگتے تھے؛ لہٰذا زید کا کہنا ٹھیک ہے یا باقی مقتدیوں کا کہنا اچھا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں بالتفصیل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: منصور عالم امام مسجد لوہاروالی چھوٹی منڈی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نمازوں کے بعد آہستہ دعا مانگنا مسنون اور افضل ہے، نیز کبھی کبھی زور سے دعا مانگنا بھی حدیث سے ثابت ہے؛ لہٰذا دونوں صورتوں کی تفصیل یوں ہوگی کہ عام حالات میں اور نمازوں کے بعد آہستہ دعا مانگنے کا معمول ہونا چاہئے؛ اس لئے

کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿ادْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ أي الجاهرين بالدعاء.
(البحر الرائق، كتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، زكريا ۲/ ۳۳٦، كوئٹه ۲/ ۱۹۲)

والسنة أن يخفي صوته بالدعاء. (الجوهرة النيرة، كتاب الحج، إمداديه ملتان ۱/ ۱۹۳، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۱۸۹)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أربعوا على أنفسكم إنكم لا تدعون أصم، ولا غائبا، إنكم تدعون سميعا قريبا، وهو معكم. (بخاري شريف، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر، النسخة الهندية ۲/ ٦۰٥، رقم: ٤۰٥۲، ف: ٤۲۰۲)

لیکن اگر دوسرے نمازیوں اور مسبوقین کی نمازوں میں خلل کا اندیشہ نہ ہو تو کبھی جہری دعا میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، جیسا کہ (مسلم، كتاب المساجد، باب الذكر بعد الصلوة، النسخة الهندية ۱/ ۲۱۷، بيت الأفكار، رقم: ۵۸۳) کی روایت سے جواز معلوم ہوتا ہے، جس کا حوالہ ''بہار شریعت'' میں دیا گیا ہے۔ اور اگر دوسرے نمازیوں اور مسبوقین کی نماز میں خلل کا اندیشہ ہے تو جہری دعا مانگنا مکروہ ہوگا؛ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس صورت میں ہے کہ جب کسی کی نماز میں خلل کا اندیشہ نہیں رہا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۴؍ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۹۴)	۱۴۲۰/۱/۲۴ھ

نماز کے بعد جہراً دعا مانگیں یا سراً؟

سوال [۲۹۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید امامت کرتا ہے اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد آہستہ سے دعا مانگتا ہے، بعض

مقتدی حضرات امام پر اعتراض کرتے ہیں کہ امام صاحب آپ پانچوں وقت کی نماز میں دعا بلند آواز سے کریں، خواہ اردو میں ہو یا عربی میں، درود شریف بھی بلند آواز سے پڑھئے، تاکہ ہم سب آمین کہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر نماز کے بعد دعا میں بلند آواز سے ایک بار یہ دعا ضرور پڑھو، دعا یہ ہے: **إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَآئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا.**

اور کہتے ہیں کہ فلاں مسجد کے امام صاحب یہ دعا پڑھتے ہیں، وہاں جا کر دیکھا اور معلوم بھی کیا، تو وہاں ہر نماز کے بعد امام بلند آواز سے دعا میں قرآن کریم کی چند آیات پڑھ کر یہی دعا امام صاحب بلند آواز سے پڑھتے ہیں جو اوپر گذری، تو مقتدی حضرات بلند آواز سے درود شریف پڑھنے لگتے ہیں اور دعا ختم ہو جاتی ہے، وہاں کا امام عالم نہیں ہے، تو یہ دعا پڑھنا کیسا ہے اور امام صاحب کے لئے کیا حکم ہے کہ کس طرح دعا کریں بلند آواز سے یا آہستہ، سنت طریقہ کیا ہے؟

المستفتی: محمد اقبال، امام مسجد بلال والی سیکر، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید امام کا آہستہ دعا مانگنا یہی مسنون اور افضل طریقہ ہے اور مقتدیوں کے لئے بھی آہستہ دعا مانگنا مسنون اور افضل ہے، کسی خاص دعا کا زبردستی پڑھوانا درست نہیں؛ بلکہ جو دعا بھی چاہے پڑھنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ.﴾ أي الجاهرين بالدعاء. (البحر الرائق، كتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، زكريا ۲/ ۳۳۶، كوئٹه ۲/ ۱۹۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱/۲۱ھ

نماز میں سری و جہری دعا کرنا کیسا ہے؟

سوال [۲۹۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جمعہ کی نماز میں دعا سراً کی جائے گی یا جہراً؟ یہ مسئلہ صرف جمعہ کی نماز اور عیدین کی نماز کا ہے، جب کہ بلند آواز کو بدعت اور مسجد کے آداب کے خلاف بتایا جاتا ہے اور یہ بدعت مولوی صاحبان بتاتے ہیں؛ لیکن ان کے پاس نہ کوئی فتویٰ ہے اور نہ کوئی سند، مسئلہ کا حل کیا ہے؟

المستفتی: حاجی سردار خان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دعا سراً اور جہراً دونوں طرح جائز اور مشروع ہے؛ لیکن سری دعا زیادہ افضل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

ادْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. [الأعراف: ۵۵]

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ. [الأعراف: ۲۰۵]

اور جہری دعا کو بدعت نہیں کہا جا سکتا ہے، ہاں البتہ اگر کوئی جہری دعا کو ہی دعا سمجھتا ہو اور سری کو کوئی حیثیت نہ دیتا ہو، اسی وجہ سے جہری دعا کی پابندی کرتا ہو، تو ایسی صورت میں التزام مالا یلزم کی وجہ سے بدعت کہا جا سکتا ہے، ورنہ وقتاً فوقتاً اور کبھی کبھی جہری دعا کرنا بلا کراہت جائز اور درست ہے، نیز کبھی بہت بڑے مجمع میں جہری دعا کرنا اور پورے مجمع کا آمین کہنا سری سے افضل ہو جاتا ہے، جیسا کہ تبلیغی اجتماعات میں ہوتا ہے، اس میں سے بھاری تعداد کے لوگ صرف دعا میں شرکت کی نیت سے ہی جاتے ہیں؛ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ جمعہ کی نمازوں میں کبھی سری دعا کی جائے اور کبھی کبھی جہری بھی کی جائے اور عیدین کی نماز سال بھر میں ایک

مرتبہ ہوتی ہے؛ اس لئے اس میں بھی جہری دعا کرنے میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص سری دعا کرتا ہو تو اس پر بھی اعتراض نہ ہونا چاہئے۔

عن سلمان –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: ما رفع قوم أكفهم إلى الله عز وجل يسألونه شيئا إلا كان حقا على الله أن يضع في أيديهم الذي سألوا. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٦/ ٢٥٤، رقم: ٦١٤٢)

من أصر على أمر مندوب وجعله عزما ولم يعمل بالرخصة، فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال. (شرح الطيبي، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، كراچی ٣/ ٣٧٤، رقم: ٩٤٢، مرقاة شرح مشكوة، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، إمداديه ملتان ٢/ ٣٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۳/۱۲/۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۸۶۴/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۱۲/۲۳ھ

نماز کے بعد بآواز بلند دعا کرانا

سوال [۲۹۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ امام صاحب ظہر، مغرب اور عشاء کی نماز میں بھی کعبہ کی طرف سے منہ پھیر کر آواز کے ساتھ دعا مانگتے ہیں، ان کا یہ عمل سنت ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح دلائل کے ساتھ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: اسحاق حسین، لالباغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فجر اور عصر کے علاوہ دیگر نمازیں جن کے بعد متصلاً سنتیں ہوتی ہیں، ان نمازوں کے بعد متصلا امام کا مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھنا کہیں نظر سے

نہیں گذرا اور جہراً دعا کرنے کا مقصد اگر یہی ہے کہ مقتدی لوگ آمین کہیں گے، تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے؛ البتہ رسمی طور پر کرنا ممنوع ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/ ۸۰۷)

عن سلمان –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: ما رفع قوم أكفهم إلى الله عز وجل يسألونه شيئا إلا كان حقا على الله أن يضع في أيديهم الذي سألوا. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٦/ ٢٥٤، رقم: ٦١٤٢)

عن حبيب بن مسلمة الفهري، وكان مستجابا، أنه أمر على جيش فدرب الدروب، فلما لقى العدو، قال للناس: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا يجتمع ملأ، فيدعو بعضهم، ويؤمن سائرهم، إلا أجابهم الله.

(المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٤/ ٢١/ رقم: ٣٥٣٦، المستدرك، كتاب معرفة الصحابة، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت، جديد ٦/ ٢٠٢٣، رقم: ٥٤٧٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۶/۸ھ

سجدہ میں سر رکھ کر دعا مانگنا

سوال [۲۹۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ صاحبان نماز وتسبیحات کے بعد اس طرح سے سجدہ میں سر رکھ کر دیر تک دعا مانگتے ہیں کہ ان کی کلائیاں زمین پر بچھی رہتی ہیں اور ہتھیلیاں آسمان کی طرف ہوتی ہیں، اس طرح دعا مانگنا کیا صحیح ہے؟ عقیدت، انکساری، عاجزی اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ قربت کے احساس سے دعا مانگنا بہتر عمل ہے۔ کیا ایسا عمل حدیث شریف یا بزرگان دین سے ثابت ہے؟ اگر نہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح سجدے میں سر رکھ کر یعنی ہاتھوں کی کیا کیفیت

رہی اور کس طرح دعا مانگی اور امت کے لئے کیا ہدایت فرمائی؟

المستفتی: محمد نبی خان زیارت شاہ بلاقی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز کے علاوہ سجدہ کی حالت میں دعا مانگنا بعض حدیث سے ثابت ہے اور اس میں ہاتھوں کو اسی حالت میں رکھنا چاہئے، جس طرح سجدہ کی حالت میں رکھا جاتا ہے اور یہ بات بھی یاد رکھئے کہ سجدہ کی حالت میں دعا کرنا جائز اور درست ہے؛ لیکن اس کا معمول بنالینا درست نہیں ہے۔

عن علي – رضي الله عنه– قال: لما كان يوم بدر قاتلت شيئا من قتال، ثم جئت إلى رسول الله ﷺ أنظر ما صنع، فجئت، فإذا هو ساجد يقول: يا حي يا قيوم، يا حي يا قيوم، ثم رجعت إلى القتال، ثم جئت، فإذا هو ساجد لايزيد على ذلك، ثم ذهبت إلى القتال، ثم جئت، فإذا هو ساجد يقول ذلك، ففتح الله عليه. (السنن الكبرى للنسائي، كتاب عمل اليوم والليلة، الاستنصار عند اللقاء، دار الكتب العلمية، بيروت ٦/ ١٥٦-١٥٧، رقم: ١٠٤٤٧، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٢/ ٢٥٤، رقم: ٦٦٢)

عن علي بن أبي طالب– رضي الله عنه– قال: لما كان يوم بدر قاتلت شيئا من قتال، ثم جئت مسرعا إلى النبي ﷺ لأنظر ما فعل، فإذا هو ساجد يقول: يا حي يا قيوم، يا حي يا قيوم، لا يزيد عليهما، ثم رجعت إلى القتال، ثم جئت، وهو ساجد يقول ذلك، ففتح الله عليه. (الطبقات الكبرى، دارالكتب العلمية ٢/ ١٩، البداية والنهاية، دارالفكر ٣/ ٢٧٦)

اور دعاؤں میں جتنی زیادہ سے زیادہ عاجزی وانکساری ہو اور دعا کی قبولیت کی عقیدت ہو اتنا ہی افضل اور اعلیٰ ہے، چاہے سجدہ کی حالت میں دعا کی جائے یا کسی اور حالت میں۔

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً. [الأعراف: ٥٥]

إعلم أن المقصود من الدعاء أن يصير العبد مشاهدًا لحاجة نفسه، ولعجز نفسه، ومشاهدًا لكون مولاه موصوفا بكمال العلم والقدرة والرحمة، فكل هذه المعاني دخلت تحت قوله: ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً.

(تفسير كبير، سورة الأعراف: ٥٥، ١٤/ ١٣٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۰۸)

فرض نماز کے بعد فوراً سجدہ کرنا

سوال [۲۹۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص فرض نماز پڑھنے کے بعد فوراً سجدہ کرتا ہے، جس سے کافی لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے، جب کچھ لوگوں نے اس کو اس سے منع کیا تو اس کے جواب میں کہا کہ مجھے جوش آتا ہے، جس کی وجہ سے میں سجدہ کرتا ہوں اور یہ بدعت نہیں؛ بلکہ جائز ہے، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

المستفتی: سعید احمد ڈھینگر پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اس طرح بلاوجہ پابندی کے ساتھ فرائض کے بعد سجدہ کرنا شریعت میں ثابت نہیں؛ بلکہ علماء نے نماز کے فوراً بعد سجدۂ شکر کو بھی مکروہ لکھا ہے؛ لہٰذا اس عمل سے اس طریقہ پر اجتناب واحتراز لازم ہے۔

لكنها تكره بعد الصلاة؛ لأن الجهلة يعتقدونها سنة، أو واجبة، وكل

مباح يؤدى إليه فمكروه. (درمختار على الشامي، باب سجود التلاوة، مطلب في سجدة الشكر، زكريا ٢/ ٥٩٨، كراچی ٢/ ١٢٠)

وسجدة الشكر مستحبة به يفتي لكنها تكره بعد الصلاة؛ لأن الجهلة يعتقدون أنها سنة، أو واجبة، وكل مباح يؤدي إليه فهو مكروه. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، فصل في سجدة الشكر مكروهة مكتبه دارالكتاب ديوبند١/ ٥٠٠، الفقه الإسلامي وأدلته، كتاب الصلاة، المطلب الثالث سجدة الشكر ٢/ ١٢٢، مكتبه هدى انٹرنيشنل) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٦ / ربیع الثانی ١٤٢٢ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٥/ ٧١٩٨)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٦/٤/١٤٢٢ھ

فرائض کے بعد پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ''یا قویّ'' پڑھنا

سوال [٢٩٩٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فرض نمازوں کے بعد عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اکثر لوگ اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو پیشانی پر رکھ کر ''یاقوی یاقوی'' سات مرتبہ پڑھتے ہیں، یا گیارہ مرتبہ، کیا اس طرح پڑھنے کا ثبوت کسی حدیث سے ہے، یا یہ بزرگوں اور مشائخ کا وظیفہ ہے؟

المستفتی: بشیر عالم تلجا پور، عثمان آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فرض نماز کے بعد دائیں ہاتھ کو سر پر رکھ دعا پڑھنا حدیث سے ثابت ہے، نفس ''یاقوی'' پڑھنے کا ثبوت حدیث سے نہیں ہے؛ البتہ اس کو بطور وظیفہ کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (فتاوی دارالعلوم ٢/ ٢١١، فتاوی عثمانی ٢٦٣)

اور حدیث شریف میں اس موقع پر پڑھنے کی جو دعا مذکور ہے وہ حسب ذیل ہے:

وكان ﷺ إذا صلى، وفرغ من صلاته مسح بيمينه على رأسه،

وقال: بسم الله الذي لا إله إلا هو الرحمن الرحيم، اللهم اذهب بالهم والحزن. (حصن حصين، ص: ۷۵)

عن أنس بن مالك -رضي الله عنه- قال: كان رسول الله ﷺ إذا قضى صلاته مسح جبهته بيده اليمنى، ثم قال: أشهد أن لا إله إلا الله الرحمن الرحيم، اللهم اذهب بالهم والحزن. (عمل اليوم والليلة لابن السني، باب ما يقول في دبر صلاة الصبح، نوع آخر، مؤسسة علوم القرآن ۱/ ۱۰۱، رقم: ۱۱۲، الدعاء للطبراني ۱/ ۲۰۹، رقم: ۶۵۸، ۱/ ۲۱۰، رقم: ۶۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍رجب ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۰۸۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۷/۱۴۲۷ھ

بعد نماز عصر وفجر سر پر ہاتھ رکھ کر ”یا قویّ“ پڑھنا

سوال [۲۹۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعد نماز عصر اور بعد نماز فجر سر پر ہاتھ رکھ کر ”یا قویّ“ گیارہ مرتبہ پڑھا جاتا ہے، تو بعض لوگ بدعت کہتے ہیں، صحیح کیا ہے؟

المستفتی: جرار احمد قاسمی، امام جامع مسجد بھنڈیہ پوسٹ خاص، ضلع سیتا پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بطور علاج کے یہ عمل کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے سر کے چکر ختم ہونے کا تجربہ ہے اور اسی مقصد کے لئے یہ عمل کیا جاتا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس کا مقصد عبادت یا رسم جاری کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اپنا ایک علاج ہے، اس طرح سے تجربہ کردہ فعل کا اختیار کرنا بطور علاج جائز ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، جیسا کہ ”شامی“ کی ذیل کی عبارت سے مستفاد ہوتا ہے:

وكذا اختاره صاحب الهداية في التجنيس، فقال: لو عرف فكتب

الفاتحة بالدم على جبهته وأنفه جاز للاستشفاء، وبالبول أيضا إن علم فيه شفاء لا بأس به. (شامي، كتاب الطهارة، مطلب في التداوي بالمحرم، زكريا ١/ ٣٦٥، كراچی ١/ ٢١٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۶۷۷/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱/۲۸ھ

دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا

سوال [۳۰۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ ایک شخص نماز کے بعد دعا کرتا ہے اور دعا کے آخری الفاظ "**لا الــــه الا الله محمد رسول الله**" کہہ کر چہرہ پر ہاتھ پھیر دیتا ہے۔ اور ان الفاظ کو کہنا ضروری سمجھتا ہے، تو کیا اس بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی حکم ہے؟

(۲) اور بعض لوگ: "**لا الـه الا الله محمد رسول الله**" سے پہلے لفظ "بحق" کو بڑھا کر کہتے ہیں اور پھر چہرہ پر ہاتھ پھیر دیتے ہیں، یہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

(۳) کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندگی میں "**لا الـه الا الله محمد رسول الله**" پڑھ کر چہرہ پر ہاتھ پھیرتے تھے؟

(۴) کیا نماز کا سلام پھیرنے کے بعد کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "**لا اله الا الله محمد رسول الله**" پڑھا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ سلام کے بعد زور سے پڑھنا چاہئے اور بعض یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آہستہ پڑھنا چاہئے، کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد یحییٰ منی پوری، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نماز کے بعد سلام پھیر کر کلمۂ طیبہ کا پڑھنا آہستہ یا زور سے کسی حدیث سے ثابت نہیں، نیز دعاؤں کے اخیر میں بھی کلمۂ طیبہ پڑھنا کسی حدیث میں ثابت نہیں؛ البتہ ہاتھ اٹھا کر دعا کے بعد اخیر میں چہرہ پر ہاتھ پھیرنا حدیث سے ثابت ہے؛ لہٰذا آخری عمل جاری رکھا جائے اور بقیہ امور ترک کر دئے جائیں۔

كان رسول الله ﷺ إذا رفع يديه في الدعاء لم يحطهما حتى يمسح بهما وجهه. (ترمذي، أبواب الدعوات، باب ماجاء فى رفع الأيدي عند الدعاء، النسخة الهندية ٢/ ١٧٦، دارالسلام، رقم: ٣٣٨٦، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم، مدينة المنورة ١/ ٢٤٣، رقم: ١١٢٩، الدعاء للطبراني ١/ ٨٧، رقم: ٢١٢، المستدرك، كتاب الدعاء والتكبير، مكتبه نزار مصطفى، جديد ٢/ ٧٤٨، رقم: ١٩٦٧)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا سألتم الله فاسألوه ببطون أكفكم، ولا تسألوه بظهورها، وامسحوا بها وجوهكم. (المستدرك، كتاب الدعاء والتكبير، مكتبه نزار مصطفى ٢/ ٧٤٩، رقم: ١٩٦٨، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٠/ ٣١٩، رقم: ١٠٧٧٩، سنن أبي داؤد، الصلاة، باب الدعاء، النسخة الهندية ١/ ٢٠٩، دارالسلام، رقم: ١٤٨٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴؍۵۹۷۴)

فجر کے بعد دعا سے قبل امام صاحب کا ''یٰسین'' پڑھ کر سنانا

سوال [۳۰۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

فجر کی فرض نماز کے بعد دعا کرنے سے پہلے امام صاحب سورۂ ''یٰسین'' پڑھتے ہیں اور سب مقتدی چپ چاپ سنتے ہیں، یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں یا مکروہ تحریمی ہے، یا بدعت؟

المستفتی: مزمل الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز کے بعد دعا سے پہلے امام کا سورۂ ''یٰسین'' پڑھنا اور مقتدیوں کا سنتے رہنے کا معمول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے۔ سورۂ ''یٰسین'' کا پڑھنا اچھی بات ہے؛ اس لئے اگر کبھی کبھی پڑھ لی جائے تو مضائقہ نہیں؛ لیکن اس کا معمول بنانا درست نہیں، اس سے غیر لازم چیز کا عملاً لازم سمجھنے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

وفي الخجندي: إمام يعتاد كل غداة مع جماعته قراء ة آية الكرسي، وآخر البقرة، وشهد الله ونحوهما جهرا لا بأس به، والأفضل الإخفاء.

(عالمگیری، کتاب الکراهية، الباب الرابع في الصلاة والتسبيح، وقرأء ة القرآن، زكريا قديم ٥/ ٣١٧، جديد ٥/ ٣٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۴/۴/۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۰۲۳/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۴/۳۰ھ

ہر روز فجر کے بعد امام صاحب کا ''سورۂ یٰسین'' پڑھنا اور مقتدی کا سننا

سوال [۳۰۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حضرت امام صاحب روزانہ فجر کی نماز کے بعد سورۂ ''یٰسین'' شریف پڑھیں اور مقتدی اس کو سنیں اور اس پر پابندی بھی کریں، تو ایسا کرنا کیسا ہے؟ اگر کریں تو بدعت میں سے تو شمار نہیں کیا جائے گا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس کا رواج تھا یا نہیں؟ اس کا

جواب کتاب وسنت کی روشنی میں مدلل فرمانے کی زحمت گوارہ کریں۔

المستفتی: محمد مسعود، ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سورۂ ’’یٰسین‘‘ شریف پڑھنا اور سننا ہر حال میں جائز اور باعث خیر وبرکت ہے؛ لیکن اس طرح معمول بنا لینے کی وجہ سے بعد میں چل کر لوگوں کے ذہنوں میں غیر لازم امر کے لازم ہونے کی بات پیدا ہو سکتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا یہی عمل سمجھا جا سکتا ہے؛ اس لئے اس خرابی سے بچنے کے لئے سوال نامہ میں درج کردہ طریقہ اختیار کرنے سے احتراز کرنا چاہئے، نیز ایسا طریقہ اختیار کرنا حضرات فقہاء نے مکروہ اور بدعت لکھا ہے۔

وقراء ۃ الفاتحة بعد المکتوبة لأجل المهمات مخافتة أو جهرا مع الجمع مکروهة (إلی قوله) قراء ۃ الکافرون إلی الآخر مع الجمع مکروهة؛ لأنها بدعة لم تنقل عن الصحابة، ولا عن التابعين رضی الله عنهم.

(عالمگیری، کتاب الکراهية، الباب الرابع في الصلاۃ والتسبیح وقراء ۃ القرآن، زکریا قدیم ٥/ ٣١٦، ٥/ ٣١٧، جدید ٥/ ٣٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٧/ جمادی الثانیہ ١٤٢٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣١/ ٨٠٧٢)

نماز کے بعد ’’جب پڑے مشکل شہ مشکل کشا کا ساتھ ہو‘‘ پڑھنا

سوال [٣٠٠٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

یا الٰہی ہر جگہ تیری عطا کا ساتھ ہو	☆	جب پڑے مشکل شہ مشکل کشا کا ساتھ ہو

اس مناجات کو بعد از نماز دعا میں پڑھنا کیسا ہے؟ مفتی محمد ایوب صاحب کا فتوی ہے کہ بلاشبہ

جائز ہے؛ اس لئے کہ مشکل کے وقت مشکل کشا کو یاد کرنا بہت بہتر ہے، اس مناجات کے بارے میں اظہار خیال کریں۔

المستفتی: محمد ہارون رضا محلّہ بروالان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ''شہ مشکل کشا'' سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں اور عقیدہ یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اور وسیلہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مرادیں اور مشکلات حل فرماتے ہیں، تو بلا شبہ اس شعر کو پڑھنا جائز ہے اور پڑھنے کے لئے کسی خاص وقت کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں، صرف نماز کے بعد کی دعا میں لازم کر لینا التزام مالا یلزم کی وجہ سے مکروہ ہوگا؛ بلکہ عام حالات میں کسی بھی وقت پڑھی جا سکتی ہے۔

من أصر علی أمر مندوب وجعله عزما ولم یعمل بالرخصة، فقد أصاب منه الشیطان من الإضلال. (شرح الطیبي، کتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، کراچی ۳/ ۳۷٤، رقم: ۹٤۲، مرقاة شرح مشکوة، کتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، إمدادیه ملتان ۲/ ۳۵۳)

حضور ﷺ کی شفاعت اور حضور ﷺ کے وسیلہ اور برکت سے دعا کی قبولیت حق ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۱۰/۳۳، جدید ڈابھیل ۱/۳٦٦)

عن عثمان بن حنیف -رضي اللّٰه عنه- أن رجلا ضریر البصر أتی النبي صلی اللّٰه علیه وسلم فقال: ادع اللّٰه أن یعافیني، قال: إن شئت دعوت، وإن شئت صبرت، فهو خیر لک، قال: فادعه قال: فأمره أن یتوضأ فیحسن وضوءه، ویدعو بهذا الدعاء: اللّٰهم إني أسئلک وأتوجه إلیک بنبیک محمد نبي الرحمة إني توجهت بک إلی ربي في حاجتي هذه لتقضي لي، اللهم فشفعه في. هذا حدیث حسن صحیح. (سنن الترمذي، أبواب

الدعوات، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢/ ١٩٨، دارالسلام، رقم: ٣٥٧٨)

ومن آداب الدعاء: تقديم الثناء على الله والتوسل بالنبي يستجاب.

(حجة الله البالغة ٢/ ٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۲۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۱/۱۲ھ

نماز کے بعد بلند آواز سے کلمۂ طیبہ پڑھنا

سوال [۳۰۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جماعت کی نماز کے بعد بلند آواز سے کلمۂ طیبہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ بحوالہ کتب جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: قاری محمد گل حسن عیدگاہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ''مسلم شریف'' (کتاب المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلاة ١/ ٢١٨) کی بعض روایات سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے؛ لیکن یہ عمل شروع میں تھا، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نمازوں کے بعد کے ذکر ودعا سے ناواقف تھے اور جب بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا علم ہوگیا تو جہری ذکر وغیرہ کا سلسلہ ختم کردیا گیا، سب اپنے طور پر آہستہ کرنے لگے؛ اس لئے نووی نے اس کی نکیر حنفیہ کی طرف منسوب کرکے نقل فرمائی ہے۔ (نووی علی ہامش مسلم، مکتبہ دارالسلام سہارنپور ۱/ ۲۱۷) اور اسی وجہ سے خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں یہ عمل بالکل ختم ہوچکا تھا؛ بلکہ ایسا کرنے والوں کو بدعتی کہا جاتا تھا، چنانچہ ایک جماعت نے ایسا عمل کیا تو ان سب کو بدعتی کہہ کر مسجد سے باہر نکال دیا گیا؛ لہٰذا ایسا عمل بدعت اور قابل ترک ہے، اس سے احتراز لازم ہے۔

عن ابن مسعود –رضي الله عنه– أنه أخرج جماعة من المسجد يهللون ويصلون على النبي صلى الله عليه وسلم جهرا، وقال لهم: ما أراكم إلا مبتدعين. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء، زكريا ۹/ ۵۷۰، كراچی ۶/ ۳۹۸، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۱/ ۲۵۱، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الكراهية، الفصل الرابع رفع الصوت عند قراءة القرآن، زكريا ۱۸/ ۵۷، رقم: ۲۸۰۲۲)

أنظر لهذا الأثر بمعناه: (مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي ۳/ ۲۲۱، رقم: ۵۴۰۹، ۳/ ۲۲۲، رقم: ۵۴۱۰، المعجم الكبير للطبراني دار إحياء التراث العربي ۹/ ۱۲۵، رقم: ۸۶۳۰، ۹/ ۱۲۶، رقم: ۸۶۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ رجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۷/ ۱۴۲۰ھ

سنن ونوافل کے بعد اجتماعی طور پر جہراً دعا کرنا

سوال [۳۰۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر امام نے نماز فرض کے بعد دعا مانگی پھر امام اور سب مقتدی سنن ونوافل سے فارغ ہوکر اکٹھے ہوکر بیٹھ گئے اور امام نے ان کے سامنے بیٹھ کر بلند آواز سے مفصل دعا مانگی اور مقتدیوں نے آمین کہی، تو یہ طریقہ کیوں کر جائز اور کیوں کر جائز نہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن موسیٰ، لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سنن ونوافل کے بعد سب کا اکٹھے ہوکر دعا مانگنے کا طریقہ کہیں منقول نہیں، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور نہ صحابہ سے اور نہ ائمۂ مجتہدین وفقہاء سے ثابت ہے، یہ طریقہ خلاف سنت بے اصل، من گھڑت اور بلا دلیل ہے؛ اس لئے واجب

الترک ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ،قدیم ۳/ ۲۸۰، ۳/ ۲۸۸، ۳/ ۲۹۱، جدید زکریا ۳/ ۳۳۰، ۳۳۷، ۳۴۰، ۳، زکریا مطول ۴/ ۴۵، احسن الفتاوی، زکریا ۱/ ۳۴۴، ۱/ ۳۴۶ ، فتاوی رحیمیہ، قدیم ۱/ ۲۱۵ ، جدید زکریا ۶/ ۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۶۱)

نماز عصر کے بعد ’’پانچ منٹ کا مدرسہ‘‘ مائک میں پڑھنا

سوال [۳۰۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز عصر کے بعد دعا سے پہلے ہماری مسجد میں ’’۵ ؍منٹ کا مدرسہ‘‘ کے عنوان سے کتاب پڑھی جاتی ہے، جس میں قرآن وحدیث کا درس ہوتا ہے؛ لیکن وہ مسبوق نمازی جن کی دو تین رکعت رہ جاتی ہیں، اس کی ادائیگی میں لاؤڈ اسپیکر پر درس ہونے کی وجہ سے خلل واقع ہونا فطری بات ہے، تو کیا یہ درس بغیر لاؤڈ اسپیکر کے ہونا چاہئے یا لاؤڈ اسپیکر پر ہی ہونا چاہئے؟ واضح طور پر اپنی رائے کا اظہار فرمائیں کیا بہتر ہے؟

المستفتی: عبدالحق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عصر کی نماز کے بعد دعا سے پہلے ’’پانچ منٹ کا مدرسہ‘‘ کا سلسلہ ایک اچھا کام ہے، مگر اس کی وجہ سے فرض نماز کے مسبوقین کی نمازوں میں خلل نہیں ہونا چاہئے؛ بلکہ ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ مسبوقین کی نماز بھی اطمینان سے پوری ہوجائے اور پانچ منٹ کا مدرسہ بھی چلتا رہے، اس کے لئے بہتر صورت یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد اتنی دیر تک تسبیح وغیرہ میں مصروف ہوجائے جتنی دیر میں مسبوقین فارغ ہوجائیں، اس کے بعد پانچ منٹ کا مدرسہ چلے، پھر اس کے بعد دعا کی جائے؛ لیکن اگر

مسبوقین کی فراغت کا انتظار نہیں کرنا ہے، تو پھر مائک میں نہیں ہونا چاہئے؛ بلکہ ہلکی آواز کے ساتھ قریب کے لوگوں کو سنانا چاہئے یہ کام آپس کے مشورے اور سب کے اتفاق سے چلنا چاہئے اختلاف وانتشار کا سبب نہیں بنانا چاہئے۔

یکره رفع الصوت بالذكر في المسجد إن ترتب عليه تهويش على المصلين، وإلا فلا يكره. (الفقه على المذاهب الأربعة، كتاب الصلاة، باب ما يكره فعله في المساجد و ما لا يكره، رفع الصوت في المسجد، دارالفكر ١/ ٢٨٦، مكمل جديد ٣/ ١٦٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍شعبان ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۲۹)

تعلیم دعا سے قبل ہو یا بعد میں

سوال [۳۰۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اکثر مساجد میں بعد نماز عصر وفجر از ۵؍تا ۷ منٹ کتابی تعلیم کا معمول رہتا ہے اور عموماً یہ معمول دعا کے بعد ہوتا ہے؛ لیکن بعضے ائمہ تسبیحات وغیرہ سے فارغ ہوکر قبل از دعا کتاب کی تعلیم کرتے ہیں، ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ افادہ عام ہوگا اور زیادہ سے زیادہ لوگ جڑیں گے؛ کیوں کہ اختتام دعا پر یہ کیفیت ختم ہوجاتی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع کتابی تعلیم قبل از دعا ہونی چاہئے یا بعد دعا، نیز ائمہ حضرات کا یہ موقف کہ قبل از دعا کتابی تعلیم افادۂ عام وکثرت عوام کا باعث ہوگی، کہاں تک درست ہے؟

المستفتی: محمد رضوان، مدرسہ امداد العلوم، حیدرآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کتابی تعلیم دعا سے پہلے کرنے کی وجہ سے بعد میں آنے والے نمازیوں اور مسبوقین کی نماز میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتو کتابی تعلیم دعا سے پہلے

نہیں ہونی چاہئے اور اگر دعا سے پہلے اتنی دیر توقف کے بعد تعلیم شروع کی جائے جتنی دیر میں بعد میں آنے والے تمام نمازی اور مسبوقین اپنی نماز سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں اور اس تعلیم کی وجہ سے کسی کی نماز میں خلل نہ پڑتا ہو تو دعا سے پہلے تعلیم میں کوئی حرج نہیں اور نمازیوں کے خلل کے خدشہ سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ دعا کے بعد کتابی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا جائے، جیسا کہ پورے ملک کے طول وعرض میں یہی معمول چلا آرہا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ میرٹھ ۱۸۲/۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۴۳/۴۰)

دعا سے قبل تعلیم کرنا

سوال [۳۰۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے محلّہ کی مسجد میں عام دنوں میں ''فضائل اعمال'' وغیرہ کی تعلیم نماز فجر اور دعا سے فراغت کے بعد ہوتی ہے؛ لیکن رمضان المبارک میں آنے والے اکثر نئے نمازیوں میں یہ ماحول بن چکا ہے کہ وہ دعا کے بعد فوراً منتشر ہوجاتے ہیں، مختصر سی تعلیم میں بھی شریک نہیں رہتے، ایسی صورت میں خاص کر رمضان المبارک میں عام دنوں کے خلاف اس ارادہ سے دعا کو تعلیم سے مؤخر کرنا، تاکہ لوگ دعا کا انتظار کرتے ہوئے تعلیم میں شریک رہیں، تو کیا اس طرح دینی مفاد کی خاطر لوگوں کو دعا کے انتظار میں لگا کر کچھ دیر تعلیم میں شریک رکھنے کی کوشش کرنا امر مستحب پر تشدد تو نہیں کہلائے گا؟ جب کہ لوگوں کو اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔

المستفتی: محمد عرفان الدین بن احمد پاشاہ، آندھرا پردیش

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دعا میں شرکت کرنا جس طرح لازم نہیں ہے، اسی طرح

تعلیم میں شرکت کرنا بھی لازم نہیں ہے؛ لہٰذا دعا سے پہلے تعلیم کا سلسلہ جاری کرنا ہو تو تعلیم کا وقفہ نہایت مختصر ہونا چاہئے، پس اگر دعا سے پہلے بہت مختصر تعلیم کا سلسلہ ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جس سے لوگوں پر گرانی نہ ہو۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۱۰/ ۲۶۶، جدید میرٹھ ۵/ ۱۸۰)

عن ابن مسعود –رضي الله عنه– قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بالموعظة في الأيام كراهة السامة علينا. (بخاري شريف، كتاب العلم، باب ما كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولهم بالموعظة في الأيام، النسخة الهندية ١/ ١٦، رقم: ٦٩، ف: ٦٨)

ويستفاد من الحديث استحباب ترك المداومة في الجد في العمل الصالح خشية الملال، وإن كانت المواظبة مطلوبة. (فتح الباري، قديم بيروت ١٩٦، جديد أشرفيه ١/ ١٦٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	**الجواب صحیح:**
۲۹/۷/۱۴۲۷ھ	**احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ**
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۹۱۲۳)	**۲۹/۷/۱۴۲۷ھ**

فرائض اور نوافل کے درمیان دعاؤں کے ذریعہ فصل کرنا

سوال [۳۰۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ لوگ قریب قریب ہر نماز فرض میں جن کے بعد سنت ونوافل بھی ہیں، اتنی دیر تک بیٹھ کر ذکر یا دعائیں مانگتے ہیں کہ دوسرے نمازی سنت ونوافل تک پڑھ لیتے ہیں، جب کہ ہدایت ہے کہ جن فرضوں کے بعد سنت ونوافل ہیں دعاؤں میں اختصار کیا جائے؟

المستفتی: ماسٹر عبدالحق ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جن فرض نمازوں کے بعد سنن ونوافل بھی ہیں، ان میں

فرض نمازوں کے سلام پھیرنے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر ذکر ودعا میں مشغول رہنا اور فرض وسنتوں کے درمیان کچھ دیر فصل کرنا حدیث پاک سے ثابت ہے، ایک دفعہ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ فرض نماز کے فوراً بعد ایک شخص سنتوں کے لئے کھڑا ہوگیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا گریبان پکڑ کر زور سے کھینچ کر بیٹھا دیا اور فرمایا کہ پچھلی امتیں فرض اور سنت کے درمیان فصل نہیں کرتی تھیں، یہ بات ان کے لئے ہلاکت کا باعث بنی، حضور پاک ﷺ نے اس بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف فرمائی۔ حدیث شریف حسب ذیل ہے:

عن الأرزق بن قيس، قال: صلى بنا إمام لنا، يكني أبارمثة، فقال: صليت هذه الصلوة، أو مثل هذه الصلوة مع النبي ﷺ قال: وكان أبو بكر وعمر يقومان في الصف المقدم عن يمينه، وكان رجل قد شهد التكبيرة الأولى من الصلاة، فصلى نبي الله صلى الله عليه وسلم، ثم سلم عن يمينه، وعن يساره، حتى رأينا بياض خديه، ثم انفتل كانفتال أبي رمثة، يعني نفسه، فقام الرجل الذى أدرك معه التكبيرة الأولى من الصلاة يشفع، فوثب إليه عمر، فأخذ بمنكبيه فهزه، ثم قال: اجلس، فإنه لم يهلك أهل الكتاب إلا أنهم لم يكن بين صلواتهم فصل، فرفع النبي صلى الله عليه وسلم بصره، فقال: أصاب الله بك يا ابن الخطاب. (أبوداؤد شريف، الصلاة، باب في الرجل يتطوع فى مكانه الذى صلى فيما المكتوبة، النسخة الهندية ٢/ ١٤٤، دارالسلام، ١٠٠٧، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٢٢/ ٢٨٤، رقم: ٧٢٨، المستدرك للحاكم، كتاب الصلاة، مكتبه نزار مصطفى، جديد ١/ ٣٩٥، رقم: ٩٩٦، مشكوة شريف ١/ ٨٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۹/۱/۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۴۲۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱/۱۸ھ

فرائض وسنن میں فصل کرتے ہوئے اوراد وظائف پڑھنا

سوال [۳۰۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) جن فرضوں کے بعد سنت ونوافل ہیں، ان میں جماعت کے بعد اجتماعی دعا کے بعد بھی اتنی دیر تک بیٹھ کر کچھ پڑھنے کو اپنے اوپر واجب کرلینا کہ دوسرے متقدی دو سنت دو نفل آرام سے پڑھ لیں، جب کہ جلدی کی تاکید اکثر مفتیان نے فرمائی ہے؟

(۲) جماعت کے بعد سنت ونوافل کے لئے جگہ بدلنے کو اپنے اوپر لازم کرلینا بھلے ہی دوسرے لوگوں کی نماز میں خلل واقع ہو، اکثر اتر سے دکھن کی جانب چلے جانا کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالحق ہلدوانی، نینی تال، اتراکھنڈ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جن نمازوں کے بعد سنن ونوافل کا ثبوت ہے، ان فرض نمازوں کے بعد سنتوں سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے اپنی جگہ بیٹھ کر ذکر ودعا اور اوراد وظائف پڑھنا حدیث سے ثابت ہے اور اس میں اتنی شدت نہیں ہے کہ فرض نماز سے فراغت کے بعد فوراً سنن پڑھی جائیں؛ بلکہ اوراد و وظائف کے ذریعہ فاصلہ کرنا حدیث شریف سے فضیلت کے ساتھ ثابت ہے، چنانچہ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مغرب کی فرض نماز کے بعد اپنی جگہ سے منتقل ہونے سے پہلے: ”**لا إلہ إلا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک، ولہ الحمد بیدہ الخیر یحیي ویمیت، وهو علی کل شيء قدیر**“ دس مرتبہ پڑھے گا، تو ہر مرتبہ پڑھنے کے مقابلہ میں دس نیکیاں لکھی جائیں گی، دس گناہ معاف ہوں گے، اور دس درجات بلند ہوں گے اور ہر ناگوار امور سے حفاظت میں رہے گا اور شیطان مردود کے مکر وفریب سے حفاظت میں رہے گا۔ اس کلمہ کو دس مرتبہ پڑھتے پڑھتے دوسرا آدمی آسانی کے ساتھ دو سنتیں پڑھ سکتا ہے۔ اور یہ حدیث شریف مغرب کی نماز کے بارے میں ہے، جس کے بعد سنتیں

ہوتی ہیں، اسی طرح مسجد سے فرض پڑھنے کے بعد پیدل چل کر گھر پہنچنے کے ذریعہ سے فرض وسنت کے درمیان میں فاصلہ کرنا حدیث سے ثابت ہے؛ حالانکہ بہت سے صحابہ کرام کی رہائش مسجد نبوی سے کافی دوری پر تھی، جہاں تک پہنچنے میں دس دس، پندرہ پندرہ منٹ کی ضرورت پڑتی تھی، چنانچہ حدیث شریف سے یہ بھی ثابت ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے ایسی فرض نماز ادا فرمائی کہ جس کے بعد سنتیں ہیں اور اس نماز میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے۔ اور ایک شخص حضور ﷺ کے ساتھ تکبیر اولیٰ میں شریک ہوگئے، جب آپ ﷺ نے دونوں طرف سلام پھیرا تو وہ شخص سنتوں کے لئے کھڑے ہوگئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے مونڈھے پکڑ کر کھینچ کر بٹھا دیا اور فرمایا کہ تم سے پچھلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوگئیں کہ وہ فرض اور سنتوں کے درمیان میں فاصلہ نہیں کرتی تھیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے عمر! بہت اچھا کیا، اسی طرح فرض نمازوں کے بعد سنتوں سے پہلے حضور ﷺ سے مختلف انداز کے مختلف اوراد و وظائف اور ذکر ودعا کا پڑھنا ثابت ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اتنی دیر کے لئے بیٹھ کر کچھ وظائف پڑھتا ہے کہ جس میں دوسرا آدمی دو رکعت سنت پڑھ سکتا ہے، تو کوئی حرج نہیں ہے، خدا کرے کہ اللہ تعالیٰ اعتراض کرنے والے معترض کو بھی کچھ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے، اب حدیثیں ملاحظہ فرمایئے:

عن عبدالرحمن بن غنم، عن النبي ﷺ أنه قال: من قال قبل أن ينصرف ويثني رجله من صلاة المغرب والصبح: ”لا إله إلا الله وحده لا شريک له، له الملک، وله الحمد بيده الخير يحيي ويميت، وهو على کل شيء قدير“ عشر مرات، کتب له بکل واحدة عشر حسنات، ومحيت عنه عشر سيئات، ورفع له عشر درجات، وکانت حرزا من کل مکروه، وحرزا من الشيطان الرجيم. (مسند أحمد ٤/ ٢٢٧، رقم: ١٨١٥٣)

عن أبي أيوب -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قال دبر صلاته إذا صلى: ”لا إله إلا الله وحده لا شريک له، له

الـمـلک، ولـه الحمد وهو على كل شيء قدير" عشر مرات، كتب له بهن عشـر حسـنات، ومحى عنه بهن عشر سيئات، ورفع له بهن عشر درجات، وكـن لـه عتـق عشـر رقـاب، وكـن له حرسا من الشيطان حتى يمسي، ومن قـالهن حين يمسي كان له مثل ذلک حتى يصبح. (صحيح ابن حبان، ذکر التی الذی یقول لمن قاله بعد صلاة الغداة والمغرب ...... دارالفکر ۳/ ۱۸۵، رقم: ۲۰۲۱)

عـن الأرزق بـن قيـس، قـال: صـلى بنا إمام لنا، يكني أبا رمثة، فقال: صـليت هذه الصلوة، أو مثل هذه الصلوة مع النبي ﷺ قال: وكان أبو بكر وعـمـر يـقـومان في الصف المقدم عن يمينه، وكان رجل قد شهد التكبيرة الأولى من الصلاة، فصـلـى نبي الله ﷺ، ثم سلم عن يمينه، وعن يساره، حتـى رأينا بياض خديه، ثم انفتل كانفتال أبي رمثة، يعني نفسه، فقام الرجل الـذى أدرک معه التكبيرة الأولى من الصلاة يشفع، فوثب إليه عمر، فأخذ بـمـنكبه فهزه، ثم قال: اجلس، فإنه لم يهلک أهل الكتاب إلا أنهم لم يكن بيـن صـلـواتهم فصل، فرفع النبي ﷺ بصره، فقال: أصاب الله بک يا ابن الخطاب. (أبـوداؤد شـريف، الـصـلاة، باب في الرجل يتطوع فی مکانه الذی صلی فيما الـمـكـتـوبة، الـنسخة الهندية ۱/ ۲۸۵، دارالسلام، ۱۰۰۷، السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الصلاة، بـاب الإمـام يتحول عن مكانه إذا اراد أن يتطوع في المسجد، دارالفکر جدید ۳/ ۲۱، رقم: ۳۱۲۹، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۲۲/ ۲۸٤، رقم: ۷۲۸)

(۲) فرض نماز کے بعد سنتوں کے لئے جگہ بدلنا صحیح حدیث شریف سے ثابت ہے، خود حضور اکرم ﷺ فرض کے بعد تھوڑی دیر کچھ دعائیہ وظائف پڑھ کر حجرۂ مبارکہ میں تشریف لے جاکر سنن ونوافل پڑھا کرتے تھے، اسی طرح حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اپنی اپنی رہائش گاہوں میں جاکر کے سنن ونوافل پڑھا کرتے تھے۔ اور جن کا قیام مسجد نبوی میں ہوا کرتا تھا، وہ مسجد ہی میں فرض نماز کی جگہ بدل کر کے سنن ونوافل پڑھا کرتے تھے؛ اس لئے اگر کوئی

شخص فرض نماز کی جگہ بدل کر سنن ونوافل پڑھنے کا معمول بنالیتا ہے تو اس کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ جگہ بدلنے کو وہ شخص واجب سمجھ رہا ہے یا اپنے طور پر لازم کرلیا ہے؛ بلکہ ایک سنت یا مستحب کام پر عمل کو جاری رکھے ہوئے ہے اور کسی دوسرے آدمی کو اس کے اوپر جارحانہ طور پر یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس شخص نے اپنے اوپر اس عمل کو لازم کرلیا ہے۔

عن عبدالله بن عمر أن رسول الله ﷺ كان يصلي قبل الظهر ركعتين وبعدها ركعتين، وبعد المغرب ركعتين في بيته. (صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب الصلاة بعد الجمعة وقبلها، النسخة الهندية ١/ ١٢٨، رقم: ٩٢٧، ف: ٩٣٧)

عن ابن عمر -رضى الله عنه- أن النبي ﷺ كان يصلي الركعتين بعد المغرب في بيته. (مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٣٢، رقم: ٥٦٠٣، المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، موسسة علوم القرآن جديد ٤/ ٣٨٢، رقم: ٦٤٣١)

عن أبى هريرة -رضي الله عنه- عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أيعجز أحدكم إذا صلى أن يتقدم أو يتأخر، أو عن يمنيه، أو عن شماله يعني السبحة (مصنف ابن أبي شيبة، الصلاة، في الرجل يقضي صلاته يتطوع في مكانه، موسسة علوم القرآن، جديد ٤/ ٢٩٩، رقم: ٦٠٦٥، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٤٢٥، رقم: ٩٤٩٢، سنن ابن ماجة، الصلاة، باب ماجاء في صلاة الداخلة حيث تصلي المكتوبة، النسخة الهندية/ ١٠٣، دارالسلام، رقم: ١٤٢٧)

عن زيد بن ثابت، أن النبي ﷺ قال: صلاة المرء في بيته أفضل من صلاته في مسجدي هذا، إلا المكتوبة. (أبوداؤد، الصلاة، باب صلاة الرجل التطوع في بيته، النسخة الهندية ١/ ١٤٩، دارالسلام، رقم: ١٠٤٤، المعجم الكبير للطبراني، داراحياء التراث العربي ٥/ ١٤٤، رقم: ٤٨٩٣)

فعليكم بالصلاة في بيوتكم، فإن خير صلاة المرء فى بيته إلا الصلاة المكتوبة. (مسلم، الصلاة، باب استحباب صلاة النافلة في بيته، وجوازها في المسجد،

النسخة الهندية ١/ ٢٦٦، دارالسلام، رقم: ٧٨١، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ٥/ ١٤٤، رقم: ٤٨٩٣)

فصلوا أيها الناس! في بيوتكم، فإن أفضل صلاة المرء في بيته إلا المكتوبة. (صحيح البخاري، باب ما يكره من كثرة السؤال وتكلف ما لا يعنيه، النسخة الهندية ٢/ ١٠٨٢، رقم: ٦٩٩٧، ف: ٧٢٩٠)

عن عطاء: أن ابن عباس، وابن الزبير، وأبا سعيد، وابن عمر كانوا يقولون: لا يتطوع حتى يتحول من مكانه الذي صلى فيه الفريضة. (مصنف ابن أبي شيبة، الصلاة، في الرجل يقضي صلاته يتطوع فيها مكانه، موسسة علوم القرآن،جديد ٤/ ٢٩٩، رقم: ٦٠٦٧)

عن أبي معمر قال: إذا صليت المكتوبة فبيتك. (مصنف ابن أبی شيبة، الصلاة، فی الرجل يقضي صلاته في المسجد، موسسة علوم القرآن، جديد ٤/ ٣٨٢، رقم: ٦٤٢٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۵۷۵)

فرض کے بعد سنتوں سے قبل حدیث سنانا

سوال [۳۰۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عالم صاحب جمعہ کی فرض نماز کا سلام پھیرنے کے بعد دعا سے پہلے مختصر وقت میں ایک حدیث شریف سنا دیا کرتے ہیں اور اس وقت سب لوگ جمعہ کی فرض نماز سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں اور ابھی کسی نے سنت کی نیت بھی نہیں باندھی ہوتی ہے، کسی کی نماز اور عبادت میں اس حدیث کے سنانے کی وجہ سے خلل نہیں پڑتا، اس کے بعد مختصر دعا بھی ہوجاتی ہے، پھر اس کے بعد لوگ سنتوں میں لگ جاتے ہیں، اسی طرح کبھی کبھار ظہر کی سنن

بعدیہ سے پہلے اور کبھی مغرب کی سنت سے پہلے ایک حدیث شریف سنادیا کرتے ہیں، تاکہ لوگوں کو عمومی فائدہ پہنچ جائے، تو کیا فرض اور سنتوں کے درمیان اس طرح اس مختصر فاصلہ کی وجہ سے عالم صاحب کا یہ عمل درست ہے یا خلاف سنت ہے؟ احادیث شریفہ اور فقہ کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد الیاس حیدرآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن فرض نمازوں کے بعد سنن بعدیہ کا ثبوت ہے، اسی طرح جمعہ کی فرض نماز کے بعد سنن بعدیہ کا ثبوت ہے، ان نمازوں میں بھی فرض نماز سے فراغت کے فوراً بعد متصلا سنتوں کے لئے کھڑا ہوجانا مسنون نہیں ہے؛ بلکہ فرض سے فراغت کے بعد کچھ وظائف، دعا یا ذکر میں مشغول ہونے کے بعد سنتیں پڑھنا مسنون ہے۔ حدیث شریف کی اکثر کتابوں میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فرض نمازوں کے بعد تھوڑی دیر دعا اور وظائف میں مشغول ہوجانا ثابت ہے، اس کے بعد چل کر گھر جاکر سنتیں پڑھا کرتے تھے، یہی مسنون طریقہ ہے، چنانچہ ''ابوداؤد شریف'' میں مفصل روایت موجود ہے کہ ایک دفعہ فرض نماز سے فراغت کے بعد ایک صحابی وظائف وغیرہ سے پہلے سنتوں کے لئے کھڑے ہوگئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا گریبان پکڑ کر فرمایا کہ بیٹھ جاؤ! فرض نماز اور سنتوں کے درمیان فاصلہ ہونا چاہئے، تو حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف نگاہ اٹھا کر فرمایا: اے ابن خطاب! اللہ نے تمہیں صحیح بات کی توفیق عطا فرمائی۔ اسی طرح حدیث کی کتابوں میں مفصل دعاؤں اور تفصیلی اذکار کے ذریعہ سنن بعدیہ اور فرضوں کے درمیان فاصلہ کا ثبوت موجود ہے، جب اذکار اور وظائف کی اجازت ہے، تو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر یا اصلاحی موضوع سے متعلق حدیث شریف کا سنانا بطریق اولیٰ جائز اور درست ہوگا، نیز فقہ کی کتابوں میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اگر فرض نمازوں کے بعد کھانا حاضر ہے، سنتوں میں لگ جانے سے کھانا ٹھنڈا ہوجانے اور بدمزہ ہوجانے کا

خطرہ ہوتو سنتوں کوموقوف کر کے پہلے کھانا کھانے اوراس کے بعد سنتیں پڑھنے کی اجازت ثابت ہے، ظاہر ہے کہ اطمینان سے کھانا کھانے میں اوسطاً پندرہ بیس منٹ کا وقت لگ جاتا ہے اوراس قدر تاخیر کی وجہ سے سنتوں کے ثواب میں کوئی کمی بھی نہیں آئے گی ، جب کھانا ٹھنڈا ہونے اور بدمزہ ہونے کے خطرہ سے سنتوں کوموقوف کر کے بعد میں پڑھنے کی شریعت نے اجازت دی ہے، تو اتنے وقت کے اندر حضور ﷺ کی اصلاحی حدیثیں سنانا بطریق اولیٰ جائزاور افضل ہوگا، اس کی وجہ سے سنتوں کے ثواب میں کمی بھی نہیں آئے گی؛ اس لئے مذکورہ عالم صاحب کا جمعہ کے فرض اور سنتوں کے درمیان، اسی طرح دیگر فرض نمازوں اور سنن بعد یہ کے درمیان دس پندرہ منٹ کے اندر اندر وقتاً فوقتاً حدیث شریف کا سنادینا یا کوئی دینی اصلاحی اور ترغیب وتذکیر سے متعلق کوئی مضمون سنادینا بلاتردد جائز اور باعث فضیلت اور افضل ہوگا؛ اس لئے کہ فرضوں کے بعد سنتوں سے پہلے ایسا وقت ہوتا ہے جس میں یکسو ہوکر اطمینان کے ساتھ دین کی بات سننے کا موقع ہوتا ہے، آج کل کے زمانہ میں لوگوں کے اندر دین کی باتیں سننے کا زیادہ داعیہ نہیں ہے اور سنتوں کے بعد لوگوں کے منتشر ہوجانے ، کچھ کے رکنے اور کچھ کے چلے جانے کا خطرہ رہتا ہے؛ لہٰذا مذکورہ عالم صاحب نے حدیث اور دینی مضامین سنانے کے لئے جس وقت کا انتخاب کیا ہے وہ نہایت مناسب ہے، اور یہ طریقہ سنت کے خلاف نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ سے نمازیوں کی سنن بعدیہ کے ثواب میں کوئی کمی نہیں آئے گی ، ہاں البتہ فرضوں کے بعد دنیوی گفتگومیں مصروف ہوجائے اس کے بعد سنتیں پڑھی جائیں تو ثواب میں کمی آئے گی ، جیسا کہ فقہ کی جزئیات سے ثابت ہے، اب حدیث شریف اور فقہ کی جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

عن الأرزق بن قيس، قال: صلى بنا إمام لنا، يكني أبارمثة، فقال: صليت هذه الصلوة، أو مثل هذه الصلوة مع النبي ﷺ قال: وكان أبو بكر وعمر يقومان في الصف المقدم عن يمينه، وكان رجل قد شهد التكبيرة

الأولى من الصلاة، فصلى نبي الله صلى الله عليه وسلم، ثم سلم عن يمينه، وعن يساره، حتى رأينا بياض خديه، ثم انفتل كانفتال أبي رمثة، يعني نفسه، فقام الرجل الذى أدرك معه التكبيرة الأولى من الصلاة يشفع، فوثب إليه عمر، فأخذ بمنكبه فهزه، ثم قال: اجلس، فإنه لم يهلك أهل الكتاب إلا أنهم لم يكن بين صلواتهم فصل، فرفع النبي صلى الله عليه وسلم بصره، فقال: أصاب الله بک يا ابن الخطاب. (أبوداؤد شريف، الصلاة، باب في الرجل يتطوع فى مكانه الذى صلى فيما المكتوبة، النسخة الهندية ٢/ ١٤٤، دارالسلام، ١٠٠٧، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٢٢/ ٢٨٤، رقم: ٧٢٨، المستدرك للحاكم، كتاب الصلاة، مكتبه نزار مصطفى، جديد ١/ ٣٩٥، رقم: ٩٩٦، السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الصلاة، باب الإمام يتحول عن مكانه إذا اراد أن يتطوع في المسجد، دارالفكر جديد ٣/ ٢١، رقم: ٣١٢٩، مشكوة شريف ١/ ٨٩، حجة الله البالغة، مكتبه حجاز ٢/ ١٥، فتح الملهم، اشرفيه ديو بند ٢/ ١٧٧)

لو حضر الطعام وخاف ذهاب لذته لو اشتغل بالسنة البعدية، فإنه يتناوله، ثم يصليها؛ لأن ذلک عذر في ترک الجماعة، ففي تأخير السنة أولى إلا إذا خاف فوتها بخروج الوقت، فإنه يصليها، ثم يأكل، هذا ما ظهر لي.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ٢/ ٢٠، زكريا ٢/ ٤٦١)

نیز تسبیحات فقراء جس کو عوام تسبیح فاطمہ بھی کہتے ہیں، وہ پانچوں نمازوں کے بعد پڑھنے کی ترغیب ہے، جس میں ۳۳؍ مرتبہ ''سبحان اللہ'' اور ۳۳؍ مرتبہ ''الحمدللہ'' اور ۳۳؍ مرتبہ ''اللہ اکبر'' اور ایک مرتبہ کلمہ توحید مکمل پڑھنے کی ترغیب ہے۔ اور ہمارے برصغیر میں صرف نماز فجر اور نماز عصر کے بعد پڑھنے کا معمول ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ حضور اکرم ﷺ نے ظہر، مغرب اور عشاء کے فرض کے بعد بھی سنتوں سے پہلے ان تسبیحات کے پڑھنے کی ترغیب دی ہے، ظاہر بات ہے کہ اطمینان سے ان تسبیحات کے پڑھنے میں چار پانچ منٹ لگ

جائیں گے اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد دعائیں اور تسبیحات فرضوں کے بعد پڑھنے کی ترغیب ہے، اگر کوئی شخص سنتوں سے پہلے فرضوں کے بعد پڑھنے کی دس بارہ دعائیں اور تسبیحات فقراء سب ایک ساتھ پڑھتا ہے، اس کے بعد سنتیں پڑھتا ہے تو کوئی شخص اس پر خلاف سنت عمل کرنے کا الزام عائد نہیں کرسکتا؛ بلکہ اس کا عمل عین سنت کے مطابق ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ اتنی تسبیحات سنتوں سے پہلے پوری کرنے میں پندرہ بیس منٹ لگ جائیں گے؛ لہٰذا اگر کوئی عالم ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ سنتوں سے پہلے امر بالمعروف نہی عن المنکر سے متعلق حدیث یا مضامین سنا دے وہ بھی بلا تردد جائز اور درست ہوگا، ان تمام وظائف پر اہل عرب کا عمل آج بھی بدستور جاری ہے اور یہاں برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان جن نمازوں کے بعد سنتیں ہیں، ان میں سنتوں سے پہلے لوگوں نے اپنے معمولات چھوڑ رکھے ہیں، جس کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں یہی بات بیٹھ گئی ہے کہ جن نمازوں کے بعد سنن بعدیہ ہے ان کے بعد سنتوں سے پہلے شریعت سے وظائف ثابت نہیں ہے جو کہ درست نہیں ہے؛ بلکہ درست یہی ہے کہ ان نمازوں کے بعد بھی لمبے وظائف ثابت ہیں؛ لہٰذا اگر کوئی امام کبھی کبھار ان وظائف کے بجائے امر بالمعروف نہی عن المنکر یا اصلاحی مضامین سنا دے تو اس کے جواز میں کوئی تردد نہیں ہے۔ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں تقریباً تین صفحات تک فرضوں کے بعد سنتوں سے پہلے دعائیں اور وظائف نقل فرمائے ہیں۔ اب حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن رسول الله ﷺ قال: من سبح الله في دبر كل صلاة ثلاثا وثلاثين، وحمد الله ثلاثا وثلاثين، وكبر الله ثلاثا وثلاثين، فتلك تسعة وتسعون، وقال تمام المائة: لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيء قدير، غفرت خطاياه، وإن كانت مثل زبد البحر. (مسلم شريف، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة، وبيان صفته، النسخة الهندية ١/ ٢١٩، رقم: ٥٩٧، صحيح ابن خزيمة،

المكتب الإسلامي بيروت ١/ ٣٩٠، رقم: ٧٥٠، بخاري شريف، باب الذكر بعد الصلاة، النسخة الهندية ١/ ١١٦، ١١٧، رقم: ٨٣٥، ف: ٨٤٣، رقم: ٨٣٦، ف: ٨٤٤، حجة الله البالغة، جديد، مكتبه حجاز ٢/ ٤٩-٥٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ر صفر ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۳۵)

نماز کے بعد طویل دعا یا وعظ وحدیث کے ذریعہ سنتوں میں فصل کرنا

سوال [۳۰۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) جن فرض نمازوں کے بعد سنن پڑھی جاتی ہیں، ان میں فرض وسنن کے درمیان لمبی لمبی دعاؤں یا ذکر واذکار کے ذریعہ طویل فصل کرنا کیسا ہے؟ از روئے شرع کتنا فصل ہونا چاہئے؟

(۲) بعض ائمہ کا معمول ہے کہ کسی ایک فرض نماز کے بعد سنن سے پہلے؛ بلکہ دعا سے بھی پہلے کوئی حدیث سنا کر اس کی تشریح کرتے ہیں، جب کہ مسبوق حضرات ابھی نماز میں مشغول رہتے ہیں، ایسی صورت میں تو بآواز تلاوت قرآن مجید بھی درست نہیں ہے، تو حدیث بیان کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۳) کیا عصر اور فجر کے بعد بھی دعا سے پہلے حدیث سنا کر تشریح کرنا بھی یہی حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: ضیاء الدین سنسار پور، لکھیم پور کھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) جن فرض نمازوں کے بعد سنتیں نہیں ہیں، ان کے بعد دعائیں اور وظائف اور دینی گفتگو جتنی چاہیں لمبی کر سکتے ہیں، قابل غور بات ان نمازوں کے بارے میں ہے، جن کے بعد سنتیں ہوتی ہیں، تو احادیث صحیحہ سے یہ بات

ثابت ہے کہ ان نمازوں کے بعد بھی حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام سے اذکار اور ادعیہ ماثورومنقول ہیں، بعض اذکار اور دعائیں مختصر ثابت ہیں اور بعض طویل بھی ہیں، اسی طرح دعاؤں اور اذکار سے فراغت کے بعد آپ ﷺ گھر تشریف لے جاکر سنتیں پڑھا کرتے تھے، یہی صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین وتبع تابعین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت ہے، اذکار اور وظائف کے بعد گھر جاکر سنتیں پڑھنا مسنون ہے، چاہے گھر مسجد سے دور ہی کیوں نہ ہو؛ لیکن آج کل کے زمانہ میں ہمتیں کمزور ہوگئیں، جس کی بناپر مسجد سے باہر نکلنے کے بعد بجائے سنتوں میں مشغول ہونے کے دوسرے مشاغل میں مشغول ہوجانے کا زیادہ اندیشہ ہے؛ اس لئے عام لوگوں کو مسجد ہی میں سنتیں پڑھ لینی چاہئیں اور خواص جن سے سنتیں چھوٹ جانے کا خطرہ نہ ہو، ان کے لئے آج بھی یہی مسنون ہے کہ اپنی رہائش گاہ میں جاکر سنن ونوافل میں مشغول ہوجائیں، اب رہی لمبی لمبی دعائیں اور ذکر واذکار کے ذریعہ سے طویل فصل کرنا، پھر سنت پڑھنا تو اس میں دیکھا جائے کہ طویل فصل سے کیا مراد ہے؟ اگر بہت زیادہ فصل ہے جو دیکھنے والا خود سمجھ سکتا ہے، تو خلاف اولیٰ ہے۔ اور اگر بہت زیادہ فصل نہیں ہے؛ بلکہ چار پانچ منٹ کا فصل ہے، تو کوئی حرج نہیں ہے، اس طرح کا فصل حدیث سے ثابت ہے اور صاحب معاملہ خود فیصلہ کرے کہ طویل فصل سے کیا مراد ہے؟ ہاں البتہ بعض جگہ امام بہت لمبی دعا کرنے لگتے ہیں، جس سے مقتدیوں کو اکتاہٹ ہوجاتی ہے؛ اس لئے امام کو عمومی طور پر دعاؤں میں اختصار کا خیال رکھنا چاہئے، ہاں البتہ کبھی کبھی حالات کے پیش نظر اگر دعا کچھ لمبی ہوجائے تو کوئی حرج نہیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۳/ ۳۶۵، ۳۰۷، جدید زکریا ۳/ ۳۵۳، ۳۵۴، زکریا مطول ۴/ ۷۹، فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۰۹، ۲۱۱)

قال الحلواني: لا بأس بالفصل بالأوراد، واختاره الكمال. (درمختار مع الرد المحتار، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ، زکریا ۲/ ۲۴۶، کراچی ۱/ ۵۳۰)

نمازیوں اور مسبوقین کا خیال اور ان کی رعایت رکھتے ہوئے کبھی کبھار دعا سے پہلے کوئی حدیث شریف چار پانچ منٹ کے اندر سنادی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، نیز

روزانہ پانچوں نمازوں میں اس کا معمول نہ بنانا چاہئے؛ بلکہ کبھی کبھار موقع ومحل کو پیش نظر رکھ کر دعا اور سنتوں سے پہلے چار منٹ کے اندر کوئی حدیث شریف سنا دی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر سوال نامہ کا مقصد یہ ہے کہ بلا ناغہ مسلسل ایسا کیا جاتا ہے، تو ظاہر بات ہے کہ مسبوقین اور بعد میں سنتیں پڑھنے والے الجھن اور اکتاہٹ کا شکار ہوجائیں گے جو شرعاً درست نہیں ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۳/ ۳۶۵، ۳۰۷، زکریا مطول ۴/ ۵۴-۵۵، فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۰۹ - ۲۱۱)

جن نمازوں کے بعد سنتیں نہیں ہیں، ان کے بعد دعا سے پہلے مسبوقین کا خیال رکھتے ہوئے ہمیشہ حدیث شریف سناتے رہیں، چاہیں لمبی ہو یا مختصر تو کوئی حرج نہیں ہے؛ بلکہ مسلمانوں کو دینی فائدہ پہنچنے کی زیادہ امیدیں وابستہ ہوں گی (جیسا کہ ترمذی شریف میں نماز عصر کے فوراً بعد غروب شمس تک حضرت سید الکونین علیہ السلام سے بیان کرنا ثابت ہے۔ اور دوسری جگہ نماز فجر کے فوراً بعد لمبا بیان کرنا ثابت ہے) حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن أبي سعيد الخدري –رضي الله عنه– قال: صلى بنا رسول الله ﷺ يوما صلاة العصر بنهار، ثم قام خطيبا فلم يدع شيئا يكون إلى قيام الساعة إلا أخبرنا به. الحديث (سنن الترمذي، أبواب الفتن، باب ما أخبر النبي صلى الله عليه وسلم اصحابه بما هو كائن إلى يوم القيامة، النسخة الهندية ۲/ ٤۲، دارالسلام، رقم: ۲۱۹۱)

عن العرباض بن سارية –رضي الله عنه– قال: وعظنا رسول الله ﷺ يوما بعد صلاة الغداة موعظة بليغة، ذرفت منها العيون، ووجلت منها القلوب. الحديث (سنن الترمذي، أبواب العلم، باب ماجاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع، النسخة الهندية ۲/ ۹٦، دارالسلام، رقم: ۲٦۷٦، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ۱۸/ ۲٤۸، رقم: ٦۲۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۹۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۴/۱۴۲۷ھ

دینی امور کے لئے سنن وفرائض میں فصل کرنا

ســـوال [۳۰۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:
آج دین سے بے رغبتی اور بے توجہی قابل بیان نہیں، دنیا کے لئے کافی اوقات ہیں، مگر دین کے لئے بمشکل بہت تھوڑا سا وقت ہے، اسی کے باعث احقر نے بعد جماعت ظہر متصلا سنن بعدیہ سے قبل حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ کا اصلاحی نسخہ ''ایک منٹ کا مدرسہ'' شروع کیا ہے؛ اس لئے کہ عصر اور فجر کے بعد جماعت والے تعلیم کرتے ہیں، نیز ایک منٹ کے مدرسہ کی تعلیم میں تقریباً ایک دو منٹ لگتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ ذرا سے وقت میں پوری جماعت کو نفع پہنچ جائے جو ادائیگی سنت کے بعد ممکن نہیں، اس پر بعض لوگوں کو اشکال ہے کہ فرض کے بعد فوراً متصلا سنت کی ادائے گی ہوگی، درمیان میں اور کسی چیز کی گنجائش نہیں، آپ سے مودبانہ التماس ہے کہ آپ ہمیں اس سلسلہ میں ازروئے شرع مطمئن فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد مظفر حسین، امام کنویں والی مسجد نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر دینی امور کے لئے سنت وفرائض کے درمیان تھوڑا سا فصل ہو جائے جس میں امر بالمعروف نہی عن المنکر یا کچھ اوراد و وظائف ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ امام شمس الائمہ حلوانی اور علامہ کمال الدین بن ہمام وغیرہ فرماتے ہیں؛ لیکن اس بات کا خیال رکھا جائے کہ بات لمبی نہ ہو؛ بلکہ بہت مختصر ہو۔

قال الحلواني: لا بأس بالفصل بالأوراد، واختاره الكمال. (درمختار مع الرد المحتار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، زكريا ٢/ ٢٤٦، كراچی ١/ ٥٣٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۱۸۹/۳۵)

دعا سے قبل مسجد یا دینی ضرورت کے لئے چندہ کرنا

سوال [۳۰۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ نئی مسجدوں میں جن میں جمعہ کی نماز ہونے لگی ہے، کچھ دنوں سے نماز میں سلام پھیرنے کے بعد دعا نہ کر کے کچھ طے شدہ نمازیوں سے اپنی جگہ سے کھڑا کرا کر جھولی پھیلا کر مسجد کے لئے چندہ کرنا شروع کرا دیا ہے، جب تک پوری مسجد میں چندہ ہو کر یہ آواز نہ آجائے کہ چندہ ہو گیا، امام صاحب دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاتے، اس وقت تک سارے نمازی خاموش بیٹھے رہتے ہیں، چندہ ہونے کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے میں کمیٹی کے اس عمل پر اعتراض ہے کہ یہ چندہ اس بیچ میں مناسب ہے کہ نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز جمعہ کے بعد مسجد میں کسی مذہبی کام یا اسی مسجد کی ضروریات کے لئے دعا کو چند منٹ موقوف کر کے چندہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، نیز سلام اور دعا کے درمیان کسی نمازی کی نماز میں خلل بھی نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے کوئی حرج نہیں ہے۔ اور معترض نے الگ صفحہ میں جو اعتراض کیا ہے کہ ''خدا سے مانگنے سے پہلے بندہ سے مانگنا شروع کر دیا ہے، یہ غلط ہے'' لیکن یہ غلط نہیں ہے؛ کیوں کہ دعا سے پہلے خاموشی کے ساتھ جو چندہ کیا جاتا ہے وہ اپنے لئے نہیں کیا جاتا ہے؛ بلکہ اللہ کے کام کے لئے یا دینی ضروریات کے لئے کیا جاتا ہے۔

والمختار أن السائل إن كان لا يمر بين يدى المصلي، ولا يتخطى الرقاب، ولا يسأل إلحافا بل لأمر لابد منه، فلا بأس بالسؤال والإعطاء.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة قبيل باب العيدين، زكريا ۳/ ٤۲، كراچی ۲/ ١٦٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲٦/ ۳٤١، الفتاوى الهندية، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ١/ ١٤٨، جديد ١/ ۲۰۹، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة،

قبیل باب صلاة العیدین، زکریا ۲/ ۲۷۵، کوئٹہ ۲/۱۵۷، بزازیة علی هامش الهندیة، کتاب الصلاة، قبیل الرابع والعشرون في العیدین، زکریا ٤/ ٧٦، جدید ١/ ٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍رجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۸۹۹/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۷/۲۳ھ

بعد نماز جمعہ دعا سے قبل چندہ کا ڈبہ پھرانا

سوال [۳۰۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جمعہ کی فرض نماز کے بعد فوراً دعا ترک کرکے ڈبہ پھرانا کیسا ہے؟ بعض آدمی اس پر اعتراض کرتے ہیں، مسجد کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے دعا کو روک کر ایسا کرتے ہیں، تو فائدہ ہوتا ہے، یعنی کہ زیادہ چندہ ہوتا ہے؛ لیکن ایسا کرنا کیسا ہے؟ بہتر کیا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جمعہ کی نماز کے بعد فوراً دعا کو روک کر کسی مذہبی کام کی وجہ سے چندہ کے لئے ڈبہ پھرانا جائز ہے؛ البتہ مسجد میں شور وشغف سے اجتناب کیا جائے۔ (مستفاد: کفایت مفتی ۳/ ۱۲۶)

والمختار أن السائل إن كان لا يمر بين يدي المصلي، ولا يتخطى الرقاب، ولا يسأل إلحافا بل لأمر لابد منه، فلا بأس بالسؤال والإعطاء. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة قبيل باب العيدين، زكريا ٣/ ٤٢، کراچی ٢/ ١٦٤، الفتاوى الهندية، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ١/ ١٤٨، جديد ١/ ٢٠٩، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، قبيل باب صلاة العيدين، زكريا ٢/ ٢٧٥، کوئٹہ ٢/ ١٥٧، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/ ٣٤١)

وفي البزازية: ولا يحل الإعطاء لسؤال المسجد إذا لم يكونوا على تلك الصفة المذكورة. (بزازية على هامش الهندية، كتاب الصلاة، قبيل الرابع والعشرون في العيدين، زكريا ٤/ ٧٦، جديد ١/ ٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰۴۲/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۵/۲۹ھ

۲۲/ باب الوتر

الفصل الأول: في الوتر

ایک رکعت وتر

سوال [۳۰۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض جگہ ائمہ تراویح کی بیس رکعات کے بعد صرف ایک رکعت وتر پڑھاتے ہیں، ایک رکعت وتر کا کیا مسئلہ ہے؟ ائمہ کا اختلاف مع دلائل اور مفتی بہ قول تحریر کریں۔

المستفتی: محمد عبدالسبحان کیلفورنیا، امریکہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: وتر کی نماز جمہور امت کے نزدیک تین رکعتیں ہیں، ان کے درمیان صرف اتنا اختلاف ہے کہ تین رکعت ایک سلام کے ساتھ ہے یا دو سلام کے ساتھ؟ دونوں طرف صحیح حدیثیں موجود ہیں۔ اور ایک رکعت وتر کی نماز غیر مقلدین کے یہاں ہے، جمہور امت نے ایک رکعت وتر کی نماز پڑھنے والوں کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، حنفیہ کے نزدیک تین رکعت وتر پڑھنا واجب ہے، جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے۔

أخبرنا يحيى بن موسىٰ قال: أخبرنا عبدالعزيز بن خالد، قال: حدثنا سعيد بن أبي عروبة عن قتادة، عن عزرة، عن سعيد بن عبدالرحمن بن أبزي، عن أبيه، عن أبي بن كعب –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في الوتر بسبح اسم ربك الأعلى، وفي الركعة الثانية بقل يا أيها الكافرون، وفي الثالثة بقل هو الله أحد، ولا يسلم إلا فى آخرهن، ويقول: يعنى بعد التسليم: سبحان الملك القدوس ثلاثا.

(سنن نسائي، الصلاة، باب كيف الوتر بثلاث؟ النسخة الهندية ١/ ١٩١، دارالسلام، رقم:

۱۷۰۲، السنن الکبری للنسائي، الصلاۃ، کیف الوتر بثلاث، دارالکتب العلمیة، بیروت ۱/ ۱۷۲، رقم: ٦٤٤٦، عمل الیوم واللیلة لابن السني، باب ما یقول إذا فرغ من وترہ، موسسة علوم القرآن ۱/ ٦٤٦، رقم: ۷۰٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/ ۱۱/ ۱۴۳۴ھ

ایک رات میں دو مرتبہ وتر پڑھنا

سوال [۳۰۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان میں ایک شخص نے اگر عشاء کی نماز کے بعد وتر پڑھ لی اس کو یہ معلوم نہیں کہ اس میں تراویح بھی ہوتی ہے، اگر تراویح کے بعد وتر پڑھ لے تو اس کی نماز وتر جو بعد میں امام کے ساتھ ادا کی ہے وہ وتر ہوگی یا نفل؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: افضل حسین قاسمی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں اس شخص کی پہلی نماز وتر جو تراویح نہ ہونے کے خیال سے پڑھی ہے، وہ وتر ہے، پھر تراویح کے بعد جو وتر امام کے ساتھ پڑھی گئی ہے وہ وتر شمار نہیں ہوگی؛ کیوں کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ایک رات میں دو وتر جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح الطحاوی ۲/ ۳۴۱)

ہاں اگر اس نے دوسری وتر کی نماز میں دوسری رکعت کے بعد قعدہ کیا ہے، تو وہ دو رکعت نفل ہوجائیں گی اور ایک رکعت باطل ہوجائے گی۔ (بہشتی زیور ۲/ ۳۹)

عن قیس بن طلق عن أبیه قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: لا وتران في لیلة. (طحاوي، کتاب الصلاۃ، باب التطوع بعد الوتر، النسخة الهندیة

۱/ ۲۰۲، دارالکتب العلمية، بيروت ۱/ ٤٤٥، رقم: ۱۹٦۹، سنن أبي داؤد، أبواب الوتر، باب في نقض الوتر، النسخة الهندية ۱/ ۲۰۳، دارالسلام، رقم: ۱٤۳۹، سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء لا وتران في ليلة، النسخة الهندية ۱/ ۱۰۷، دارالسلام، رقم: ٤۸۰، سنن النسائي، الصلاة، باب نهي النبي عن الوترين في ليلة، النسخة الهندية ۱/ ۱۸۹، دارالسلام، رقم: ۱٦۸۰، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ۱/ ٥٤٧، رقم: ۱۱۰۱، مسند آحمد بن حنبل ٤/ ٢٤، رقم: ۱٦٤۰٥، مسند أبي داؤد الطيالسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ٦۱۳، رقم: ۱۱۹۱، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ۸/ ۳۳۳، رقم: ۸۲٤٧، صحيح ابن حبان، دارالفكر ۳/ ۳۱٥، رقم: ٢٤٤٦)

والصحيح أن وقتها (أي صلوة التراويح) ما بعد العشاء إلى طلوع الفجر قبل الوتر، وبعده حتى لو تبين أن العشاء صلاها بلا طهارة دون التراويح والوتر أعاد التراويح مع العشاء دون الوتر. (عالمگیری، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ۱/ ۱۱٥، جديد ۱/ ۱٧٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۱/۱۴ھ

شافعی امام کی اقتداء میں حنفی کی نماز وتر کا حکم

سوال [۳۰۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بندہ شکیل احمد بنگلوری خادم ''مدرسہ کاشف الہدیٰ'' مدراس، امسال رمضان المبارک میں عمرہ کے لئے گیا ہوا تھا، وہاں وتر کی اقتدا کے سلسلہ میں جب مسئلہ زیر بحث آیا تو بعض مفتیان کرام نے آپ کا حوالہ دیا کہ آپ نے ایک رسالہ میں اس کو مع دلائل پیش کیا ہے کہ وہاں یعنی حرمین شریفین میں اقتدا درست ہے اور اس کی وجوہ ترجیح بھی بیان کی ہیں، بندہ نے

آپ کے حوالہ سے اپنے علاقہ کے بعض تاجر حضرات جوتقریباً ہرسال رمضان المبارک میں عمرہ کے لئے جاتے ہیں، بات پیش کی ،تو ان کا کہنا ہے کہ وہ کتاب اوراس کے دلائل ہمیں بتلائیں، مقصودان کو بتانانہیں ہے؛ بلکہ علاقہ کےعلماء ومفتیان کرام جنہوں نے عدم جواز کی بات کہی ہےکو بتانا ہے۔آں محترم سے گزارش ہے کہ وہ رسالہ بندہ کے نام جلدازجلد روانہ فرمائیں، ان لوگوں نے کئی بار مجھ سے تقاضہ کرلیا ہے، امید ہے کہ حضرت والا بندہ کی اس گزارش کو پوری فرمائیں گے، اس کی جو رقم ہےانشاء اللہ میں اس کوادا کردوں گا، حضرت والا کی دیگر کتابوں کی فہرست بھی ہوتو روانہ فرمائیں،تا کہ مکمل سیٹ حاصل کیا جاسکے۔

المستفتی: شکیل احمد بنگلوری، مدرسہ کاشف الہدیٰ مدراس (چنئی) پونا مالی ہائی روڈ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ۱۴۱۸ھ ماہ اکتوبر میں بمبئی حج ہاؤس میں ایک بڑا سمینار ہوا تھا، پورے ملک کے گوشہ گوشہ سے علماء اور مفتیان کرام نے اس سمینار میں شرکت فرمائی تھی اوراس میں حرمین شریفین میں رمضان المبارک کی وتر کے موضوع پر اکثر علماء نے مقالہ لکھ کرکے پیش کیا تھا، احقر نے بھی ایک مدلل رسالہ پیش کیا تھا،اس میں بلاکسی اختلاف کے تمام علماءاور مفتیان نےاس بات پر اتفاق کرلیا تھا کہ حرمین شریفین کےاماموں کے پیچھے حنفی مسلک کےلوگوں کے لئے وتر کی نماز تین رکعات دوسلاموں کے ساتھ پڑھ لینے کی گنجائش ہے؛اس لئے کہ ان کے پاس بھی حدیث کی روشنی میں دلیل موجود ہے۔اوراس پر علماء نے مختلف دلائل پیش کئے ہیں،ہم نے بھی اپنے مقالہ میں کئی دلائل پیش کئے ہیں،ان میں سے دودلیلیں ہم یہاں بھی پیش کردیتے ہیں:

(۱) ایسی ضرورت میں حضرت ابوبکر رازی حنفیؒ اور علامہ ابن وہبانؒ کے نزدیک جائز ہے۔ ’’معارف السنن‘‘ کی عبارت ملاحظہ ہو:

لو اقتدى حنفي بشافعي في الوتر وسلم ذلك الشافعي الإمام على الشفع الأول على وفق مذهبه، ثم أتم الوتر صح وتر الحنفي عند أبي بكر

الرازي وابن وهبان. (معارف السنن، أبواب الوتر، مسألة اقتداء الحنفي بالشافعي في الوتر، اشرفيه ديوبند ٤/ ١٧٠)

دوسری دلیل یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں ائمہ کے درمیان اختلاف واقع ہوجائے اور زمانہ کے حاکم مختلف اقوال میں سے ایک پر عمل کرنے کا حکم کریں تو ہر مسلک کے لوگوں کے لئے اسی قول پر عمل کرنے کی اجازت ہوجاتی ہے۔ اور اختلاف کو ختم سمجھا جاتا ہے۔ اور حرمین شریفین میں حکومت اور حاکم کے حکم سے تین رکعات دو سلاموں کے ساتھ وتر پڑھی جاتی ہے؛ اس لئے جو حنفی وہاں رہ کر حرمین کے امام کے پیچھے انہیں کی طرح وتر کی نماز پڑھے گا، تو اس کی وتر صحیح ہوجائے گی، اعادہ کی ضرورت نہیں؛ اس لئے کہ حکم حاکم رافع اختلاف ہے۔

ثم أن حكم الحاكم رافع للخلاف فی الأمور المجتهد فيها، فلو وقع التقنين عملا بمذهب المالكية أو الحنابلة جاز من هذا الوجه. (تكملة فتح الملهم، كتاب البيوع، باب بيع البعير واستثناء ركوبه، الأحاديث الواردة في الباب، أشرفيه ديوبند ١/ ٦٣٦)

نیز مدینۃ المنورہ میں مفتی عاشق الٰہی صاحب بلند شہریؒ کے ساتھ براہ راست اس مسئلہ پر مذاکرہ ہوا، انہوں نے بھی جواز پر اتفاق کرلیا تھا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۳/۴ھ

شافعی المسلک کے پیچھے حنفی کا وتر نماز پڑھنا

سوال [۳۰۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حنفی کا شافعی کے پیچھے اقتدا کرنے کا کیا حکم ہے اور جب اقتدا کرلی تو حنفی پر نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے یا نہیں؟ یعنی ایک ہی سلام کے ساتھ وتر کی تین رکعت والی نماز میں شافعی المسلک کے پیچھے اقتدا کرلی تو حنفی پر وتر کی نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے یا نہیں؟ دو

سلام کے ساتھ وتر کی تین رکعت والی نماز میں حنفی المسلک شافعی المسلک کے پیچھے اقتدا کرلے تو حنفی پر کیا حکم ہوگا؟

المستفتی: مولانا سید قیصر علی شاہ، مہتمم مدرسہ رونق الاسلام، بن الویں، برما

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حضرات حنفیہ کے نزدیک وتر کی تینوں رکعتیں ایک سلام کے ساتھ پڑھنا واجب ہے، دو رکعت پر سلام جائز نہیں ہے؛ اس لئے عام حالات میں بغیر کسی سخت مجبوری کے حنفیہ کا راجح اور مفتی بہ قول یہی ہے کہ دو سلاموں کے ساتھ وتر پڑھنے والے کے پیچھے حنفی شخص کی نماز وتر صحیح نہیں ہوتی؛ البتہ مسلک حنفی کے مشہور فقیہ امام ابوبکر الجصاص الرازی المتوفی ۳۷۰ھ اور علامہ ابن وہبان کے نزدیک حنفی شخص کی نماز اس کے پیچھے صحیح ہوجائے گی؛ لہٰذا حرمین شریفین میں حنفی لوگوں کے لئے مسجد حرام کے امام اور مسجد نبوی کے امام کے پیچھے انہیں کی طرح دو سلاموں کے ساتھ وتر کی نماز پڑھنا جائز اور درست ہوجائے گا اور اس کی تین دلیلیں ہمارے سامنے ہیں:

(۱) امام ابوبکر رازی اور علامہ ابن وہبان یہ دونوں مسلک حنفی کے مشہور فقیہ ہیں، ان کے قول پر عمل کرنا حرمین شریفین میں جائز ہوگا؛ اس لئے کہ اتنے بڑے مجمع میں حنفی شخص کے لئے الگ سے وتر پڑھنا مشکل ہے اور شریک نہ ہوکر بیٹھے رہنا یہ بڑے مجمع کی مخالفت ہے، جو درست نہیں اور اس مجمع کے بیچ میں وتر کی جماعت ہونے کے درمیان تنہا الگ سے اپنی وتر پڑھنا یہ اور زیادہ برا ہے، ان مجبوریوں کی وجہ سے وہاں اس کی گنجائش ہے۔

فمذهب الحنفية أنه لا وتر عندهم إلا بثلاث ركعات بتشهدين وتسليم، نعم لو اقتدى حنفي بشافعي في الوتر وسلم ذلك الشافعي الإمام على الشفع الأول على وفق مذهبه، ثم أتم الوتر صح وتر الحنفي عند أبي بكر الرازي وابن وهبان. (معارف السنن، أبواب الوتر، مسألة اقتداء الحنفي بالشافعي في الوتر، اشرفيه ديوبند ٤/ ١٧٠)

وفي البحر: لا يجوز اقتداء الحنفي بمن يسلم على رأس الركعتين

في الوتر، وجوزه أبوبكر الرازي، ويصلي معه بقية الوتر؛ لأن إمامه لم يخرج بسلامه عنده وهو مجتهد فيه. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ٢/ ٦٨، كوئٹه ٢/ ٣٩)

(۲) حکم حاکم رافع اختلاف ہوا کرتا ہے اور وہاں پر حاکم وقت کی طرف سے دو سلاموں کے ساتھ وتر پڑھنے کا حکم ہے، اس کے خلاف کرنے کی اجازت نہیں؛ اس لئے بھی گنجائش ہے۔

إن حكم الحاكم رافع للخلاف في الأمور المجتهد فيها، فكما أن النزاع يرتفع بالتعامل السابق، فإنه يرتفع أيضا بتقنين من قبل الحكومة. (تكملة فتح الملهم، كتاب البيوع، باب بيع البعير واستثناء ركوبه، الأحاديث الواردة في الباب، أشرفيه ديوبند ١/ ٦٣٦)

(۳) حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی یہی رائے نقل فرمائی ہے کہ ان کے پیچھے اقتدا کرنا جائز ہے۔

ولا عبرة بحال المقتدي، وإليه ذهب الجصاص، وهو الذي اختاره لتوارث السلف، واقتداء أحدهم بالآخر بلا نكير مع كونه مختلفين في الفروع، وكان مولانا شيخ الهند محمود الحسن أيضا يذهب إلى مذهب الجصاص. (فيض الباري، كتاب الطهارة، باب مسح اليد، كوئٹه ١/ ٣٥٢)

لہٰذا ان تمام دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حرمین شریفین میں بلا تکلف وہاں کے ائمہ کے پیچھے انہیں کی طرح وتر کی نماز پڑھنا جائز اور درست ہے۔ نیز ۱۴۱۸ھ ماہ اکتوبر کو ممبئی حج ہاؤس میں ہندوستان کے تقریباً ہر صوبہ کے علماء ومفتیان کرام کا ایک بڑا فقہی سمینار ہوا، اس میں بلا کسی اختلاف کے تمام علماء اور مفتیان نے حرمین شریفین میں جواز پر اتفاق کرلیا ہے؛ لیکن حرمین شریفین کے علاوہ دنیا کے کسی اور مقام میں ایسی مجبوری نہیں ہوتی؛ اس لئے دیگر مقامات میں راجح قول کے مطابق اقتدا درست نہ ہوگی۔ حنفی لوگوں کو اپنے وتر الگ سے پڑھنے چاہئے۔

سوال نامہ میں تہجد کی نماز میں اقتدا کی بات پوچھی گئی ہے، حنفیہ کے نزدیک تہجد کی نماز

جماعت کے ساتھ مکروہ تحریمی ہے؛ اس لئے تہجد میں اقتداء کرنا مشروع نہیں ہوگا؛ لیکن اگر مسجد نبوی میں معتکف ہے اور وہاں آخری عشرہ میں تہجد کی نماز باجماعت ہوتی ہے اور وہاں حکومت کی طرف سے یہ آڈر ہے کہ تہجد کے وقت کوئی معتکف نہ بیٹھا رہ سکتا ہے اور نہ لیٹا رہ سکتا ہے، ان کے ساتھ شریک ہونے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں؛ اسی لئے مسجد نبوی میں اقتداء کی گنجائش ہے۔ اور مسجد حرام میں تہجد کے درمیان معتکف کے لئے طواف کرنے کی گنجائش ہوتی ہے؛ اس لئے بجائے تہجد میں اقتداء کرنے کے حنفی لوگوں کے لئے طواف کرنا زیادہ بہتر ہوگا؛ لیکن اگر طواف کا موقع نہیں ہے، تو پھر مسجد حرام میں بھی تہجد میں اقتداء کرنے کی گنجائش ہے اور اس کی دلیلیں وہی ہیں جو جواز وتر پر لکھی گئی ہیں، مگر دنیا کے دیگر مقامات میں ان کے پیچھے تہجد کی جماعت میں اقتداء کرنا مکروہ ہوگا۔

ولا يصلي التطوع بجماعة خارج رمضان، أي يكره ذلك على سبيل التداعي، بأن يقتدى أربعة بواحد كما في الدر، ولا خلاف في صحة الاقتداء إذ لا مانع نهر. (درمختار، كتاب الصلاة، قبيل باب إدراك الفريضة، زكريا ٢/ ٥٠٠، كراچی ٢/ ٤٩، عالمگيری، كتاب الصلاة، باب الإمامة، الفصل الأول في الجماعة، زكريا قديم ١/ ٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۸۰۵)

فتنہ کے اندیشہ کے وقت دو سلام سے وتر پڑھنا

سوال [۳۰۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں بلکہ پورے خلیج میں رمضان میں وتر دو سلام سے پڑھے جاتے ہیں، احناف وتر میں الگ ہوجاتے ہیں۔ (الف): ایسی صورت میں امام صاحب سخت ناراضی کا

اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تراویح اور دیگر نمازیں ہوجاتی ہیں وتر ادانہیں ہوتی، وتر میں الگ کیوں ہوجاتے ہو؟ (ب): حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر دوسلام سے ثابت ہے، تو احناف کی وتر کیوں نہیں ہوگی؟ ایک حنفی عالم کا کہنا ہے کہ جو اس قسم کا فتویٰ دیتے ہیں کہ وتر تنہا ادا کرو، اگر وہ یہاں ہوتے اور ایک دوسرے کا آپس میں اختلاط ہوتا تو ایسا فتویٰ نہیں جاری کرتے۔ (د) ایسا کرنے سے آپس میں نزاع پیدا ہوگا، فرقہ پرستی کو ہوا ملے گی اور ہر آدمی اپنے ہی امام کے پیچھے نماز ادا کرے گا۔

المستفتی: شفیع احمد الاعظمی، بحرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حنفیہ کا قول راجح اور مفتی بہ یہی ہے کہ دوسلام کے ساتھ وتر پڑھنے والے کے پیچھے وتر نہ پڑھی جائے؛ اس لئے کہ سلام خروج عن الصلاۃ کے لئے ہوتا ہے؛ لہٰذا جہاں تک ممکن ہو حنفی امام ہی کے پیچھے وتر کی نماز پڑھنی چاہئے؛ لیکن حنفیہ کا ایک قول مرجوح یہ بھی ہے کہ دوسلام کے ساتھ وتر پڑھنے والوں کے پیچھے مجبوری کے تحت ان ہی کی طرح وتر پڑھ لیے جائیں، تو وہ بھی اس شرط کے ساتھ صحیح ہوجائیں گے کہ وتر پڑھانے والے کا عقیدہ یہ ہو کہ درمیان میں جو سلام پھیرا جارہا ہے اس سلام سے وہ نماز سے باہر نہیں ہوتا ہے، نیز نمازیوں کے درمیان اختلاف اور فتنے کا اندیشہ ہو تو فتنے سے بچنے کے لئے حنفی کے لئے قول ضعیف پر عمل کرکے دوسلام کے ساتھ وتر پڑھنے والوں کے پیچھے وتر پڑھنے کی گنجائش ہے، نیز جہاں یہ واقعہ پیش آرہا ہے، وہاں کے حاکم کی طرف سے دوسلام کے ساتھ وتر پڑھنے کا حکم ہے، تو ایسی صورت میں بھی حنفی کے لئے دوسلام کے ساتھ وتر پڑھنے والے کے پیچھے وتر کی نماز پڑھنا جائز ہے؛ اس لئے کہ حاکم جب ائمہ کے اقوال میں سے کسی ایک کے قول پر حکم دے تو سب کو اس پر عمل کرنا ضروری ہوجاتا ہے، جیسا کہ حرمین شریفین میں حکم حاکم کے مطابق دوسلام کے ساتھ وتر کی نماز پڑھی جاتی ہے۔

قول أبي بكر الرازي: أن اقتداء الحنفي بمن يسلم على رأس

الركعتين في الوتر يجوز، ويصلي معه بقيته؛ لأن إمامه لم يخرج بسلامه عنده؛ لأنه مجتهد فيه. (فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صلاة الوتر، زكريا ١/ ٤٥٣، كوئٹه ١/ ٣٨١، دارالفكر بيروت، قديم ١/ ٤٣٧)

قرر الفقهاء أن حكم الحاكم رافع للخلاف في الأمور المجتهد فيها، فمتى صادف أمره فصلا مجتهدا فيه نفذ، ووجب اتباعه، ولو كان الرجل لا يرى رأيه في تلك المسئلة، ولذلك لما أمر هارون الرشيد أبا يوسف ومحمدا أن يكبرا فى العيدين بتكبير جده، امتثلا بأمره مع أنهما لا يريان التكبيرات الزوائد على الست. (تكملة فتح الملهم، كتاب الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء، اشرفيه ديوبند ٣/ ٣٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/صفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۵۱۳/۳۶)

وتر کی نماز ایک سلام سے پڑھنے سے متعلق احادیث

سوال [۳۰۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وتر کی نماز تین رکعت ایک سلام سے پڑھنے کے بارے میں روایات درکار ہیں، کم از کم تین روایات ضرور نقل فرمادیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد سلیم قاسمی، مدرسہ حبیبیہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وتر میں دو رکعت پر سلام پھیرنے کی روایات بھی کتب حدیث میں موجود ہیں اور دو رکعت پر سلام نہ پھیر کر آخر میں تین رکعت پر سلام پھیرنے کی روایات بھی ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے تین رکعت پر سلام پھیرنے والی روایات کو زیادہ راجح سمجھا اور تین رکعت پر سلام پھیرنے سے متعلق احادیث شریفہ کا ایک بڑا ذخیرہ

موجود ہے، ان میں سے یہ چند روایات پیش کرتے ہیں، جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۱) **حدثنا أبوبكر بن إسحاق، أنبأ الحسن بن علي بن زياد، ثنا إبراهيم بن موسىٰ، ثنا عيسى بن يونس، ثنا سعيد بن أبي عروبة، عن قتادة، عن زرارة بن أوفى عن سعد بن هشام، عن عائشة –رضي الله عنها– قالت: كان رسول الله ﷺ لا يسلم في الركعتين الأولين من الوتر، هذا حديث صحيح على شرط الشيخين، ولم يخرجاه، وله شواهد.** (المستدرك للحاكم، كتاب الوتر، قديم ١/ ٤٤٦-٤٤٧، مكتبه نزار مصطفى الباز ٢/ ٤٤١، رقم: ١١٣٩، مصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، باب من كان يوتر بثلاث، أو أكثر، قديم ٢/ ٢٩٥، مؤسسة علوم القرآن جديد ٤/ ٤٩٤، رقم: ٦٩١٢، سنن النسائي، الصلاة، باب كيف الوتر بثلاث، النسخة الهندية ١/ ١٩١، دارالسلام، رقم: ١٦٩٩، السنن الكبرى للنسائي، الصلاة، كيف الوتر بثلاث؟ دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٤٤٠، رقم: ١٤٠٠، المعجم الصغير للطبراني ٢/ ١٨٠، رقم: ٩٩٠، سنن الدارقطني، كتاب الوتر، دارالكتب العلمية، بيروت ٢/ ٢٣، رقم: ١٦٤٩، مؤطا محمد ١/ ١٥٠-١٥١)

(۲) **أخبرنا يحيى بن موسىٰ قال: أخبرنا عبدالعزيز بن خالد، قال: حدثنا سعيد بن أبي عروبة عن قتادة، عن عزرة، عن سعيد بن عبدالرحمن بن أبزي، عن أبيه، عن أبي بن كعب –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في الوتر بسبح اسم ربك الأعلى، وفي الركعة الثانية بقل يا أيها الكافرون، وفي الثالثة بقل هو الله أحد، ولا يسلم إلا في آخرهن.** (نسائي، الصلاة، باب كيف الوتر بثلاث؟ النسخة الهندية ١/ ١٩١، دارالسلام، رقم: ١٧٠٢، السنن الكبرى للنسائي، الصلاة، كيف الوتر بثلاث، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ١٧٢، رقم: ٤٤٦، عمل اليوم والليلة لابن السني، باب ما يقول إذا فرغ من

وتره، مؤسسة علوم القرآن ۱/ ٦٤٦، رقم: ٧٠٦)

(۳) **حدثنا ابن أبي داؤد، قال: حدثنا يحيى بن سليمان الجعفي، قال: أخبرنا ابن وهب، قال: أخبرني عمرو بن أبي هلال عن ابن السباق عن المسور بن مخرمة، قال: دفنا أبا بكر ليلا، فقال عمر: إني لم أوتر، فقام وصففنا وراءه، فصلى بنا ثلاث ركعات لم يسلم إلا في آخرهن.** (طحاوي، كتاب الصلاة، باب الوتر ركعة من آخر الليل ۱/ ۱۷۳، مطبوعه مكتبه رحيميه ديوبند، دارالكتب العلمية، بيروت ۱/ ۳۸۲، رقم: ۱۷۰۵)

(٤) **حدثنا ابن مرزوق، قال: حدثنا عفان، قال: حدثنا حماد بن سلمة، قال: حدثنا ثابت، قال: صلى بي أنس الوتر أنا عن يمينه، وأم ولده خلفه ثلاث ركعات لم يسلم إلا في آخرهن.** (طحاوي، كتاب الصلاة، باب الوتر ركعة من آخر الليل، مطوبعه رحيميه ديوبند ۱/ ۱۷۳، دارالكتب العلمية، بيروت ۱/ ۳۸۲، رقم: ۱۷۰۵، مصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من كان يوتر بثلاث أو أكثر، قديم ۲/ ۲۹٤، مؤسسة علوم القرآن ٤/ ٤۹۳، رقم: ٦۹۱۰)

(٥) **حدثنا حفص بن عمرو عن الحسن، قال: أجمع المسلمون على أن الوتر ثلاث لا يسلم إلا في آخرهن.** (مصنف ابن ابي شيبة، كتاب الصلاة، من كان يوتر بثلاث أو أكثر، قديم ۲/ ۲۹٤، مؤسسة علوم القرآن، جديد ٤/ ٤۹۲، رقم: ٦۹۰٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۳۱)

تین رکعت وتر ایک سلام کے ساتھ

سوال [۳۰۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس طرح سے ہم احناف نماز وتر ادا کرتے ہیں یہ کونسی حدیث سے ثابت ہے؟

المستفتی: محمد الیاس فیضی، مٹیا برج کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: تین رکعت وتر ایک سلام کے ساتھ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ نسائی شریف میں موجود ہے، ملاحظہ فرمائے:

عن أبي ابن كعب –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في الوتر بسبح اسم ربک الأعلى، وفي الركعة الثانية بقل يا أيها الكافرون، وفي الثالثة بقل هو الله أحد، ولا يسلم إلا فى آخرهن، ويقول: يعنى بعد التسليم: سبحان الملک القدوس ثلاثا. (سنن نسائي، الصلاة، باب كيف الوتر بثلاث؟ النسخة الهندية ۱/ ۱۹۱، دارالسلام، رقم: ۱۷۰۲، السنن الكبرى للنسائي، الصلاة، كيف الوتر بثلاث، دارالكتب العلمية، بيروت ۱/ ۱۷۲، رقم: ٤٤٦، عمل اليوم والليلة لابن السني، باب ما يقول إذا فرغ من وتره، موسسة علوم القرآن ۱/ ٦٤٦، رقم: ۷۰٦)

اور دعا قنوت پڑھنے سے پہلے رفع یدین کی روایت امام بخاری علیہ الرحمہ کی ''جزو رفع الیدین'' اور امام طبرانی علیہ الرحمہ کی ''معجم کبیر'' اور ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں موجود ہے۔ اور اس پر بھی پورا ایک رسالہ ہے، جو ''انجمن تحفظ شریعت'' سے شائع ہوا ہے، یہاں صرف ایک روایت نقل کر دی جاتی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

عن عبدالله أنه كان يرفع يديه إذا قنت في الوتر. (مصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، باب في رفع اليدين في قنوت الوتر، موسسة علوم القرآن ٤/ ٥٣٠، برقم: ۷۰۲۸، المعجم الكبير، داراحياء التراث العربي ۹/ ۲۸۳، رقم: ۹٤۲٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ شعبان ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۷۸۲/۳۹)

دعائے قنوت کی تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھانا

سوال [۳۰۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی شخص وتر کی نماز پڑھ رہا تھا اور اس نے کان تک ہاتھ نہیں اٹھائے اور دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا اور بعد میں سجدہ سہو کرلیا، اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟

المستفتی: محمد عقیل، ساکن میرنچک پوسٹ چکدریا، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دعائے قنوت کے لئے تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھانا سنت ہے، واجب نہیں ہے، اس کے ترک سے نماز میں خرابی نہیں آتی ہے؛ البتہ خلاف سنت ہوتا ہے۔

عن عبدالرحمن بن الأسود، عن أبيه قال: كان عبدالله يقرأ في آخر ركعة من الوتر: قل هو الله أحد، ثم يرفع يديه، فيقنت قبل الركعة. (المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ۹/ ۲۸۳، رقم: ۹۴۲۵)

فلا يسن إلا عند افتتاح كل صلاة، وعند تكبيرة القنوت في الوتر. (مراقی الفلاح، كتاب الصلاة، فصل في كيفية تركيب أفعال الصلاة، قديم ۱۵۵، جديد دارالكتاب ديوبند ۲۸۴)

فلا يسن رفع اليدين عندها كتكبيرة السجود، وتأثيره أن المقصود من رفع اليدين إعلام الأصم الذي خلفه، وإنما يحتاج إلى الإعلام بالرفع في التكبيرات التي يؤتى بها في حالة الاستواء كتكبيرات الزوائد في العيدين، وتكبير القنوت. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في سنن الصلاة، حكم رفع اليدين، قديم ۱/ ۲۰۷، جديد زكريا ۱/ ۴۸۵)

اور اگر دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا ہے اور بعد میں سجدہ سہو کرلیا ہے، تو نماز بلا کراہت صحیح اور درست ہوگئی۔

وأما القنوت فتركه سهوا، يوجب سجود السهو؛ لأنه واجب. (بدائع

الصنائع، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، جديد زكريا ١/ ٤٠٦، قديم ١/ ١٦٧)

وأما السهو في القنوت، إن ترك القنوت ساهيا، ثم تذكر بعد ما سجد، لا يعود إلى القيام في هذه الصورة، ولا يقنت بل يمضي في صلاته، ويسجد للسهو في آخره. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر في سجود السهو ٢/ ٣٩٨، رقم: ٢٧٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۳۱۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۴/۲ھ

وتر کے قعدۂ اولیٰ میں بیٹھنا

سوال [۲۰۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وتر کی نماز تین رکعت ہے، غیر مقلدین حضرات کہتے ہیں کہ بیچ کے قاعدہ میں حضور اکرم ﷺ نہیں بیٹھتے تھے۔ اور ہم لوگ بیٹھتے ہیں، اس سے ہمیں مطلع کرو۔

المستفتی: ملاجی اللہ دئے، موضع شہباز پور، تھانہ پاکبڑہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وتر کی تین رکعت اور دو رکعت پر قعدہ کرنا حدیث سے ثابت ہے کہ جس طرح مغرب کی نماز تین رکعت اور دو رکعت پر قعدہ ہے، اسی طرح وتر میں بھی مغرب کی طرح بیچ میں قعدہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وتر کی نماز بالکل مغرب کی نماز کی طرح ہے۔

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– قال: الوتر ثلاث، كوتر النهار صلاة المغرب. (طحاوی شريف، كتاب الصلاة، باب الوتر ركعة من آخر الليل، مكتبه رحيميه ديوبند ١/ ١٧٣، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٣٨٢، رقم: ١٧٠٢،

المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من كان يوتر بثلاث أو أكثر، مؤسسة علوم القرآن، جديد ٤/ ٤٩٠، رقم: ٦٨٨٩، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ٩/ ٢٨٢، رقم: ٧٨٠، السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الصلاة، باب من أوتر بثلاث موصولات بتشهدين وتسليم، دارالفكر جديد ٤/ ١٢٦، رقم: ٤٩١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۴؍رمضان ۱۴۱۱ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۳۸۱)

وتر میں دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے

سوال [۳۰۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید عمر وبکر کو دعائے قنوت یاد نہیں ہے، وہ اس کی جگہ کوئی اور دعا وغیرہ پڑھ لیتے ہیں اور اس پر مداومت کرتے ہیں، دعائے قنوت یاد کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، تو کیا ان کی نماز ہو جاتی ہے؟

المستفتی: اسرار احمد محلّہ ضابطہ گنج، نجیب آباد (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے۔ **ويجب قراءة قنوت الوتر عند أبي حنيفة.** (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلاة، فصل في بيان واجبات الصلوات، قديم، ص: ١٣٧، جديد دارالكتاب ديوبند ٢٥٢) **اور دعائے قنوت متعین طور پر اس دعا کا نام نہیں ہے جو مشہور ہے؛ بلکہ وتر کی تیسری رکعت میں جو بھی دعا پڑھی جائے اس کو دعائے قنوت کہا جائے گا؛ البتہ ''اللهم إنا نستعينك'' الخ پڑھنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے۔** (مستفاد: احسن الفتاوی، زکریا ۳/ ۴۴۹)

اس لئے زید عمر بکر کی نماز ہو جائے گی؛ البتہ مشہور ومنقول دعائے قنوت کا یاد کرلینا بہتر ہے۔

وليس في القنوت دعاء مؤقت، كذا في التبيين، والأولىٰ أن يقرأ:

اللهم إنا نستعينک. (هندية، کتاب الصلاة، الباب الثامن في الوتر، زكريا قديم ١/ ١١١، جديد ١/ ١٧٠)

وليس في القنوت دعاء مؤقت؛ لأنه يذهب برقة القلب، هكذا ذكره محمد رحمه الله قال في المحيط والذخيرة: يعني غير قوله: ''اللهم إنا نستعينک إلى آخره اللهم اهدنا إلى آخره. (تبيين الحقائق، کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل إمداديه ملتان ١/ ١٧٠، زكريا ١/ ٤٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۷۵۳/۲۵)

جسے دعائے قنوت یاد نہ ہو تو وہ کیا پڑھے؟

سوال [۳۰۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر نمازی وتروں میں دعائے قنوت نہ پڑھ سکے یعنی اس کو یاد نہ ہو، تو اس کو وتروں میں دعائے قنوت کی جگہ کیا پڑھنا چاہئے؟ جو صحیح طریقہ ہو وہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: حافظ محمد عمر سلیم پور گڑھی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کسی کو دعائے قنوت یاد نہیں ہے تو وہ دعائے قنوت کی جگہ ''**ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار**'' پڑھ لے۔ اور یہ بھی یاد نہیں ہے، تو تین مرتبہ ''**اللهم اغفر لی**'' پڑھ لے۔ اور اگر یہ بھی یاد نہیں ہے تو ''**یا رب**'' تین مرتبہ پڑھ لے۔

ومن لم يحسن القنوت يقول: ''اللهم اغفرلي'' ثلاث مرات، أو ''ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار''، أو ''يارب، يا

رب، یا رب". (نور الإیضاح، کتاب الصلاة، باب الوتر، إمدادیه دیوبند، ص: ۹٤)

(ومن لم یحسن) التقیید به لیس بشرط، بل یجوز لمن یعرف الدعاء المعروف أن یقتصر علی واحد مما ذکر، أو یقول: ربنا آتنا في الدنیا حسنة، قال صاحب البحر: الظاهر أن الاختلاف في الأفضلیة لا في الجواز. (حاشیة الطحطاوي علی المراقي، قدیم ۲۱۰، جدید دارالکتاب دیوبند ۳۸٤)

ومن لا یحسن دعاء القنوت قال المرغیناني: یقول علی وجه الاستحباب: اللهم اغفرلي، ثلاثا، وفي الواقعات، والذخیرة: اللهم اغفرلنا ثلاثا، أو أکثر، وقیل: یقول: یا ربي ثلاثا، ذکره في الذخیرة، وقیل: یقول: "ربنا آتنا في الدنیا حسنة وفي الآخرة حسنة" وهو اختیار بعض المشایخ.

(البنایة، کتاب الصلاة، باب الوتر، اشرفیه ۲/ ٥٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/ ۴/ ۱۴۱۵ھ

طلوع صبح صادق کے بعد نماز وتر کی قضاء

سوال [۳۰۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ طلوع صبح صادق کے بعد وتر کی قضاء کرنا کیسا ہے؟ وتر کی قضاء جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: طلوع صبح صادق کے بعد وتر کی قضاء کرنا جائز اور درست ہے؛ کیوں کہ ان اوقات میں واجب نمازوں کی قضاء درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۳۵۸، جدید، انوار مناسک: ۳۸۸)

والواجبات علی قسمین: قسم وجب بإیجاب العبد کالمنذورة،

وقسم وجب بإيجاب الله تعالىٰ يجوز أداؤه في هذين الوقتين، وما وجب بإيجاب العبد لا يجوز. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الأول في المواقيت، زكريا ٢/ ١٥، رقم: ١٥٢٢)

ويكره أن يتنفل بعد طلوع الفجر بأكثر من ركعتي الفجر؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم لم يزد عليهما فقد منع عن تطوع آخر ليبقى جميع الوقت كالمشغول بهما لكن صلاة فرض آخر فوق ركعتي الفجر، فجاز أن يصرف الوقت إليه. (الجوهرة النيرة، كتاب الصلاة، قبيل باب النوافل إمداديه ملتان، ١/ دارالكتاب ديوبند ١/ ٨٤)

إن الوتر أقوى من سائر السنن، حتى أنها تقضي إذا انفردت بالفوات ألا ترى! أن لا وتر بعد الصبح، المراد النهي عن تأخيرها لا في قضائها، وكذلك تقضى بعد صلاة الفجر قبل طلوع الشمس. (المبسوط للسرخسي، كتاب الصلاة، باب مواقيت الصلاة، دارالكتب العلمية، بيروت، ١/ ١٥٥)

الوتر يقضى بعد طلوع الفجر بالإجماع بخلاف سائر السنن. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، زكريا ١/ ٤٣٧، كراچی ١/ ٢٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۱۰)

وتروں کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا

سوال [۳۰۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: وتروں کے بعد دو نفل پڑھنے کا کیا حکم ہے، جب کہ ایسی حدیثیں ملتی ہیں کہ تمہاری آخری نماز وتر ہو یا اپنی نماز وتروں پر ختم کرو، اکثر لوگ وتروں سے پہلے نفل چھوڑ دیتے ہیں اور وتروں

کے بعد نفل پابندی سے پڑھتے ہیں، اکثر بزرگوں کا معمول رہا ہے کہ انہوں نے پابندی سے تہجد پڑھی ہے، تو وہ وتر بھی چھوڑ دیتے ہیں اور تہجد کے بعد وتر پڑھتے ہیں۔

المستفتی: ماسٹر عبدالحق صدیقی لائن ۱، ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وتر کے بعد دو رکعت نفل پڑھنے کا ثبوت بھی حدیث سے ثابت ہے۔

عن أم سلمة –رضی الله عنها– أن النبي صلی الله علیه وسلم کان یصلي بعد الوتر رکعتین خفیفتین، وهو جالس. (ابن ماجة شریف، الصلاة، باب ما جاء في الرکعتین بعد الوتر جالسا، النسخة الهندیة/ ۸۵، دار السلام، رقم: ۱۱۹۵، سنن الدار قطني، کتاب الوتر، في الرکعتین بعد الوتر، دارالکتب العلمیة، بیروت ۲/ ۲۶، رقم: ۱۶۶۶، مسند أحمد بن حنبل ۶/ ۲۹۸–۲۹۹، رقم: ۲۷۰۸۸)

جن روایات میں وتر کو آخری نماز قرار دینے کو کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ رات میں تہجد کی نمازوں کے بعد وتر کی نماز پڑھا کرو اور وتر کے بعد دو رکعت تہجد سے الگ نماز ہے؛ اس لئے تعارض نہیں ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۰۷)

وتر کے بعد کی دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے یا کھڑے ہوکر؟

سوال [۳۰۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بوڑھے عالم کا کہنا ہے کہ رمضان شریف میں وتر کے بعد کی دو نفلیں کھڑے ہوکر پڑھنے سے بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے؛ لیکن جدید فارغ شدہ عالم کا کہنا ہے کہ ان نفلوں کا

کھڑے ہوکر پڑھنا بیٹھ کر پڑھنے سے افضل ہے اور ثواب زیادہ ملے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں عالموں میں سے کس کا قول صحیح اور کس کا غلط ہے؟

المستفتی: محمد ہارون متعلم شعبہ افتاء، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وتر کے بعد کی دو نفلیں بیٹھ کر پڑھنے کے مقابلہ میں کھڑے ہوکر پڑھنے میں زیادہ ثواب اور فضیلت ہے، چاہے رمضان المبارک میں ہو یا غیر رمضان میں۔ اور ان دونوں نفلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستثنیٰ ہیں؛ لہٰذا جدید فارغ شدہ عالم کا قول ہی صحیح ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی، زکریا ١/ ٤٥٩، ٤٦١، کفایت المفتی، قدیم ٣/ ٢٦٦، ٣/ ٢٦٧، جدید زکریا ٣/ ٣١٥، زکریا مطول ٤/ ٥٧٣، فتاوی دارالعلوم، زکریا ٤/ ٢١٨، فتاوی محمودیہ قدیم ٢/ ١٦٨، جدید ڈابھیل ٧/ ٢٢٩، فتاوی رشدیہ مبوب، ص: ٣٠١)

عن ابن عمر –رضي الله عنه– حدثت أنه صلى الله عليه وسلم قال: صلاة الرجل قاعدا نصف صلاة القائم، فأتيته فوجدته يصلي جالسا، قال: حدثت يا رسول الله إنک قلت صلاة الرجل قاعدا على النصف من صلاة القائم، وأنت تصل قاعدا، قال: أجل، ولكن لست كأحدكم. (حاشيه چلپی على تبيين الحقائق، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، إمداديه ملتان ١/ ١٧٥، جديد زكريا ١/ ٤٣٧، ٤٣٨)

عن عبدالله بن عمرو قال: حدثت أن رسول الله ﷺ قال: صلاة الرجل قاعدا نصف الصلاة، قال: فأتيته وهو يصلي جالسا، فوضعت يدي على رأسه، فقال: مالک؟ يا عبدالله بن عمرو! قلت: حدثت يا رسول الله أنک قلت: صلاة الرجل قاعدا على نصف الصلاة، وأنت تصلي قاعدا، قال: أجل، ولكني لست كأحدكم. (صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب جواز النافلة وقائما وقاعدا، النسخة الهندية ١/ ٢٥٢، بيت الأفكار، رقم: ٧٣٥، مسند البزار،

مکتبہ العلوم والحکم ٦/ ٣٥٢، رقم: ٢٣٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۵۲۳/۲۵)

کیا فرائض اور وتر کے درمیان ترتیب واجب ہے؟

سوال [۳۰۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صاحب ترتیب کے اوپر جس طرح فرائض کے درمیان ترتیب واجب ہوتی ہے، اسی طرح فرض اور وتر کے درمیان بھی ترتیب واجب ہوتی ہے یا نہیں؟ مثلاً کسی صاحب ترتیب نے عشاء کی نماز پڑھ لی اس کے بعد دیگر مصروفیات میں مشغول ہوگیا اور وتر پڑھنا بھول گیا اور اسی حالت میں فجر کی نماز بھی پڑھ لی اور پھر ظہر اور عصر کی نماز بھی پڑھ لی، مغرب کی نماز کے درمیان یاد آیا کہ وتر کی نماز نہیں پڑھی ہے، تو ایسی صورت میں وتر فوت ہونے کے بعد جو نمازیں پڑھی گئی ہیں وہ صحیح ہوگئی یا نہیں؟ نیز مغرب کی نماز میں جو یاد آیا ہے، اس نماز کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبید اللہ بھاگلپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: صاحب ترتیب کے لئے وتر اور فرائض کے درمیان ترتیب قائم رکھنا واجب ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے، حضرات صاحبینؒ کے نزدیک وتر کی نماز واجب نہیں ہے، سنت ہے اور سنتیں فرض کے تابع ہوتی ہیں اور وتر کی نماز حضرات صاحبینؒ کے نزدیک عشاء کی سنن بعدیہ کی طرح عشاء کے تابع ہے؛ لہٰذا اگر عشاء کی فرض نماز پڑھ لی گئی ہے اور سنتیں رہ گئی ہیں، اسی حالت میں فجر کا وقت ہوکر دن طلوع ہوگیا ہے تو اب سنتوں کی قضاء لازم نہیں؛ اس لئے کہ وقت نکل جانے کے بعد سنتوں کی قضاء

نہیں ہوا کرتی ہے؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں حضرات صاحبینؒ کے قول کے مطابق صاحب ترتیب کی ترتیب باقی رہے گی، وتر کی نماز فوت ہوجانے کی وجہ سے صاحب ترتیب کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ صاحبینؒ کے قول کی تائید کتب فقہ کی ذیل کی عبارات سے ہوتی ہے، ملاحظہ فرمائے:

والمسألة الثانية: وهو أن من صلى الفجر وهو ذاكر أنه لم يوتر ...... عندهما يجوز؛ لأن مراعاة الترتيب بين السنة والمكتوبة غير واجبة. (بدائع الصنائع، زكريا ١/ ٦١٠)

والوتر كالفرض عملا، فذكره مفسد عند الإمام خلافا لهما، ومبنى الخلاف على أن الوتر واجب عنده، وسنة عندهما، ولا ترتيب بين الفرائض والسنن. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب الوتر، مكتبه فقه الأمت ١/ ٢١٦، مثله في الهداية، أشرفي بكڈپو ديوبند ١/ ١٥٦)

اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وتر ایک مستقل واجب نماز ہے، سنت کی طرح عشاء کے تابع نہیں ہے؛ اس لئے جس طرح فرض نمازوں کے درمیان صاحب ترتیب پر ترتیب کا باقی رکھنا واجب ہوا کرتا ہے، اسی طرح فرض اور وتر کے درمیان میں بھی ترتیب کا باقی رکھنا واجب ہے اور وقت نکل جانے کے بعد بھی وتر کی نماز قضاء کرنا ذمہ میں واجب رہتا ہے؛ لہٰذا مذکورہ مسئلہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق مذکورہ صاحب ترتیب شخص کی نمازیں جو فجر سے لے کر مغرب تک پڑھی گئی ہیں، فساد موقوف کے طور پر موقوف رہیں گی اور اس کے اوپر لازم ہے کہ مغرب کی نماز پوری کرنے کے بعد پہلے وتر کی نماز پڑھے، اس کے بعد فجر، پھر ظہر، پھر عصر، پھر مغرب کی نماز کا اعادہ کرے، اس سے اس کی ترتیب اپنی جگہ قائم ہوجائے گی، اس سے متعلق فقہی جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

والمسألة الثانية: وهو أن من صلى الفجر وهو ذاكر أنه لم يوتر وفي الوقت سعة لا يجوز عنده؛ لأن الواجب ملحق بالفرائض في العمل، فيجب

مراعاة الترتيب بينه وبين الفرائض. (بدائع الصنائع، زكريا ١/ ٦١٠)

فلو صلى فرضا ذاكرا فائتة ولو كانت وترا فسد فرضه فسادا موقوفا، وتحته في حاشية الطحطاوي قوله: ولو كانت وترا: أي لأنه فرض عملي عنده. (حاشية الطحطاوي على المراقي، أشرفيه بكڈپو ٤٤٤)

لو صلى الصبح وهو ذاكر أنه لم يصل الوتر، فصلاة الصبح فاسدة عند أبي حنيفة لوجوب الترتيب بين الوتر والفريضة. (الموسوعة الفقهية ٧/ ٣٠١)

فرض الترتيب بين الفروض الخمسة والوتر فائتا كلها أو بعضها، أي إن كان الكل فائتا فلا بد من رعاية الترتيب بين الفروض الخمسة، وكذا بينها وبين الوتر، وكذا إن كان البعض فائتا والبعض وقتيا لابد من رعاية الترتيب، فيقضى الفائتة قبل أداء الوقتية ولم يجز فرض فجر من ذكر أنه لم يوتر ...... هذا عند أبي حنيفة ...... بناء على وجوب الوتر عنده. (شرح وقاية، مكتبه ياسر نديم ١/ ١٨١-١٨٢)

صاحب ترتیب حضرات کے لئے احتیاط اسی میں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق عمل کریں اور اسی کے مطابق ترتیب قائم رکھیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۱۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۸/۱۴۳۶ھ

عشاء اور وتر کے مابین ترتیب کا حکم بعض شرائط کے ساتھ مقید

سوال [۳۰۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: وتر کی نماز کا وقت عشاء کی نماز کے بعد ہے یا عشاء کا ہی وقت ہے؟ اگر عشاء کی نماز سے قبل وتر پڑھ لی تو اس وتر کا کیا حکم ہے؟ کیا عامدا اور ناسیا اور اختیاری اور غیر

اختیاری کا کوئی فرق ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال کے جواب سے پہلے اتنی وضاحت ضروری ہے کہ وتر کی نماز صرف حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک واجب ہے اور حضرات صاحبینؒ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وتر کی نماز واجب نہیں ہے؛ بلکہ سنن بعدیہ کی طرح سنت ہے اور سنتوں کا جو حکم ہے وہی نماز وتر کا بھی حکم ہے۔ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق تمام متأخرین نے وتر کے واجب ہونے پر فتوی دیا ہے، یہی حنفیہ کا مفتی بہ اور صحیح ترین قول ہے۔ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وتر کا وقت بعینہٖ عشاء کا وقت ہونے کے ساتھ ساتھ ہے اور عشاء اور وتر کے درمیان ترتیب بھی واجب ہے؛ لیکن ترتیب کا وجوب مطلقاً نہیں ہے؛ بلکہ عامداً اور حالت اختیاری کے ساتھ مشروط ہے؛ لہٰذا اگر جان بوجھ کر بلا کسی عذر کے وتر کو عشاء سے پہلے پڑھ لیا تو عشاء کی نماز کے بعد دوبارہ وتر کا اعادہ واجب ہے؛ لیکن اگر کسی عذر کی وجہ سے یا بھول کر کے وتر کی نماز کی ادائے گی عشاء سے پہلے ہوجائے یا کسی وجہ سے عشاء کی نماز فاسد ہوجائے اور وتر کی نماز صحیح ہوجائے، پھر جب عشاء کی نماز کا اعادہ کیا جائے تو وتر کا اعادہ لازم نہیں ہوتا، سنتوں کا اعادہ ہر حال میں لازم ہے اور حضرات صاحبینؒ کے نزدیک عذر یا غیر عذر دونوں صورتوں میں سنن بعدیہ کی طرح وتر کا اعادہ لازم ہوجاتا ہے؛ اس لئے کہ ان کے نزدیک وتر واجب ہی نہیں۔ اور فتویٰ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہے؛ لہٰذا اگر کسی امام نے بے خیالی میں بھول کر عشاء کی نماز بغیر وضو کے پڑھادی ہے، یا ناپاک کپڑے میں پڑھادی ہے اور اس نے عشاء کی نماز کے بعد حدث یا پیشاب وغیرہ کی وجہ سے دوبارہ وضو کرلیا، وضو کر کے وتر اور سنن پڑھ لی، اس کے بعد اس کو پتہ چلا کہ عشاء کی نماز بغیر وضو کے پڑھائی گئی ہے، یا عشاء کی نماز ناپاک کپڑے میں پڑھی تھی، مگر وتر اور سنن پاک کپڑے میں پڑھی گئی ہیں، تو ایسی صورت میں عشاء کی نماز کے اعادہ کے ساتھ ساتھ صرف

سنتوں کا اعادہ لازم ہے، وتر کا اعادہ لازم نہیں ہے۔

وعند أبي حنيفة: وقته وقت العشاء، فإن قيل: لو كان وقت الوتر وقت العشاء لجاز تقديمه على العشاء أجاب بقوله: إلا أنه لا يقدم عليه عند التذكر يعني إذا لم يكن ناسيا للترتيب، وعلى هذا إذا أوتر قبل العشاء متعمدا أعاد الوتر بلا خلاف، وإن أوتر ناسيا للعشاء، ثم تذكر لا يعيده؛ عنده؛ لأن النسيان يسقط الترتيب، ويعيده عندهما؛ لأنه سنة العشاء كركعتي العشاء، فلو قدم الركعتين على العشاء لم يجز عامدا كان أو ناسيا، فكذلك الوتر. (عناية على الفتح، كتاب الصلاة، باب صلاة الوتر، زكريا ١/ ٤٢٦، دارالفكر ١/ ٤٢٢، كوئٹه ١/...... وهكذا في البناية أشرفيه ديوبند ٢/ ٣٢)

إن أوتر في وقت العشاء قبل أن يصلى العشاء، وهو ذاكر لذلك لم يجز بالإتفاق. وفي الكافي: ولو صلى العشاء بلا وضوء، ثم توضأ وصلى السنة والوتر، ثم علم أنه صلى العشاء بلا وضوء يعيد العشاء عنده والسنة، ولا يعيد الوتر، وعندهما يعيد الوتر أيضا. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل ١٠، قضاء الفائتة، زكريا ٢/ ٤٥٠، رقم: ٢٩٥٠)

أما أصل الوقت فوقت العشاء عند أبي حنيفة إلا أنه شرع مرتبا عليه حتى لا يجوز أداء ه قبل صلاة العشاء مع أنه وقته لعدم شرطه، وهو الترتيب إلا إذا كان ناسيا، كوقت أداء الوقتية، وهو وقت الفائتة لكنه شرع مرتبا عليه. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، باب صلاة الوتر، فصل في بيان وقتها، كراچی ١/ ٢٧٢، زكريا ١/ ٦١٠)

وقت العشاء والوتر من غروب الشفق إلى الصبح، ولا يقدم الوتر على العشاء لوجوب الترتيب، لا لأن وقت الوتر لم يدخل حتى لو صلى الوتر قبل العشاء ناسيا أو صلاهما فظهر فساد العشاء دون الوتر، فإنه يصح الوتر ويعيد العشاء وحدها عند أبي حنيفة؛ لأن الترتيب يسقط بمثل هذا العذر.

(هـنـدية، كتـاب الصلاة، الباب الأول في المواقيت، زكريا قديم ۱/ ۵۱، جديد ۱/ ۱۰۸)
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۱۲)

عشاء امام صاحب کے پیچھے اور وتر مقتدی کے پیچھے پڑھنا

سوال [۳۰۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا ایسا مقتدی جس نے نماز باجماعت پڑھی ہے (لیکن امام صاحب اچانک چلے گئے) تو کیا نماز وتر اس مقتدی کے پیچھے جائز ہے یا ایسی حالت میں فرداً فرداً وتر پڑھی جائے؟

المستفتی: احقر عابد رضا بارہ دری محمد علی روڈ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: امام کے علاوہ مقتدی کے پیچھے بھی نماز وتر باجماعت جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/ ۱۵۸)

لكن ينبغي أن يكون قول القهستاني معه احترازا عن صلاتها منفردا، أما لو صلاها جماعة مع غيره، ثم صلى الوتر معه لا كراهة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ۲/ ۵۰۰، كراچی ۲/ ۴۸، مصري ۱/ ٦٦٣)

ولو لم يصل التراويح جماعة مع الإمام فله أن يصلي الوتر معه، ثم ذكر بعده أنه لو صلى التراويح مع غيره له أن يصلي الوتر معه، وهو الصحيح. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، قبيل باب إدراك الفريضة، كوئٹه ۲/ ۷۰، زكريا ۲/ ۱۲۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۸۶۹)

تراویح نہ پڑھنے والے کا وتر کی جماعت میں شریک ہونا

سوال [۳۰۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہماری جماعت دہلی سے وطن واپس آرہی تھی رمضان میں، ایک جگہ نماز عشاء پڑھنی تھی، مسجد میں تراویح ہورہی تھی، ہم نے اپنی الگ عشاء کی جماعت کی اور تراویح کسی نے نہیں پڑھی، مسجد میں وتر کی جماعت ہونے لگی تو کیا ہم اس وتر کی جماعت میں مسجد میں شریک ہوسکتے ہیں، جب کہ ہم میں سے کسی نے بھی تراویح نہیں پڑھی یا ہم اپنی وتر کی نماز جماعت سے الگ ہی پڑھ لیں یا الگ الگ پڑھیں؟ شرعاً جو حکم ہو واضح فرمائیں۔

المستفتی: سعید احمد قاسمی، امام مدنی جامع مسجد سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: وتر مستقل نماز ہے، اس کی جماعت عشاء کی جماعت کے تابع نہیں ہے؛ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ حضرات عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد تراویح پڑھنے سے پہلے امام صاحب کے ساتھ وتر کی جماعت میں شریک ہوسکتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الاحکام ۲/ ۲۱۵-۲۱۷، فتاوی محمودیہ جدید ۷/ ۲۷۲، کتاب المسائل ۱/ ۴۱۱)

ولو لم يصلها، أي التراويح بالإمام أو صلاها مع غيره له أن يصلي الوتر معه، لو تركها الكل هل يصلون الوتر بجماعة؟ فليراجع ...... أما لو صلاها جماعة مع غيره، ثم صلى الوتر معه لا كراهة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ۲/ ۴۸، زكريا ۲/ ۴۹۹-۵۰۰)

قوله: فليراجع قضية التعليل في المسألة السابقة لقولهم: لأنها تبع أن يصلي الوتر بجماعة في هذه الصورة؛ لأنه ليس بتبع للتراويح، ولا للعشاء عند الإمام رحمه الله. (حاشية الطحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كوئٹه ۱/ ۲۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۰/۱۲/۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۳۱/۳۸)

جس نے عشاء کی نماز با جماعت ادا نہ کی ہو وہ وتر کی جماعت میں شرکت کرسکتا ہے یا نہیں؟

سوال [۳۰۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے عشاء کی نماز باجماعت ادا نہیں کی، تو کیا زید تراویح میں شریک ہونے کے بعد وتر میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اگر شریک ہوسکتا ہے تو کس صورت میں؟ اور اگر شریک نہیں ہوسکتا تو کس صورت میں؟ اس کا تفصیل کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد شمس الدین قاسمی، رجب پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں ایسا آدمی وتر کی نماز باجماعت پڑھ سکتا ہے۔ اور ''شامی'' کی جس عبارت سے ممانعت ثابت ہے وہ عبارت حضرات فقہاء اور اہل فتاوی کے نزدیک مخدوش اور ناقابل اعتبار ہے؛ اس لئے کہ علامہ شامی سے بہت بڑی بڑی شخصیات علامہ طحطاویؒ وغیرہ نے اس قسم کی عبارات پر سختی سے رد فرمایا ہے۔ اور جواز پر دلیل بیان فرمائی ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/۱۵۲)

قضية التعليل في المسألة السابقة لقولهم: لأنها تبع أن يصلى الوتر بجماعة في هذه الصلاة؛ لأنه ليس بتبع للتراويح ولا للعشاء...... عند الإمام.

(طحطاوی علی الدر المختار، باب الوتر والنوافل، بحث التراويح، كوئٹه ١/ ٢٩٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴۱۲/۲۷)

اکیلے عشاء پڑھنے والے کا وتر کی جماعت میں شریک ہونا

سوال [۳۰۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی شخص عشاء کی فرض نماز جماعت سے نہ پڑھ سکا ہوتو کیا وہ وتر کی نماز جماعت سے پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ بریلوی مسلک کے مفتیان کرام نے منع فرمایا ہے کہ جو عشاء کی نماز جماعت سے نہ پڑھ سکا ہو وہ وتر اپنی الگ سے پڑھے۔ مدرسہ حیات العلوم کے کتابچہ میں لکھا ہے کہ جو شخص عشاء کی نماز جماعت سے نہ پڑھ سکا ہو وہ بھی وتر کی نماز امام کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اور اس میں حدیث بھی لکھی ہوئی ہے۔ جناب مفتی عبدالجلیل صاحب قاسمی نگینہ مدرسہ رشیدیہ کے مفتی تھے، انہوں نے بھی اس شخص کو جو عشاء کی نماز جماعت سے نہ پڑھ سکا ہو وہ وتر الگ پڑھے لکھا ہے۔ برائے مہربانی مفصل مدلل حوالہ کے ساتھ بندہ ناچیز کو جواب سے نوازیں۔

المستفتی: قاری سلطان قاسمی، امام مسلم کالج والی مسجد کٹگھر، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص رمضان المبارک میں عشاء کی نماز باجماعت نہ پڑھ سکے، اس کے لئے وتر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا بلا کراہت جائز اور درست ہے، جب کہ اس نے اپنی نماز عشاء الگ سے پڑھ لی ہو، یہی صحیح اور راجح ہے۔ اور ناجائز کہنا صحیح نہیں ہے۔ حیات العلوم کے کتابچہ میں صحیح لکھا ہے۔

وكان رجل قد صلى الفرض وحده، فله أن يصليها مع ذلك الإمام؛ لأن جماعتهم مشروعة فله الدخول فيها معهم. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ۲/ ۴۸، زكريا ۲/ ۴۹۹)

هذا قضية التعليل في المسألة السابقة لقولهم: أنها تبع أن يصلي الوتر بجماعة في هذه الصورة؛ لأنه ليس بتبع للتراويح ولا

للعشاء عند الإمام. (طحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كوئٹه ۱/ ۲۹۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۷۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۴/۳ھ

نمازعشاء کی جماعت چھوٹنے والے کا وتر کی نماز باجماعت پڑھنا

سوال [۳۰۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عشاء کی فرض نماز کی جماعت نہ ملے تو وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عابد رضا بارہ دری محمد علی روڈ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہاں زیادہ صحیح اور راجح یہی ہے کہ عشاء کی فرض نماز باجماعت نہ پڑھنے کی صورت میں بھی رمضان المبارک میں وتر جماعت کے ساتھ پڑھی جائے، وتر کی جماعت میں شریک ہونا بلا کراہت جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم، زکریا ۴/ ۱۵۲، احسن الفتاوی، زکریا ۳/ ۴۵۹)

كما صرح به في الطحطاوي على الدر، قضية التعليل في المسألة السابقة لقولهم: لأنها تبع أن يصلي الوتر بجماعة في هذه الصورة؛ لأنه ليس بتبع للتراويح ولا للعشاء عند الإمام رحمه الله تعالىٰ. (طحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، قبيل باب إدراك الفريضة، كوئٹه ۱/ ۲۹۷)

وفي الصغيري: وإذا لم يصلى الفرض مع الإمام (إلى قوله) والصحيح أنه يجوز أن يتبعه في ذلک كله. (صغيري مطبع مجتبائي دهلى ۲۱۰)

وفي الهندية: صلى العشاء وحده فله أن يصلي التراويح مع الإمام، ولو

تركوا الجماعة في الفرض ليس لهم أن يصلوا التراويح بجماعة، وإذا صلى معه شيئا من التراويح أو لم يدرك شيئا منها، أو صلاها مع غيره له ان يصلي الوتر معه هو الصحيح. (فتاوی عالمگیری، کتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ١/ ١١٧، جديد ١/ ١٧٦)

اورعلامہ شامی کی تحریراس کے خلاف ہے؛لیکن مذکورہ کتابوں میں جواز کی صراحت موجود ہے۔اورقاعدہ کا تقاضہ بھی جواز کا ہے۔علامہ شامی کی تحریرمیں دلیل کچھ نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۹/رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۴/ ۸۶۹)

ایک سلام کے ساتھ تین رکعت وتر کا تحقیقی جائزہ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ أَمَّا بَعْد! وتر کی نماز کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں مختلف طریقے مروی ہیں؛لیکن حضرات ائمہ ٔاربعہ اور جمہورامت کے نزدیک وتر کی نماز تین رکعت ہے؛البتہ اختلاف اس بارے میں ہے کہ تینوں رکعتیں ایک سلام کے ساتھ ہیں یا دوسلاموں کے ساتھ؟ تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وتر کی تینوں رکعتیں ایک سلام کے ساتھ ہیں،اوراس کے ثبوت میں ہم آپ کے سامنے متعدد حدیثیں پیش کریں گے، اور حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک وتر کی نماز تین ہی رکعت ہیں مگر دوسلاموں کے ساتھ ہیں،یہی امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے،اوران کے مسلک کے مطابق بھی حدیث کی کتابوں میں روایات موجود ہیں،اورچونکہ اس مختصر سے مضمون میں ایک سلام کے ساتھ وتر کی نماز کو ثابت کرنا ہے؛ اس لئے اس سے متعلق ہم آپ کے سامنے روایات پیش کرتے ہیں۔

ایک سلام کے ساتھ تین رکعت وتر کی گیارہ (۱۱) روایات

ایک سلام کے ساتھ تین رکعت وتر کے ثبوت میں گیارہ (۱۱) روایات پیش خدمت ہیں، جن میں تین مرفوع ہیں، باقی آثار تائید میں ہیں۔ امام نسائیؒ نے سندِ صحیح اور حسن مرفوع کے ساتھ حضرت ابی بن کعبؓ سے ایک سلام کے ساتھ تین رکعت وتر کی روایت کو صاف الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

(۱) أخبرنا یحییٰ بن موسیٰ قال: أخبرنا عبد العزیز بن خالد قال: حدثنا سعید بن أبي عروبة عن قتادة عن عزرة عن سعید بن عبدالرحمن بن أبزیٰ عن أبیه عن أبي بن کعبؓ قال: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقرأفي الوتر بسبح اسم ربک الأعلی، وفي الرکعة الثانیة بقل یا أیها الکافرون، وفي الثالثة بقل هو الله أحد، ولا یسلّم إلاَّ في آخرهنّ، ویقول یعني بعد التسلیم: سبحان الملک القدوس ثلاثاً. (سنن نسائي ۱/ ۱۹۱، جدید برقم: ۱۷۰۲)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پہلی رکعت میں سورۃ "**سبح اسم ربک الأعلی**" اور دوسری رکعت میں "**قل یا أیها الکافرون**" اور تیسری رکعت میں "**قل هو الله أحد**" پڑھا کرتے تھے، اور تینوں رکعت کے آخر میں سلام پھیرتے تھے اور سلام کے بعد تین مرتبہ "**سبحان الملک القدوس**" پڑھا کرتے تھے۔

(۲) عن عائشة قالت: کان نبي الله صلی الله علیه وسلم

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی نماز میں دو

لایسلّم في رکعتي الوتر. (طحاوي شریف ۱/ ۳۶۳ برقم: ۱۶۳۰، السنن الکبری ٤/ ۱۲۷ برقم: ٤٩١٩، مصنف ابن أبي شیبة ٤/ ٤٩٤ برقم: ٦٩١٢، السنن الکبری للنسائي ۱/ ٤٤٠ برقم: ۱٤۰۰، المحلی بالآثار ۱/ ۸۹)

رکعت پر سلام نہیں پھیرتے تھے۔

(۳) عن عائشة قالت: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یؤتر بثلاث لایسلّم إلّا في آخرهنّ، وهذا وتر أمیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ، وعنه أخذه أهل المدینة. (مستدرک حاکم ۲/ ٤٤١ برقم: ۱۱٤۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی نماز تین رکعت پڑھا کرتے تھے، اور ان تینوں کے درمیان میں سلام نہیں پھیرتے تھے؛ بلکہ آخر میں سلام پھیرتے تھے، اور یہی امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وتر تھے، اور انہی سے اہل مدینہ نے اس عمل کو اختیار فرمایا ہے۔

(٤) عن المسور بن مخرمة قال: دفنا أبا بکر لیلاً فقال عمر: إني لم أوتر، فقام وصففنا وراءه، فصلی بنا ثلاث رکعات لم یسلم إلا في آخرهنّ. (طحاوي شریف ۱/ ۳۸۱ برقم: ۱۷۰۰)

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رات کے وقت میں دفن کرکے فارغ ہوگئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیشک میں نے وتر کی نماز نہیں پڑھی ہے، پھر وہ وتر کی نماز کے لئے کھڑے ہوگئے، اور ہم ان کے پیچھے صف بندی کرکے کھڑے ہوگئے تو انہوں نے ہم کو تین رکعت وتر کی نماز پڑھائی، درمیان میں کوئی سلام نہیں پھیرا؛ بلکہ ان رکعتوں کے بالکل آخر میں سلام پھیرا۔

(۵) عن عبدالله بن مسعودؓ قال: الوتر ثلاث کوتر النهار صلاة المغرب. (طحاوي شريف ۱/ ۳۸۲ برقم: ۱۷۰۲، السنن الكبرى للبيهقي ٤/ ١٢٦، برقم: ٤٩١٧، مصنف ابن أبي شيبة ٤/ ٤٩٠، برقم: ٦٨٨٩)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وتر کی نماز اسی طرح تین رکعت ہیں جس طرح وتر النہار یعنی مغرب کی نماز (تین رکعت ایک سلام کے ساتھ ہوتی ہے)۔

(٦) عن ثابت قال: صلى بي أنسؓ الوتر أنا عن يمينه وأم ولده خلفنا ثلاث ركعات لم يسلّم إلا في آخرهنّ ظننت أنه يريد أن يعلّمني. (طحاوي شريف ۱/ ۳۸۲، برقم: ۱۷۰۵)

حضرت ثابت فرماتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مجھے وتر کی نماز پڑھائی اور میں ان کے داہنی طرف تھا، اور ان کی ام ولد ہمارے پیچھے تھیں اور تین رکعت وتر اس طرح پڑھائی ہے کہ ان رکعتوں کے بالکل آخر میں سلام پھیرا، اور مجھے ایسا خیال ہورہا تھا کہ وہ مجھ کو وتر کی نماز سکھارہے ہیں۔

(۷)حدثنا وكيع عن حماد بن سلمة عن ثابت عن أنسؓ أنه أوتر بثلاث لم يسلّم إلا في آخرهنّ. (مصنف ابن أبي شيبة ٤/ ٤٩٣، برقم: ٦٩١٠)

حضرت حماد بن سلمہ حضرت ثابت بنانی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے تین رکعت وتر کی نماز پڑھی درمیان میں کوئی سلام نہیں پھیرا؛ بلکہ ان رکعتوں کے بالکل آخر میں سلام پھیرا۔

(۸) عن الحسن قال: كان أبي بن كعب -رضى الله عنه- يؤتر بثلاث لا يسلم إلا في الثالثة مثل المغرب. (مصنف عبد الرزاق ۳/ ۲۵ برقم: ٤٦٥٩)

حضرت حسن فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تین رکعت وتر پڑھتے تھے، درمیان میں کوئی سلام نہیں پھیرتے تھے؛ بلکہ مغرب کی طرح تیسری رکعت میں سلام پھیرتے تھے۔

(**۹**) **عن مکحول عن عمر بن الخطابؓ أنّه أوتر بثلاث رکعات لم یفصل بینهنّ بسلام.** (مصنف ابن أبي شیبة ٤/ ٤٩٢ برقم: ٦٩٠١)

حضرت مکحول حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ بے شک حضرت عمرؓ تین رکعت وتر اس طرح پڑھتے تھے کہ ان کے درمیان میں سلام کے ذریعہ سے فصل نہیں فرماتے تھے۔

(**۱۰**) **عن أبي خالدة قال: سألت أبا العالیة عن الوتر فقال: علمنا أصحاب محمدؐ صلی الله علیه وسلم، أو علّمونا أن الوتر مثل صلاة المغرب غیر أنا نقرأ في الثالثة، فهذا وتر اللیل، وهذا وتر النهار.** (طحاوي شریف ١/ ٣٨٢، برقم: ١٧٠١)

ابو خالدہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوالعالیہ سے نماز وتر کی کیفیت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے ہم کو وتر کی نماز اس طرح سے سکھائی ہے کہ بے شک وتر کی نماز کی کیفیت نماز مغرب کی کیفیت کی طرح ہے، علاوہ اس کے کہ وتر کی تیسری رکعت میں ہم قرأت کرتے ہیں (مغرب کی تیسری رکعت میں قرأت نہیں کرتے) تو یہ رات کی وتر ہے، اور یہ دن کی وتر ہے۔

(**۱۱**) **عن عبد الرحمٰن بن أبی الزناد عن أبیه عن السبعة سعید بن المسیب وعروۃ بن الزبیر والقاسم بن محمد وأبي بکر بن عبدالرحمن وخارجة بن زید وعبید الله بن عبدالله وسلیمان بن یسار في مشیخة سواهم أهل فقه وصلاح**

حضرت عبد الرحمٰن بن ابی الزناد اپنے والد سے نقل کرتے ہیں وہ فقہاء سبعہ یعنی (۱) حضرت سعید بن المسیب (۲) عروہ بن الزبیر (۳) قاسم بن محمد (۴) ابوبکر بن عبدالرحمٰن (۵) خارجہ بن زید (۶) اور عبیداللہ بن عبداللہ بن مسعود (۷) سلیمان بن یسار، ان سب فقہاء اور اہل صلاح اور اہل فضل سے نقل فرماتے ہیں کہ بے شک وتر کی نماز تین

وفضل، وربما اختلفوا في الشيء فآخذ بقول أكثرهم وأفضلهم رأيا، فكان مما وعيت عنهم على هذه الصفة أن الوتر ثلاث لا يسلم إلا في آخرهنّ، فهذا من ذكرنا من فقهاء المدينة، وعلمائهم قد أجمعوا أن الوتر ثلاث لا يسلم إلا في آخرهنّ . (طحاوي شريف ۱/ ۳۸۵، برقم: ۱۷۱۶)

رکعت ہے، اور درمیان میں کوئی سلام نہیں صرف اس کے آخر میں سلام پھیرا جائے گا، یہ فقہاء مدینہ اور علماء مدینہ ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، یقیناً ان لوگوں کا اتفاق اس بات پر ہے کہ تین رکعت وتر ایک سلام کے ساتھ ہے۔

روایات کا تحقیقی جائزہ

بے شک وتر کی نماز کے بارے میں بخاری مسلم ترمذی ابو داؤد وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں متعدد طریقے مروی ہیں، اور اس کا کوئی انکار نہیں کرتا ہے کہ وہ مختلف طریقے صحیح سندوں کے ساتھ ثقہ راویوں سے مروی ہیں، اور ان تمام روایتوں کے پیش نظر علاّمہ ابن حزم ظاہری نے وتر کی نماز پڑھنے کے تیرہ (۱۳) طریقے بیان کئے ہیں، اور سب کو صحیح کہا ہے، اور کسی پر بھی رد نہیں کیا اور ہر ایک پر عمل کی اجازت دی ہے۔

(۱) تیرہ رکعت جن میں آخر میں ایک رکعت ایک سلام کے ساتھ ہے (۲) تیرہ رکعت جن میں آخر میں پانچ رکعت ایک سلام کے ساتھ ہیں (۳) گیارہ رکعت جن میں آخر میں ایک رکعت ایک سلام کے ساتھ ہے (۴) نو رکعت جن میں سے ایک رکعت کو وتر شمار کیا گیا (۵) نو رکعت دو قعدہ اور ایک سلام کے ساتھ (۶) سات رکعتیں جن میں ایک رکعت وتر ہے (۷) سات رکعتیں ۶ ر رکعت پر قعدہ اور ساتویں رکعت پر سلام کا ذکر ہے (۸) سات رکعت ایک قعدہ اور ایک سلام کے ساتھ (۹) پانچ رکعتیں جن میں ایک رکعت وتر ہے (۱۰) پانچ رکعت ایک سلام کے ساتھ (۱۱) تین رکعت دو سلام کے ساتھ (۱۲) تین رکعت ایک سلام کے ساتھ (۱۳) ایک رکعت ایک سلام کے ساتھ۔ (المحلی بالآثار مسئلہ ۲۹۰، ۲/۸۲تا۹۰)

اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ عامۃ المسلمین کس پر عمل کریں گے؟ اس میں امت حیران اور ششدر ہو کر رہ جائے گی کہ ہم کیا کریں، اور عامۃ المسلمین کے لئے ایک ہی طریقہ ہوتا ہے جس پر وہ مستقل عمل کرسکیں؛ اس لئے ائمہ اربعہ نے تمام روایتوں پر غور کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل کیا ہے، اس کو متعین فرمایا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل یہی ثابت ہوا کہ آپ نے تین رکعت وتر کی نماز پڑھی اور پڑھائی ہے، ان ائمہ اربعہ کے درمیان صرف اتنا اختلاف رہ جاتا ہے کہ یہ تین رکعت وتر دو سلاموں کے ساتھ ہیں یا ایک سلام کے ساتھ؟ تو اس بارے میں دونوں طرف روایات صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہیں، چنانچہ ائمہ ثلاثہ نے تین رکعت وتر دو سلاموں کے ساتھ والی روایات کو اختیار کر کے یہ مسئلہ واضح کردیا ہے کہ وتر کی نماز تین رکعتیں دو سلاموں کے ساتھ ہیں، چنانچہ ان کے متبعین اسی طرح تین رکعت وتر دو سلاموں کے ساتھ پڑھتے ہیں، اور حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ان روایات کو اختیار فرمایا ہے جن میں تین رکعت وتر ایک سلام کے ساتھ مروی ہیں، اور یہ روایات بھی صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہیں، اب اس تمہید کے بعد امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو چند وجوہ سے ترجیح حاصل ہے۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین نے ایک سلام والی تین رکعت وتر کو اختیار فرمایا اور اسی پر عمل فرمایا ہے، جیسا کہ ماقبل میں ذکر کردہ روایت نمبر ۳، اور روایت نمبر ۴ر اور روایت نمبر ۹ر سے واضح ہوتا ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل یہی ثابت کیا گیا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت سے صحابہ نے اسی طرح وتر کی نماز پڑھی ہے۔

(۲) خلفاء راشدینؓ کے علاوہ دیگر صحابہ کرامؓ سے بھی یہی عمل ثابت ہے، کہ وہ تین رکعت وتر ایک ہی سلام کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، جیسا کہ روایت نمبر ۵ر اور روایت نمبر ۶ر اور روایت نمبر ۷، ۸ر سے واضح ہوتا ہے، جن میں حضرت عبد اللہ بن مسعود حضرت انس بن مالک اور حضرت ابی بن کعب رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل واضح طور پر ثابت ہے کہ وہ تین رکعت وتر ایک سلام کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، اور امت کو یہی مسئلہ بتایا کرتے تھے۔

(۳) مدینۃ المنورہ میں سات فقہاء تابعین ایسے پیدا ہوئے ہیں، جن کے علم و فضل اور ان کی فقاہت اور دیانت پر تمام امت کا اتفاق ہے، جن کو فقہاء سبعہ سے موسوم کیا جاتا ہے، ان کا

اتفاق بھی اسی پر ہے کہ وتر کی نماز تین رکعت ایک ہی سلام کے ساتھ ہے، جیسا کہ روایت نمبر ۱۱؍ میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

(۴) ان تمام وجوہات سے نیز صحابہ اور تابعین کے مذکورہ آثار سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی اس مرفوع روایت کی تائید ہوتی ہے جو سند صحیح کے ساتھ امام نسائی نے نقل فرمائی ہے جس میں حضور ﷺ کا تین رکعت وتر کی نماز ایک سلام کے ساتھ پڑھنا ثابت ہے، جس کو ہم نے روایت نمبر ۱؍ میں نقل کیا ہے؛ اس لئے اسی کو ترجیح حاصل ہے، اور یہی امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔

بوقتِ قنوتِ وتر رفعِ یدین کا ثبوت

حضرت امام بخاریؒ نے اپنی کتاب ''جزء رفع الیدین'' میں اور امام ابوبکر ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب المصنف میں اور امام طبرانی نے المعجم الکبیر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل فرمایا ہے کہ قنوتِ وتر رکوع سے پہلے ہے اور قنوت شروع کرنے سے پہلے رفعِ یدین ہے، اور یہی ان حضرات کا عمل رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

(۱) حدثنا عبد الرحیم المحاربي حدثنا زائدة عن لیث عن عبد الرحمٰن بن الأسود عن أبیه عن عبدالله أنه كان یقرأ في آخر ركعة من الوتر قل هو الله ثم یرفع یدیه فیقنت قبل الركعة. (جزء رفع الیدین للبخاري ص: ۲۸، المعجم الکبیر للطبراني ۹/ ۲۸۳، برقم: ۹۴۲۵، مجمع الزوائد ۲/ ۲۴۴، مصنف ابن أبي شیبه جدید ۴/ ۵۳۱، برقم: ۷۰۲۸)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وتر کی آخری رکعت میں ''قل ہو اللہ'' شریف پڑھتے تھے، پھر اس کے بعد رفعِ یدین کر کے قنوت پڑھتے تھے رکوع سے پہلے۔

شبیر احمد قاسمی: خادم الحدیث والافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یو-پی)
بروز اتوار ۱۳؍ صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

الفصل الثاني: في القنوت النازلة

قنوت نازلہ کا حدیث سے ثبوت

سوال [۳۰۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قنوت نازلہ کا ثبوت کسی مستند حدیث سے ہے، حدیث اور راوی کا حوالہ دیں، صحاح ستہ میں سے کسی ایک حدیث کا، اگر حدیث سے ثابت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کن مواقع میں قنوت نازلہ پڑھی ہے؟ اور کتنے دنوں تک پڑھی ہے، نیز خلفائے راشدین نے کتنے دنوں تک پڑھی ہے؟

"من أحدث في أمرنا" حدیث کا کیا مطلب ہے؟ ۲۹/غزوات ہوئے، کیا ۲۹/ غزوات میں قنوت نازلہ پڑھ کر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنگ میں جایا کرتے تھے؟ نیز اصلاح معاشرہ، اصلاح نفس ضروری ہے یا قنوت نازلہ ہی امن وامان اور صلاح واصلاح کا ضامن ہے؟ علامہ قرطبیؒ نے انکار کیا ہے، کیا یہ غلط ہے؟ ہر ایک اجزاء کا الگ الگ جواب با صواب مدلل ومفصل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: تصور حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلمانوں پر کفار کی طرف سے مظالم کے زمانہ میں قنوت نازلہ کا پڑھنا نبی کریم ﷺ، دور نبوت اور دور صحابہ سے صحیح اور معتبر روایات کے ذریعہ سے ثابت ہے، جب ہجرت کا سلسلہ جاری ہوا اور کمزور مسلمان مکہ میں رہ گئے اور ان پر طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جانے لگیں، تو حضور ﷺ نے قنوت نازلہ میں ظالموں کے نام لے لے کر کے بد دعا فرمائی اور مظلوموں کے نام لے لے کر کے دعا فرمائی، پھر بیر معونہ کے موقع پر جب ستر صحابہ کو دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا، تو اس وقت ایک مہینہ تک مسلسل حضور ﷺ نے قنوت نازلہ پڑھی۔

سـالـم عـن أبيه أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا رفع رأسه مـن الـركـوع مـن الـركعة الآخرة من الفجر يقول: ''اللهم العن فلانا وفلانا وفـلانـا'' بـعد ما يقول: سمع الله لمن حمده ربنا ولک الحمد، كان رسول الله صـلـى الله عـليـه وسـلـم يـدعو على صفوان بن أمية، وسهيل بن عمرو، والحارث بن هشام. (بـخـاري شـريف، كتاب المغازي، باب قوله ثم انزل عليكم من بعد الغم الآية، النسخة الهندية ٢/ ٥٨٢، رقم: ٣٩٢٢، ف: ٤٠٦٩)

إن نبـي الله صـلـى الله عـليـه وسلم قنت شهرا في صلاة الصبح يدعو عـلـى أحياء من أحياء العرب على رعل وذكوان وعصية، وبني لحيان، ...... **أولـئک السبعين من الأنصار قتلوا ببئر معونة.** (بـخاري، كتاب المغازي، باب غزوة الرجيع، ورعل وذكوان، النسخة الهندية ٢/ ٥٨٦، رقم: ٣٩٤٣، ف: ٤٠٩٠)

الـلهـم أنـج الـولـيـد بـن الوليد، ومسلمة بن هشام وعياش ابن أبي ربيـعة، الـلهـم اشـدد وطـأتک عـلـى مضر واجعلها سنين كسني يوسف يجهر بذلک. (بـخـاري شريف، كتاب التفسير، باب قوله: ليس لك من الأمر شيء، النسخة الهندية ٢/ ٦٥٥، رقم: ٤٣٧٤، ف: ٤٥٦٠)

أن أبا بكر قنت في الفجر. (الـمصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، من كان يقنت فى الفجر ويراه، مؤسسة علوم القرآن جديد ٥/ ٣٠، رقم: ٧٠٧٤، قديم: ٢/ ٣١١)

عن زيد بن وهب قال: ربما قنت عمر في صلاة الفجر. (المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، مـن كـان يـقنت فى الفجر ويراه، قديم: ٢/ ٣١١، موسسة علوم القرآن جديد ٥/ ٣١، رقم: ٧٠٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۱ھ

قنوت نازلہ

سوال [۳۰۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قنوت نازلہ کے بارے میں تفصیلی معلومات مطلوب ہے، جوقرآن وحدیث سے مدلل ہو اور کن کن اوقات میں پڑھنا مشروع ہے، تحریر فرما کر ممنون فرمائیں، تا کہ عمل کرنا آسان ہو۔

المستفتی: حافظ عبد الکلام گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: قنوت نازلہ یہ ایک طرح کی دعا ہے جو کفار کی طرف سے مسلمانوں پر مظالم اور حوادثات کے پیش آنے کے وقت مظلومین کے حق میں دعا اور ظالمین کے حق میں ان کی ہلاکت وبربادی کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ اوراس کا دور نبوت اور دور صحابہ میں بھی کفار کی طرف سے مسلمانوں پر مظالم کے وقت صحیح اور معتبر روایات سے پڑھنا ثابت ہے۔ اور یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف فجر میں پڑھنا مشروع ہے۔ اور بخاری شریف میں فجر ہی میں پڑھنے کی روایت ہے۔

عن أبيه أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا رفع رأسه من الركوع من الركعة الآخرة من الفجر يقول: ''اللهم العن فلانا، وفلانا'' بعد ما يقول: سمع الله لمن حمده ربنا ولك الحمد –إلى– كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يدعو على صفوان بن أمية، وسهيل بن عمرو، والحارث بن هشام. (بخاري شريف، كتاب المغازي، باب ليس لك من الأمر شيء، النسخة الهندية ۲/ ۵۸۲، رقم: ۳۹۲۲، ف: ۴۰۶۹، ۴۰۷۰)

عن أنس بن مالك –رضي الله عنهما– أن النبي صلى الله عليه وسلم قنت شهرا في صلاة الصبح يدعو على أحياء من أحياء العرب على رعل وذكوان وعصية، وبني لحيان، ...... أولئك السبعين من الأنصار قتلوا ببئر

معونة . (بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة الرجيع، ورعل وذكوان، النسخة الهندية ٢/ ٥٨٦، رقم: ٣٩٤٣، ف: ٤٠٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۱۱ھ

مسلمانوں پر ظلم وستم کے وقت قنوت نازلہ پڑھنا

سوال [۳۰۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم ایک دیہی علاقہ کے رہنے والے ہیں، ہمارے یہاں تعلیم بہت قلیل ہے، ہمارے یہاں ایک مولوی صاحب کسی دوسری جگہ سے مہمان بن کر تشریف لائے اور اس دور میں ہندو مسلم فسادا کثر جگہ ہورہا تھا اورانہوں نے نماز پڑھائی عشاء وفجر کی نماز میں ایک رکعت میں رکوع کے بعد سجدے میں جانے سے قبل سیدھے کھڑے ہوکر ایک دعا پڑھی، اس کو قنوت نازلہ کہتے ہیں اور مقتدیوں نے آمین کہی۔ یعنی:

اللهم اهدنا في من هديت، وعافنا فی من عافيت، وتولنا فی من توليت، وبارک لنا في ما أعطيت، وقنا شر ما قضيت، فإنک تقضي ولا يقضى عليک، إنه لا يذل من واليت، ولا يعز من عاديت، تبارکت ربنا وتعاليت، نستغفرک ونتوب إليک، وصلى الله على نبيه الكريم الخ.

ہم لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ یہ دعا کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جس وقت اسلام کو یا قوم مسلم کو دشواریوں کا وقت آتا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس مذکورہ دعا کو پڑھتے تھے، ہمیں یہ تحقیق نہیں تھی، اتنا معلوم تھا کہ نماز میں اگر کوئی بھی زیادتی یا کمی ہوگئی، تو سجدہ سہو لازم ہوتا ہے، تو پھر کیا ایسے ماحول میں یہ دعا نماز مذکورہ میں پڑھنا قرآن وحدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ مدلل جواب سے نوازیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محبوب عالم رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں دشمنانِ اسلام کی طرف سے جب مسلمانوں پر ظلم وستم شروع ہوجائے تو اس طرح نماز میں دعا پڑھنا حدیث سے ثابت ہے، ایسی دعا کو ’’قنوت نازلہ‘‘ کہتے ہیں،اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آتی اور نماز میں جو تاخیر واجب کی وجہ سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے،وہ حکم ان ارکان میں ہے کہ جن میں کوئی تسبیح یا دعا نہ ہو۔اور رکوع کے بعد سجدہ سے پہلے قومہ کی حالت میں حدیث سے دعا ثابت ہے؛ اس لئے اس میں قنوت نازلہ پڑھنے سے جو تاخیر ہوئی ہے، اس سے سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا ہے؛ البتہ حنفیہ کے یہاں قنوت صرف فجر میں پڑھنا مسنون ہے،عشاء میں قول راجح کے اعتبار سے مسنون نہیں ہے۔اور سجدہ سہو عشاء میں پڑھنے سے بھی لازم نہیں ہے۔

ویقنت في الأخیرة إذا رفع رأسه من الرکوع، فیقول: اللهم اهدني في من هدیت. الحدیث (حصن حصین، ص: ٥٦)

عن أنس بن مالک –رضي الله عنهما– أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قنت شهرا بعد الرکوع في صلاة الفجر یدعو علی بني عصیة. (مسلم شریف، باب استحباب القنوت في جمیع الصلاة، إذا نزلت بالمسلمین نازلة، النسخة الهندیة ١/ ٤٣٢، بیت الأفکار، رقم: ٦٧٧)

إن قنوت النازلة عندنا مختص بصلاة الفجر، دون غیرها من الصلاة الجهریة والسریة. (شامي، کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زکریا ٢/ ٤٤٩، کراچی ٢/ ١١، مصري ١/ ٦٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۲۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

فاسق وفاجر مسلمانوں کے لئے قنوت نازلہ پڑھنا

سوال [۳۰۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک شخص ہمیشہ اپنی گفتگو میں علماء کی توہین وتحقیر کرتا رہتا ہے، ایک مرتبہ اس نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ کے ایک متبع سنت خلیفہ عظیم کی شان میں بڑبڑاتے ہوئے تیزی کے ساتھ نازیبا گفتگو کی اوراس نے گفتگو میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے ایک خلیفۂ اجل کی شان میں بھی گستاخی کی تھی، جس پر شہر کے ایک عالم نے موصوف کی گرفت کی اور مجبور کیا کہ مذکورہ بالا بزرگوں کے موجودہ وارث عالم دین شہر کے قاضی صاحب سے معافی مانگے، چنانچہ اس بدزبان شخص نے اس وقت بمجبوری معافی مانگ لی تھی؛ لیکن روش نہیں بدلی، کیا ایسا شخص کسی دینی منصب کا اہل ہوسکتا ہے یا نہیں؟ شخص مذکور کا یہ عمل کیسا ہے؟

(۲) ابھی ۲؍محرم ۲۳ھ بروز اتوار بعد نماز فجر تفسیر قرآن کے بعد سب نمازیوں کے سامنے شخص مذکور نے کہا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قنوت نازلہ پڑھی تھی اس وقت مسلمان سو فیصد مومن ومخلص تھے اور آج تو سب مسلمان فاجر، فاسق، ظالم، مجرم ہیں اور قنوت نازلہ میں ظالموں اور مجرموں پر بددعا ہے؛ اس لئے آپ کو قنوت نازلہ نہیں پڑھنی چاہئے؟ کیا شخص مذکور کی یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟ آج بھی قنوت نازلہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) امام صاحب نے کہا کہ قنوت نازلہ کے لئے امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب مدظلہ العالی نے بھی اپیل کی ہے، تو اس پر شخص مذکور نے مولانا اسعد مدنی صاحب کی شان میں گستاخی کی اور بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ یہ شخص ملک وملت بچاؤ تحریک میں قوم کا مال ہڑپ کر گیا، اس کی کوئی بات مسلمانوں کے لئے لائق عمل نہیں، تو کیا مولانا اسعد مدنی صاحب علمائے حق میں ہیں یا نہیں؟

(۴) بدزبان شخص مذکور فتنہ پرور ہونے کے ساتھ بھوسا چور اور خائن بھی ہے، تو کیا اس شخص

کوکوئی دینی منصب سونپا جائے یا نہیں؟ شخص مذکور اگر اپنی باتوں اور حرکتوں سے توبہ نہ کرے تو اس کے باوجود اس کو امام بنا سکتے ہیں یا نہیں؟ مقصد صرف صحیح بات کا معلوم کرنا ہے، کسی مومن کی توہین وتذلیل نہیں، برائے مہربانی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی سے نوازیں۔

المستفتی: شاہ محمد، حسن پور، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۴) جو شخص یہ کہہ رہا ہے کہ تمام مسلمان فاسق وفاجر ہیں، ان کے لئے قنوت نازلہ پڑھ کر دعائیں کرنا اور ان کے خلاف دشمنوں کے لئے بد دعائیں کرنا شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔ اور تمام مسلمانوں کو فاسق وفاجر سمجھ رہا ہے، تو سوال یہ ہے کہ خود وہ شخص کیا ہے؟ وہ ان مسلمانوں میں شامل ہے یا خارج؟ اگر وہ کہتا ہے کہ خود بھی انہیں میں شامل ہے، تو وہ خود بھی فاسق اور فاجر ہوا۔ اور فاسق وفاجر کی کوئی بات حکم شرعی سے متعلق اور عبادات سے متعلق قابل قبول نہیں ہے؛ اس لئے اس کی باتیں سننے والے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کی باتوں کو کوئی حیثیت نہ دیں۔ اور اگر وہ یہ کہتا ہے کہ وہ خود سب مسلمانوں میں سے ایک فرد نہیں ہے، تو وہ ہے کیا؟ کیا وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے خارج سمجھتا ہے؟ تو اس کا فیصلہ وہ خود کرے، اب رہی یہ بات کہ مسلمانوں پر جب دشمنان اسلام کی طرف سے ایذائیں اور تکلیفیں پہنچنے لگیں، تو قنوت نازلہ کا پڑھنا دور نبوت اور دور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے اور ائمہ مجتہدین اور فقہاء بھی اسی کے قائل ہیں اور کتب حدیث وکتب فقہ میں اس کی کوئی قید موجود نہیں ہے کہ مسلمان فاسق ہیں یا عادل؛ بلکہ صرف اہل ایمان ہونا شرط ہے؛ اس لئے حوادثات کے وقت میں قنوت نازلہ کا پڑھنا آج بھی مسنون ہے، جیسا کہ حدیث وفقہ سے واضح ہے۔ اور حضرات مشائخ وبزرگوں کو برا بھلا کہنا اپنے اوپر مصیبت لانا ہے، ایسے شخص کو دین کے اچھے کام کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

عن أنس بن مالک – رضي الله عنهما– أن النبي صلی الله علیه وسلم قنت شهرا في صلاة الصبح یدعو علی أحیاء العرب علی رعل وذکوان

وعـصية، وبني لحيان، زاد خليفة. الحديث (بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة الرجيع، ورعل وذكوان، النسخة الهندية ٢/ ٥٨٦، رقم: ٣٩٤٣، ف: ٤٠٩٠)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: إن الله قال: من عادى لي وليا، فقد آذنته بالحرب. الحديث (صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب التواضع النسخة الهندية ٢/ ٩٦٣، رقم: ٦٢٥٣، ف: ٦٥٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۲/۱۴۲۳ھ

سخت مصیبت کے وقت فجر میں قنوت نازلہ پڑھنا

سوال [۳۰۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز فجر کی دوسری رکعت اور مغرب نماز کی تیسری رکعت کا رکوع کرنے کے بعد قومہ میں امام کسی قسم کی دعا عربی میں جیسے "**اللهم ألف بين قلوبهم وشتت شملهم**" وغیرہ کسی قسم کی ناگہانی آفت یا کوئی پریشانی دفع کرنے کی نیت سے وقتی طور سے بلند آواز سے پڑھے اور مقتدی امام کے ہر جملہ پر آمین بالجہر کریں، بعد ختم ہونے دعا پھر امام "اللہ اکبر" کہتا ہوا سجدہ میں جائے اور نماز کو پورا کرے، تو اس صورت میں فرض نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

(نوٹ) ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فرض نماز کی جماعت میں امام کا اس طرح بلند آواز سے دعا پڑھنا اور مقتدیوں کا بلند آواز سے آمین کہنا جائز ہے یا نہیں؟۔

المستفتی: حافظ محمد شبیر چندوسی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جی ہاں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سخت مصیبت کے وقت میں امام کا فجر کی دوسری رکعت کے رکوع سے فارغ ہو کر قومہ کی حالت میں جہراً بلند آواز سے

قنوت نازلہ پڑھنا اور مقتدیوں کا آمین کہنا جائز ہے؛ البتہ مقتدیوں کے لئے آہستہ اور سراً آمین کہنا بہتر ہے۔ اور سوال نامہ میں ذکر کردہ موقعوں پر دعا پڑھنا بھی جائز ہے اور یہ دعا حدیث کی مشہور کتاب ''حصن حصین ص:۵۰۶'' میں موجود ہے۔

إن قنوت النازلة عندنا مختص بصلاة الفجر، دون غيرها من الصلوات الجهرية والسرية. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ٢/ ٤٤٩، كراچی ٢/ ١١، مصري ١/ ٦٢٨)

ولا شك أن القراءة والتأمين في الوتر لا يكون إلا سرا، فكذا في القنوت النازلة في الفجر. (إعلاء السنن، كتاب الصلاة، تتمة بقيه أحكام قنوت النازلة، دارالكتب العلمية، بيروت ٦/ ١٢٢، كراچی ٦/ ١٠١)

نوٹ: فجر کے علاوہ باقی مغرب یا کسی اور نماز میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۵۷)

قنوت نازلہ میں ملکوں کے ناموں کا اضافہ کرنا

سوال [۳۰۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مسجد کا امام ہے، کافی دنوں سے ہمارے یہاں ''قنوت نازلہ'' ہورہی ہے، امام مذکور معروف ''قنوت نازلہ'' کے علاوہ: **''اللهم انصر الأفغانيين''** اور **''اللهم أهلك الأمريكية والبريطانية''** پڑھتے ہیں، جو غیر معروف ہے، کیا یہ غیر معروف اسماء پڑھے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: افضال احمد، محلّہ چودھریان سہسپور، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قنوت نازلہ چونکہ مسلمانوں پر حوادث ومصائب کے پیش آنے پر پڑھی جاتی ہے؛ لہٰذا اس میں حالات وواقعات کے اعتبار سے مظلومین کے حق میں ان کے شہروں اور ملکوں کے نام لے کر دعا کرنا اور ظالمین کے حق میں ان کی ہلاکت وبربادی کے لئے ان کے ملکوں اور شہروں کے نام لے کر بددعا کرنا جائز اور درست ہے۔

(مستفاد: کفایت المفتی، قدیم ۳/۳۹۴، جدید زکریا ۳/۴۴۰، زکریا مطول ۴/۵۱۲)

عن أنس بن مالک – رضي الله عنهما – أن النبي صلى الله عليه وسلم قنت شهرا في صلاة الصبح يدعو على أحياء العرب على رعل وذكوان وعصية، وبني لحيان، زاد خليفة. (بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة الرجيع، ورعل وذكوان، النسخة الهندية ۲/ ۵۸۶، رقم: ۳۹۴۳، ف: ۴۰۹۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/۷ھ

قنوت نازلہ میں مقتدی حضرات کا آمین کہنا

سوال [۳۰۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اثنائے صلاۃ خواہ مقتدی ہو یا منفرد ’’ولا الضالین‘‘ کے بعد آمین کہنے کے علاوہ اور کسی آیت یا دعا میں آمین کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً قنوت نازلہ کے اندر یا قرآن کے کسی دعا کی جملہ کے اندر، اگر کہے تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد شاہد متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نماز کے اندر مقتدی یا منفرد کو ’’ولا الضالین‘‘ کے علاوہ باقی کسی بھی آیت یا جملۂ دعائیہ پر آمین کہنا جائز نہیں ہے؛ البتہ قنوت نازلہ کے جملہ دعائیہ پر

سراً اور آہستہ آمین کہنا جائز ہے۔

ولو قرأ الإمام آية الترغيب أو الترهيب، فقال المقتدي: صدق الله وبلغت رسله فقد أساء ولا تفسد صلاته. (فتاوی قاضيخان، كتاب الصلاة، فصل في ما يفسد الصلاة، زكريا جديد ١/ ٨٧، وعلى هامش الهندية ١/ ١٣٨، فتاوى عالمگيرى، كتاب الصلاة، الباب السابع في ما يفسد الصلاة، الفصل الأول، زكريا قديم ١/ ١٠٠، جديد ١/ ١٥٩)

والمختار في النازلة عند الشامي أنه يقرأ إن أسر الإمام، ويومن إذا جهر ولا شك أن القراءة أو التأمين في الوتر لا يكون إلا سرا، فكذا في القنوت النازلة في الفجر. (إعلاء السنن، كتاب الصلاة، تتمه بقيه احكام قنوت النازلة، دارالكتب العلمية، بيروت ٦/ ١٢٢، كراچی ٦/ ١٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۵۹)

قنوت نازلہ میں آمین کے جہر اور ارسال و وضع ید کی شرعی حیثیت

سوال [۳۰۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ جب امام نماز میں ''قنوت نازلہ'' پڑھے، تو مقتدیوں کو آمین بالجہر کہنا چاہئے یا بالسر؟ اگر سراً اولیٰ ہے تو جہراً کہنے سے اور اگر جہر اولیٰ ہے تو سراً کہنے سے نماز میں کچھ کراہت ہوگی یا نہیں؟ (۲) اور جب قنوت نازلہ پڑھی جائے تو ارسال ید اولیٰ ہے یا وضع ید تحت السرہ؟ بینوا بالبرہان وتوجروا عند الرحمان۔

المستفتی: احقر غلام محمد (گجراتی) شریک شعبہ دار الافتاء مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) بوقت ''قنوت نازلہ'' آمین بالسر مسنون ہے۔ اور آمین بالجہر خلاف سنت ہے۔

والثناء، والتعوذ، والتسمية، والتأمين، وكونهن سرا. وتحته في

الشامية: أن الإسرار بها سنة أخرى. (الدرالمختار، باب صفة الصلاة، مطلب في التبليغ خلف الإمام، كراچی ۱/ ۴۷۵، ۴۷۶، زكريا ۲/ ۱۷۲)

وثامنها: التأمين، وتاسعها: الإخفاء بهن، أي بالأربعة المذكورة من الثناء وما بعده، أما ما كان المصلى أو مقتديا، أو منفردا لما مر من الدليل. (حلبي كبير، كتاب الصلاةن، فصل في سنن الصلاة، أشرفيه ديو بند ۳۸۲)

ويسن الثناء، والتعوذ، والتسمية، والتأمين للإمام والمأموم، والمنفرد، ويسن التحميد والإسرار بها بالثناء وما بعده للآثار الواردة بذلك. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلاة، فصل في بيان سننها، دارالكتاب ديوبند ۲۵۹-۲۶۲)

(۲) اس سلسلہ میں ارسال اور وضع دونوں طرح روایات سے ثابت ہے؛ لیکن ارسال زیادہ اولیٰ ہے۔ (مستفاد: امدادالفتاویٰ ۱/۳۰۳)

فيرسل عنده حالة الثناء والقنوت. (طحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، فصل في بيان سننها، قديم ۱۴۰، جديد، دارالكتاب ديوبند ۲۵۸)

وأما سنن الصلاة: فمن جملتها: ...... (۱۰) والتأمين يأتى به الإمام والقوم جميعا، ويخفونه. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في سنن الصلاة، زكريا ۲/ ۱۳۴)

وسنتها رفع اليدين للتحريمة، ونشر أصابعه، وجهر الإمام بالتكبير والثناء، والتعوذ، والتسمية، والتأمين سرا. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، جديد دارالكتب العلمية، بيروت ۱/ ۱۳۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم شعبان ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۳۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
یکم شعبان ۱۴۱۱ھ

نماز مغرب میں قنوت نازلہ

سوال [٣٠٤٥]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ امام حنفی ہے اور ''قنوت نازلہ'' فجر میں آدمیوں کے شریک نہ ہونے کی وجہ سے (یعنی مقتدی کم شریک ہوتے ہیں) مغرب کی نماز میں بھی پڑھتے ہیں، کیا ایسا کرنا مسلک حنفی کے مطابق درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں مسلک حنفی کیا ہے؟ اوران لوگوں کی مغرب کی نماز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد ہاشم گڈ اوی، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حضرات حنفیہ کے یہاں ''قنوت نازلہ'' فجر کے علاوہ کسی اور نماز میں مسنون نہیں ہے۔

إن قنوت النازلة عندنا مختص بصلاة الفجر، دون غيرها من الصلوات الجهرية والسرية. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ٢/ ٤٤٩، كراچی ٢/ ١١، مصري ١/ ٦٢٨)

اور بخاری ومسلم کی جن روایات میں عشاء، مغرب، ظہر میں قنوت نازلہ پڑھنا ثابت ہے، وہ سب منسوخ ہیں؛ اس لئے حضرات حنفیہ کے یہاں دیگر نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھنا مشروع نہیں ہے۔ اور ہم کو حنفیہ کے مفتی بہ قول پر عمل کرنا چاہئے، یعنی فجر کے علاوہ کسی اور نماز میں قنوت نازلہ نہیں پڑھنی چاہئے، تاہم جن لوگوں نے مغرب کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھ لی ہے، ان کی نمازوں کا اعادہ لازم نہیں؛ البتہ ان کا یہ عمل سنت کے خلاف ہوگا۔

وأما القنوت في الصلاة كلها للنوازل، فلم يقل به إلا الشافعيّ، وكأنهم حملوا ما روى عنه عليه الصلاة والسلام، أنه قنت في الظهر والعشاء، كما في المسلم، وأنه قنت في المغرب أيضا، كما في البخاري على النسخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ٢/ ٤٤٩، مصري قديم ١/ ٦٢٨، كراچی ٢/ ١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍رجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۳۱۵ ۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۷/۱۴۲۲ھ

ظہر، عصر، مغرب کی قنوتِ نازلہ میں حکمرانوں پر لعنت کرنا

سوال [۳۰۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: امریکہ میں بعض حضرات ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی فرض نماز کی آخری رکعت میں بلند آواز سے قنوت نازلہ پڑھتے ہیں اور بعض اوقات خاص حکمرانوں کے نام لے کر نماز میں لعنت کرتے ہیں، کیا یہ دونوں عمل نماز میں صحیح ہیں؟ مع دلائل ائمہ اور مفتی بہ قول تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد عبدالسبحان، کیلفورنیا، امریکہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امریکہ خود دارالحرب ہے، اگر وہاں رہ کر کے دشمنان اسلام پر بددعا کے لئے قنوت نازلہ پڑھی جائے اور اس علاقہ پر اللہ کا عذاب نازل ہوجائے تو کیا بددعا کرنے والا خود بچے گا؟ نیز ہم حنفی مسلک کے لوگ ہیں اور حنفی مسلک میں راجح قول کے مطابق جہاں قنوت نازلہ پڑھنے کی گنجائش ہے وہاں پر صرف فجر کی نماز میں آخری رکعت کے رکوع کے بعد قومہ میں مشروع ہے۔ اور راجح قول کے مطابق کسی اور نماز میں حنفیہ کے نزدیک قنوت نازلہ مشروع نہیں ہے۔

عن أنس بن مالک –رضي الله عنهما– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قنت شهرا بعد الركوع في صلاة الفجر يدعو على بني عصية.

(مسلم، باب استحباب القنوت في جميع الصلاة إذا نزلت بالمسلمين نازلة، النسخة الهندية ۱/ ۲۳۷، بيت الأفكار، رقم: ۶۷۷)

إن قنوت النازلة عندنا مختص بصلاة الفجر، دون غيرها من الصلوات الجهرية والسرية. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ۲/ ۴۹۹،

کراچی ۲/ ۱۱، مصري ۱/ ٦٢٨)

وقد وضح علامة الشامي في منحة الخالق: ومقتضى هذا أن القنوت النازلة خاص بالفجر. (منحة الخالق على هامش البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ۲/ ۷۹، کوئٹه ۲/ ٤٤، إعلاء السنن، الصلاة، تتمة في بقية أحكام قنوت النازلة، دارالكتب العلمية، بيروت ٦/ ١١٤، ١٢٠، کراچی ٦/ ٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۴)

جمعہ کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنے کی شرعی حیثیت

سوال [۳۰۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ایک عالم صاحب نے جمعہ کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھ دی، بعد نماز عوام میں بہت ہی زیادہ ہنگامہ سا ہوگیا، لوگوں نے دلیل مانگی، تو انہوں نے کوئی صریح دلیل نہیں دی، تو جمعہ کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا عند الحنفیہ کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: دلشاد احمد سپولوی، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: حضرات حنفیہ کے یہاں قنوتِ نازلہ فجر کے علاوہ کسی اور نماز میں پڑھنا مسنون نہیں ہے؛ لہٰذا جمعہ کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا خلاف سنت ہے، پھر بھی نماز جمعہ بلاشبہ درست ہوگئی ہے۔

إن قنوت النازلة عندنا مختص بصلاة الفجر، دون غيرها من الصلوات الجهرية والسرية. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ۲/ ٤٩٩، کراچی ۲/ ۱۱، مصري ۱/ ٦٢٨، منحة الخالق على هامش البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ۲/ ۷۹، کوئٹه ۲/ ٤٤، إعلاء السنن، الصلاة، تتمة في بقية أحكام قنوت

النازلة، دارالکتب العلمیة، بیروت ٦/ ١١٤، ١٢٠، کراچی ٦/ ٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٣/٦/١٤٢٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/٨٤٠١)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٣/٦/١٤٢٥ھ

مغرب، عشاء اور ظہر میں قنوت نازلہ پڑھی جانے والی احادیث منسوخ ہیں

سوال [٣٠٤٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جن احادیث شریفہ میں عشاء ومغرب اور نماز ظہر میں قنوت نازلہ پڑھنا ثابت ہے، حضرات حنفیہ کی طرف سے ان روایات کا کیا جواب دیا جاتا ہے اور ہم کو کس پر عمل کرنا چاہئے؟

المستفتی: حضرت مولانا محمد سالم صاحب، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بخاری ومسلم کی جن روایات میں عشاء، مغرب، ظہر میں قنوت نازلہ پڑھنا ثابت ہے، وہ سب منسوخ ہیں؛ اس لئے حضرات حنفیہ کے یہاں دیگر نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھنا مشروع نہیں ہے۔ اور ہم کو حنفیہ کے مفتی بہ قول پر عمل کرنا چاہئے، یعنی فجر کے علاوہ کسی اور نماز میں قنوت نازلہ نہیں پڑھنی چاہئے۔

وأما القنوت في الصلاة كلها للنوازل، فلم يقل به إلا الشافعيؒ، وكأنهم حملوا ما روى عنه عليه الصلاة والسلام، أنه قنت في الظهر والعشاء، كما في المسلم، وأنه قنت في المغرب أيضا، كما في البخاري على النسخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ٢/ ٤٩٩، مصري قديم ١/ ٦٢٨، کراچی ٢/ ١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢١/ جمادی الاولیٰ ١٤١١ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٦/٢٢٢٤)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢١/٥/١٤١١ھ

٢٣/ باب إدراك الفريضة

جماعت کھڑی ہونے کے وقت سنن ونوافل کا حکم

سوال [٣٠٤٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے حنفی مسلک کے عالم صاحب سے رابطہ قائم کیا، انہوں نے بتایا جس خن میں جماعت میں ہورہی ہے اس خن میں سنت یا نفل نماز پڑھنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

المستفتی: مقتدیان جامع مسجد منڈی دھنورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جماعت کھڑی ہونے کے بعد سنت ونفل مشروع نہیں ہے؛ لیکن چونکہ سنت فجر کے بارے میں حضور ﷺ نے بہت تاکید فرمائی ہے اور از خود بھی اس پر مواظبت اختیار فرمائی؛ اس لئے حنفی مسلک میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کو ایک رکعت ملنے کی بھی قوی امید ہو تو فجر کی سنت تخفیف کے ساتھ ادا کر کے جماعت میں شریک ہوجائے، اب سوال یہ ہے کہ سنت فجر کہاں ادا کریں؟ تو جس خن اور حصہ میں جماعت ہورہی ہے اس میں بلا حائل اور آڑ کے سنت ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے؛ البتہ مسجد میں جماعت کی آڑ سے مثلاً اندر جماعت ہو تو باہر برآمدہ یا صحن میں اور برآمدے میں ہو تو صحن میں اور صحن میں ہو تو جماعت خانہ میں کسی دوسرے مقام پر یا وضو خانہ وغیرہ پر سنت فجر ادا کرسکتے ہیں۔ اور اگر مسجد کا ایک ہی حصہ ہے، تو پھر ستون وغیرہ کی آڑ میں ہوکر اور اگر ستون نہ ہو؛ لیکن مسجد بڑی ہے، تو جماعت کی صف سے دور ہوکر ایک جانب میں سنت فجر ادا کریں۔ اور اگر مسجد بڑی بھی نہ ہو اور نہ کوئی ستون ہو، تو اب سنت فجر چھوڑ کر جماعت میں شریک ہوجائے؛ کیوں کہ جماعت صف میں یا اس کے پیچھے بلا حائل اور آڑ کے سنت ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ٣/ ٤٦١، محمودیہ ٢/ ٢٥٦، رحیمیہ ٣/ ٤٧، امداد الفتاوی ١/ ٤٦٢، امداد الاحکام ٢/ ٢٢٦، کفایت المفتی ٣/ ٢٦٤، زکریا مطول ٤/ ٥٥٩)

ولا يتركها بل يصليها عند باب المسجد إن وجد مكانا، وإلا تركها.

(درمختار) وفي الشامية: وقال في العناية: لأنه لو صلاها فی المسجد كان متنفلا فيه عند اشتغال الإمام بالفرضية، وهو مكروه، فإن لم يكن على باب المسجد موضع للصلاة يصليها في المسجد خلف سارية من سوارى المسجد، وأشدها كراهة أن يصليها مخالطا للصف مخالفا للجماعة، والذي يلى ذلک خلف الصف من غير حائل (قوله: وإلا تركها) ينبغي أن لا يصلى فيه؛ لأن ترک المكروه مقدم على فعل السنة. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، کراچی ٢/ ٥٧، زكريا ٢/ ٥١١، ومثله في البحر، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، زكريا ٢/ ١٢٩، كوئٹه ٢/ ٧٣، هندية، الباب العاشر في إدراك الفريضة، زكريا قديم ١/ ١٢٠، جديد ١/ ١٧٩)

زید کو حنفی مسلک کے جن عالم صاحب نے سنت ونفل سے متعلق جو مسئلہ بتایا ہے، وہ کسی حد تک درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۱۲ھ

فجر کی جماعت کھڑی ہونے کے بعد سنت فجر پڑھنے کی شرعی حیثیت

سوال [۳۰۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز فجر شروع ہوجانے کے بعد سنت فجر کا کیا حکم ہے؟ بعض حضرات جماعت شروع ہوجانے کے بعد سنت پڑھنے پر تنقید کرتے ہیں اور خود فرض سے فراغت کے بعد سنت ادا کرتے ہیں، اس سلسلہ میں امریکہ میں عجیب تشویش پائی جاتی ہے، مفصل ومدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد عبد السبحان، کیلوفورنیا، امریکہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: فجر کی نماز کی بے شمار خصوصیات اور فضائل احادیث میں وارد ہیں، بریں بناء حنفیہ کے نزدیک فجر کی جماعت شروع ہوجانے کے بعد خارج مسجد یا مقتدیوں کی صفوں سے ہٹ کر ستون کے پاس یا مسجد کے کونے میں بشرطیکہ فجر کی جماعت مل جائے تو فجر کی سنتوں کو پڑھنا بلا شبہ جائز ہے؛ لیکن صفوں سے متصل یا جماعت چھوٹنے کا اندیشہ ہو تو اس وقت فجر کی سنتیں پڑھنا مکروہ ہے، جیسا کہ بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل اس پر شاہد ہے؛ البتہ فجر کی سنت اگر رہ جائے تو فجر کی جماعت کے بعد طلوع شمس سے پہلے پہلے سنت کا اعادہ جائز نہیں ہے۔ اور طلوع شمس کے بعد اسے پڑھنے کی گنجائش ہے، مگر وہ سنت نہیں رہے گی بلکہ نفل بن جائے گی۔

عن عائشة –رضي الله عنها– أن النبي صلى الله عليه وسلم لم يكن على شيء من النوافل أشد معاهدة منه على ركعتين قبل الصبح. (صحيح مسلم، الصلاة، باب تعاهد ركعتي الفجر، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، بيت الأفكار، رقم: ٧٢٤، صحيح البخاري، الصلاة، باب تعاهد ركعتي الفجر، و من سماها تطوعا، النسخة الهندية ١/ ١٥٦، رقم: ١١٥٦، ف: ١١٦٩، سنن أبي داؤد، الصلاة، باب ركعتي الفجر، النسخة الهندية ١/ ١٧٨، دارالسلام، رقم: ١٢٥٤)

عن عائشة –رضى الله عنها– أن النبي ﷺ كان لا يدع أربعا قبل الظهر، وركعتين قبل الغداة. (بخاري، الصلاة، باب الركعتين قبل الظهر، النسخة الهندية ١/ ١٥٧، رقم: ١١٦٩، ف: ١١٨٢، سنن أبي داؤد، الصلاة، باب تفريع أبواب التطوع وركعات السنة، النسخة الهندية ١/ ١٧٨، دارالسلام، رقم: ١٢٥٣، سنن النسائي، الصلاة، المحافظة على الركعتين قبل الفجر، النسخة الهندية ١/ ١٩٦، دارالسلام، رقم: ١٧٥٩، مسند الدارمي، دارالمغني ٢/ ٩٠٣، رقم: ١٤٧٩)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا تدعوهما وإن طردتكم الخيل. (أبوداؤد شريف، الصلاة باب في تخفيفهما، النسخة الهندية ١/ ١٧٩، دارالسلام، رقم: ١٢٥٨، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٤٠٥، رقم: ٩٢٤٢)

عـن عـائشة -رضـى الله عـنهـا- عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ركـعتـا الفجر خير من الدنيا وما فيها. (صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب ركعتي سنة الفجر، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، بيت الأفكار، رقم: ٧٢٥، سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في ركعتي الفجر من الفضل، النسخة الهندية ١/ ٩٤، ٩٥، دار السلام، رقم: ٤١٦، سنن النسائي، الصلاة، باب المحافظة على الركعتين قبل الفجر، النسخة الهندية ١/ ١٩٧، دار السلام، رقم: ١٧٦٠، المستدرك، كتاب التطوع، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ٢/ ٤٤٧، رقم: ١١٥٩)

عـن أبـي مـوسـى قـال: أقيمت الصلاة، فتقدم عبدالله بن مسعود إلى أسـطـوانة فـي الـمسـجـد، فـصلى ركعتين، ثم دخل يعني في الصلاة. رواه الطبراني في الكبير، ورجاله ثقات. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٧٥)

عـن عبـدالله بـن أبـي مـوسـىٰ، عـن أبيـه قـال: أقيمت الصلاة، فتقدم عبـدالله إلـى الـمسـجد، فصلى ركعتين، ثم دخل المسجد. (المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ٩/ ٢٧٧، رقم: ٩٣٨٧)

عـن أبـي إسـحـاق أن الـوليـد بن عقبة بعث إلى حذيفة وابن مسعود يسألهما عن الصلاة يوم العيد، فأقيمت صلاة الفجر، فقام ابن مسعود خلف سـارية، فـصلى ركعتين، ثم دخل معهم. (المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ٩/ ٢٨٤، رقم: ٩٤٣٣، وهكذا في شرح معاني الآثار، كتاب الصلاة، باب الرجل يدخل المسجد والإمام في صلاة الفجر، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٤٨٥، رقم: ٢١٥٧-٢١٥٨)

عـن أبـي هريرة -رضي الله عنه- أن رسول الله ﷺ قال: إذا أقيمت الصلاة فـلا صـلاة إلا المكتوبة إلا ركعتي الصبح. (السنن الكبرى، الصلاة، باب كراهية الاشتغال بهما بعد ما أقيمت الصلاة، قديم ٢/ ٤٨٣، دارالفكر جديد ٤/ ٣٥، رقم: ٤٦٥١)

عـن أبـي الـدرداء -رضـي الله عـنـه- قـال: إني لأجئ إلى القوم وهم صـفـوف فـي صلاة الفجر، فأصلى الركعتين، ثم أنضم إليهم. (المصنف لابن ابي شيبة، الصلاة، باب في الرجل يدخل المسجد فى الفجر، مؤسسة علوم القرآن، جديد

٤/ ٣٩٤، رقم: ٦٤٨٢، مصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب هل يصلي ركعتي الفجر إذا أقيمت الصلاة؟ المجلس العلمي ٢/ ٤٤٣، ٤٤٤، رقم: ٤٠٢٠، شرح معاني الآثار، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٤٨٧، رقم: ٢١٦٤)

عن محمد بن كعب، قال: خرج عبدالله بن عمر رضى الله عنهما من بيته، فأقيمت صلاة الصبح، فركع ركعتين قبل أن يدخل المسجد، وهو في الطريق، ثم دخل المسجد، فصلى الصبح مع الناس. (شرح معاني الآثار، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٤٨٦، رقم: ٢١٦١)

عن أبي عثمان الأنصاري قال: جاء عبدالله بن عباس والإمام في صلاة الغداة، ولم يكن صلى الركعتين، فصلى عبدالله بن عباس رضى الله عنهما الركعتين خلف الإمام، ثم دخل معهم. (شرح معاني الآثار، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٤٨٦، رقم: ٢١٥٩)

عن أبي مجلز قال: دخلت المسجد في صلاة الغداة مع ابن عمر وابن عباس رضى الله عنهم، والإمام يصلي، فأما ابن عمر رضى الله عنهما، فدخل في الصف، وأما ابن عباس رضى الله عنهما، فصلى ركعتين، ثم دخل مع الإمام، فلما سلم الإمام قعد ابن عمر مكانه حتى طلعت الشمس، فقام فركع ركعتين. (شرح معاني الآثار، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٤٨٦، رقم: ٢١٥٩)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من لم يصل ركعتي الفجر، فليصلهما بعد ما تطلع الشمس. (ترمذي، الصلاة، باب ماجاء في إعادتهما بعد طلوع الشمس، النسخة الهندية ١/ ٩٦، دارالسلام، رقم: ٤٢٣، صحيح ابن حبان، ذكر الأمر لمن فاتته ركعتا الفجر أن يصليهما بعد طلوع الشمس، دارالفكر ٣/ ٣٢١، رقم: ٢٤٦٩، المستدرك للحاكم، كتاب الصلاة، قديم ١/ ٢٧٤، جديد مكتبه نزار مصطفى الباز ١/ ٤٠٠، رقم: ١٠١٥، سنن الدارقطني، الصلاة، باب قضاء الصلاة بعد وقتها ...... دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٣٧١، رقم: ١٤٢٢)

وفي هامشه: وعند أبي حنيفة وأبى يوسف لا قضاء لسنة الفجر بعد الفوت لا قبل طلوع الشمس ولا بعدها؛ لأنه يبقى نفلا مطلقا؛ لأن السنة ما أداها رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يثبت أنه أداهما في غير الوقت على الإنفراد، وإنما قضاهما تبعا للفرض في ليلة التعريس، والنفل المطلق لا يقضي بعد الصبح، ولا بعد ارتفاعها، وقال محمد: أحب إلي أن يقضيها إلى وقت الزوال؛ لأنه صلى الله عليه وسلم قضاهما بعد ارتفاع الشمس غداة ليلة التعريس. (حاشية ترمذي شريف، كتاب الصلاة، باب ماجاء في إعادتهما بعد طلوع الشمس، مكتبه مريم أجمل فاؤنڈيشن ١/ ٩٦)

وإذا خاف فوت ركعتي الفجر لاشتغاله بسنتها تركها لكون الجماعة أكمل، وإلا بأن رجا إدراك ركعة لا يتركها، بل يصليها عند باب المسجد إن وجد مكانا. (درمختار، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ٢/ ٥٦، زكريا ٢/ ٥١٠)

وتحته في الشامية: قوله: عند باب المسجد: أي خارج المسجد كما صرح به القهستاني، فإن لم يكن في باب المسجد موضع للصلاة يصليها في المسجد خلف سارية من سواري المسجد، وأشدها كراهة أن يصليها مخالطا للصف مخالفا للجماعة، والذي يلى ذلک خلف الصف، من غير حائل. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ٢/ ٥٦، زكريا ٢/ ٥١١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱ر ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۱۱/۱۴۳۴ھ

فجر کی جماعت کے وقت سنت پڑھنا

سوال [۳۰۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اگر فجر کی جماعت ہورہی ہو تو اس وقت فجر کی سنتیں پڑھنا کیسا ہے؟

(۲) اگر سنتیں نہ پڑھ سکے اور جماعت کے بعد کافی وقت ہے، مثلاً رمضان المبارک میں عام طور سے جلدی نماز ہوجاتی ہے، یا بعض مساجد میں عام دنوں میں بھی طلوع آفتاب سے تقریباً آدھا گھنٹہ یا بیس منٹ پہلے نماز ہوجاتی ہے، تو جماعت کے بعد وقت میں گنجائش کی وجہ سے فجر کی سنتیں پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

(۳) حدیث شریف میں "**لاصلوۃ بعد الصبح حتی ترتفع الشمس**" کے الفاظ آئے ہیں، تو "**بعد الصبح**" کا اطلاق کس وقت پر ہوگا؟ متعین فرما کر اس مسئلہ کو واضح فرمائیں۔

المستفتی: جلیل حسن نواب پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) اگر فجر کی جماعت ہورہی ہو اور دونوں رکعت یا ایک رکعت ملنے کی امید ہو، تو پہلے سنت پڑھ لے، پھر جماعت میں شامل ہوجائے۔ اور اگر سنت پڑھنے کی وجہ سے دونوں رکعتیں نکل جانے کا خطرہ ہو تو سنت پڑھے بغیر جماعت میں شامل ہوجائے۔

ومن انتهى إلى الإمام في صلاة الفجر، وهو لم يصل ركعتي الفجر، إن خشي أن تفوته ركعة، ويدرك الأخرى يصلي ركعتي الفجر عند باب المسجد، ثم يدخل، وإن خشي فوتها دخل مع الإمام؛ لأن ثواب الجماعة أعظم. (هداية، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، اشرفيه ۱/ ۱۵۲)

(۲) فجر کی نماز کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے فجر کی چھوٹی ہوئی سنتیں پڑھنا جائز نہیں ہے، اگرچہ سورج طلوع ہونے سے پہلے وقت میں آدھا پون گھنٹہ کی گنجائش ہی کیوں نہ ہو؛ اس لئے کہ طلوع فجر کے بعد سے طلوع شمس تک کے درمیان، اسی طرح عصر کی فرض نماز پڑھنے کے بعد سے غروب تک کے درمیان نفل پڑھنے کی جو ممانعت ہے وہ قلت وقت کی وجہ

سے نہیں ہے؛ بلکہ وقت کی کراہیت کی وجہ سے ہے۔ حدیث پاک میں ان دونوں اوقات میں نفل پڑھنے کی ممانعت آئی ہے اور فجر کی سنت بھی فرض پڑھ لینے کے بعد نفل کے حکم میں ہوجاتی ہے۔ اور فجر کی فرض نماز کے بعد طلوع شمس تک کا وقت اسی طرح عصر کے بعد سے غروب تک کا وقت وقت ناقص کہلاتا ہے۔ اور وقت ناقص میں سنن ونوافل پڑھنا ممنوع ہے۔

عطاء بن يزيد الجندعي، أنه سمع أبا سعيد الخدري يقول: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا صلاة بعد الصبح حتى ترتفع الشمس، ولا صلاة بعد العصر حتى تغيب الشمس. (صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب لا تتحرى الصلاة قبل غروب الشمس، النسخة الهندية ١/ ٨٢، رقم: ٥٧٨، ف: ٥٨٦، مشكوة شريف/ ٩٤)

وأما إذا فاتت وحدها فلا تقضى قبل طلوع الشمس بالإجماع لكراهة النفل بعد الصبح. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ٢/ ٥٧، زكريا ٢/ ٥١٢)

(۳) "**بعد الصبح**" سے مراد "**بعد صلاة الصبح**" ہے؛ اس لئے "**صلاة الصبح**" سے پہلے دو رکعت سنت پڑھنا جائز ہے۔

لا صلاة بعد الصبح، أي بعد صلاته. (مرقاة، كتاب الصلاة، باب أوقات النهي الفصل الأول، إمداديه، ملتان ٣/ ٤٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۳/۲۶ھ

جب جماعت کھڑی ہوجائے تو فجر کی سنت کب تک پڑھی جائے؟

سوال [۳۰۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جب فجر کی جماعت کھڑی ہوجائے تو فجر کی سنت کا کیا حکم ہے؟ جب کہ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ جب جماعت کھڑی ہوجائے تو سنت کو موخر کرکے جماعت میں شامل ہوجائے

اورسلام پھیرنے کے بعد متصلا سنت پڑھ لے، جب کہ اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ اگر آخری قعدہ ملنے کی امید ہے تو پہلے سنت پڑھ لے، اگر یہ امید نہیں ہے تو پھر جماعت میں شامل ہوجائے۔ اور سورج نکلنے کے بعد سنت کی قضاء پڑھ لے۔ پہلی جماعت اس آیت سے استدلال کرتی ہے: ''وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ''.

اور اہل سنت والجماعت کے کیا دلائل ہیں؟ واضح فرمائیں، نیز سنت کے بارے میں راجح قول کیا ہے؟ فقہ کے علاوہ صرف قرآن وحدیث سے جواب واضح فرمائیں۔

المستفتی: نورعالم گلشہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو جماعت یہ کہتی ہے کہ جب جماعت فجر کھڑی ہوجائے تو سنت مؤخر کرکے جماعت میں شریک ہوجائے اور سلام پھیرنے کے بعد متصلا سنت پڑھ لے، ان کی یہ بات درست نہیں ہے؛ کیوں کہ فجر کے بعد سورج نکلنے تک نفل مکروہ ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: نهى رسول الله ﷺ عن صلاتين: بعد الفجر، حتى تطلع الشمس، و بعد العصر حتى تغرب الشمس. (صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب لا يتحرى الصلاة قبل غروب الشمس، النسخة الهندية ۱/ ۸۳، رقم: ۵۸۰، ف: ۵۸۸، صحيح مسلم، كتاب فضائل القرآن، باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها، النسخة الهندية ۱/ ۲۷۵، بيت الأفكار، رقم: ۸۲۵)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من لم يصل ركعتي الفجر، فليصليها بعد ماتطلع الشمس. (الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في إعادتهما بعد طلوع الشمس، النسخة الهندية ۱/ ۹۶، دارالسلام، رقم: ۴۲۳)

اور ان کا استدلال بھی اس آیت: ''وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ'' سے درست نہیں ہے؛ کیوں کہ اس سے صرف تاکید جماعت کا ثبوت ہوتا ہے، یہ آیت اس وضاحت سے خاموش ہے کہ جب فجر کی جماعت کھڑی ہوجائے تو سنت کو چھوڑ کر جماعت میں شامل ہوجائے؛ لہٰذا مذکورہ

استدلال درست نہیں ہے۔اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت مذکورہ استدلال کا مستدل اس وقت بنے گی جب مقتدی سنت پڑھ چکا ہو، اس کے برخلاف اہل سنت والجماعت کی بات درست ہے، کہ اگر امام کے ساتھ قعدہ اخیرہ بھی ملنے کی توقع ہے، تو پہلے فجر کی سنت ادا کرے؛ کیوں کہ احادیث میں فجر کی سنت پڑھنے کی بہت تاکید آئی ہے۔

وروى أن رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يكن على شيء من التطوع أدوم منه عليهما، وأنه قال: لا تتركوهما، وإن طردتكم الخيل.
(طحاوي، كتاب الصلاة، قبيل باب الصلاة في الثوب الواحد، مكتبه رحيميه ١/ ٢٢٠، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٤٨٨، رقم: ٢١٧٢)

عن ابن عمر –رضي الله عنه– أنه جاء والإمام يصلي الصبح، ولم يكن صلى الركعتين قبل صلاة الصبح، فصلاهما في حجرة حفصة، ثم أنه صلى مع الإمام. (طحاوي، كتاب الصلاة، باب الرجل يدخل المسجد والإمام في صلاة الفجر، مكتبه رحيميه ١/ ٢٢٠، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٤٨٦، رقم: ٢١٦٣)

اور سنت کے بارے میں یہی قول راجح ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۲۸ھ

دورانِ جماعت فجر کی سنت کا حکم

سوال [۳۰۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فجر کی سنتوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اگر تشہد ملنے کی امید ہو تو سنت پڑھ لینی چاہئے۔

المستفتی: مقتدیان جامع مسجد منڈی دھنورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص جماعت کھڑی ہونے کے بعد مسجد میں پہنچے

اور اس نے ابھی سنت فجر ادا نہ کی ہو، تو اگر اس کو سنت ادا کرنے کے بعد ایک رکعت ملنے کی قوی امید ہو تو پہلے سنت فجر ادا کرے، پھر جماعت میں شریک ہو۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۳/۲۶۴، زکریا مطول ۴/۱۵۵، رحیمیہ ۳/۴۷)

وإذا خاف الفوت ركعتي الفجر لاشتغاله بسنتها تركها لكون الجماعة أكمل وإلا بأن رجا إدراك ركعة في ظاهر المذهب. (درمختار، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ۲/ ۵۷، زكريا ۲/ ۵۱۰، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، زكريا ۲/ ۱۲۹، كوئٹه ۲/ ۷۳)

زید کو حنفی مسلک کے عالم صاحب نے جو تشہد ملنے کی بات کہی ہے یہ مذہب کے اعتبار سے کمزور ہے؛ بلکہ صحیح اور راجح وہی ہے جو اوپر لکھا گیا کہ ایک رکعت ملنے کی قوی امید پر سنت فجر ادا کرے۔

وقيل: التشهد واعتمده المصنف والشرنبلالي تبعا للبحر، لكن ضعفه في النهر. (درمختار، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ۲/ ۵۷، زكريا ۲/ ۵۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۱۲ھ

فجر کی سنت کب تک پڑھ سکتے ہیں؟

سوال [۳۰۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر فجر میں امام پہلی رکعت میں ہو یا دوسری رکعت میں ہو یا قعدہ میں ہو تب پہلے سنتیں پڑھیں یا جماعت میں شامل ہوں؟ اور اگر معلوم نہ ہو کہ امام پہلی رکعت میں ہے یا دوسری رکعت میں تو کیا کریں؟ پہلے سنتیں پڑھیں یا جماعت میں شامل ہوں؟ اگر سنتیں پڑھنی ہو تو فرض کے بعد یا طلوع آفتاب کے بعد؟ اور قضاء سنتیں کب تک پڑھ سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد اقبال شمسی ہاؤس، طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر امام کے ساتھ دوسری رکعت پانے کی قوی امید ہو تو سنتیں ادا کرلیں، ورنہ ترک کردیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۳/ ۲۶۴، زکریا مطول ۴/ ۵۴۷-۵۵۱)

وإذا خاف فوت ركعتي الفجر لاشتغاله بسنتها تركها لكون الجماعة أكمل وإلا بأن رجا إدراك ركعة في ظاهر المذهب. (درمختار، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ۲/ ۵۷، زكريا ۲/ ۵۱۰)

اگر معلوم نہ ہو کہ امام پہلی رکعت میں ہے یا دوسری رکعت میں ہے؟ تو تحقیق کرلے، اگر یہ گمان غالب ہو کہ امام دوسری رکعت میں ہے، تو سنت ترک کردے اور جماعت میں شریک ہوجائے۔ اور اگر دلی رجحان یہ ہے کہ امام پہلی رکعت میں ہے، تو سنت پڑھ لے اور سنت ترک ہوجانے کی صورت میں سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اس کو پڑھنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ سورج طلوع ہوجانے کے بعد اشراق کے وقت سنت پڑھنے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/ ۲۶۸، جدید زکریا ۳/ ۳۱۷، زکریا مطول عزیز الفتاوی ۱/ ۲۴۱)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا أقيمت الصلاة، فلا صلاة إلا المكتوبة، إلا ركعتي الصبح. (السنن الكبرى للبيهقي، الصلاة، باب كراهية الاشتغال بهما بعد ما أقيمت الصلاة، قديم ۲/ ٤٨٣، دارالفكر جديد ٤/ ٣٥، رقم: ٤٦٥١)

عن ابن عباس –رضي الله عنهما– قال: سمعت غير واحد من أصحاب النبي ﷺ منهم عمر بن الخطاب، وكان من أحبهم إلي، أن رسول الله ﷺ نهى عن الصلاة بعد الفجر حتى تطلع الشمس، وعن الصلاة بعد العصر حتى تغرب. (سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في

كراهية الصلاة، بعد الفجر و بعد العصر، النسخة الهندية ١/ ٤٥، دارالسلام، رقم: ١٨٣)

عن أبی هريرة -رضي الله عنه- عن النبي ﷺ قال: من لم يصل ركعتي الفجر، فليصلهما إذا طلعت الشمس. (صحيح ابن حبان، ذكر الأمر لمن فاتته ركعتا الفجر أن يصليهما بعد طلوع الشمس، دارالفكر ٣/ ٣٢١، رقم: ٢٤٦٩، المستدرك، الصلاة، قديم ١/ ٢٧٤، جديد، مكتبه نزار ١/ ٤٠٠، رقم: ١٠١٥)

والسنن إذا فاتت عن وقتها لم يقضها إلا ركعتي الفجر إذا فاتتا مع الفرض يقضيهما بعد طلوع الشمس إلى وقت الزوال، ثم يسقط، وإذا فاتتا بدون الفرض لا يقضي عندهما خلافا لمحمد. (عالمگيری، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ١/ ١١٢، جديد ١/ ١٧١، شامي كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ٢/ ٥٧، زكريا ٢/ ٥١٠، حاشية الطحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كوئٹه ١/ ٣٠٠، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٢١١، مصري، قديم ١/ ١٤٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۱۰ھ

دوران نماز فجر کی سنت کہاں پڑھی جائے؟

سوال [۳۰۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فجر کی جماعت کھڑی ہے، قاعدہ ملنے کی امید ہے، ہمیں سنتیں پڑھنی ہیں تو یہ سنتیں مسجد کی سرحد کے اندر پڑھیں یا مسجد کی سرحد سے باہر پڑھیں؟ ہمارے یہاں دوندوی حضرات ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر فجر کی جماعت کھڑی ہے اور آپ کو سنتیں پڑھنی ہیں، تو یہ سنتیں جماعت سے اتنی دور پڑھیں جہاں امام کی قراءت یا آواز نہ پہنچے یا مسجد کی حد سے باہر پڑھیں، کیا یہ

مسئلہ صحیح ہے یا غلط؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص جماعت کھڑی ہونے کے بعد مسجد میں آئے اور اس کو ایک رکعت ملنے کی قوی امید ہو، تو جس حصہ میں جماعت ہورہی ہے، اس حصہ سے ہٹ کر یا مسجد بڑی ہونے کی صورت میں جماعت کی صف سے دور ہوکر ایک کنارہ میں تخفیف کے ساتھ سنت ادا کرلے، جماعت کی صف سے متصل بلاحائل اور آڑ کے سنت ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ (مستفاد: رحیمیہ ٣/ ٤٧، احسن الفتاوی ٣/ ٤٦١)

عن أبي الدرداء –رضي اللّٰہ عنه– أنه كان يدخل المسجد والناس صفوف في صلاة الفجر، فيصلي الركعتين في ناحية المسجد، ثم يدخل مع القوم الصلاة. (شرح معاني الآثار، كتاب الصلاة، باب الرجل يدخل المسجد والإمام في صلاة الفجر، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٤٨٧، رقم: ٢١٦٤، المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، باب في الرجل يدخل المسجد في الفجر، موسسة علوم القرآن جديد ٤/ ٣٩٤، رقم: ٦٤٨٢، مصنف عبدالرزاق، كتاب الصلاة، باب هل يصلي ركعتي الفجر إذا أقيمت الصلاة، المجلس العلمي ٢/ ٤٤٣، ٤٤٤، رقم: ٤٠٢٠)

لا يتركها بل يصليها عند باب المسجد إن وجد مكانا، وإلا تركها. (درمختار) وتفصيله في الشامية. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ٢/ ٥٧، زكريا ٢/ ٥١١، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، زكريا ٢/ ١٢٩، كوئٹه ٢/ ٧٣) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٧/٦/١٤٢٢ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٥/ ٢٩٥)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٩/٦/١٤٢٢ھ

فجر کی سنتیں کہاں اور کب تک پڑھی جاسکتی ہیں؟

سوال [۳۰۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ مساجد ایسی ہیں جہاں کوئی آڑ نہیں ہے، وہ شرائط پوری نہیں کرتیں، جہاں فجر کی سنتیں پڑھی جاسکیں؛ لیکن اکثر لوگ پڑھتے ہیں اور اکثر ان کی جماعت کی نماز نکل جاتی ہے، کیا مخالفت جماعت کر کے اور اکثر جماعت چھوڑ کر بھی فجر کی سنتیں پڑھنی چاہئیں۔

المستفتی: ماسٹر عبدالحق صاحب، ہلدوانی لائن اینی تالی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن مساجد میں کوئی آڑ نہیں ہے، ان میں نماز شروع ہونے کے بعد صفوں کے اندر فجر کی سنتیں نہ پڑھی جائیں؛ بلکہ مسجد کے بالکل آخری حصہ میں ایک طرف ہو کر سنتیں پڑھی جائیں اور جماعت کی صفوں کے بیچ میں سنتیں پڑھنی مکروہ ہیں۔ اور قول راجح کے مطابق فجر کی جماعت کھڑی ہونے کے بعد التحیات سے اتنی دیر پہلے تک سنتیں پڑھنی مشروع ہیں، جتنی دیر میں سنت پڑھ کر التحیات ملنے کی امید ہو۔ اور ایک روایت کے مطابق آخری رکعت کے رکوع ملنے کی امید ہو تب سنتیں پڑھی جائیں، ورنہ سنتیں ترک کر دینے کا حکم ہے۔

وقال في العناية: لأنه لو صلاها في المسجد كان متنفلا فيه عند اشتغال الإمام بالفريضة، وهو مكروه، فإن لم يكن على باب المسجد موضع للصلاة يصليها في المسجد خلف سارية من سواري المسجد، وأشدها كراهة أن يصليها مخالطا للصف مخالفا للجماعة، والذي يلي ذلک خلف الصف من غير حائل. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، کراچی ۲/ ۵۷، زکریا ۲/ ۵۱۱)

قال في الشرنبلالية: الذي تحرر عندي أنه يأتي بالسنة إذا كان يدركه، ولو في التشهد بالاتفاق فيما بين محمد وشيخيه، ولا يتقيد بإدراک ركعة. (منحة الخالق على البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة،

زکریا ۲/ ۱۲۹، کوئٹہ ۲/ ۷۳، حلبي کبیر، کتاب الصلاۃ، فصل في النوافل فروع لو ترك، اشرفیہ/ ۳۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۹۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۵/۱۴۲۷ھ

جس ہال میں نماز فجر ہو رہی ہو اس میں سنت پڑھنا

سوال [۳۰۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہماری مسجد کا ایک بڑا ہال ہے، جس کا برآمدہ نہیں ہے؛ البتہ اس کا صحن ہے، جس میں اینٹیں بچھی ہوئی ہیں، اس پر ٹین یا چھپر وغیرہ کا کوئی نظم نہیں ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ فجر کی جماعت شروع ہونے کے بعد ہال کے پیچھے والے حصے میں جماعت کی صفوں سے کافی ہٹ کر یا ستون کے پیچھے سنتیں پڑھی جا سکتی ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ مسجد کا بیرونی حصہ یعنی صحن سخت سردی کی وجہ سے تکلیف دہ بھی ہے اور کپڑوں کے گندے ہونے کا سخت اندیشہ بھی ہے؟

المستفتی: عبد اللہ میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب جماعت کھڑی ہو جائے تو جماعت سے متصل سنتیں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اگر کسی نے فجر کی سنتیں نہیں پڑھی ہیں، تو وہ جماعت کی صفوں سے دور مسجد کے دروازہ کے پاس یا کسی کونے میں ایک طرف جا کر سنت پڑھے، تو اس کی گنجائش ہے اور صفوں کے بیچ میں یا صفوں سے متصل سنتیں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے؛ لہٰذا مسئولہ صورت میں اگر ہال بڑا ہے اور جماعت کی صفوں سے دور ستون کے پیچھے سنن ادا کی جائیں، تو گنجائش ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: إذا أقيمت الصلاة، فلا صلاة إلا المكتوبة. (ترمذی شریف، الصلاۃ، باب إذا أقيمت

الصلاة فلا صلاة إلا المكتوبة، النسخة الهندية ۱/ ۹٦، دارالسلام، رقم: ٤٢١)

ومن حضر وكان الإمام فی صلاة الفرض اقتدی به ولا يشتغل عنه بالسنة في المسجد -إلی قوله- إلا فی الفجر؛ فإنه يصلي سنته، ولو في المسجد بعيدا عن الصف إن أمن فوته. (حاشية الطحطاوي علی مراقي الفلاح، الصلاة، باب إدراك الفريضة، دارالكتاب ديوبند، ص: ٤٥١)

والحاصل أن السنة في سنة الفجر أن يأتی بها في بيته، وإلا فإن كان عند باب المسجد مكان صلاها فيه، وإلا صلاها في الشتوی أو الصيفي إن كان للمسجد موضعان، وإلا فخلف الصفوف عن سارية. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ۲/ ۵۷، زكريا ۲/ ۵۱۱)

ومن انتهی إلی الإمام في صلاة الفجر، وهو لم يصل ركعتي الفجر إن خشي أن تفوته ركعة ويدرك الأخری يصلي عند باب المسجد، ثم يدخل؛ لأنه أمكنه الجمع بين الفضيلتين. (هداية أولين، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، أشرفي بكڈپو/ ۱۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۹۸۵)

جماعت کو حاصل کرنے کے لئے صرف تشہد پر سلام پھیرنا

سوال [۳۰۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی شخص فجر کی نماز میں یا دیگر نمازوں میں سنت پڑھ رہا ہے اور جماعت کھڑی ہوگئی، تو فرض نماز میں شامل ہونے کے لئے قعدہ اخیرہ میں صرف تشہد پڑھ لے اور درود شریف ودعا وغیرہ کو چھوڑ دے، کیا رکعت پکڑنے کی وجہ سے یہ تخفیف کرسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، لالباغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جماعت کوحاصل کرنے کے لئے سنن کے افعالِ واجبہ ادا کرکے افعالِ مسنونہ میں تخفیف کرنے کی گنجائش ہے؛ لہٰذا درود ودعا چھوڑ کر جماعت میں شرکت کی گنجائش ہے۔

لو خاف أنه لو صلی سنة الفجر بوجهها تفوته الجماعة، ولو اقتصر فيها بالفاتحة وتسبيحة في الركوع والسجود يدركها، فله أن يقتصر عليها؛ لأن ترك السنة جائزة لإدراک الجماعة، فسنة السنة أولی.

(شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، مطلب هل الإساءة دون الكراهة، أو أفحش؟ کراچی ۲/ ۵۷، زکریا ۲/ ۵۱۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۷)

فجر کی سنتیں نماز کے فوراً بعد پڑھنا

سوال [۳۰۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں کے لوگ جب فجر کی جماعت کھڑی ہوتی ہے، تو جماعت میں شریک ہوجاتے ہیں، اگرچہ اتنا ٹائم ہوتا ہے کہ سنتیں پڑھ کر جماعت میں شریک ہوجائیں، مگر ایسا نہیں کرتے، جب جماعت ہوجاتی ہے تو فوراً اٹھ کر دعا ختم ہونے سے پہلے سنتیں پڑھ لیتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے یا غلط؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سنت فجر رہ جائے تو اصلاً تو اس کی قضاء لازم نہیں؛

لیکن اگر کوئی پڑھنا ہی چاہے، تو طلوع آفتاب کے بعد پڑھنا جائز ہے، اس سے قبل پڑھنا مکروہ ہے۔

عن أبي هريرة – رضي الله عنه – قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من لم يصل ركعتي الفجر، فليصلهما بعد ما تطلع الشمس. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في إعادتهما بعد طلوع الشمس، النسخة الهندية ١/ ٩٦، دار السلام، رقم: ٤٢٣)

أما إذا فاتت وحدها، فلا تقضى قبل طلوع الشمس بالإجماع لكراهة النفل. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ٢/ ٥٧، زكريا ٢/ ٥١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۲/۶/۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۶/۲۹ھ

۲۴/ باب السنن والنوافل

سنت کی نیت کا طریقہ

سوال [۳۰۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص سنت ادا کرتے وقت نیت میں سنت رسول اللہ کہتا ہے اور دوسرا شخص صرف سنت کہہ کر واسطہ اللہ کے نیت باندھ لیتا ہے، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

(۲) سنت کہاں سے چلی ہے؟ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ سنت خلیل اللہ سے چلی ہے، آپ برائے کرم مکمل ومدلل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: ذوالفقار احمد کٹا باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کی نیت صحیح ہے؛ کیوں کہ سنتوں میں مطلق سنت کی نیت کرنا کافی ہے؛ البتہ احتیاط اس میں ہے کہ سنت پڑھتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی نیت کرے۔

ویکفیه مطلق النية للنفل، والسنة، والتراويح هو الصحيح. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الرابع فى النية، زكريا ١/ ٦٥، جديد ١/ ١٢٣، تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني الفرائض، كوئٹه ١/ ٤٢٨، زكريا ٢/ ٣٩، رقم: ١٦٣٤)

وفي السنة ينوى السنة. (البحر الرائق، كوئٹه ١/ ٢٧٨)

والاحتياط في السنن أن ينوي الصلاة متابعا لرسول الله صلى الله عليه وسلم، كذا في الذخيرة. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الرابع في شروط الصلاة، زكريا قديم ١/ ٦٥، جديد ١/ ١٢٣، تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في الفرائض، كوئٹه ١/ ٤٢٨، زكريا ٢/ ٣٩، رقم: ١٦٣٤، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب

شروط الصلاة، کوئٹه ۱/ ۲۷۸، زکریا ۱/ ۴۸۵)

(۲) سنت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام سے چلی ہے؛ اس لئے کہ سنت نام ہے اس طریقہ کا جو دین میں رائج اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

السنة: هي الطريقة المسلوكة في الدين. (شامي، كتاب الطهارة، مطلب في السنة وتعريفها، زكريا ۱/ ۲۱۹، کراچی ۱/ ۱۰۳، البحر الرائق، كتاب الطهارة، کوئٹه ۱/ ۱۶، زكريا ۱/ ۳۵، قواعد الفقه، اشرفی دیوبند، ص: ۳۸۲)

فسنة الرسول: هي الطريقة التي سلكها رسول الله صلى الله عليه وسلم، وواظب عليها. (تاتارخانية، كتاب الطهارة، الفصل الأول في الوضوء، کوئٹه ۱/ ۹۷، زكريا ۱/ ۲۰۸، رقم: ۵۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۸/۶/۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۶/۱۱ھ

سننِ قبلیہ و بعدیہ سب از قبیل نوافل ہیں

سوال [۳۰۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سننِ قبلیہ اور سننِ بعدیہ از قبیل فرائض ہیں یا از قبیل نوافل؟ واضح فرما دیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سننِ قبلیہ ہوں یا بعدیہ تمام کی تمام از قبیل نوافل ہیں؛ کیوں کہ فقہائے کرام فرائض وواجبات کے علاوہ تمام نمازوں کو تطوع (نفل) سے تعبیر کرتے ہیں، پھر ان میں سے بعض مؤکدہ ہیں اور بعض غیر مؤکدہ۔

كل سنة نافلة (وفي الشامية) قدمنا قبل هذا الباب في آخر المكروهات، تقسيم السنة إلى مؤكدة وغيرها، والكل يسمى نافلة؛ لأنه زيادة على الفرض

لتكميله. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ٢/ ٤٣٨، كراچی ٢/ ٣)

يجب أن يعلم أن التطوع قبل الفجر ركعتان، والتطوع قبل الظهر أربع ركعات، وبعد الظهر ركعتان، وأما قبل العصر، فإنه تطوع بأربع ركعات، والتطوع بعد المغرب ركعتان، وأما التطوع قبل العشاء بأربع ركعات فحسن، والتطوع بعدها ركعتان. (المحيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل الحادي عشر في التطوع قبل الفرض وبعده، المجلس العلمي بيروت ٢/ ٢٣٢، رقم: ١٦٣٦-١٦٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۵۶)

نوافل وسنن گھر پر پڑھنا

سوال [۳۰۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سنن اور نوافل اگر آدمی گھر ادا کرنا چاہے، تو کیا حکم ہے؟ جب کہ ہمارے یہاں ایسے آدمیوں کو مطعون کیا جاتا ہے جو آدمی گھر سنتیں پڑھ کر جماعت میں شریک ہوتا ہے اور بعد کی سنتیں بھی گھر جا کر ادا کرتا ہے۔

المستفتی: محمد ہارون، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اصل یہی ہے کہ نوافل وسنن کو گھر میں ادا کرنا افضل ہے، مگر اس زمانہ میں جب نمازی مسجد سے باہر نکل جاتے ہیں، تو سیدھے گھر جا کر سنن ونوافل میں نہیں لگتے؛ بلکہ دوسرے امور میں لگ جاتے ہیں؛ اس لئے افضل اس زمانہ میں یہی ہے کہ مسجد ہی میں پڑھ لئے جائیں۔

عن زيد بن ثابت -رضي الله عنه- أن رسول الله صلى الله عليه وسلم

إتخذ حجرة –إلى– فصلوا أيها الناس في بيوتكم، فإن أفضل الصلاة صلاة المرء في بيته إلا المكتوبة. (صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب صلاة الليل، النسخة الهندية ١/ ١٠١، رقم: ٧٢٢، ف: ٧٣١)

والأفضل في النفل غير التراويح المنزل إلا لخوف شغل عنها. (درمختار، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، قبيل مطلب سنة الوضوء، كراچی ٢/ ٢٢، زكريا ٢/ ٤٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۶۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۸ھ

سنن ونوافل گھر میں پڑھیں یا مسجد میں؟

سوال [۳۰۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض حضرات ''**إجعلوا في بيوتكم من صلاتكم، ولا تتخذوها قبورا**'' سے استدلال کرتے ہوئے فرائض مسجد میں ادا کرنے کے بعد سنن وغیرہ اپنے گھروں میں پڑھتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ان کا یہ استدلال درست ہے؟ مذکورہ حدیث کا تعلق سنن ونوافل سے ہے یا فرض سے؟

المستفتی: نورحسن کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جن صاحب نے مذکورہ حدیث شریف سے استدلال کر کے فرض نماز مسجد میں پڑھنے کے بعد سنن ونوافل گھروں میں پڑھنے کی بات کہی ہے، وہ صحیح اور درست ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی فرض نماز کے بعد سنن ونوافل اپنی رہائش گاہ میں پڑھا کرتے تھے۔

عن زيد بن ثابت –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ اتخذ حجرة

-إلی- فصلوا أیها الناس في بیوتکم، فإن أفضل الصلاة صلاة المرء في بیته، إلا المکتوبة. (صحیح البخاري، کتاب الصلاة، باب صلاة اللیل، النسخة الهندیة ١/ ١٠١، رقم: ٧٢٢، ف: ٧٣١)

وفي روایة مسلم: فعلیکم بالصلاة في بیوتکم، فإن خیر صلاة المرء في بیته إلا الصلاة المکتوبة. (صحیح مسلم، المساجد، باب استحباب صلاة النافلة في بیته، وجوازها في المسجد، النسخة الهندیة ١/ ٢٦٦، بیت الأفکار، رقم: ٧٨١)

الأفضل في النفل شمل ما بعد الفریضة، وما قبلها لحدیث الصحیحین علیکم بالصلاة في بیوتکم، فإن خیر صلاة المرء في بیته إلا المکتوبة. (شامي، کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، قبیل مطلب سنة الوضوء، کراچی ٢/ ٢٢، زکریا ٢/ ٤٦٤، هندیة، کتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، زکریا قدیم ١/ ١١٣، جدید ١/ ١٧٢، أحسن الفتاوی ٣/ ٢٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/۸/۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۱۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۸/۱۴۲۷ھ

فرائض کے بعد سنن ونوافل کے لئے جگہ بدلنا مسنون ہے

سوال [۳۰۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جماعت کی نماز کے بعد سنت ونوافل کے لئے جگہ بدلنا فرض، واجب یا سنت ہے؟ یہ کتنا ضروری ہے کہ اکثر مسجد کا اندر کا حصہ آدھے سے زیادہ خالی ہوجاتا ہے، جس کی وجہ گرمی کی شدت نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ طریقہ جاڑوں میں بھی اپنایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اکثر مسبوق کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے۔

المستفتی: ماسٹر عبد الحق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: فرض نماز کے بعد سنتوں کے لئے جگہ بدلنا مسنون ومستحب ہے۔ اوراس سلسلہ میں اصل مسنون طریقہ یہی ہے کہ سنتیں اپنی رہائش گاہ میں جاکر ادا کریں؛ لیکن اگر راستہ میں کسی اور کام میں لگنے کا خطرہ ہو یا لاپرواہی سے سنت ترک ہونے کا خطرہ ہو، تو ایسی صورت میں مسجد میں ہی سنت پڑھنی چاہئے جیسا کہ آج کل دستور ہے۔ اوراس میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ مسبوق نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔

عن زيد بن ثابت –رضي الله عنه– حديثا طويلا، وطرفه: فقال لهم رسول الله ﷺ: مازال بكم صنيعكم حتى ظننت أنه سيكتب عليكم، فعليكم بالصلاة في بيوتكم، فإن خير صلاة المرء في بيته، إلا الصلاة المكتوبة. (بخاري، كتاب الأدب، باب ما يجوز من الغضب والشدة لأمر الله؟ النسخة الهندية ٢/ ٩٠٣، رقم: ٥٨٧٥، ف: ٦١١٣)

إذا صلى الرجل المغرب في المسجد بالجماعة يصلي ركعتي المغرب في المسجد إن كان يخاف أن لو رجع إلى بيته يشتغل بشيء، وإن كان لا يخاف فالأفضل أن يصلي في بيته. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الحادي عشر في مسائل التطوع، زكريا ٢/ ٣٠٦، رقم: ٢٥٠٣)

وحيث كان هذا أفضل يراعي ما لم يلزم منه خوف شغل عنها لو ذهب لبيته أو كان في بيته ما يشتغل باله ويقلل خشوعه فيصليها حينئذ في المسجد؛ لأن اعتبار الخشوع أرجح. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، قبيل مطلب سنة الوضوء، كراچی ١/ ٢٢، زكريا ٢/ ٤٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲؍شوال ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۴۸۹)	۱۴۳۲/۱۰/۲۸ھ

فرائض کے بعد نوافل پڑھنے کے لئے جگہ تبدیل کرنا

سوال [۳۰۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس طرح فقہائے کرام نے امام کے لئے لکھا ہے کہ امام سلام پھیر کر جب سنت اور نفلیں پڑھے، تو جس جگہ فرض پڑھے ہیں وہاں سے ہٹ کر دائیں بائیں آگے پیچھے بہر حال ہیئت تبدیل کر کے سنن ونوافل پڑھے اور یہ عمل امام کے لئے مستحب لکھا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کیا مقتدیوں کے لئے بھی یہ مستحب ہے کہ جس جگہ جماعت کے ساتھ فرض نماز پڑھی سلام پھیرنے کے بعد سنت ونفل جگہ بدل کر پڑھیں؟ مع حوالہ تحریر فرمائیں، ہمارے یہاں مسجد میں دار الافتاء کے فیصلہ کا انتظار ہے۔

المستفتی: محمد اصغر سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فرض نماز سے فراغت کے بعد سنن ونوافل جگہ بدل کر پڑھنا امام ومقتدی ومنفرد سب کے لئے مستحب اور افضل ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۱۱۲/۸، کفایت المفتی ۲۶۴/۳، زکریا مطول ۵۶۴/۴-۵۶۶)

عن أبي هريرة –رضى الله عنه– عن النبي ﷺ قال: أ يعجز أحدكم إذا صلى أن يتقدم أو يتأخر عن يمينه، أو عن شماله يعنى السبحة. (ابن ماجة، الصلاة، باب ماجاء في صلاة النافلة حيث تصلى المكتوبة، النسخة الهندية ۱/ ۱۰۳، دارالسلام، رقم: ۱۴۲۷، سنن أبي داؤد، الصلاة، باب في الرجل يتطوع في مكانه الذي يصلي فيه، النسخة الهندية ۱/ ۱۴۴، دارالسلام، رقم: ۱۰۰۶)

أما المتقدي والمنفرد فإنهما إن لبثا أو قاما إلى التطوع فى مكانهما الذي صليا فيه المكتوبة جاز، والأحسن أن يتطوعا في مكان آخر. (شامي كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، كراچى ۱/ ۵۳۱، زكريا ۲/ ۱۴۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۵۰/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۲۵ھ

سننِ قبلیہ چھوٹ جائیں تو کب ادا کریں؟

سوال [۳۰۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فرض سے پہلے کی سنت مؤکدہ چھوٹ جائے تو اس کو کب ادا کریں؟ (فتاوی رحیمیہ ۱/۱۷۰) میں فرض کے بعد کی سنتیں ادا کرنے کے بعد پہلے کی سنتوں کو ادا کرنا لکھا ہے۔ اور ملفوظات فقیہ الامت قسط نمبر ۷ ص: ۲۰ ر پر لکھا ہے کہ فرض کے بعد کی سنتیں ادا کرنے سے پہلے ادا کرلیں اس کے بعد بعد کی سنتیں ادا کریں، ان دونوں میں راجح قول کون سا ہے اور مفتی بہ قول کی نشاندہی کریں، جب کہ فتاوی محمودیہ ۲/۲۰۲ ر پر دونوں طرح درست لکھا ہے، واضح فرمائیں۔

المستفتی: فصیح احمد، مدھوبنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وقت کے اندر اندر چھوٹی ہوئی سنتیں ادا کرنا مسنون ہے، جیسا کہ ظہر سے پہلے چار رکعت سنت ہے، اگر وہ چھوٹ جائے تو فرض کے بعد پڑھنا مسنون ہے، مگر فجر کی سنت اگر چھوٹ جائے تو سورج طلوع ہونے سے پہلے پڑھنا جائز نہیں؛ بلکہ سورج طلوع ہوجانے کے بعد اگر وقت ہو تو گنجائش ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من لم يصل ركعتي الفجر، فليصلهما بعد ما تطلع الشمس. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في إعادتهما بعد ما تطلع الشمس، النسخة الهندية ١/ ٩٦، دارالسلام، رقم: ٤٢٣، سنن الدارقطني، الصلاة، باب قضاء الصلاة بعد وقتها …… دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٣٧١، رقم: ١٤٢٢)

وأما إذا فاتت وحدها فلا تقضى قبل طلوع الشمس بالإجماع لكراهة النفل بعد الصبح، وأما بعد طلوع الشمس (إلى قوله) قال محمد: أحب إلي أن يقضيهما إلى الزوال. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ٢/ ٥٧، زكريا ٢/ ٥١٢)

ہاں البتہ جب ظہر کی سنن قبلیہ فرض کے بعد پڑھی جائیں تو بعد کی دونوں سنتوں کے بعد پڑھی جائے یا پہلے؟ دونوں طرح کے قول موجود ہیں، مگر راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے فرض کے بعد والی دونوں سنتیں پڑھے اس کے بعد پہلے کی چھوٹی ہوئی سنتیں پڑھے۔

عن عائشة –رضي الله عنها– قالت: كان رسول الله ﷺ إذا فاتته الأربع قبل الظهر، صلاها بعد الركعتين بعد الظهر. (سنن ابن ماجة، الصلاة، باب من فاته الأربع قبل الظهر، النسخة الهندية ۸۰، دارالسلام، رقم: ۱۱۵۸)

بخلاف سنة الظهر، فإنه يتركها ثم يأتي بها في وقتها قبل شفعه، إلى قوله: الأصح لحديث عائشة أنه عليه الصلاة والسلام، كان إذا فاتته الأربع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ۲/ ۵۹، زكريا ۲/ ۵۱٤)

ثم قضاها قبل شفعه، أي قبل الركعتين اللتين بعد الفرض (قال المحشي) هذا عند أبي يوسف، وعند محمد يقدم الركعتين، وفيهم من ذكر الخلاف بالعكس، والأصح هو الثاني. (شرح وقاية مع حاشية، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، مكتبه بلال ۱/ ۱۸۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۸۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۵/۲۰ھ

طلباء کو نماز سکھانے کے لئے نفل کی جماعت کرنا

سوال [۳۰۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا مدرسے میں طلبہ کو نماز سکھانے کے لئے نفل کی جماعت ہوسکتی ہے؟ مثلاً ایک شخص امامت کرے اور قراءت جہراً کرے، رکوع اور سجدہ کی تسبیح اور ثناء،

التحیات، درود اور دعا کو بھی جہراً پڑھے اور جو کچھ امام پڑھ رہا ہے اس کو تمام مقتدی دہرائیں، تو آیا یہ درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: نسیم احمد غازی پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بالغوں کے لئے تداعی کے ساتھ نفل کی نماز جائز نہیں ہے، حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے، مقتدی ایک دو ہوں تو جائز ہے، تین ہوں تو اختلاف ہے، چار یا اس سے زیادہ ہوں تو باتفاق حنفیہ مکروہ ہے۔ اور نابالغ بچوں کی جماعت سوال مذکور میں ذکر کردہ طریقہ سے کروانا ان کی تربیت کے واسطے بلا تردد جائز ہے؛ اس لئے کہ بابِ تربیت میں بہت سی ایسی چیزیں جائز ہیں جو بابِ احکام میں جائز نہیں ہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳/ ۶۱، جدید ڈابھیل ۶/ ۴۰۲)

عن عمرو بن شعيب عن أبيه، عن جده قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مروا أولادكم بالصلاة، وهم أبناء سبع سنين، واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين، وفرقوا بينهم في المضاجع. (سنن أبي داؤد، الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة؟ دارالسلام، رقم: ٤٩٥، سنن دارقطني، كتاب الصلاة، باب الأمر بتعليم الصلوات والضرب عليها، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٢٣٧، رقم: ٨٧٧)

يؤمر الصبي بالصلاة قبل البلوغ للاعتياد، كما هو نص حديث الباب، إلا أنها غير واجبة عليه. (العرف الشذي على هامش الترمذي، الصلاة، باب ماجاء متى يؤمر الصبي بالصلاة؟ ١/ ٩٥)

أما اقتداء واحد بواحد، أو اثنين بواحد فلا يكره، وثلاثة بواحد فيه خلاف. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ٢/ ٤٩، زكريا ٢/ ٥٠٠)

التطوع بالجماعة إذا كان على سبيل التداعي يكره. (عالمگیری،

کتاب الصلاۃ، باب الإمامة، الفصل الأول في الجماعة، زکریا قدیم ۱/ ۸۳، جدید ۱/ ۱۴۱)
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۸/۳/۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۱۹/۳۸)

نماز میں ضم سورت سے قبل ”بسم اللہ“ پڑھنا

سوال [۳۰۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورت شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہئے یا نہیں؟ کونسا طریقہ افضل ہے؟

المستفتی: محمد ناصر انصاری، ملکیان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سورۂ فاتحہ کے بعد سورت شروع کرنے سے قبل ”بسم اللہ“ پڑھنا افضل اور بہتر ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۷۵)

ولهذا صرح فی الذخیرة والمجتبی: بأنه إن سمی بین الفاتحة والسورة المقروءة سرا، أو جهرا كان حسنا عند أبي حنيفة. (درمختار مع الشامي، کتاب الصلاۃ، فصل في بیان تالیف الصلاۃ، مطلب قراءۃ البسملة بین السورۃ والفاتحة، کراچی ۱/ ۴۹۰، زکریا ۲/ ۱۹۲، بحر الرائق، باب صفة الصلاۃ، فصل إذا اراد الدخول في الصلاۃ کبر، زکریا ۱/ ۵۴۵، ۱/ ۳۱۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۹۳۲/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱۱/۶ھ

نماز میں ضم سورت سے قبل ''بسم اللہ'' پڑھنا

سوال [٣٠٦٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز میں ''سورۂ فاتحہ'' اور سورت کے درمیان میں ''بسم الرحمٰن الرحیم'' پڑھنا واجب ہے یا سنت یا مستحب؟

المستفتی: عبدالواجد، ٹانڈا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ''سورۂ فاتحہ'' اور سورت کے درمیان ''بسم اللہ'' پڑھنا واجب اور سنت تو نہیں ہے؛ البتہ پڑھ لینا مستحب اور افضل واولیٰ ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ٤/٣٠٢، ١/١٧٦)

إن سمى بين الفاتحة والسورة المقروءة سرا، أو جهرا كان حسنا عند أبي حنيفة رحمه الله. (شامي، كتاب الصلاة، فصل في بيان تاليف الصلاة، مطلب قراءة البسملة بين السورة والفاتحة، كراچی ١/ ٤٩٠، زكريا ٢/ ١٩٢)

ورجحه المحقق ابن الهمام. (شامي، زكريا ٢/ ١٩٢، كراچی ١/ ٤٩٠، البحر الرائق، باب صفة الصلاة، فصل إذا أراد الدخول في الصلاة كبر، زكريا ١/ ٥٤٥، كوئٹه ١/ ٣١٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١۵/ربیع الثانی ١٤٢٢ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣۵/ ٧١٦٧)

سجدوں کے درمیان دعا کس نماز میں پڑھی جائے؟

سوال [٣٠٧٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دونوں سجدوں کے درمیان کیا پڑھا جاتا ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں: "**اللهم اغفر لي،**

وارحمني، واهدني، واجبرني، وعافني، وارزقني'' یہ پڑھنا کیسا ہے اور کس نماز میں یہ دعا پڑھی جائے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دونوں سجدوں کے درمیان کی دعا بعینہٖ اسی ترتیب سے تو نہیں؛ لیکن اس سے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ اسی طرح کی دعا پڑھنا منقول ہے، جیسا کہ ذیل کی حدیث شریف سے واضح ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يقول بين السجدتين: "اللهم اغفرلي، وارحمني، واجبرني، واهدني، وارزقني''. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ما يقول بين السجدتين؟ النسخة الهندية ١/ ٦٣، دارالسلام، رقم: ٢٨٤)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله ﷺ يقول بين السجدتين: ''اللهم اغفرلي، وارحمني، واجبرني، وارفعني، وارزقني''. (المستدرك، الصلاة، مكتبه نزار مصطفى الباز ١/ ٣٩٧، رقم: ١٠٠٤)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– إلى– فقال بين السجدتين: ''اللهم اغفرلي، وارحمني، واجبرني، وارفعني، وارزقني، واهدني''. (المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ١٢/ ٢٠، رقم: ١٢٣٤٩)

اس قسم کی دعائیں نفلوں میں پڑھنا بالاتفاق مستحب ہے۔ اور بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ فرائض میں ان مقامات میں اس قسم کی دعائیں مسنون یا مستحب نہیں اور حدیث شریف نوافل پر محمول ہے۔ ''درمختار'' کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

ويجلس بين السجدتين مطمئنا ...... وليس بينهما ذكر مسنون، وكذا ليس بعد رفعه من الركوع دعاء، وكذا لا يأتي في ركوعه وسجوده بغير التسبيح على المذهب، وما ورد محمول على النفل. (الدرالمختار على هامش ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، كراچی ١/ ٥٠٥-٥٠٦، زكريا

۲/ ۲۱۲-۲۱۳)

مگر حدیث شریف میں فرض نماز میں پڑھنا بھی ثابت ہے؛ اس لئے مقتدیوں کی گرانی کا خیال رکھتے ہوئے پڑھنے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ ان دعاؤں کے پڑھنے سے تعدیل ارکان اطمینان سے ہوجاتا ہے، جیسا کہ قومہ اور جلسہ بین السجدتین کی بحث میں آرہا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۳/۲/۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۵۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۲۵ھ

رباعیات مندوبہ کے قعدۂ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود اور تیسری رکعت میں ثناء کا حکم

سوال [۳۰۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سنن غیر مؤکدہ مثلاً عصر کی قبلیہ سنتیں یا عشاء کی، کیا اس کے قعدۂ اولیٰ میں التحیات کے بعد درود شریف اور دعا وغیرہ پڑھنی چاہئے یا نہیں؟ نیز تیسری رکعت کے شروع میں ثناء وتعوذ پڑھا جائے گا یا نہیں؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: مولانا عبد الناصر صاحب، مدرس مدرسہ ہذا الالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: افضل یہی ہے کہ رباعیات مندوبہ میں دوسری رکعت میں التحیات کے بعد درود شریف اور تیسری رکعت کے شروع میں ثناء وتعوذ وغیرہ بھی پڑھ لئے جائیں۔

الرباعيات المندوبة، فيستفتح ويتعوذ، ويصلي على النبي صلى الله عليه وسلم في ابتداء كل شفع منها. (طحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، فصل في بيان النوافل، قديم ٢١٤، جديد، دارالكتاب ديوبند ٣٩٢)

وفي البواقى من ذوات الأربع يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم ويستفتح ويتعوذ. (درمختار، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب قولهم كل شفع

من النفل صلاۃ لیس مطردا، کراچی ۲/ ۱٦، زکریا ۲/ ٤٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۳۱)

رباعی سنت غیر مؤکدہ کی تیسری رکعت کی ابتداء میں ثناء پڑھنا

سوال [۳۰۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رباعی سنت غیر مؤکدہ میں دو رکعت پڑھنے کے بعد قعدہ میں التحیات اور دعا پڑھنے کے بعد تیسری رکعت میں، پھر ''سبحانک اللہم'' پڑھتے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ اگر یہ صحیح ہے، تو جو لوگ اس طرح نہیں پڑھتے ہیں، ان کی نماز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد اختر کھوکران، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سنن غیر مؤکدہ دو دو رکعت کرکے پڑھنا زیادہ افضل ہے۔ اور اگر چار رکعت کی نیت باندھ لی جائے تو قعدۂ اولیٰ میں التحیات کے بعد درود شریف مکمل پڑھنے کا اختیار ہے، چاہے مکمل پڑھے یا التحیات پڑھ کر کھڑا ہو جائے، اسی طرح جب تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے تو ثناء اور تعوذ پڑھنے اور نہ پڑھنے، دونوں طرح کا اختیار ہے، فقہاء کی عبارات میں دونوں طرح کی باتیں موجود ہیں؛ اس لئے جو شخص پڑھے گا، اس کی نماز بھی بلا کراہت درست ہو جائے گی۔ اور جو نہیں پڑھے گا اس کی نماز بھی درست ہو جائے گی۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۳۱)

وفي البواقي من ذوات الأربع يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم، ويستفتح ويتعوذ ولو نذرا؛ لأن كل شفع صلاة، وقيل: لا يأتي في الكل، وصححه في القنية. (درمختار على شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب

قولهم كل شفع من النفل صلاة ليس مطردا، كراچی ۲/ ۱٦، زكريا ۲/ ٤٥٧، حاشية الطحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، فصل في بيان النوافل، قديم ٢١٤، جديد دارالكتاب ديوبند ٣٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ ؍صفر المظفر ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۲/۲۵ھ

قومہ اور بین السجدتین منقول تسبیح

سوال [۳۰۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فرض نماز میں قومہ اور بین السجدتین کی تسبیح حدیث میں وارد ہیں، پڑھنا مشروع ہے یا نہیں؟ حدیث اور فقہ کی کتابوں کے حوالوں سے جواب تحریر کریں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فرائض کے قومہ اور بین السجدتین حدیث میں منقول تسبیح پڑھنا مستحب ہے، ہاں امام کے لئے اس بات کی رعایت کے ساتھ مستحب ہے کہ مقتدیوں کو گرانی نہ ہوتی ہو؛ کیوں کہ یہ تعدیل ارکان کے لئے اہم ترین ذریعہ ہے؛ اس لئے نوافل کی طرح فرائض میں بھی اس پر عمل ہو جائے تو بہتر ہے۔

عن ابن أبي أوفى قال: كان رسول الله ﷺ إذا رفع ظهره من الركوع قال: سمع الله لمن حمده، اللهم ربنا لك الحمد ملأ السموات وملء الأرض، وملأ ما شئت من شيء بعد. (مسلم شريف، الصلاة، باب ما يقول إذا رفع رأسه من الركوع؟ النسخة الهندية ١/ ١٩٠، بيت الأفكار، رقم: ٤٧٦)

عن أبي سعيد الخدري -رضي الله عنه- أن رسول الله ﷺ كان يقول حين يقول: سمع الله لمن حمده: أللهم ربنا لك الحمد ملأ السماء،

قال مؤمل: ملء السموات، وملء الأرض، وملء ما شئت من شيء بعد. (أبوداؤد شريف، الصلاة، باب ما يقول إذا رفع رأسه من الركوع؟ النسخة الهندية ۱/ ۱۲۳، رقم: ۸٤۷، ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب ما يقول إذا رفع رأسه من الركوع، النسخة الهندية، ص: ٦۲، دارالسلام، رقم: ۸۷۸)

عن رفاعة بن رافع الزرقي قال: كنا يوما نصلي وراء النبي صلى الله عليه وسلم، فلما رفع رأسه من الركعة قال: سمع الله لمن حمده، قال: رجل وراءه ربنا ولك الحمد حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه، فلما انصرف قال: من المتكلم؟ قال: أنا، قال: رأيت بضعة وثلاثين ملكا يبتدرونها أيهم يكتبها أول. (بخاري شريف، الأذان، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۱/ ۱۱۰، رقم: ۷۹۱، ف: ۷۹۹)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يقول بين السجدتين: اللهم اغفر لي وارحمني، وعافني واهدني، وارزقني. (ابوداؤد شريف، الصلاة، باب الدعاء بين السجدتين، النسخة الهندية ۱/ ۱۲۳، دارالسلام، رقم: ۸۵۰)

عن حذيفة أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يقول بين السجدتين: رب اغفرلي رب اغفرلي. (ابن ماجة، باب ما يقول بين السجدتين، النسخة الهندية ۱/ ٦٤، دارالسلام، رقم: ۸۹۷)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يقول بين السجدتين: اللهم اغفرلي، وارحمني، واجبرني، واهدني، وارزقني. (ترمذي، باب ما يقول بين السجدتين، النسخة الهندية ۱/ ٦۳، دارالسلام، رقم: ۲۸٤)

قال يعقوب: سألت أبا حنيفةؒ عن الرجل يرفع رأسه من الركوع في الفريضة أيقول: اللهم اغفرلي؟ قال: يقول: ربنا لك الحمد وسكت، وكذلك بين السجدتين، فقد أحسن حيث لم ينهه عن الاستغفار صريحا، أقول: وفي عدم نهيه عنه إشارة إلى أنه لو فعل لم يكره إذا لو كره لكان الأولى

النهي كما نهي عن القراء ة في الركوع والسجود. (البحر الرائق، زكريا ١/ ٥٦١، كوئٹه ١/ ٣٢١، كذا في تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ١/ ١١٨، زكريا ديو بند ١/ ٣٠٧،)

(ويجلس بين السجدتين مطمئنا، وليس بينهما ذكر مسنون على المذهب) وما ورد محمول على النفل، تحته في الشامي: محمول على النفل، أي تهجدا، أو غيره، ثم الحمل المذكور صرح به المشايخ في الوارد في الركوع والسجود، وصرح به في الحلية في الوارد في القومة والجلسة، وقال: على أنه إن ثبت في المكتوبة فليكن حالة الإنفراد أو الجماعة، والمأمومون محصورون لا يتثقلون بذلك. (شامي، زكريا ٢/ ٢١٣، كراچی ١/ ٥٠٥-٥٠٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۱/۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۳۱۲/۴۰)

اذان سے قبل سنتیں پڑھ لینا کیسا ہے؟

سوال [۳۰۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسجد میں ظہر کا وقت ہونے کے ایک گھنٹہ بعد اذان دی جاتی ہے، کوئی شخص مسجد میں آ کر اذان سے پہلے سنن قبلیہ پڑھ لے تو وہ سنن قبلیہ شمار ہوں گی یا نہیں؟ یا اذان کے بعد دوبارہ پڑھنا لازم ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر نماز کا وقت شروع ہونے کے بعد اذان سے پہلے سنن قبلیہ پڑھ لے تو یہ درست ہے، اذان کے بعد اعادہ لازم نہیں ہے۔

الأذان سنة لأداء المكتوبات بالجماعة، وليس لغير الصلوات

الخمس، والجمعة، نحو السنن، والوتر، والتطوعات، والتراويح، والعيدين أذان ولا إقامة. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، زكريا قديم ١/ ٥٣، جديد ١/ ١١٠)

سنن للفرائض، وخرج بالفرائض ما عداها، فلا أذان للوتر، ولا العيدين، ولا الجنائز، ولا للكسوف، والتراويح والسنن الرواتب. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الأذان، زكريا ١/ ٤٤٤، كراچی ١/ ٢٥٥)

فالمحل الذي يجب فيه الأذان، ويؤذن له الصلوات المكتوبة التي تؤدي بجماعة. (بدائع، كتاب الصلاة، فصل في بيان محل وجوب الأذان، قديم كراچی ١/ ١٥٢، زكريا ١/ ٣٧٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۶/۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۶۱)

صبح صادق کے بعد سنت فجر کے علاوہ نفل پڑھنا

سوال [۳۰۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فجر کا وقت شروع ہونے پر سنت اور فرض کے علاوہ کوئی نفلی نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: ڈاکٹر نسیم احمد، محلّہ مقبرہ درگاہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جی ہاں فجر کا وقت شروع ہونے پر فرض اور سنت فجر کے علاوہ نفل نماز پڑھنا ناجائز اور مکروہ ہے۔

عن عبدالله بن عمر –رضي الله عنهما– قال: قال رسول الله صلى الله

علیه وسلم: لا صلاة بعد طلوع الفجر، إلا ركعتين قبل صلاة الفجر. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من أكثر إذا طلع الفجر أن يصلي أكثر من ركعتين، موسسة علوم القرآن ٥/ ١٢٦، رقم: ٧٤٤٦)

ويكره أن يتنفل بعد طلوع الفجر، بأكثر من ركعتي الفجر؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم لم يزد عليها. (الجوهرة النيرة، كتاب الصلاة، قبيل باب النوافل، دارالكتاب ديوبند ١/ ٨٤، مكتبه إمداديه ملتان ١/ ٨٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رصفر المظفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۶۶۴/۲۵)

صبح صادق کے بعد تہجد کی نیت سے پڑھی گئی نماز سنت فجر کے قائم مقام ہے

سوال [۳۰۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: وقت کا صحیح اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے تہجد کی نفل پڑھنے کے دوران اذان فجر ہوجاتی ہے، آخری دو نفل اذان فجر کے دوران پڑھی گئیں، تو کیا یہ نفل تہجد میں شمار کی جائیں گی یا یہ نفل باطل ہوگئیں، یا سب بیکار ہوگئیں، یا یہ نفل کس درجہ میں آئیں گی؟

المستفتی: عبدالحق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر تہجد کی نیت سے دو رکعت پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ دو رکعتیں صبح صادق کے بعد پڑھی گئی ہیں تو یہی دو رکعتیں فجر کی سنت کے قائم مقام ہوجائیں گی، الگ سے سنت فجر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱/ ۴۴۹)

صحح في المسألة الأولى الإجزاء معللا بأن السنة تطوع فتأدى بنية التطوع. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، قبيل مطلب في لفظة ثمان، كراچی

۲/ ۱۵، زکریا ۲/ ۴۵۵)

وكـذا الحكم من كراهة نفل، وواجب لغيره لا فرض، وواجب لعينه بعد طلوع الفجر سوى سنته حتى لو نوى تطوعا كان سنة الفجر بلا تعيين. (تحته في الشامية:) فلو تهجد بركعتين يظن بقاء الليل، فتبين أنهما بعد الفجر كانتا عن السنة على الصحيح، فلا يصليها بعده، للكراهة. (شامي، كتاب الصلاة، زكريا ۲/ ۳۷، کراچی ۱/ ۳۷۵- ۳۷۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۶/۲۴ھ

فجر کے بعد طلوع آفتاب سے قبل سنت فجر پڑھنا

سوال [۳۰۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر فجر کی جماعت ہورہی ہو اور اتنا وقت نہیں ہے کہ فجر کی سنتیں پڑھ کر جماعت میں شریک ہوسکے اور نماز جماعت سے فراغت کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے اتنا وقت باقی ہے کہ دو رکعت سنت پڑھ کر فارغ ہوجائے، تو کیا اس وقت طلوع آفتاب سے پہلے سنتیں پڑھ لے یا نہیں؟ شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: جلیل حسن بجلی مستری، نواب پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فجر کی چھوٹی ہوئی سنت فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے پڑھنا جائز نہیں ہے، اگرچہ سورج طلوع ہونے سے پہلے وقت میں اتنی گنجائش کیوں نہ ہو۔

عطاء بن يزيد الليثي، أنه سمع أبا سعيد الخدري –رضى الله عنه–

یقول: قال رسول الله ﷺ: لا صلاة بعد صلاة العصر، حتی تغرب الشمس، ولا صلاة بعد صلاة الفجر حتی تطلع الشمس. (مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب الأوقات التي نهي عن الصلاة فیها، النسخة الهندیة ۱/ ۲۷۵، بیت الأفکار، رقم: ۸۲۷، صحیح البخاري، کتاب مواقیت الصلاة، باب لا تتحری الصلاة قبل غروب الشمس، النسخة الهندیة ۱/ ۸۲، رقم: ۵۷۸، ف: ۵۸٦)

وأما إذا فاتت وحدها فلا تقضی قبل طلوع الشمس بالإجماع لکراهة النفل بعد الصبح، وأما بعد طلوع الشمس، فکذلک عندهما، وقال محمد: أحب إلي أن یقضیها إلی الزوال، کما في الدرر. (شامي، کتاب الصلاة، باب إدراك الفریضة، کراچی ۲/ ۵۷، زکریا ۲/ ۵۱۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ صفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲٦۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۲ھ

فجر کی سنت امام سے آگے پڑھنا

سوال [۳۰۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: برآمدے میں فجر کی جماعت ہورہی ہے اور باہر صحن میں بارش ہورہی ہے، مسجد اندر سے خالی ہے، اس حالت میں امام سے آگے جاکر سنت پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: مقتدیان جامع مسجد منڈی دھنورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر برآمدے میں نماز ہورہی ہے اور صحن میں بارش ہورہی ہے، تو اگر اندر جانے کا راستہ ہو اور سنت ادا کرنے کے بعد نمازیوں کے سامنے گذرے بغیر باہر آکر جماعت میں شرکت کرنا ممکن ہو تو پھر اندر کے حصے میں امام سے آگے

سنت فجر ادا کرنے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۳/ ۴۷، جدید زکریا ۴/ ۱۳۵)

لیکن اگر اندر جانے کا کوئی راستہ نہ ہو اور نمازیوں کے سامنے گذرے بغیر جماعت میں شرکت کرنا ممکن نہ ہو تو پھر اندر جا کر سنت پڑھنا جائز نہ ہوگا؛ بلکہ ایسی صورت میں سنت چھوڑ کر جماعت میں شریک ہوجائے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۳/ ۶۱، جدید ڈابھیل ۶/ ۶۹۵)

قال أبو جهيم: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لو يعلم المار بين يدي المصلي ما ذا عليه، لكان أن يقف أربعين خيرا له من أن يمر بين يديه، قال أبو النضر: لا أدري، قال: أربعين يوما أو شهرا أو سنة. الحديث (صحيح البخاري، الصلاة، باب إثم المار بين يدي المصلي، النسخة الهندية ١/ ٧٣، رقم: ٥٠٤، ف: ٥١٠)

ويكره المرور بين يدي المصلي. (خانية على الهندية، كتاب الصلاة، باب الحدث في الصلاة، وما يكره فيها، وما لا يكره، زكريا ١/ ١١٩، زكريا جديد ١/ ٧٥، شامي، باب ما يفسد الصلاة، مطلب إذا قرأ تعالىٰ جدك بدون ألف، زكريا ٢/ ٣٩٨، كراچی ١/ ٦٣٤، هداية، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، و ما يكره فيها، اشرفي ديو بند ١/ ١٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۱۲ھ

فجر کی سنت فرض کے بعد پڑھنا

سوال [۳۰۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فجر کی نماز کی سنت فجر کے فرض کے بعد پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ جب کہ کافی وقت ہے، سورج کے طلوع ہونے میں۔ اور ہم نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ پڑھ سکتے ہیں، صحیح کیا

ہے، غلط کیا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں آپ برائے مہربانی ہم کو آگاہ کریں۔

المستفتی: محمد فیروز عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فجر کی سنت فرض نماز کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے پڑھنا جائز نہیں ہے، اگرچہ سورج طلوع ہونے میں کافی وقت ہو۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۲۷۶، فتاوی رشیدیہ/۳۶۳)

عن ابن عباس –رضي الله عنهما– قال: سمعت غير واحد من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، منهم عمر بن الخطاب، وكان أحبهم إلي، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن الصلاة بعد الفجر، حتى تطلع الشمس، وبعد العصر، حتى تغرب الشمس. (صحيح مسلم، كتاب فضائل القرآن، باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها، النسخة الهندية ١/ ٢٧٥، بيت الأفكار، رقم: ٨٢٦)

وأما إذا فاتت وحدها فلا تقضى قبل طلوع الشمس بالإجماع لكراهة النفل بعد الصبح. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچى ٢/ ٥٧، زكريا ٢/ ٥١٢، هدايه، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، أشرفى ١/ ١٥٢، رشيديه ١/ ١٣٢، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٢١١، حاشية الطحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كوئٹه ١/ ٣٠٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۱۰ھ

فجر کی سنت دو کی جگہ چار پڑھ لیں تو کیا حکم ہے؟

سوال [۳۰۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سنت فجر اگر دو کے بجائے چار پڑھ لے بھول کر تو مزید دو رکعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد طیب فیل خانہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: فجر میں دو رکعت سنت کے بجائے چار رکعت پڑھ لے تو دو رکعت سنت ہو جائیں گی اور مزید دو رکعت کراہت کے ساتھ نفل ہو جائیں گی؛ اس لئے کہ فجر کی اذان کے بعد سنت فجر کے علاوہ نفل مکروہ ہے۔

عن عبدالله بن عمر -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا صلاة بعد طلوع الفجر، إلا ركعتين قبل صلاة الفجر.

(المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، من أكثر إذا طلع الفجر أن يصلي أكثر من ركعتين، مؤسسة علوم القرآن ٥/ ١٢٦، رقم: ٧٤٤٦)

ويكره أن يتنفل بعد طلوع الفجر بأكثر من ركعتي الفجر؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم لم يزد عليها. (الجوهرة النيرة، كتاب الصلاة، قبيل باب النوافل، دارالكتاب ديوبند ١/ ٨٤، إمداديه ملتان ١/ ٨٤)

يكره فيه التطوع بأكثر من سنة الفجر. (هندية، كتاب الصلاة، باب المواقيت، الفصل الثالث في بيان الأوقات التي لاتجوز فيها الصلاة، وتكره فيها، زكريا قديم ١/ ٥٢، جديد ١/ ١٠٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۱۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۴/۶ھ

فجر کی سنت دو کے بجائے بھول سے چار رکعت پڑھنا

سوال [۳۰۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی شخص نماز فجر کی دو رکعت سنت کو بھول کر چار رکعت پڑھ لے، تو اس صورت میں جواز اور عدم جواز کی کتنی صورتیں ہیں اور مزید دو رکعت کا کیا حکم ہے؟ مفصل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد شمیم قاسمی، مہاراشٹری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: فجر میں دو رکعت سنت کے بجائے اگر چار رکعت پڑھ لے، تو دو رکعت سنت ہو جائیں گی اور مزید دو رکعت کراہت کے ساتھ نفل ہو جائیں گی؛ اس لئے کہ فجر کی اذان کے بعد سنت فجر کے علاوہ نفل پڑھنا مکروہ ہے۔

عن عبدالله بن عمر –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا صلاة بعد طلوع الفجر، إلا ركعتين قبل صلاة الفجر.

(المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، من أكثر إذا طلع الفجر أن يصلي أكثر من ركعتين، مؤسسة علوم القرآن ٥/ ١٢٦، رقم: ٧٤٤٦)

ويكره أن يتنفل بعد طلوع الفجر بأكثر من ركعتي الفجر؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم لم يزد عليها. (الجوهرة النيرة، كتاب الصلاة، قبيل باب النوافل، دارالكتاب ديوبند ١/ ٨٤، إمداديه ملتان ١/ ٨٤)

يكره فيه التطوع بأكثر من سنة الفجر. (هندية، كتاب الصلاة، باب المواقيت، الفصل الثالث في بيان الأوقات التي لاتجوز فيها الصلاة، وتكره فيها، زكريا قديم ١/ ٥٢، جديد ١/ ١٠٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۶ھ

صبح صادق کے بعد قبل الاذان یا بعدہ تحیۃ المسجد پڑھنا

سوال [۳۰۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صبح صادق کے بعد مسجد میں قبل اذان یا بعد اذان تحیۃ المسجد یا تحیۃ الوضوء پڑھنا کیسا ہے؟ کتب حدیث کے حوالہ کے ساتھ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عرفان احمد قاسمی، گونڈوی، مدرسہ تنویر العلوم دارا پور، پرتاب گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: طلوع فجر کے بعد فجر کی دو رکعت سنت کے علاوہ دیگر نوافل کا پڑھنا مکروہ تحریمی ہے؛ اس لئے تحیۃ المسجد بھی الگ سے پڑھنا مکروہ ہوگا۔

عن عبدالله بن عمر -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا صلاة بعد طلوع الفجر، إلا ركعتي الفجر. (مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي ۳/ ۵۳، رقم: ۴۷۵۷، سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء لا صلاة بعد طلوع الفجر إلا ركعتين، النسخة الهندية ۱/ ۹۶، دارالسلام، رقم: ۴۱۹)

وقتان آخران يكره فيهما التطوع، وهما: بعد طلوع الفجر إلى طلوع الشمس، إلا ركعتي الفجر. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الأول المواقيت، زكريا ۲/ ۱۵، رقم: ۱۵۱۹، كوئٹه قديم ۱/ ۴۰۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۱/۱۱/۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۱۱/۱۳ھ

فجر کی جماعت کھڑی ہوجائے تو سنت کب تک پڑھ سکتے ہیں؟

سوال [۳۰۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک شخص نے ابھی سنت فجر نہیں پڑھی کہ جماعت کھڑی ہوگئی، اب یہ سنت پڑھے یا جماعت میں شریک ہو؟ اور سنت فجر کب تک پڑھی جاسکتی ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر اس کو سنت پڑھ کر جماعت کے ساتھ ایک رکعت ملنے کی امید ہو، تو سنت پڑھ لینی چاہئے، پھر جماعت میں شریک ہو۔ اور اگر سنت سے فراغت کے بعد ایک رکعت ملنے کی امید نہ ہو تو سنت چھوڑ کر جماعت میں شریک ہوجانا چاہئے۔ (مستفاد: کفایت المفتی، جدید۳/ ۳۱۱، قدیم۳/۲۶۲)

رجل انتهى إلى الإمام والناس في صلاة الفجر، إن خشي أن تفوته ركعة من الفجر بالجماعة، ويدرك ركعة صلى سنة الفجر ركعتين عند باب المسجد، ثم دخل المسجد، فيصلي مع القوم، وإن خاف أن تفوته الركعتان جميعا دخل مع القوم في صلاتهم. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الحادي عشر مسائل التطوع، زكريا ۲/ ۳۰۸، رقم: ۲۵۱۱، كذا في الهداية، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، أشرفي ۱/ ۱۵۲، شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ۲/ ۵۷، زكريا ۲/ ۵۱۰، العرف الشذي على هامش الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في إعادتهما بعد طلوع الشمس، ص: ۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/۴/ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۸۰)

فجر کی سنت چھوٹ جائے تو قضاء کا کیا حکم؟

سوال [۳۰۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی کی سنت فجر چھوٹ جائے اور طلوع آفتاب ہوجائے تو صرف سنت کی قضاء کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فجر کی سنت چھوٹ جائے تو اس کی قضا نہیں ہوتی؛ اس لئے کہ سنتوں کی قضا نہیں ہے، تاہم ان دو رکعتوں کا طلوع آفتاب کے بعد پڑھ لینا بہتر ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۷۷۴، محمودیہ، ڈابھیل جدید ۷/ ۱۹۵، میرٹھ ۱۱/ ۲۵۵)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من لم يصل ركعتي الفجر، فليصلهما بعد ماتطلع الشمس. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في إعادتهما بعد طلوع الشمس، النسخة الهندية ۱/ ۹۶، دارالسلام، رقم: ٤٢٣، صحيح ابن حبان، ذكر الأمر لمن فاتته ركعتا الفجر أن يصليهما بعد طلوع الشمس، دارالفكر ٣/ ٣٢١، رقم: ٢٤٦٩، المستدرك للحاكم، الصلاة، قديم ١/ ٢٧٤، جديد مكتبه نزار مصطفى الباز ١/ ٤٠٠، رقم: ١٠١٥، سنن الدار قطني، الصلاة، باب قضاء الصلاة، بعد وقتها، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٣٧١، رقم: ١٤٢٢)

وركعتا الفجر إذا فاتتا وحدهما بأن جاء رجل ووجد الإمام في صلاة الفجر، فدخل مع الإمام في صلاته...... أنها لا تقضى قبل طلوع الشمس، ولا بعده قياسا ...... وتقضى بعد طلوع الشمس استحسانا إلى وقت الزوال. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الحادي عشر، باب مسائل التطوع، زكريا ٢/ ٣٠٢، رقم: ٢٤٩٤، كذا في الشامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، كراچی ٢/ ٥٧، زكريا ٢/ ٥١٢، بدائع، كتاب الصلاة، فصل وأما بيان السنة إذا فاتت عن وقتها هل تقضى أم لا؟ زكريا ١/ ٦٤٣، حلبي كبير، كتاب الصلاة، فروع لو ترك سنة الفجر، ص: ٣٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۹۳)

ظہر کے بعد قبلیہ چار رکعت کو مقدم کرے یا بعدیہ دو رکعت کو؟

سوال [۳۰۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ظہر سے قبل ظہر کی سنت کسی وجہ سے نہیں پڑھ سکا، اب جب فرض نماز سے فارغ ہوجائے تو پہلے جو چار رکعت سنت فوت ہوئی اس کو مقدم کرے یا ظہر کے بعد جو دو رکعت سنت ہے اس کو مقدم کرکے پڑھے؟

المستفتی: حافظ طاہر حسین، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دونوں طرح پڑھنا درست ہے؛ البتہ بہتر یہ ہے کہ پہلے دو رکعت پڑھے، اس کے بعد فوت شدہ چار رکعت پڑھے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۲/۲۰۲، فتاوی دارالعلوم ۴/۴۲۲)

عن عائشة –رضي الله عنها– قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا فاتته الأربع قبل الظهر صلاها بعد الركعتين بعد الظهر. (ابن ماجه شريف، الصلاة، باب من فاتته الأربع قبل الظهر، النسخة الهندية ١/ ٨٠، دارالسلام، رقم: ١١٥٨)

فإنه إن خاف فوت ركعة يتركها ويقتدى، ثم يأتي بها على أنها سنة في وقته، أي الظهر قبل شفعه عند محمد، وبه يفتي. وفي الشامي: لكن رجح في الفتح تقديم الركعتين، قال فى الإمداد، وفي فتاوى العتابية: أنه المختار، وفي مبسوط شيخ الإسلام: أنه الأصح. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ٢/ ٥٩، زكريا ٢/ ٥١٣، ٥١٤، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، الصلاة، باب إدراك الفريضة، دارالكتاب ديوبند، ص: ٤٥٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱رمحرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۴۱۷)

ظہر کی سنت چھوٹ جائیں تو نماز کے بعد کیا ان کی اہمیت کم ہوجاتی ہے؟

سوال [۳۰۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ظہر کی جماعت کھڑی ہوتے ہی جماعت میں شریک ہوگئے، پہلی چار سنتیں رہ گئیں، یہ چار سنتیں ویسی ہی مؤکدہ اہمیت کے ساتھ باقی رہتی ہیں یا اہمیت کم ہوجاتی ہے، کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ظہر کی پہلی چار سنتیں جماعت کے بعد مؤکدہ نہیں رہتیں کیا یہ صحیح ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ظہر کی چار سنت اگر کوئی فرض سے پہلے نہیں پڑھ سکا، تو فرض کے بعد دوسنت ادا کرنے کے بعد چار سنت ادا کرنی چاہئیں اور فرض کے بعد بھی چار سنتیں مؤکدہ ہی رہتی ہیں، ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا؛ اس لئے کہ وقت کامل باقی رہتا ہے۔

عن عائشة -رضي الله عنها- أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا لم يصل أربعا قبل الظهر، صلاهن بعدها. (سنن الترمذي، الصلاة، باب آخر، النسخة الهندية ۱/ ۹۷، دارالسلام، رقم: ۴۲۶)

عن عائشة -رضي الله عنها- قالت: كان رسول الله ﷺ إذا فاتته الأربع قبل الظهر، صلاها بعد الركعتين بعد الظهر. (سنن ابن ماجة، الصلاة، باب من فاتته الأربع قبل الظهر، النسخة الهندية ۱/ ۸۰، دارالسلام، رقم: ۱۱۵۸)

بخلاف سنة الظهر، وكذا الجمعة، فإنه إن خاف فوت ركعة يتركها، ويقتدي، ثم يأتي بها على أنها سنة في وقته، أي الظهر، وتفصيله في الشامي. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ۲/ ۵۹، زكريا ۲/ ۵۱۳) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۶/۲۹ھ

عصر وعشاء کی سنتیں مستحب ہیں

سوال [۳۰۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عصر وعشاء کی شروع کی چار سنتیں اگر فوت ہوجائیں، تو وہ شخص گنہگار رہے یا نہیں؟ اگر ایسا فعل امام سے ہوجائے تو کیا اس امام کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟ جواب مع ثبوت عنایت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: یہ سنتیں استحباب کے درجہ میں ہیں، ان کے تارک گنہگار نہ ہوں گے؛ البتہ پڑھنے سے ثواب ملتا ہے۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: رحم الله امرأ صلى قبل العصر أربعا. (سنن أبي داؤد، الصلاة، باب الصلاة، قبل العصر، النسخة الهندية ۱/ ۱۸۰، دارالفكر، رقم: ۱۲۷۱)

وأما قبل العصر، فإن تطوع بأربع ركعات فحسن، وخيره بين أن يفعل وبين أن لا يفعل. وفي الكافي: وروى أنه عليه السلام كان يصلي قبل العصر ركعتين، والأربع أفضل. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الحادي عشر في مسائل التطوع، زكريا ۲/ ۲۹۹، رقم: ۲٤۸۵)

وأما التطوع قبل العشاء، فإن تطوع قبلها بأربع ركعات فحسن. (الفتاوى التاتارخانية، الصلاة، الفصل الحادي عشر في مسائل التطوع، زكريا ۲/ ۳۰۰، رقم: ۲٤۸۸)

وندب الأربع قبل العصر والعشاء. (هندية، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ۱/ ۱۱۲، جديد ۱/ ۱۷۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: رجسٹر خاص)

نماز عصر سے قبل نوافل

سوال [۳۰۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عصر کی نماز کا وقت شروع ہو جانے پر فرض نماز سے قبل نفل نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اور شکریہ والے نفل بھی پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتية: مسماۃ رقیہ خاتون، زوجہ مقبول احمد، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عصر کی فرض نماز ادا کرنے سے پہلے جب وقت موجود ہو تو کوئی بھی نفل نماز پڑھ سکتے ہیں، چاہے شکرانہ نماز ہو یا مطلقاً نفل ہو، یا صلاۃ الحاجہ ہو، یا تحیۃ المسجد ہو، سب جائز ہے۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: رحم الله امرأ صلى قبل العصر أربعا.

(مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۱۱۷، رقم: ۵۹۸، سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في الأربع قبل العصر، النسخة الهندية ۱/ ۹۸، دارالسلام، رقم: ۴۳۰، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ۱/ ۵۸۸، رقم: ۱۱۹۳، سنن أبي داؤد، الصلاة، باب الصلاة، قبل العصر، النسخة الهندية ۱/ ۱۸۰، دارالفكر، رقم: ۱۲۷۱)

عن علي –رضي الله عنه– قال: كان النبي صى الله عليه وسلم يصلي قبل العصر أربع ركعات. الحديث (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في الأربع قبل العصر، النسخة الهندية ۱/ ۹۸، دارالسلام، رقم: ۴۲۹)

ويجوز التطوع قبل العصر. (خانية على هامش الهندية، كتاب الصلاة، قبيل باب استقبال القبلة، زكريا ۱/ ۷۴، جديد ۱/ ۴۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ رجب ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/ ۷/ ۱۴۳۱ھ

عصر سے قبل تحیۃ الوضوء پڑھنا

سوال [۳۰۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی عصر کے وقت اذان ہونے کے بعد تحیۃ الوضوء یا تحیۃ المسجد ادا کرنا چاہے، تو شرعاً کیا حکم ہے؟ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: شفیق احمد بھائے پوری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عصر کی اذان کے بعد فرض کی ادائیگی سے قبل تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھنا شرعاً درست ہے۔ اور عصر کی نماز کے بعد کسی قسم کی سنن ونوافل پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم دیوبند۲/ ۷۰)

عن ابن عباس –رضي الله عنهما– قال: سمعت غير واحد من أصحاب النبي ﷺ منهم عمر بن الخطاب، وكان من أحبهم إلي: أن رسول الله ﷺ نهى عن الصلاة بعد الفجر، حتى تطلع الشمس، وعن الصلاة بعد العصر، حتى تغرب الشمس. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في كراهية الصلاة بعد العصر و بعد الفجر، النسخة الهندية ۱/ ۴۵، رقم: ۱۸۳)

ويكره أن يتنفل بعد الفجر حتى تطلع الشمس، وبعد العصر حتى تغرب، لما روى أنه عليه السلام نهى عن ذلک. (هداية، كتاب الصلاة، باب المواقيت، فصل في الأوقات التي تكره فيها الصلاة، أشرفي ديوبند ۱/ ۸۵)

ووقتان آخران يكره فيهما التطوع، وهما: بعد طلوع الفجر إلى طلوع الشمس، إلا ركعتي الفجر، وما بعد صلاة العصر إلى وقت غروب الشمس. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الأول في المواقيت، زكريا ۲/ ۱۵، رقم: ۱۵۱۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رصفر ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۴/۲۵ھ

جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت مؤکدہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قبل صلاۃ الجمعہ چار رکعت نماز سنت ہیں یا غیر سنت؟ اگر سنت ہیں تو کونسی سنت شریعت کی نظر میں اس کا کیا حکم ہے؟ بالدلیل زحمت گوارہ فرمائیں۔

المستفتی: محمد شاہد کٹیہاری، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمعہ سے قبل چار رکعت سنت مؤکدہ ہیں۔

عن ابن عباس – رضي الله عنه – قال: كان النبي ﷺ يركع قبل الجمعة أربعا لا يفصل في شيء منهن. (سنن ابن ماجة، الصلاة، باب ماجاء في الصلاة قبل الجمعة، النسخة الهندية ۱/ ۷۹، دارالسلام، رقم: ۱۱۲۹)

عن ابن عباس – رضي الله عنه – قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم، يركع قبل الجمعة أربعا، وبعدها أربعا، لا يفصل بينهن. (المعجم الكبير للطبراني، داراحياء التراث العربي ۱۲/ ۱۲۹، رقم: ۱۲۶۷۴)

وسن مؤكدا أربع قبل الجمعة، وأربع بعدها بتسليمة. (الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في السنن والنوافل، زكريا ۲/ ۴۵۱، كراچی ۲/ ۱۲، كوئٹه ۱/ ۴۲۷، الأشباه، قديم ص: ۶۴، عالمگيری، الصلاة، الباب التاسع في النوافل، زكريا ۱/ ۱۱۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/۴/۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۱۷۵۹)

جمعہ سے قبل چار رکعت سنت کا تحقیقی جائزہ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّي عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ أَمَّا بَعْد! جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنا سنت

ہے،اور حضرات حنفیہ کے نزدیک یہ چاروں رکعت سنت مؤکدہ ہیں، اس سلسلے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیم جوزیؒ نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ جمعہ سے پہلے آج کل کے زمانہ میں جو اذان اول دی جاتی ہے وہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جاری ہوئی، حضور ﷺ کے زمانہ میں وہ اذان نہیں تھی، بلکہ منبر کے پاس خطیب کے سامنے جو اذان دی جاتی ہے وہی ایک اذان تھی، تو جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت پڑھنے کا موقع کہاں تھا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام جمعہ میں جلدی پہنچنے کی کوشش کرتے تھے، جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے، اور منبر کے پاس جو اذان دی جاتی ہے اس اذان سے پہلے حضورؐ اور صحابہ کرام کا چار رکعت پڑھنے کا معمول رہا ہے، اور ان چار رکعت کا پڑھنا کسی اذان پر موقوف نہیں تھا؛ بلکہ زوال کے بعد خطبۂ جمعہ سے پہلے پڑھنے کا معمول رہا ہے، پھر یہی چار رکعت حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے اذانِ اوّل کے بعد پڑھی جانے لگیں، جیسا کہ ہم آگے متعدد صحابہ کرام سے روایت پیش کریں گے، اسی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ لوگوں کو تاکید سے حکم فرمایا کرتے تھے کہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھ لیا کریں؛ لہٰذا ہم اس سلسلہ میں ناظرین کے سامنے دس روایات پیش کرتے ہیں، جن میں سے متعدد صحابہ کا عمل صحیح سندوں کے ساتھ پیش کریں گے، اور چند مرفوع روایات ان کی تائید میں پیش کریں گے اور مرفوع روایات کو تائید میں اس لئے پیش کریں گے کہ ان کی سند کے کچھ راویوں پر محدثین نے کلام کیا ہے، اور ان کو بنیاد نہیں بنائیں گے۔

جمعہ سے پہلے چار سنتوں کی روایات

(۱) عبد الرزاق عن الثوري عن عطاء بن السائب عن أبي عبدالرحمن السلمي قال: كان عبدالله يأمرنا أن نصلّي قبل الجمعة أربعاً، وبعدها أربعاً.

(مصنف عبد الرزاق ۳/ ۲۴۷ برقم: ۵۵۲۵، إعلاء السنن بيروت ۷/ ۱۰ بريم: ۱۷۱۶)

حضرت امام ابو عبدالرحمٰن سلمی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہم لوگوں کو جمعہ سے پہلے چار رکعت اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھنے کا حکم فرمایا کرتے تھے۔

(۲) عبد الرزاق عن معمر عن قتادة أن ابن مسعودؓ كان يصلّي قبل الجمعة أربع ركعات، وبعدها أربع ركعات.

(مصنف عبد الرزاق ۳/ ۲٤۷ برقم: ۵۵۲٤)

امام قتادہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے، اور جمعہ کے بعد بھی چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

(۳) عن عبدالله بن عمرؓ أنه كان يصلّي قبل الجمعة أربعاً لايفصل بينهن بسلام، ثم بعد الجمعة ركعتين، ثم أربعاً.

(طحاوي شريف ۱/ ٤۳۵ برقم: ۱۹۱۹)

جبلہ بن سحیم عبداللہ بن عمرؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے اور ان چاروں رکعتوں کے درمیان سلام کے ذریعہ سے فاصلہ نہیں فرماتے تھے، اور جمعہ کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے، اور پھر چار رکعت پڑھتے تھے۔

(٤) عن إبراهيم أن عبد الله بن مسعود كان يصلّي قبل الجمعة أربعا وبعدها أربعا لايفصل بينهن بتسليم.

(طحاوي شريف ۱/ ٤۳٦، برقم: ۱۹۲۵)

حضرت امام ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے، اور جمعہ کے بعد بھی چار رکعت پڑھتے تھے، اوران رکعتوں کے درمیان سلام کے ذریعہ سے فاصلہ نہیں فرماتے تھے۔

(۵) حدثنا ابن فضيل عن حنيف عن أبي عبيدة عن عبدالله قال: كان يصلّي قبل الجمعة أربعا. (مصنف ابن أبي شيبة ٤/ ۱۱٤ برقم: ۵٤۰۲)

ابوعبیدہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

(٦) روي عن عبدالله بن مسعود أنه كان يصلّي قبل الجمعة أربعاً وبعدها أربعاً.

(ترمذي ۱/ ۱۱۷- ۱۱۸، جديد برقم: ۵۲۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی جاتی ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے، اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے۔

اب چند مرفوع روایات تائید میں پیش کی جاتی ہیں، جن کی سند میں محدثین نے کچھ کلام کیا ہے، مگر تعدد طرق کی وجہ سے اس میں قوت پہونچ جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

(۷) عن عبدالله عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان يصلّي قبل الجمعة أربعاً، وبعدها أربعا. (المعجم الأوسط ٤/ ٥٦٨ برقم: ٣٩٧١، المعجم الأوسط جديد ٣/ ٩١، برقم: ٣٩٥٩)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے چار رکعت اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

(۸) عن علي قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلّي قبل الجمعة أربعا، وبعدها أربعاً، يجعل التسليم في آخرهنّ. (المعجم الأوسط ١/ ٤٤٠ برقم: ١٦١٧، إعلاء السنن كراچى ٧/ ١٠، بيروت ٧/ ١٥ برقم: ١٧٦٢)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے چار رکعت اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھا کرتے تھے، اور ان چاروں رکعتوں کے آخر میں سلام پھیرا کرتے تھے

(۹) عن ابن عباسؓ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يركع قبل الجمعة أربعاً لا يفصل في شيء منهنّ. (ابن ماجة ص ٧٩، جديد برقم: ١١٢٩، المعجم الكبير ١٢/ ١٠١ برقم: ١٢٦٧٤)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے، اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے، اور ان کے درمیان کوئی فصل نہیں کرتے تھے۔

(**۱۰**) **وروى ابن النجار عن أبي هريرة مرفوعاً من كان مصليًّا فليصل قبلها أربعاً، وبعدها أربعاً.** (إعلاء السنن بيروت ٧/ ١٤، كنز العمال بيروت ٧/ ٣٠٨، برقم: ٢١٢٢١)

ابن نجار حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً نقل فرماتے ہیں کہ جوشخص نماز پڑھنا چاہے تو وہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھے، اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھے۔

روایات کا تحقیقی جائزہ

(۱) جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت کا ثبوت حضرات صحابہ کرام سے صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہے، جیسا کہ مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ اور طحاوی شریف کی روایات صحیح سند کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ ابن عمرؓ کا عمل اور ان حضرات کا امت کو جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنے کا حکم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، ورنہ حکم کیسے کر سکتے تھے۔

(۳) اسی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے جو مرفوع روایات اوپر پیش کی گئیں ہیں ان کی سند میں اگرچہ متکلم فیہ راوی بھی موجود ہیں، تب بھی ان روایات کی کوئی اصل اور حقیقت ہے، نیز تعدد طرق اور متعدد صحابہ سے نقل ہونے کی وجہ سے روایات میں قوت آجاتی ہے، اسی وجہ سے ان روایتوں کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمرؓ کے آثار کے لئے تائید میں پیش کرنے میں کوئی اشکال نہ ہونا چاہئے۔

(۴) حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مستدلات کی تمام روایات صحیح اور درست ہوا کرتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ روایات کی سند میں جو متکلم فیہ راوی داخل ہوتا ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کے استدلال کے

بعد ہوتا ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کا ان متکلم فیہ راویوں سے روایات کا لینا صحیح سند سے ثابت نہیں ہے؛ اس لئے روایات کے ضعف کا اثر امام ابوحنیفہؒ پر نہیں پڑسکتا۔ اور امام عبدالوہاب شعرانیؒ جو اپنے زمانہ کے مشہور محدث اور محقق تھے، اور شافعی المسلک کے ترجمان تھے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے میرے اوپر یہ احسان فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی مسانید کا مطالعہ کر کے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ کی تمام روایات ایسے خیار تابعین سے مروی ہیں جو سب کے سب عدول اور ثقات میں سے ہیں، اور انہوں نے جن لوگوں سے روایت لی ہیں ان میں سے کوئی بھی ضعیف اور متکلم فیہ یا متہم بالکذب نہیں ہے، اور ان کی لی ہوئی روایتوں کی سندوں میں جو ضعیف رواۃ آئے ہیں وہ ان کے استدلال کے بعد آئے ہیں؛ لہٰذا ضعف کا اثر ان کے مستدلات پر نہیں پڑتا۔ (اوجز المسالک دارالقلم دمشق ۱/ ۱۸۷، مقدمۃ التحقیق فتاوی تاتارخانیہ ۱/ ۴۴ زکریا) ورنہ یہ ایسا ہوجائے گا جیسا کہ کوئی بہتی نہر ہے اس کے بیچ میں مردار پڑا ہوا ہو، اور مردار کے نیچے کی جانب سے کچھ لوگوں نے پانی پیتے ہوئے بدبو محسوس کر کے کہہ دیا کہ اس نہر کے اوپر سے نیچے تک ہر طرف کا پانی بدبودار ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ جہاں پر مردار پڑا ہوا ہے صرف وہاں سے نیچے کی طرف کا پانی بدبودار ہے، اور مردار کے اوپر کی جانب بہتی نہر کے پانی میں اس کا کوئی اثر قطعاً نہیں ہے؛ لہٰذا نیچے والے کے بارے میں یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کو اوپر والے پانی کے بارے میں واقفیت نہیں ہے، پھر بھی بلاتحقیق ان کے اوپر بدبودار پانی پینے کا حکم لگا رہے ہیں جو شرعاً قانوناً وعرفاً کسی طرح بھی جائز نہیں ہے؛ اس لئے امام ابوحنیفہؒ پر ضعیف راویوں کے ضعف کا اثر نہیں پڑتا؛ لہٰذا جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت مؤکدہ کی صحت کے ثبوت میں کوئی کلام نہ ہونا چاہئے؛ اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ روایات کی سند میں ضعیف راویوں کے آنے سے پہلے اپنے مسائل پر استدلال کر چکے ہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کو مستدل کیوں بنایا گیا؟

اس مضمون کے اندر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پانچ (۵) آثار پیش کئے گئے ہیں، خاص

طور سے مصنف عبدالرزاق کی دونوں روایتیں سندِ صحیح کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، ان میں سے ایک میں اس بات کی صراحت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مسلمانوں کو جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنے کا حکم فرمایا ہے، اور دوسری میں اس بات کی صراحت ہے کہ خود عبداللہ بن مسعودؓ کا معمول یہ رہا ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پابندی سے پڑھا کرتے تھے، اسی طرح مصنف بن ابی شیبہ اور طحاوی شریف کی روایت بھی صحیح سند کے ساتھ مروی ہے جن میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنے کا معمول ثابت کیا گیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول اور عمل کی تصدیق کرنے کے لئے حضرت سید الکونین علیہ السلام نے امت کو تاکیدی حکم فرمایا ہے، اور آپ ؐ کا تاکیدی حکم مسند امام احمد بن حنبل اور صحیح ابن حبان میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

(۱) حدثنا وكيع عن سفيان عن عبدالملك بن عمير عن مولى لربعيّ عن ربعي عن حذيفة قال: كنّا عند النبي صلى الله عليه وسلم جلوساً فقال: إني لا أدرى ما قدر بقائي فيكم فاقتدوا باللذين من بعدي، وأشار إلى أبي بكر وعمر، وتمسكوا بعهد عمار وما حدثكم ابن مسعود فصدقوه.

(مسند إمام أحمد ابن حنبل ٥/ ٣٨٥، برقم: ٢٣٦٦٥- ٢٣٨١٣)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، تو آپ ؐ نے فرمایا بے شک مجھے معلوم نہیں ہے کہ میری زندگی تمہارے درمیان کتنے دنوں تک باقی رہے گی؛ لہٰذا تم میرے بعد ان دونوں کی اقتدا کرتے رہنا، اور یہ کہہ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ فرمایا، اور فرمایا کہ عمار بن یاسر کے عہد کو مضبوطی سے پکڑو، اور فرمایا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو کچھ بھی تمہارے سامنے بیان کریں اس کی ضرور تصدیق کیا کرو۔

(۲) عن حذيفة قال: كنّا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود

فقال: إني لا أرىٰ بقائي فيكم إلا قليلاً فاقتدوا باللذَين من بعدي، وأشار إلى أبي بكر وعمر، واهتدوا بهدى عمّار، وما حدّثكم ابن مسعودؓ فاقبلوه . (صحيح ابن حبان ٤/ ٢٥٥، برقم: ٦٩١١)

تھے، تو آپ نے فرمایا کہ بیشک میں یہی سمجھتا ہوں کہ تمہارے درمیان میرا باقی رہنا تھوڑے وقت کے لئے ہے؛ لہٰذا میرے بعد تمہیں ان دونوں کی اقتدا کرنا ہے، اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی طرف اشارہ فرمایا، اور فرمایا کہ عمار بن یاسر سے ہدایت حاصل کرتے رہنا ہے، اور فرمایا کہ تمہارے سامنے عبداللہ بن مسعودؓ جو کچھ بھی بیان کریں اس کو ضرور قبول کرو۔

حضور ﷺ کے اس قدر تاکیدی حکم کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول وعمل سے صرف نظر کیسے کی جاسکتی ہے؟ نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فقہاء صحابہ میں سے ہیں، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک قول وعمل کو گہرائی تک پہنچ کر اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔

اور یہ بات بھی خوب یادر رکھنے کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اوّلین اسلام لانے والوں میں سے ہیں، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں دنیا کے مسلمانوں میں چھٹے نمبر کا مسلمان تھا، اور پوری روئے زمین میں ہم چھ کے علاوہ کوئی مسلمان نہ تھا، صحیح سند کے ساتھ ابن مسعودؓ کا یہ قول بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

عن القاسم بن عبدالرحمن عن أبيه قال: قال عبدالله بن مسعودؓ: لقد رأيتني سادس ستةٍ ما على الأرض مسلمٌ غيرنا. (صحيح ابن حبان ٦/ ٣١٥، برقم: ٧٠٧١، المستدرك للحاكم جديد ٥/ ١٩٨٤، برقم: ٥٣٦٧)

حضرت قاسم ابن عبدالرحمٰن اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یقیناً میں اپنے آپ کو چھ میں سے چھٹا آدمی دیکھ چکا ہوں، اور روئے زمین میں ہم چھ کے علاوہ کوئی اور مسلمان نہیں تھا۔

تو معلوم ہوا کہ نبوت کے پہلے سال سے لے کر حضرت سید الکونین علیہ السلام کے دنیا سے

پردہ فرما کرتشریف لے جانے تک ۲۳ ؍سالہ پورے دورِ نبوت کوحضرت ابن مسعودؓ نے دیکھا ہے، اورآپؐ کے خادم خاص تھے، سفر میں حضر میں ہر وقت ساتھ رہا کرتے تھے، اورصاحب النعلین سے مشہور تھے، اوراپنی جگہ فقیہ النفس تھے؛ لہٰذا اتنی خوبیوں کے مالک صحابی رسول کے قول وعمل کوصرف یہ کہہ کرچھوڑ دینا کہ ابن مسعودؓ کا اثر ہے، انتہائی جسارت یاشریعت سے ناواقفیت کی بات ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ان کے حکم اور عمل کو پیش نظر رکھ کر جمعہ سے پہلے چار رکعت کوسنت مؤکدہ کہا ہے، یہی صحیح ہے اوریہی حق ہے۔

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفی عنہ، خادم الحدیث والافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یو- پی)

۱۳؍صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

نماز جمعہ کے بعد کتنی رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جمعہ کے فرض کے بعد کتنی سنت مؤکدہ ہیں؟ احناف کے مذہب کے صحیح اقوال نقل فرمائیں، اگر چھ سنت مؤکدہ ہیں، تو ان کے پڑھنے کی کیا ترتیب ہوگی؟ پہلے چار رکعت ایک سلام سے اور پھر دو رکعت ایک سلام سے، یا اس کے برعکس؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک چار رکعت ایک سلام کے ساتھ سنت مؤکدہ ہیں۔ اور حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک چھ رکعت سنت ہیں، اولا چار رکعت ایک سلام کے ساتھ اوراس کے بعد دو رکعت ایک سلام کے ساتھ، اگر وقت میں گنجائش ہوتو چھ رکعت پڑھنا افضل ہے۔ اوراگر عجلت یا کوئی عذر ہے تو چار رکعت سے سنت ادا ہوجائے گی۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه

وسلم: من كان منكم مصليا بعد الجمعة، فليصل أربعا . (صحيح مسلم، الجمعة، فصل في استبحاب أربع ركعات أو الركعتين بعد الجمعة، النسخة الهندية ١/ ٢٨٨، بيت الأفكار، رقم: ٨٨١، مسند الدارمي، دارالمغني ٢/ ٩٨٢، رقم: ١٦١٦، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ٢/٣/ ٩٠٣، رقم: ١٨٧٤)

منها أربع قبل الجمعة، وأربع بعدها بتسليمة، وتحته في الطحطاوي وقال أبو يوسف: يصلي أربعا قبل الجمعة، وستا بعدها وفي الكرخي محمد مع أبي يوسف، ثم عند أبي يوسف يصلي أربعا، ثم اثنتين. (طحطاوي على المراقي، ص: ٢١٣، دارالكتاب ديوبند ٣٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/۴/۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۴/۱۴۱۴ھ

جمعہ کے بعد کی چار رکعت ظہر بالشبہ نہیں ہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کہتا ہے کہ بعد نماز جمعہ جو چار سنتیں اور دو سنت اور دو نفل پڑھتے ہیں، اس میں چار سنتیں بطور ظہر بالشبہ پڑھتے ہیں اور یہ اس وقت سے ہے جس وقت علماء نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا تھا، اب جب کہ ایسا نہیں تو پھر چار سنتیں کیوں؟ مزید کہتا ہے کہ ”فتاوی رشیدیہ وامداد الفتاوی، بہشتی زیور“ کی عبارات سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے۔

المستفتی: ثناء الرحمٰن ہتھورا، گڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کا یہ کہنا کہ جمعہ کے بعد جو چار رکعتیں سنت پڑھی جاتی ہیں، وہ بطور ظہر بالشبہ پڑھی جاتی ہیں اور اس کا ثبوت علماء کا ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے

کے وقت سے ہے، غلط ہے؛ اس لئے کہ اس کا ثبوت احادیث نبویہ اور صحابہ کرام کے عمل سے ملتا ہے، علماء کا ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کے وقت سے نہیں۔ اور فتاوی رشیدیہ اور امداد الفتاوی اور بہشتی زیور وغیرہ کتابوں میں جہاں بھی جمعہ کے بعد چار رکعت ظہر بالشبہ پڑھنے کا ذکر آتا ہے، وہ ان قریہ صغیرہ کے متعلق ہیں، جہاں صحت جمعہ میں کسی وجہ سے شبہ ہو نہ کہ ظہر کے بعد کی چار رکعت سنتوں کا اس لئے کہ یہ سنتیں مؤکدہ ہیں، جس کا تارک گنہگار ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی۱/ ۶۷۹، فتاوی رشدیہ، ص: ۳۶۵)

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كان منكم مصليا بعد الجمعة، فليصل أربعا. هذا حديث حسن صحيح. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في الصلاة قبل الجمعة وبعدها، النسخة الهندية ١/ ١١٧، دارالسلام، رقم: ٥٢٣، مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي ٣/ ٢٤٨، رقم: ٥٢٩)

قال في اللمعات: السنة عند أبي حنيفة بعد الجمعة أربع، وعند صاحبيه ست أربع، ثم اثنتان هذا في الصلاة بعد الجمعة. (حاشية ترمذي ١/ ١١٨، عالمگيرى، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ١/ ١١٢، جديد ١/ ١٧١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/۵/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۵/۱۴۱۵ھ

جمعہ پڑھا کر دوسری جگہ جمعہ میں بنیت نفل شرکت کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک امام صاحب جو شہر یا قصبہ کی چھوٹی مسجد میں نماز جمعہ پڑھا کر بعد میں جامع مسجد میں جمعہ کی نماز میں شریک ہوجاتے ہیں، تو ان کا یہ عمل درست ہے؟ ان کا یہ کہنا ہے کہ فقہاء نے ظہر

وعشاء کی جماعت میں نفلی نیت سے دوبارہ شریک ہونے کو جائز قرار دیا ہے، کچھ لوگ اس فقہی مسئلہ کو غلط بتاتے ہیں۔

المستفتی: محمد عفان مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن نمازوں کے بعد سنن ونوافل ہیں، ان میں نفل کی نیت سے شرکت جائز ہے؛ البتہ مغرب میں اس لئے جائز نہیں ہے کہ تین رکعت کی نفل نہیں ہوتی ہے۔ اور جمعہ کے بعد بھی سنن ونوافل ہوتے ہیں؛ اس لئے جس نے جمعہ پڑھ لیا ہے، اس کا نفل کی نیت سے دوسری مسجد میں جمعہ کی جماعت میں شرکت کرنا جائز ہے۔

ثم بعد الإتمام اقتدی متنفلا إن شاء وهو أفضل لعدم الكراهة، إلا في العصر، والفجر للنهي عن التنفل بعدهما، وفي المغرب للمخالفة. (حاشية الطحاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، دارالكتاب ديوبند، جديد ١/ ٤٥٠، قديم، ص: ٢٤٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ر محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۳۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۱/۲۷ھ

تہجد کی کتنی رکعات ہیں؟

سوال [۳۰۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تہجد کی نماز میں کتنی نفل پڑھی جاتی ہیں؟

المستفتی: منصور احمد، تمبا کو محلہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تہجد کے بارے میں روایات مختلف ہیں، کم از کم دو رکعت

یا چار رکعت اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعت تک وارد ہوئی ہیں؛ البتہ اکثر وبیشتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تہجد آٹھ رکعت تھیں، اسی وجہ سے فقہاء حنفیہ نے فرمایاہیکہ تہجد میں افضل آٹھ رکعات ہیں۔

وصلاة الليل وأقلها، وتحته في الشامية قال: يصلى ما سهل عليه، ولو ركعتين، والسنة فيها ثمان ركعات بأربع تسليمات. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في صلاة الليل، زكريا ٢/ ٤٦٧، كراچی ٢/ ٢٥، فتاوى دارالعلوم ٤/ ٣١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍رمضان ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۳۹۸/۲۵)

بغیر سوئے نصف رات کے بعد تہجد پڑھنا

سوال [۳۰۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تہجد کی نماز کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے؟ اگر کوئی آدمی بغیر سوئے ہوئے نصف رات کے بعد تہجد کی نماز ادا کرے تو کیا یہ تہجد کی نماز ہوگی؟

المستفتی: محمد ایوب کاشی پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تہجد کی نماز کے لئے عشاء کی نماز کے بعد سونا لازم نہیں ہے؛ بلکہ عشاء کی نماز اور سنن ونوافل کی ادائے گی کے بعد جو بھی نفل تہجد کی نیت سے پڑھی جائے گی وہ تہجد کہلائے گی اور تہجد کی نماز سے پہلے سونا لازم نہیں ہے، چاہے نصف لیل کے بعد پڑھی جائے یا نصف لیل سے پہلے پڑھی جائے، تہجد ہی کہلائے گی۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۳۰۵، ایضاح المسائل/ ۴۹، احسن الفتاوی ۳/ ۴۹۳)

عـن إيـاس بن معاوية المزني، أن رسول الله ﷺ قال: لابد من صلاة بـلـيـل، ولـو نـاقة، ولو حلب شاة، وما كان بعد صلاة العشاء الآخرة فهو من الليل. (المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ١/ ٢٧١، رقم: ٧٨٧)

وروى الطبـراني مـرفـوعا لا بد من صلاة بليل، ولو حلب شاة، وما كـان بعد صلاة العشـاء فهـو مـن الـليل، وهذا يفيد أن هذه السنة تحصل بـالتـنفل بعد صلاة العشاء قبل النوم. (شـامـي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في صلاة الليل، كراچی ٢/ ٢٤، زكريا ٢/ ٤٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/۸/۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۱۳۰/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۸/۱۴۲۷ھ

تہجد میں بیدار ہونے کے لئے ''الارم والی گھڑی'' رکھنا

سوال [۳۰۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید آدھی شب کے بعد اٹھ کر نماز تہجد ادا کرتا ہے، زید کی کسی دن آنکھ نہیں کھلتی، زید نے اپنے پاس ایک گھڑی الارم والی رکھ لی ہے کہ وقت پر آنکھ کھل جائے؛ لیکن زید کے پاس ایک صاحب سوتے ہیں، ان کو گھڑی کے بولنے سے اعتراض ہے، وہ منع کرتے ہیں کہ یہ طریقہ غلط ہے، ہماری نیند خراب ہوتی ہے۔ اور زید نے صرف اپنی عبادت کرنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کے لئے ایسا کیا ہے، اب مجھے بتایا جائے کہ یہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟ میں تلاوت قرآن کرتا ہوں تو بہت کم آواز سے پڑھتا ہوں، میرے پاس والے کہتے ہیں کہ بلند آواز سے پڑھا کرو ادھر کہتے ہیں کہ گھڑی کی آواز سے اٹھنا غلط ہے، ادھر قرآن کو بلند آواز سے پڑھنے کو کہتے ہیں۔

المستفتی: مستری شبیر احمد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تہجد وغیرہ کے لئے ''الارم والی گھڑی'' رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بس اس کی آواز سے بیدار ہوتے ہی ''الارم'' بند کردیا جائے، تاکہ دوسروں کو خلل نہ ہو، اس احتیاط کے ساتھ الارم رکھنے میں دوسروں کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجة، الأحكام باب من بنى في حقه ما يضره بجاره، النسخة الهندية/ ١٦٩، دارالسلام، رقم: ٢٣٤١، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي بيروت ٢/ ٨٦، رقم: ١٣٨٧، المؤطا إمام مالك، كتاب الأقضية، القضاء في المرفق، أشرفی ديوبند، ص: ٣١١)

لا ضرر ولا ضرار. أخرجه مالک في المؤطا. (الأشباه، ص: ١١٨، باب القضاء في المرفق، النسخة الهندية/ ٣١١، باب ما لا يجوز من عتق المكاتب، النسخة الهندية/ ٢٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر شعبان ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۱۵۳)

تہجد کی جماعت

سوال [۳۰۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کوئی حافظ نماز تہجد میں قرآن شریف کی تلاوت کرتا ہے اور دو تین حضرات کو قرآن سننے کا خوب شوق ہے اور اس حافظ کے پیچھے قرآن سننا چاہتے ہیں، یعنی جماعت کی شکل میں دو تین حضرات اس حافظ کی اقتدا کرنا چاہتے ہیں، تو یہ اقتدا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اگر مکروہ ہے، تو مکروہ تنزیہی ہے یا تحریمی؟

المستفتی: محمد نورالاسلام، متعلم جامع الہدیٰ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر صرف دو ہی آدمی اقتدا کرکے سننا چاہتے ہیں، تو اقتدا بلا کراہت درست ہے۔ اور اگر تین ہوں تو کراہت میں علماء کا اختلاف ہے، بعض بلا کراہت درست کہتے ہیں۔ اور بعض مع الکراہت۔ اور چار یا چار سے زائد ہونے کی صورت میں بالا تفاق مکروہ ہے۔ (امداد الفتاوی زکریا دیوبند ۱/ ۳۷۷، احسن الفتاوی، زکریا ۳/ ۴۱۹، فتاوی رشیدیہ/ ۳۷۲، جدید زکریا دیوبند ۳۵۴، فتاوی رحیمیہ قدیم ۱/ ۱۷۸، جدید زکریا ۵/ ۲۱۸، فتاوی محمودیہ ۲/ ۱۹۸، فتاوی دار العلوم ۴/ ۳۱۲)

عن أنس بن مالك – رضي الله عنهما – أن جدته مليكة دعت رسول الله ﷺ لطعام صنعته، فأكل منه، فقال: قوموا فلأصلي بكم، فقمت إلى حصير لنا قد اسود من طول مالبس، فنضحته بماء، فقام رسول الله ﷺ واليتيم معي والعجوز من ورائنا، فصلى بنا ركعتين. (صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب وضوء الصبيان، النسخة الهندية ۱/ ۱۱۹، رقم: ۸۵۲، ف: ۸۶۰)

وتطوع على سبيل التداعي مكروهة. (درمختار) قال الطحطاوي: والتداعي أن يجتمع أربعة، فأكثر على إمام ودون ذلك لا يكره إذا صلوا في ناحية من المسجد كذا في القهستاني، ونقله في البحر عن الصدر الشهيد، وظاهر إطلاقه الكراهة إنها التحريمية. (طحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كوئٹه ۱/ ۲٤۰)

ولا يصلي الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان، أي يكره ذلك على سبيل التداعي، بأن يقتدى أربعة بواحد، وفي الشامية: وأما اقتداء واحد بواحد أو اثنين بواحد فلا يكره، وثلاثة بواحد فيه خلاف. (الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في كراهة الاقتداء في النفل على سبيل التداعي، كراچی ۲/ ٤۸، زكريا ۲/ ۵۰۰) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۶۵۵)

تہجد کی نماز باجماعت ادا کرنا

سوال [۳۰۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ میں بعد نماز تراویح قیام لیل کے نام سے جیسا کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ہوتا ہے، اس کی اتباع کرتے ہوئے بغیر تداعی کے خواہشمند احباب شریک ہوکر قیام لیل (نماز تہجد) جماعت سے ادا کریں تو اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: مفتی فاروق صاحب میرٹھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مقتدی دو ہوں تو نفل نماز جماعت سے پڑھنا بالاتفاق جائز ہے۔ اور اگر مقتدی تین ہوں، تو بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ ہے۔ اور مقتدی چار یا اس سے زائد ہوں تو پھر مکروہ تحریمی ہے؛ اس لئے کہ نوافل میں تداعی جائز نہیں ہے اور مقتدیوں کا چار یا اس سے زائد ہوجانا یہ خود تداعی ہے؛ لہٰذا رمضان اور غیر رمضان دونوں صورتوں میں نفل نماز باجماعت پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، خواہ تہجد کی نماز ہو یا دیگر نفل نماز احناف کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔

عن أنس بن مالك –رضي الله عنهما– أن جدته مليكة دعت رسول الله ﷺ لطعام صنعته، فأكل منه، ثم قال: قوموا فلنصل بكم، قال أنس: فقمت إلى حصير لنا، قد اسود من طول مالبس، فنضحته بالماء، فقام عليه رسول الله ﷺ وصففت عليه أنا واليتيم وراءه والعجوز من ورائنا، فصلى بنا ركعتين، ثم انصرف. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في الرجل يصلي ومعه رجال ونساء، النسخة الهندية ۱/ ۵۵، دارالسلام، رقم: ۲۳٤)

إن التطوع بالجماعة إنما يكره إذا كان على سبيل التداعي، أما لو اقتدى واحد بواحد أو اثنان بواحد لا يكره، وإذا اقتدى ثلاثة بواحد

اختلف فيه، وإن اقتدى أربعة بواحد كره إتفاقا. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل العاشر في التطوع، زكريا ٢/ ٢٩٣، رقم: ٢٤٥٩، قديم ١/ ٦٣٦)

التطوع بالجماعة إذا كان على سبيل التداعي يكره، وقال شمس الأئمة الحلواني: إن كان سوى الإمام ثلاثة لا يكره بالإتفاق، وفي الأربع اختلف المشايخ، والأصح أنه لا يكره. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الأول في الجماعة، زكريا قديم ١/ ٨٣، جديد ١/ ١٤١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ ذیقعدہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/ ۱۱/ ۱۴۲۵ھ

ماہ رمضان میں تہجد واوابین کو باجماعت ادا کرنا

سوال [۳۰۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نوافل کو باجماعت ادا کرنا اور بالخصوص رمضان میں تہجد اور اوابین کو جماعت سے پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اسرار دھام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مقتدی دو ہوں تو بالاتفاق جائز ہے۔ اور اگر مقتدی تین ہوں تو بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ اور بعض فقہاء کے نزدیک مکروہ ہے۔ اور اگر مقتدی چار یا اس سے زیادہ ہوجائیں تو بالاتفاق مکروہ ہے؛ اس لئے کہ نوافل پر تداعی جائز نہیں ہے۔ اور مقتدیوں کا چار یا اس سے زیادہ ہوجانا یہ خود تداعی ہے؛ لہٰذا رمضان یا غیر رمضان دونوں صورتوں میں مکروہ ہے، اسی طرح تہجد اور اوابین میں بھی مکروہ ہے اور نوافل باجماعت صرف صلوۃ الاستسقاء، صلوۃ الکسوف اور صلوۃ تراویح میں جائز ہے اور کسی نفل یا سنت کی جماعت جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الاحکام ۲/ ۲۲۵)

عن أنس بن مالک –رضي الله عنهما– أن جدته مليكة دعت رسول الله صلى الله عليه وسلم لطعام صنعته، فأكل منه، فقال: قوموا فلأصلي بكم، فقمت إلى حصير لنا قد اسود من طول مالبس، فنضحته بماء، فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم واليتيم معي والعجوز من ورائنا، فصلى بنا ركعتين. (صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب وضوء الصبيان، النسخة الهندية ١/ ١١٩، رقم: ٨٥٢، ف: ٨٦٠)

إعلم أن النفل بالجماعة على سبيل التداعي مكروه على ما تقدم ماعدا التراويح، وصلاة الكسوف والاستسقاء. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، تتمات من النوافل، اشرفيه ديوبند ١/ ٤٣٢)

وتطوع على سبيل التداعي مكروهة. (درمختار) قال الطحطاوي: والتداعي أن يجتمع أربعة، فأكثر على إمام ودون ذلك لا يكره إذا صلوا في ناحية من المسجد كذا في القهستاني، ونقله في البحر عن الصدر الشهيد، وظاهر إطلاقه الكراهة إنها التحريمية. (طحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كوئٹه ١/ ٢٤٠)

إن التطوع بالجماعة إنما يكره إذا كان على سبيل التداعي، أما لو اقتدى واحد بواحد أو اثنان بواحد لا يكره، وإذا اقتدى ثلاثة بواحد اختلف فيه، وإن اقتدى أربعة بواحد كره إتفاقا. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل العاشر في التطوع، زكريا ٢/ ٢٩٣، رقم: ٢٤٥٩، قديم ١/ ٦٣٦، شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، قبيل مطلب في تكرار الجماعة في المسجد، كراچى ١/ ٥٥٢، زكريا ٢/ ٢٨٨) *فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم*

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/۶/۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۴۲۴/۳۷)

رمضان میں تہجد اور صلاۃ التسبیح کی جماعت کا حکم

سوال [۳۰۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا رمضان میں تہجد کی نماز، اسی طرح صلاۃ التسبیح با جماعت ادا کی جاسکتی ہے؟ مسالک اربعہ مع دلائل اور راجح قول تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد عبد السبحان کیلوفورنیا، امریکہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہمارے یہاں سے حنفی مسلک کے مطابق مسئلہ لکھا جاتا ہے، مسالک اربعہ میں سے ہر ایک مسلک کا الگ الگ مسئلہ یہاں سے نہیں لکھا جاتا ہے؛ اس لئے کہ عوام کی ضرورت صرف ایک بات پر عمل کرنے کی ہوتی ہے؛ لہٰذا اگر عامۃ المسلمین کو مسئلہ بتلاتے وقت چاروں اماموں میں سے ہر ایک کا الگ الگ مسلک بتایا جائے تو ان کو گمراہی کے علاوہ کوئی چیز ہاتھ نہیں آئے گی؛ اس لئے کہ وہ بیچارے مختلف اقوال میں سے کس پر عمل کریں؟ اسی وجہ سے فتوی لکھنے میں صرف ایک ہی حکم لکھا جاتا ہے؛ لہٰذا ہم حنفی مسلک کے مکلّف ہیں، اسی کے اعتبار سے یہاں بھی دلائل کے ساتھ مسئلہ پیش کیا جارہا ہے کہ حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کی پوری زندگی میں صلاۃ کسوف، صلاۃ استسقاء اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے صلاۃ التراویح کے علاوہ کسی بھی نفل نماز کا تین سے زائد مقتدیوں کے ساتھ باجماعت پڑھنا ثابت نہیں ہے، چنانچہ حضرت عتبان بن مالک کی روایت میں دو مقتدیوں کے ساتھ نفل پڑھنا ثابت ہے، جس میں حضرت ابوبکر اور حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہم مقتدی بنے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دو روایتیں ہیں، ایک میں عجوزہ یعنی بڑھیا اور خود حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ایک نابالغ یتیم بچے نے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی اقتدا میں نفل نماز باجماعت پڑھی۔ اور دوسری روایت میں ان کی والدہ حضرت ام سلیم، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور یتیم بچہ کی اقتدا کا ذکر ہے، اب اگر نابالغ کو شمار کیا

جائے تو تین مقتدی ہوں گے۔ اور اگر نابالغ کا اعتبار نہ کیا جائے تو دو مقتدی ہیں؛ اس لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر دو مقتدی ہوں تو بلاتر دد جائز ہے۔ اور اگر تین مقتدی ہوں تو حنفی فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، بعض جائز کہتے ہیں؛ اس لئے کہ انہوں نے نابالغ کا بھی اعتبار کیا ہے۔ اور بعض مکروہ کہتے ہیں؛ اس لئے کہ انہوں نے نابالغ کا اعتبار نہیں کیا ہے، اس کے علاوہ پورے ذخیرۂ حدیث میں نفل نماز تین سے زائد مقتدیوں کے ساتھ باجماعت ادا کرنا پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا تین سے زائد مقتدی ہونے کی صورت میں علی سبیل التداعی میں شامل ہوگا اور علی سبیل التداعی نفل نماز باجماعت باتفاق فقہائے احناف مکروہ ہے، صرف علامہ شامی علیہ الرحمہ نے بحث کرتے ہوئے اپنی رائے میں مکروہ تنزیہی لکھا ہے، جس کے پیش نظر مولانا ابوالوفاء افغانی نے بھی مکروہ تنزیہی لکھا ہے، ان کے علاوہ باقی کسی بھی حنفی مسلک کے فقیہ نے مکروہ تنزیہی نہیں کہا ہے، یا تو مطلقاً مکروہ کہا یا مکروہ تحریمی کہا ہے، جیسا کہ علامہ طحطاوی علیہ الرحمہ نے ”طحطاوی علی الدر“ میں مکروہ تحریمی لکھا ہے۔ اسی طرح مجدد الف ثانیؒ نے بھی مکروہ تحریمی لکھا ہے۔ اور اسی طرح حضرت گنگوہیؒ نے بھی مکروہ تحریمی لکھا ہے۔ اور مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے بھی مکروہ تحریمی لکھا ہے۔ اور اسی وجہ سے حضرت مفتی شفیع صاحبؒ اور ان کے صاحبزادہ مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی نے بھی مکروہ تحریمی لکھا ہے؛ لہٰذا تہجد اور صلاۃ التسبیح کی نماز باجماعت پڑھنا جس میں تین سے زائد مقتدی ہوں مشروع نہیں ہے؛ بلکہ اکثر فقہاء کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے؛ اس لئے اس سے گریز کرکے اپنے آپ کو دور رکھنا ضروری ہے۔ حوالہ ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہما اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ملاحظہ فرمایئے:

وفي حديث طويل عن عتبان بن مالك الأنصاري –رضي الله عنه– قال: فغدا علي رسول الله ﷺ وأبوبكر معه، بعد ما اشتد النهار، فاستأذن النبي ﷺ، فأذنت له، فلم يجلس حتى قال: أين تحب أن أصلي من

بیتک؟ فأشار إلیه من المکان الذي أحب أن یصلي فیه، فقام، فصففنا خلفه، ثم سلم وسلمنا حین سلم. (بخاري شریف، الصلاة، باب من لم یرد السلام علی الإمام واکتفی بتسلیم الصلاة، النسخة الهندیة ۱/ ۱۱۶، رقم: ۸۳۲، ف: ۸٤۰، مسلم، المساجد، باب الرخصة في التخلف عن الجماعة بعذر، النسخة الهندیة ۱/ ۲۳۳، بیت الأفکار، رقم: ۲٦۳)

عن أنس -رضي الله عنه- قال: صلی النبي صلی الله علیه وسلم في بیت أم سلیم، فقمت ویتیم خلفه، وأم سلیم خلفنا. (بخاري، شریف، الأذان، باب صلاة النساء خلف الرجال، النسخة الهندیة ۱/ ۱۲۰، رقم: ۸٦۳، ف: ۸۷۱، مسلم شریف، المساجد، باب جواز الجماعة في النافلة والصلاة علی حصیر وخمرة وثوب وغیرها من الطهارة، النسخة الهندیة ۱/ ۲۳٤، بیت الأفکار، رقم: ٦٥۸)

عن أنس بن مالک -رضي الله عنهما- أن جدته ملیکة دعت رسول الله صلی الله علیه وسلم لطعام صنعته، فأکل منه، فقال: قوموا فلأصلي بکم، فقمت إلی حصیر لنا قد اسود من طول مالبس، فنضحته بماء، فقام رسول الله صلی الله علیه وسلم والیتیم معي والعجوز من ورائنا، فصلی بنا رکعتین. (صحیح البخاري، کتاب الأذان، باب وضوء الصبیان، النسخة الهندیة ۱/ ۱۱۹، رقم: ۸٥۲، ف: ۸٦۰، صحیح مسلم، المساجد، باب جواز الجماعة في النافلة، النسخة الهندیة ۱/ ۲۳٤، بیت الأفکار، رقم: ٦٥۸)

فقہاء کی عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

وتطوع علی سبیل التداعي مکروهة. (درمختار) قال الطحطاوي: والتداعي أن یجتمع أربعة، فأکثر علی إمام ودون ذلک لا یکره إذا صلوا في ناحیة من المسجد کذا في القهستاني، ونقله في البحر عن الصدر الشهید، وظاهر إطلاقه الکراهة أنها التحریمیة. (طحطاوي علی الدر، کتاب الصلاة، باب الإمامة، کوئٹه ۱/ ۲٤۰)

افسوس ہزار افسوس بعضے از بدعتہا کہ در سلاسل دیگر اصلاً موجود نیست، دریں طریقہ علیہ احداث نمودہ اند و نماز تہجد را بجماعت می گذار نداز اطراف وجوانب دراں وقت مردم از برائے نماز تہجد جمع می گردند و بجمعیت تمام ادامی نمایند وایں عمل مکروہ ہست بکراہت تحریمہ الخ۔ (مکتوبات ص: ۱۳۱-۲۳۷، دفتر اول بحوالہ احسن الفتاوی ۳/ ۴۷۶، مستفاد: فتاوی رشیدیہ، ص: ۳۵۴، باقیات فتاوی رشیدیہ، ص: ۱۸۳، فتاوی عثمانی ۱/ ۴۳۸، ۴۴۴، فتاوی دار العلوم ۴/ ۳۱۲، فتاوی رحیمیہ زکریا ۴/ ۱۳۶، آپ کے مسائل اوران کا حل، جدید ۴/ ۲۰۸، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۹، فتاوی محمودیہ میرٹھ ۱۱/ ۳۰۶، ۳۰۸، ڈابھیل ۷/ ۲۳۸-۲۴۹، کتاب المسائل ۱/ ۴۱۶، احسن الفتاوی ۳/ ۴۶۹-۴۷۶)

التطوع بالجماعة إذا كان على سبيل التداعي يكره. (هندية، الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، زكريا قديم ١/ ٨٣، جديد ١/ ١٤١)

اعلم أن النفل بالجماعة على سبيل التداعي مكروه على ما تقدم ماعدا التراويح، وصلاة الكسوف والاستسقاء. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، تتمات من النوافل، اشرفيه ديو بند ١/ ٤٣٢)

ولا يصلي الوتر، ولا التطوع بجماعة خارج رمضان، أي يكره ذلک على سبيل التداعي بأن يقتدى أربعة بواحد. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچى ٢/ ٤٨، زكريا ٢/ ٥٠٠)

والجماعة في النفل في غير التراويح مكروهة، فالاحتياط تركها في الوتر خارج رمضان، وعن شمس الأئمة أن هذا فيما كان على سبيل التداعي، أما لو اقتدى واحد بواحد، أو اثنان بواحد لا يكره، وإذا اقتدى ثلاثة بواحد اختلف فيه، وإن اقتدى أربعة بواحد كره إتفاقا، قال الطحطاوي: اختلف فيه، والأصح عدم الكراهة. (حاشية الطحطاوي، كتاب الصلاة، باب الوتر وأحكامه، دارالكتاب، ص: ٣٨٦، خلاصة الفتاوى، أشرفيه ديوبند ١/ ٦٣، حلبي كبير، الصلاة، فصل في النوافل، قبيل فروع، أشرفيه، ص: ٤٠٨، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل العاشر التطوع، زكريا ٢/ ٢٩٢، رقم: ٢٤٥٩، فتح القدير، كتاب

الصلاة، باب الاستسقاء، زکریا ۲/ ۹۱، کوئٹه ۲/ ۵۹، البحر الرائق، کتاب الصلاة، قبیل باب إدراک الفریضة، کوئٹه ۲/ ۷۰، زکریا ۲/ ۱۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۱۱/۱۴۳۴ھ

تہجد کی نماز باجماعت پڑھنا جس میں تین سے زائد مقتدی ہوں کیسا ہے؟

سوال [۳۰۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تہجد کی نماز باجماعت پڑھنے کا کیا حکم ہے، جب کہ تین سے زائد افراد مقتدی ہوں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تہجد کی نماز باجماعت پڑھنا جب کہ مقتدی چار افراد یا اس سے زائد ہوں؛ حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانوی، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ وغیرہ نے مکروہ تحریمی لکھا ہے۔ (باقیات فتاوی رشیدیہ/۱۸۳، ایضاح المسائل ۵۹، امداد الفتاوی ۱/ ۳۷۸، فتاوی دار العلوم ۴/۲۲۳، ایضاح المسالک/ ۵۸، فتاوی عثمانی ۱/ ۴۴۸)

وتطوع علی سبیل التداعي مکروهة. (درمختار) قال الطحطاوي: والتداعي أن یجتمع أربعة، فأکثر علی إمام ودون ذلک لا یکره إذا صلوا في ناحیة من المسجد کذا في القهستاني، ونقله في البحر عن الصدر الشهید، وظاهر إطلاقه الکراهة إنها التحریمیة. (طحطاوي علی الدر، کتاب الصلاة، باب الإمامة، کوئٹه ۱/ ۲٤۰)

ولا یصلي الوتر، ولا التطوع بجماعة خارج رمضان، أي یکره ذلک علی سبیل التداعي بأن یقتدی أربعة بواحد. (شامي، کتاب الصلاة، باب الإمامة، کراچی ۲/ ٤۸، زکریا ۲/ ۲۸۸)

لأن صلاة النفل غیر التراویح ونحوها بالجماعة إنما یکره إذا کان

الإمام والمتقدي معا متنفلين به، وكان على سبيل التداعى بأن يجتمع جمع كثير فوق الثلاثة حتى لو اقتدى به واحد أو اثنان لا يكره، وفي الثلاثة اختلاف المشايخ، وفي الأربعة يكره إتفاقا. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، مكتبه أشرفيه، ص: ٤٠٨)

أن التطوع بالجماعة إنما يكره إذا كان على سبيل التداعي، أما لو اقتدى واحد بواحد، أو اثنان بواحد لا يكره، وإذا اقتدى ثلاثة بواحد اختلف فيه، وإن اقتدى أربعة بواحد كره إتفاقا. (تاتارخانية زكريا ٢/ ٢٩٣، رقم: ٢٤٥٩)

التطوع بالجماعة إذا كان على سبيل التداعي يكره، وقال شمس الأئمة الحلواني: إن كان سوى الإمام ثلاثة لا يكره بالإتفاق، وفي الأربع اختلف المشايخ، والأصح أنه يكره. (هندية، كتاب الصلاة، باب الإمامة، الفصل الأول في الجماعة، زكريا قديم ١/ ٨٣، جديد ١/ ١٤١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۲/۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۴۹/۴۰)

نماز اشراق

سوال [۳۰۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سورج طلوع ہونے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے دوران جو نماز پڑھی جاتی ہے، جس کو عام طور پر ''اشراق'' کہتے ہیں، کیا اس نماز کا کوئی ثبوت حدیث سے ملتا ہے؟ اور اس کی فضیلت میں کوئی حدیث آئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس حدیث کو نقل فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

المستفتی: عبید اللہ خان نواب پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سورج طلوع ہونے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے دوران جونماز پڑھی جاتی ہے، وہ عوام کے درمیان ''صلاۃ الاشراق'' سے مشہور ہے اور یہ نماز حدیث شریف سے ثابت ہے۔ اور حدیث شریف میں اس نماز کی بہت زیادہ فضیلت آئی ہے۔ حدیث شریف حسب ذیل ہے:

عن أنس –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من صلى الفجر في جماعة، ثم قعد يذكر الله حتى تطلع الشمس، ثم صلى ركعتين كانت له كأجر حجة وعمرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تامة تامة تامة، قال أبو عيسى: هذا حديث حسن غريب. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ذكر ما يستحب من الجلوس في المسجد بعد صلاة الصبح، حتى تطلع الشمس، النسخة الهندية ١/ ١٣٠، دارالسلام، رقم: ٥٨٦)

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله ﷺ إذا صلى الفجر لم يقم من مجلسه حتى تمكنه الصلاة، وقال: من صلى الصبح، ثم جلس في مجلسه حتى تمكنه الصلاة كانت بمنزلة عمرة وحجة متقبلتين.

(المعجم الأوسط للطبراني، دارالفكر ٤/ ١٦٩، رقم: ٥٦٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/۸/۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۵۶۴/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/۸/۱۴۱۶ھ

نماز اشراق کا وقت کب ہوتا ہے؟

سوال [۳۰۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: سورج کا گول گھیرا پورا نکل آنے پر اشراق کی نماز پڑھ لی جائے، تو نماز درست ہوگی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبدالقدیر، محلّہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صرف گول گھیرا پورا نکلنے سے نماز اشراق کا وقت نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ سورج پورا نکلنے کے بعد ایک دو نیزہ کی مقدار بلند ہونے اور اچھی طرح چمک ہونے سے پہلے کفار اور اغیار کی عبادت کا وقت ہوتا ہے؛ اس لئے سورج نکلنے کے بعد متصلاً نماز مکروہ ہے۔ اور دس پندرہ منٹ تک انتظار کرنا لازم ہے، اس کے بعد اشراق کا وقت شروع ہوتا ہے اور جو نماز اس سے قبل پڑھی جائے وہ مکروہ تحریمی ہوگی۔

فإن الصلاة مشهودة مكتوبة حتى تصلى الصبح ثم أقصر حتى تطلع الشمس، فترتفع قيس رمح، أو رمحين، فإنها تطلع بين قرني شيطان، ويصلي لها الكفار. (أبو داؤد شريف، الصلاة، باب من رخص فيهما إذا كان الشمس مرتفعة، النسخة الهندية ١/ ١٨١، دارالسلام، رقم: ١٢٧٧، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ١/ ١٦٤، رقم: ٢٦٠، المستدرك، كتاب الطهارة، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ١/ ٢٤٤، ٢٣٥، رقم: ٥٨٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۹۴)

نماز اشراق کا وقت کب تک رہتا ہے؟

سوال [۳۱۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پاکستان ریڈیو سے صبح کے وقت سوال وجواب آتے ہیں، ایک شخص نے مفتی صاحب سے

سوال کیا کہ اشراق کا وقت کب تک رہتا ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ سورج نکلنے کے دو گھنٹے بعد تک اشراق کی نماز کا وقت رہتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبد القدیر، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سال کے بڑے دن کے اعتبار سے مفتی صاحب مجیب کا قول صحیح ہے، حدیث میں آیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سورج نکلنے کے اتنی دیر بعد اشراق پڑھتے تھے جتنی دیر کا وقفہ عصر کی ابتداء اور غروب تک کے درمیان ہوتا ہے۔ ماہ جون میں ابتداء عصر وغروب کے درمیان کم وبیش دو گھنٹے کا فاصلہ رہتا ہے؛ لہٰذا ماہ جون میں اشراق کا وقت سورج نکلنے کے دو گھنٹے بعد تک رہے گا۔

عن علي –رضي الله عنه– قال: كان النبي ﷺ يصلي الضحى –إلى– سألنا عليا عن صلاة رسول الله ﷺ، قد أمليته قبل، قال في الخبر: إذا كانت الشمس من ههنا، كهيئتها من ههنا عند العصر صلى ركعتين، فهذه صلاة الضحى. (صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ١/ ٦٠٩، رقم: ١٢٣٢)

وصلاة الإشراق –إلى قوله– بارتفاع النهار بعد خروج الوقت المكروه. (معارف السنن، كتاب الصلاة، أبواب الوتر، باب ماجاء في صلاة الضحى، أشرفيه، ص: ٢٦٦، الكوكب الدري، الصلاة، باب ماجاء في صلاة الضحى، مكتبه يحيوي سهارنپور ١/ ١٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍صفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۳۸)

چاشت کے وقت چاشت کی نماز پڑھنا افضل ہے یا قرآن کی تلاوت؟

سوال [۳۱۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک شخص قرآن کی تلاوت کررہا تھا، چاشت کی نماز کا وقت ہوگیا، وہ شخص قرآن کی تلاوت کو بند کرکے چاشت کی نماز پڑھنے لگا، زید عالم دین ہے، تو زید نے کہا ظالم تو یہ ظلم کررہا ہے قرآن کی تلاوت کو بند کردیا اور چاشت کی نماز پڑھنے لگا، چاشت کی نماز چھوڑ اور قرآن کی تلاوت کر، چاشت کی نماز سے قرآن کی تلاوت افضل ہے۔

المستفتی: رئیس احمد، اغوان پور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جو نمازیں مخصوص اوقات میں پڑھنا حدیث سے ثابت ہے انہیں اوقات میں دوسرے نیک اعمال کے مقابلہ میں ان نمازوں کو پڑھنا زیادہ افضل اور بہتر ہے؛ لہٰذا قرآن کی تلاوت کا سلسلہ جاری ہے اور اسی اثنا میں چاشت کا وقت ہوگیا ہے، تو تلاوت بند کرکے چاشت کی نماز ادا کرنا افضل اور بہتر ہے، بعد میں پھر دل چاہے تو تلاوت کی جاسکتی ہے، جو شخص چاشت کے وقت میں چاشت کی نماز پڑھنے پر اعتراض کررہا ہے، وہ غلط کررہا ہے، حدیث میں چاشت کے وقت میں اسی کی نماز ثابت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی پڑھتے تھے اور دوسروں کو ترغیب بھی دیتے تھے، اس کو عربی میں ''صلوۃ الضحیٰ'' کہا جاتا ہے۔

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى الضحى ثنتى عشرة ركعة بنى الله له قصرا في الجنة من ذهب. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في صلاة الضحى، النسخة الهندية ١/ ١٠٨، دارالسلام، رقم: ٤٧٣، سنن ابن ماجة، الصلاة، باب ماجاء في صلاة الضحى، النسخة الهندية ٨٦، دارالسلام، رقم: ١٣٨٠)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من حافظ على شفعة الضحى غفر له ذنوبه، وإن كانت مثل زبد البحر. (ترمذي، شريف، كتاب الصلاة، باب ماجاء في صلاة الضحى، النسخة الهندية ١/ ١٠٨، دارالسلام، رقم:

٤٧٦، المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، من كان يصليها، موسسة علوم القرآن، جديد ٥/ ٢٥٧، رقم: ٧٨٦٨، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٤٤٣، رقم: ٩٧١٤، ٢/ ٤٩٧، رقم: ١٠٤٥١، ٢/ ٤٩٩، رقم: ١٠٤٨٥، سنن ابن ماجة، الصلاة، باب ماجاء في صلاة الضحى، النسخة الهندية ١/ ٨٦، دارالسلام، رقم: ١٣٨٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۶۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۲۶ھ

صلاۃ التسبیح اور صلاۃ الاستخارہ کا طریقہ

سوال [۳۱۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صلاۃ التسبیح اور صلاۃ استخارہ کا طریقہ مع ادعیۂ ماثورہ لکھ دیں۔

المستفتی: (حضرت مولانا) رشید الدین (صاحب)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صلاۃ التسبیح کی دو صورتیں منقول ہیں: (۱) چار رکعت نماز کی نیت باندھ کر ثنا اور قراءت سے فراغت کے بعد پندرہ مرتبہ **"سبحان الله، والحمد لله، ولا إله إلا الله والله أكبر"** پڑھا کرے، پھر رکوع میں دس مرتبہ، پھر قومہ میں دس مرتبہ، پھر اول سجدہ میں دس مرتبہ، پھر دونوں سجدوں کے درمیان دس مرتبہ، پھر دوسرے سجدے میں دس مرتبہ، پھر سجدہ ثانیہ سے فارغ ہوکر بیٹھ کر دس مرتبہ یہ کل ۷۵/ مرتبہ ہوگئے اور جب دوسرے سجدے کے بعد بیٹھ کر دس مرتبہ پڑھے تو قیام کے وقت تکبیر کی ضرورت نہیں، اس طریقہ پر چار رکعت میں تین سو مرتبہ تسبیح ہوجاتی ہیں۔

(۲) دوسرا طریقہ ثنا سے فارغ ہوکر پندرہ مرتبہ، پھر اعوذ باللہ وبسم اللہ سے قراءت پوری کرکے رکوع سے قبل دس مرتبہ، بقیہ بدستور سابق ہوگا؛ لیکن دوسرے سجدے کے بعد بیٹھ کر

پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ (سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في صلاة التسبيح، النسخة الهندية ۱/ ۱۰۹، دار السلام، رقم: ۴۸۱ – ۴۸۳)

اور التحیات کے بعد سلام سے قبل یہ دعا اگر پڑھ سکتے ہیں تو پڑھیں:

اللهم إني أسئلك توفيق أهل الهدى، وأعمال أهل اليقين، ومناصحة أهل التوبة، وعزم أهل الصبر وجد أهل الخشية، وطلب أهل الرغبة، وتعبد أهل الورع، وعرفان أهل العلم حتى أخافك، اللهم إني أسألك مخافة تحجزني بها عن معاصيك، وحتى أعمل بطاعتك عملا استحق به رضاك، وحتى أناصحك في التوبة خوفا منك، وحتى أتوكل عليك في الأمور حسن الظن بك، سبحان خالق النور ربنا أتمم لنا نورنا، واغفرلنا إنك على كل شيء قدير برحمتك يا أرحم الراحمين.

اور سلام کے بعد بھی جو مراد ہو اللہ سے مانگے۔ (فضائل ذکر، ص:۱۷۶)

صلاۃ الاستخارہ کا طریقہ یہ ہے کہ: اولا دو رکعت نفل پڑھے، اس کے بعد خوب دل لگا کر یہ دعا پڑھے: "**أللهم إني استخيرك بعلمك، واستقدرك بقدرتك، وأسألك من فضلك العظيم، فإنك تقدر ولا أقدر، وتعلم ولا أعلم، وأنت علام الغيوب، اللهم إن كنت تعلم أن هذا الأمر خير لي في ديني ومعاشي ومعادي وعاقبة أمري، فاقدره لي ويسره لي، وبارك لي فيه، وإن كنت تعلم أن هذا الأمر شر لي في ديني ومعاشي، وعاقبة أمري فاصرفه عني واصرفني عنه، واقدر لي الخير حيث كان، ثم أرضني به**".

جب "**هذا الأمر**" پر پہنچے تو اپنی مراد پر دھیان کرے، پھر پاک بچھونے پر قبلہ کی طرف منہ کر کے سو جائے اور بیداری پر جو بات دل میں مضبوطی سے آئے وہی بہتر پہلو ہے، اسی کو کرنا چاہئے، اگر ایک دن نہ ہو تو یکے بعد دیگرے سات روز کرے، انشاء اللہ تعالیٰ کام کی اچھائی برائی معلوم ہو جائے گی۔ (ترمذی، الصلاۃ، باب ما جاء فی صلاۃ الاستخارہ، النسخۃ الہندیہ ۱/ ۱۰۹،

دارالسلام رقم: ۹۸۰، سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الاستخارہ، النسخۃ الہندیۃ ۱/ ۲۱۵، دارالسلام، رقم: ۱۵۳۸، بہشتی زیور۲/۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۳۹۰)

نماز میں تسبیح وآیات کس طرح شمار کی جائیں؟

سوال [۳۱۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''ایضاح المسائل'' کے ص: ۵۷ر پر صلاۃ حل المشکلاۃ کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے اس میں ذکر کردہ آیتیں کس طرح شمار کی جائیں؟ اگر دل ودماغ سے شمار کی جائیں تو صرف گنتی کی طرف دھیان رہے گا اور آیات کے معانی اور نماز سے دھیان ہٹ جائے گا اور گنتی میں بھی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ اور اگر ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تسبیح لے کر اس سے آیات شمار کریں تو نماز اور آیات کے معانی کی طرف بھی دھیان جمارہے گا اور گنتی میں بھی کمی بیشی نہیں ہوگی، تو کیا ایسی حالت میں ہاتھ میں تسبیح لے کر نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے تو اس کے پڑھنے کی آسان شکل کیا ہے؟ تحریر فرمائیں، جس سے گنتی میں کمی بیشی نہ ہو اور نماز کی طرف بھی دھیان جمارہے۔

المستفتی: نفیس اختر عرف منا بھائی، بڑی مسجد اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز کے اندر ہاتھ میں تسبیح لے کر شمار کرنا مکروہ ہے۔ اور اگر دل سے شمار کرنے میں دشواری پیش آئے تو انگلیوں کو اپنے حال پر رکھتے ہوئے ایک ایک کو دبا کر دل دل میں شمار کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ صلاۃ التسبیح میں تسبیحات کو اس طرح شمار کیا جاتا ہے، تو اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

وكره تنزيها عد الآئی والسور والتسبيح باليد في الصلاة مطلقا ولو نفلا، أما خارجها فلا يكره كعده بقلبه، أو بغمزه أنامله، وقال الشامي: أما الغمز برؤوس الأصابع أو الحفظ بالقلب فهو غير مكروه إتفاقا. (شامي، كتاب الصلاة، قبيل مطلب الكلام على اتخاذ المسجد، زكريا ٢/ ٤٢١، ٤٢٠، كراچی ١/ ٦٤٩، ٦٥٤٠، العناية مع فتح القدير، كتاب الصلاة، قبيل فصل ويكره استقبال القبلة، دارالفكر ١/ ٤١٨، زكريا ١/ ٤٣١، كوئٹه ١/ ٣٦٥، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، كوئٹه ٢/ ٢٩، زكريا ٢/ ٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۸؍ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۳۴۶/۳۷)	۱۴۲۵/۴/۲۸ھ

علاج کرانے کے لئے استخارہ کرنا

سوال [۳۱۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب نے کافی علاج کرایا؛ لیکن فائدہ نہیں ہو پایا، اب وہ دوبارہ کسی اور سے اپنا علاج کرانا چاہتے ہیں، تو کیا وہ اس بارے میں استخارہ کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد فاروق نرسکھیڑہ دلپت پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انسان کو اپنا علاج کرانا مندوب ہے؛ لہٰذا جب مذکورہ شخص نے ایک ڈاکٹر سے علاج کرایا اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور اب وہ دوبارہ کسی اور ڈاکٹر سے علاج کرانے کے لئے استخارہ کرنا چاہتے ہیں، تو شرعاً ان کو استخارہ کرنے کی اجازت ہے۔ اور استخارہ کا مقصد دلی رجحان ہے، اور آپ کا رجحان دوسرے کسی ڈاکٹر سے علاج کرانے کا ہے؛ لہٰذا استخارہ کی خاص ضرورت نہیں کیوں کہ استخارہ تردد اور تشویش کی صورت میں کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

قد ذهب جمهور العلماء الحنفية والمالكية إلى أن التداوي مباح.
(الموسوعة الفقهية ۱۱/۱۱۷)

إن الاستخارة تكون في الأمور التي لا يدري العبد وجه الصواب فيها ......، فالإستخارة لا محل لها في الواجب، والحرام، والمكروه، وإنما تكون في المندوبات والمباحات. (الموسوعة الفقهية ۳/ ۲٤۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۳۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱/۱۴۲۸ھ

کسی کام کو کرنے سے پہلے استخارہ

سوال [۳۱۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: استخارہ کسی اہم کام کو کرنے سے پہلے کرنا چاہئے یا بعد کو؟ کیا استخارہ میں مستقبل کے حالات رونما ہوجاتے ہیں؟

المستفتی: محمد فرمود صدیقی، محلّہ کوٹ امروہہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: استخارہ کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے جب اس میں تردد ہوتو استخارہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے ازالۂ تردد کی دعا مانگنی چاہئے اور دلی میلان کسی ایک جانب ہوجائے یہی استخارہ کا اصل مقصد ہے۔ اور کبھی اللہ تعالیٰ خواب میں مقصد دکھلا دیتے ہیں؛ لیکن خواب دیکھنا تکمیل استخارہ کے لئے لازم نہیں ہے؛ بلکہ دلی میلان اصل چیز ہے۔ اور کبھی اتفاقاً خواب کے ذریعہ مستقبل کے حالات رونما بھی ہوجاتے ہیں؛ لیکن یہ ضروری نہیں اور دو رکعت نماز کے بعد حسب ذیل دعا پڑھنا حدیث سے ثابت ہے:

”**أللهم إني استخيرك بعلمك، واستقدرك بقدرتك، وأسئلك من فضلك العظيم، فإنك تقدر ولا أقدر، وتعلم ولا أعلم،**

وأنت علام الغيوب، اللهم إن كنت تعلم أن هذا الأمر خير لي في ديني ومعيشتي وعاقبة أمري، أو قال: في عاجل أمري وآجله، فيسره لي، ثم بارك لي فيه، وإن كنت تعلم أن هذا الأمر شر لي في ديني ومعيشتي وعاقبة أمري، أو قال: في عاجل أمري وآجله، فاصرفه عني واصرفني عنه، واقدر لي الخير حيث كان، ثم أرضني به، قال: ويسمي حاجته“.

(ترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في صلاة الإستخارة، النسخة الهندية ١/ ١٠٩،

دارالسلام، رقم: ٤٨٠، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الاستخارة، النسخة الهندية

١/ ٢١٥، دارالسلام، رقم: ١٥٣٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۳؍رجب ۱۴۱۲ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۷۷۱)

طلب بارش کا انوکھا اور ناجائز طریقہ

سوال [۳۱۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہماری بستی میں طلب بارش کے لئے لوگ چھترہ پر چڑھ کر اذانیں دیتے ہیں، اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی، اس کا ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا ہے، تمام لوگ دعا بعد صف بستہ ہوتے ہیں اور امام آگے ہوتا ہے، امام تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد معا سورۂ ”یٰسین“ شروع کر دیتا ہے، جب امام ”وكل شيء احصيناه فى امام مبين“ پر پہنچتا ہے، توامام اور تمام مقتدیان بلند آواز سے اذانیں دیتے ہیں، جب تمام لوگ اذانوں سے فارغ ہوجاتے ہیں تو امام آگے قراءت شروع کر دیتا ہے، جب امام دوسرے والے ”مبین“ پر پہنچتا ہے تو یہی عمل کیا جاتا ہے، یعنی ہر ”مبین“ پر اذان دیتے ہیں، جب سورت ختم ہوجاتی ہے، تو امام کھڑے کھڑے سلام پھیر دیتا ہے، اب آپ مہربانی فرما کر تحریر فرمائیں کہ اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد الناصر جامعہ رحمانیہ ٹانڈا بادلی، ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بارش کے لئے اذان دینا قرآن وحدیث اور صحابہ وتابعین، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک، فقہائے متقدمین ومتأخرین رحمہم اللہ میں سے کسی سے ثابت نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ وتابعین کے دور میں بھی بار بار خشک سالیاں ہوئیں، تاہم کسی سے اذان ثابت نہیں؛ البتہ صلاۃ الاستسقاء ثابت ہے، جس کی تفصیل اپنی جگہ موجود ہے، نیز نیت باندھ کر سورۂ یٰسین کے ہر ''مبین'' پر اذان محض بدعت مخترعہ ضالہ ہے، اس سے احتراز لازم ہے۔

من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه، فهو رد. (صحيح مسلم، كتاب الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة، ورد محدثات الأمور، النسخة الهندية ۲/ ۷۷، بيت الأفكار، رقم: ۱۷۱۸، سنن ابن ماجة، كتاب السنة، باب تعظيم حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم، والتغليظ على من عارضه، النسخة الهندية/ ۳، دارالسلام، رقم: ۱٤، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، النسخة الهندية ۲/ ٦۳٥، دارالسلام، رقم: ٤٦۰٦، مسند أحمد بن حنبل ٦/ ۲٤۱، رقم: ۲٦٥٦۱، صحيح ابن حبان، باب الاعتصام بالسنة...... دارالفكر ۱/ ۸٤، رقم: ۲٦، ۲۷، مشكوة ۱/ ۲۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴۲۹)

سورج گرہن کی نماز

سوال [۳۱۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سورج گرہن کے بارے میں عامۃ الناس میں طرح طرح کی باتیں گردش کر رہی ہیں، ادھر سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ جب سورج گرہن ہو تو اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہئے، حاملہ

عورتوں اور حاملہ جانوروں کو بند جگہ میں (جہاں سورج کی کرنیں نہ پہنچتی ہوں) رکھنا چاہئے، بقول ان کے اس کی شعائیں آنکھوں کو نقصان پہنچاتی ہیں اور بہت سی اس طرح کی باتیں ہیں، جن کو سائنسداں بیان کرتے ہیں؛ لہٰذا چند باتوں کی وضاحت مطلوب ہے:

(۱) سورج گرہن کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲) مسلمانوں کو ایسے موقع پر کیا کرنا چاہئے؟

(۳) سائنسدانوں کی بیان کردہ احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنے میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں؟

المستفتی: جلیس احمد، ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سورج گرہن کے وقت اس کی شعاؤں سے حاملہ اور آنکھوں کو نقصان پہنچنا اس کا تعلق اہل طب سے ہے، ان کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔ اور شرعی اعتبار سے سورج گرہن ہونا اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ بتلانا چاہتا ہے کہ سورج لائق عبادت نہیں؛ بلکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہے، جب اللہ تعالیٰ اس کی روشنی کو ختم کردے تو سورج میں اتنی طاقت وقدرت نہیں کہ وہ اپنے اندر روشنی پیدا کرے۔

وإن الشمس والقمر آيتان من آيات الله تعالىٰ يريهما عباده ليعلموا أنهما مسخران بأمره ليس لهما سلطان في غيرهما، ولا قوة الدفع عن أنفسهما، فلا يستحقان أن يعبدا. (طحطاوي على مراقي الفلاح، باب صلاة الكسوف، جديد دارالكتاب ديوبند ٥٤٤، قديم ٢٩٧)

(۲) جب سورج گرہن ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا اور استغفار کرنا اور نماز پڑھنا چاہئے۔

عن قيس قال: سمعت أبا مسعود يقول: قال النبي ﷺ: إن الشمس والقمر لا يخسفان لموت أحد من الناس، ولكنهما آيتان من آيات الله، فإذا

رأيتموها فقوموا، فصلوا. (صحيح البخاري، كتاب الكسوف، باب الصلاة في كسوف الشمس، النسخة الهندية ۱/ ۱۴۱، رقم: ۱۰۳۱، ف: ۱۰۴۱)

ولكنهما آيتان من آيات الله، إن الله إذا بدا لشيء من خلقه خشع له، فإذا رأيتم ذلك فصلوا، والله تعالىٰ يخوف عباده ليتركوا المعاصي، ويرجعوا إليه بالطاعة والاستغفار. (طحطاوي، دارالكتاب ديوبند ۵۴۳، قديم ۲۹۷)

(۳) مذکورہ سائنسی تدابیر کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۰/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۱۸)	۱۴۱۶/۶/۲۰ھ

سورج گرہن، چاند گرہن سے متعلق ہندو روایات معتبر نہیں

سوال [۳۱۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سورج گرہن، چاند گرہن اور ان سے متعلق ہندو روایتیں، مثلاً حاملہ عورتوں کے لئے نقصان دہ ہے اور دیگر روایتیں اور اس کا پس منظر صحیح اسلامی روایت یا عمل کیا ہونا چاہئے؟ روشناس فرمائیں۔

المستفتی: شہزادے راعینی، سبزی منڈی، شہر گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت اسلامی میں ہندو روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، سورج گرہن کے موقع پر اسلام کا حکم یہ ہے کہ لوگ دو رکعت نماز باجماعت ادا کریں اور نماز کے بعد سورج نکل آنے تک دعاؤں میں مشغول رہیں۔ اور چاند گرہن کے موقع پر لوگوں کو تنہا تنہا دو رکعت نماز ادا کرنی چاہئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، جس سے انسان کو عبرت حاصل کرنی چاہئے اور خدا کو یاد کرنا چاہئے۔

عن أبي بكرة قال: كنا عند النبي ﷺ، فانكسفت الشمس، فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم يجر رداءه حتى دخل المسجد، فدخلنا فصلى بنا ركعتين حتى انجلت الشمس، فقال: إن الشمس والقمر لا ينكسفان لموت أحد، وإذا رأيتموها فصلوا وادعوا حتى يكشف ما بكم.

(صحيح البخاري، كتاب الكسوف، باب الصلاة في كسوف الشمس، النسخة الهندية ١/ ١٤١، رقم: ١٠٣٠، ف: ١٠٤٠)

وهي سنة تؤدي بجماعة واختلفوا في صفة أدائها، قال علماء نا: يصلي ركعتين كل ركعة بركوع وسجدتين كسائر الصلوات، يقرأ فيهما ما أحب، ويدعو بعد الصلاة حتى تنجلي الشمس كمال الانجلاء.

(عالمگيری، كتاب الصلاة، الباب الثامن عشر في صلاة الكسوف، زكريا قديم ١/ ١٥٣، جديد ١/ ٢١٣، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل التاسع والعشرون في صلاة الكسوف، زكريا ٢/ ٦٥٧، رقم: ٣٥٢٢)

يصلون ركعتين في خسوف القمر وحدانا. (عالمگيری، زكريا قديم ١/ ١٥٣، جديد ١/ ٢١٤)

وكسوف القمر ذهاب ضوءه، والخسوف ذهاب دائرته، ثم يصلي الصلاة فيها، فرادى عندنا. (الفتاوى التاتارخانية، الصلاة، فصل في صلاة الكسوف، زكريا ٢/ ٦٦٠، رقم: ٣٥٢٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۲۰۹)

نمازِ کسوف کا طریقہ

سوال [۳۱۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: (۱) کہ صلاۃِ کسوف کا طریقہ کیا ہے؟ ہماری بستی میں ایک صاحب نے نماز کسوف اس طرح پڑھائی کہ پہلے طویل قراءت کی، پھر رکوع کیا، رکوع سے کھڑے ہوکر پھر سورہ فاتحہ پڑھی اور سورت ملائی، پھر رکوع کیا، یعنی دو مرتبہ رکوع کیا، معلوم کرنے پر کہا کہ یہی طریقہ حدیث سے ثابت ہے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ صحیح طریقہ صلاۃ کسوف کا کونسا ہے مع حوالہ کتب جواب سے نوازیں؟

(۲) نماز کسوف میں قراءت جہری کرنی چاہئے یا سری؟ مفتی بہ قول جہر کا ہے یا سر کا؟

(۳) نماز کسوف کس وقت تک پڑھیں گے؟

(۴) نماز کسوف کے بعد تقریر کرنی چاہئے یا نہیں؟

المستفتی: جلیس احمد ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اس طرح دو رکوع کے ساتھ صلاۃِ کسوف حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو جائز ہے، مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دو رکوع کرنا جائز نہیں ہے۔ اور حدیث شریف میں دو، تین، چار رکوع کی جو بات آئی ہے اس کا مدار اس پر ہے کہ حضور ﷺ نے اس نماز کے اندر لمبا رکوع فرمایا تھا، جس کی وجہ سے صف اول کے نمازیوں نے یہ سوچا کہ شاید آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھالیا ہے، چناں چہ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو پیچھے کی صف والوں نے بھی سر اٹھالیا، اس کے بعد جب صف اول والوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ رکوع ہی میں ہیں تو وہ لوگ دوبارہ رکوع میں چلے گئے اور پیچھے والوں نے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ نے دو رکوع کئے ہیں اور اسی خیال کے مطابق روایت بیان کردی، اسی وجہ سے دو رکوع یا چار رکوع والی روایت صرف صحابیہ عورتیں یا اصاغر صحابہ نقل کرتے ہیں جو پیچھے تھے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں جو کہ بچوں اور عورتوں کی صفوں میں تھے اور ان کی صفیں پیچھے ہوتی تھیں، انہوں نے اگلی صف والوں کو دیکھ

کر یہ سمجھا کہ دو رکوع کئے ہیں، حالاں کہ حقیقت میں ایک رکوع کیا تھا، اسی وجہ سے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم صرف ایک رکوع کی روایت بیان کرتے ہیں۔

الحنفية قالوا: صلاة الكسوف لا تصح بركوعين، وقيامين بل لابد من قيام واحد وركوع واحد، كهيئة النفل بلا فرق. (الفقه على المذاهب الأربعة، كتاب الصلاة، سنن صلاة الكسوف، دارالفكر ١/ ٣٦٤)

نحمل ما رويتم على أن النبي ﷺ ركع فأطال الركوع كثيرا زيادة على قدر ركوع سائر الصلوات لما روى أنه عرض عليه الجنة والنار في تلك الصلاة، فرفع أهل الصف الأول رؤوسهم ظنا منهم أنه صلى الله عليه وسلم رفع رأسه من الركوع، فرفع من خلفهم، فلما رأى أهل الصف الأول رسول الله ﷺ راكعا ركعوا، وركع من خلفهم، فلما رفع رسول الله صلى الله عليه وسلم رأسه من الركوع رفع القوم رؤوسهم، فمن كان خلف الصف الأول ظنوا أنه ركع ركوعين، فرووا على حسب ما وقع عندهم، وعلم الصف الأول حقيقة الأمر، فنقلوا على حسب ما علموه، ومثل هذا الاشباه قد يقع لمن كان في آخر الصفوف، وعائشةؓ كانت واقفة في خير صفوف النساء، وابن عباس في صف الصبيان في ذلك الوقت، فنقلا كما وقع عندهما. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في صلاة الكسوف و كيفيتها، جديد زكريا ١/ ٦٢٨، كراچی ١/ ٢٨١، التقرير للترمذي، باب صلاة الكسوف، ص: ١٩)

(۲) نمازِ کسوف کے اندر امام صاحب کے نزدیک قراءت آہستہ کرنے کا حکم ہے اور یہی مفتی بہ قول ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل، ص: ۴۶)

ولا جهر في القراءة فيهما عنده، خلافا لهما، وفي الطحطاوي: الصحيح قول الإمام كما في المضمرات. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب صلاة الكسوف، ص: ٢٩٨، جديد دارالكتاب ديوبند ٥٤٥، تاتارخانية، كتاب

الصلاة، فصل في صلاة الكسوف، قديم ٢/ ١١٧، جديد زكريا ٢/ ٦٥٨، رقم: ٣٥٢٤)

(۳) نماز کسوف جب تک سورج گرہن باقی رہے اس وقت تک پڑھیں، اگر نماز گرہن مکمل ہونے سے پہلے مکمل کردیں تو سورج میں روشنی آنے تک استغفار اور دعا میں مشغول رہیں۔

حتى يكمل انجلاء الشمس لقوله صلى الله عليه وسلم: فإذا رأيتموها فادعوا وصلوا حتى ينكشف ما بكم. (طحطاوي على المراقي الفلاح، باب صلاة الكسوف، جديد دارالكتاب ديوبند ٥٤٦، قديم ٢٩٨، تاتارخانية، كتاب الصلاة، فصل في صلاة الكسوف، زكريا ٢/ ٦٥٩، رقم: ٣٥٢٥، قديم ٢/ ١١٨)

(۴) نماز کے بعد آفتاب روشن ہونے تک استغفار ودعا وغیرہ میں مشغول رہیں، تقریر کرنا بھی جائز ہے۔

إن المسنون أن يشتغل بالصلاة والدعاء حتى تنجلي الشمس.
(تاتارخانية زكريا ٢/ ٦٥٩، رقم: ٣٥٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۱۴۱۶/۶/۲۴ھ
۱۴۱۶/۶/۲۴ھ	(الف فتویٰ نمبر: ۴۵۱۵/۳۲)

۲۵/ باب التراويح

الفصل الأول في صلاة التراويح

گرمی کی وجہ سے صرف تراویح کی جماعت مسجد کی چھت پر کرنا

سوال [۳۱۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سخت گرمی کی وجہ سے نماز عشاء کی جماعت مسجد کے اندر کرکے تراویح کی جماعت مسجد کی چھت پر کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ہارون قاسمی، لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح کی نماز فرض نہیں ہے؛ بلکہ سنت ہے؛ اس لئے فرض نماز اصل مسجد میں ادا ہوجانے کے بعد گرمی کی وجہ سے تراویح کی نماز چھت کے اوپر جاکر کے ادا کرنا بلا کراہت جائز ودرست ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی، جدید، زکریا ۳/ ۱۴۶، جواب: ۲۱۰، قدیم ۳/ ۱۰۳، زکریا مطول ۴/ ۳۰۲)

التراويح سنة مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، كراچى ۲/ ۴۳، زكريا ۲/ ۴۹۳، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، دارالكتب العلمية بيروت، جديد ۲/ ۲۰۲، مصري، قديم ۱/ ۱۳۵، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، الصلاة، فصل في صلاة التراويح، دارالكتاب ديوبند جديد، ص: ۴۱۲، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۷/ ۱۳۶)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۴۴)

فرم میں نماز عشاء اور تراویح پڑھنا

سوال [۳۱۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے محلّہ میں کیت والی مسجد میں نماز تراویح میں کافی مجمع ہوجاتا ہے، جگہ نہ ملنے کی وجہ سے کچھ لوگوں کو واپس ہونا پڑتا ہے؛ اس لئے ایک فرم میں نماز تراویح ونماز عشاء باجماعت ادا کرتے ہیں، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ نماز عشاء وتراویح فرم میں ادا کرنے سے فرض نماز ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ فرض نماز فرم کے اندر جماعت سے ادا کرنے پر نماز عشاء ادا نہیں ہوگی۔

المستفتی: احمد جان پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح کی نماز کی جماعت فرم یا کسی ہال میں کرنے کی گنجائش ہے، مگر عشاء کے فرض مسجد میں باجماعت پڑھنا ضروری ہے؛ لیکن اگر مسجد کی تنگی کی مجبوری ہے تو دوسری مسجد میں جاکر کے فرض نماز ادا کرنی چاہئے، اگر وہاں بھی تنگی ہے تو فرم میں عشاء کی نماز پڑھنے کی گنجائش ہے؛ لیکن اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ فرم میں نماز پڑھنے سے مسجد کا ثواب نہیں ملے گا؛ لہٰذا ہر شخص رمضان جیسے مبارک مہینے میں اپنے آپ کو عظیم ترین فضیلت اور ثواب سے محروم ہونے سے بچائے رکھے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: من سمع النداء فلم يأته، فلا صلاة له، إلا من عذر. (سنن ابن ماجة، الصلاة، باب التغليظ في التخلف عن الجماعة، النسخة الهندية ٥٧، دارالسلام، رقم: ٧٩٣)

وإن صلى أحد في بيته بالجماعة حصل لهم ثوابها، وأدركوا فضلها؛ ولكن لم ينالوا فضل الجماعة التي تكون في المسجد لزيادة فضيلة المسجد، وتكثير جماعته، وإظهار شعائر الإسلام. (حلبي كبير، الصلاة، فصل في التراويح، أشرفيه ١/ ٤٠٢)

وإن صلى أحد في البيت بالجماعة لم ينالوا فضل جماعة المسجد. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر، كراچی ٢/ ٤٥، زكريا ٢/ ٤٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٣٠ر رجب ١٤٢٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/٨٥٠٣)

کھلے میدان میں تراویح کی نماز

سوال [٣١١٢]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کشادہ میدان اسکول جہاں کسی وقت کی نماز نہیں ہوتی ہے، کیا وہاں نماز تراویح ادا ہوسکتی ہے؟ اور کیا وہاں عشاء کی نماز بھی ہوسکتی ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن واجد نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جی ہاں وہاں نماز تراویح وعشاء اور دیگر نمازیں سب صحیح اور درست ہو جائیں گی، بشرطیکہ مقام نجاست میں نماز نہ پڑھی جائے؛ البتہ وہاں مسجد کا ثواب نہیں ملے گا، حدیث میں آیا ہے کہ امت محمدیہ کی نماز روئے زمین کے ہر حصہ میں ادا ہوجاتی ہے۔

جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: –إلى– وجعلت لي الأرض مسجدا وطهورا، وأيما رجل من أمتي أدركته الصلاة فليصل. الحديث (صحيح البخاري، الصلاة، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم جعلت لي الأرض مسجدا وطهورا، النسخة الهندية ١/ ٦٢، رقم: ٤٣٣، ف: ٤٣٨)

عن جابر بن عبدالله الأنصاري –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: –إلى– وجعلت لي الأرض طيبة طهورا، ومسجدا،

فـأيما رجل أدركته الصلاة صلى حيث كان. الحديث (صحيح مسلم، كتاب المساجد، ومواضع الصلاة، النسخة الهندية ١/ ١٩٩، بيت الأفكار، رقم: ٥٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/رجب ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲٦/ ۱۸۵۷)

گھر میں تراویح پڑھنے والے فرض نماز کہاں پڑھیں؟

سوال [۳۱۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم لوگ بیس افراد ایک مکان کی چھت پر تراویح میں دس دن کا قرآن سن رہے ہیں، آیا ہم لوگ عشاء کی نماز بھی جماعت کے ساتھ مکان پر ہی ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جب کہ مسجد ہمارے محلّہ میں سات گھروں کے بعد ہی ہے اور ایک عذر بھی ہے کہ اگر مسجد میں جماعت سے نماز پڑھتے ہیں تو کوئی پانچ منٹ، کوئی دس منٹ کی تاخیر سے آتا ہے، آیا ہم لوگوں کا مکان کی چھت پر جماعت کرنا درست ہے؟

المستفتی: محمد عقیل، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ماہ رمضان المبارک میں ہر عبادت کا ثواب ستر گنا ہوجاتا ہے اور حدیث شریف میں مسجد کی جماعت کی بہت زیادہ فضیلت آئی ہے اور عشاء کی باجماعت نماز گھر اور چھتوں پر پڑھنا اگرچہ بلاتردد جائز اور درست ہے، مگر رمضان جیسے مبارک مہینہ میں مسجد کی جماعت کو ترک کردینا بہت بڑی محرومی کی بات ہے؛ اس لئے عشاء کی فرض نماز مسجد ہی میں باجماعت ادا کرنی چاہئے، اس کے بعد گھر یا چھتوں پر جہاں تراویح کی نماز ہوتی ہے وہاں آکر سنتیں وغیرہ پڑھ کر تراویح کی نماز شروع کرنی چاہئے اور یہ جو عذر پیش کیا گیا ہے کہ کوئی ۵/ منٹ یا ۱۰/ منٹ کے بعد آئے گا، یہ غیر

معقول عذر ہے؛ کیوں کہ جس کوتراویح باجماعت پڑھنی ہوتی ہے، اس کوخود اپنی تراویح کی فکر ہوتی ہے، جس کا تجربہ ہم کوخود ہے۔

عن سلمان الفارسي –رضي الله عنه– قال: خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم في آخر يوم من شعبان، فقال: ...... من تقرب فيه بخصلة من الخير كان كمن أدى فريضة فيما سواه، ومن أدى فريضة فيه كان كمن أدى سبعين فريضة فيما سواه. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٠٥، رقم: ٣٦٠٨، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ٢/ ٩١١، رقم: ١٨٨٧)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: صلاة الرجل في الجماعة تضعف على صلاته في بيته، وفي سوقه خمسا وعشرين ضعفا، وذلک أنه إذا توضأ، فأحسن الوضوء، ثم خرج إلى المسجد، لا يخرجه إلا الصلاة لم يخط خطوة، إلا رفعت له بها درجة، وحط عنه بها خطيئة، فإذا صلى لم تزل الملائكة تصلي عليه ما دام في مصلاه: اللهم صل عليه، اللهم ارحمه، ولا يزال أحدكم في صلاة ما انتظر الصلاة. (صحيح البخاري، الصلاة، باب فضل صلاة الجماعة، النسخة الهندية ١/ ٨٩، رقم: ٦٣٨، ف: ٦٤٧)

وإن صلى أحد فى بيته بالجماعة لم ينالوا فضل الجماعة التي تكون فى المسجد لزيادة فضيلة المسجد، وتكثير جماعته، وإظهار شعائر الإسلام، وهكذا في المكتوبات، أي الفرائض ...... فالحاصل أن كل ما شرع فيه الجماعة فالمسجد فيه أفضل لما اشتمل عليه من شرف المكان، وإظهار الشعائر، وتكثير سواد المسلمين، وائتلاف قلوبهم. (حلبي كبير، الصلاة، تراويح، أشرفيه، ص: ٤٠٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦ رمحرم الحرام ١٤٣۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤٠/ ١١٣٧٠)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٣۵/١/٧ھ

زکوۃ وغیرہ کی رقم سے تعمیر شدہ مدرسہ میں نماز وتراویح کا حکم

سوال [۳۱۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرسہ جس کی تعمیر زکوۃ، صدقۂ فطر، چرم قربانی کے پیسہ سے ہوئی ہے، اس میں لوگ رمضان میں تراویح شروع کرنے اور دوسرے مسئلے معلوم کرنے کے لئے آتے ہیں، مدرسہ میں تراویح کی نماز ہوتی ہے اور عشاء کی جماعت بھی ہوتی ہے؛ کیوں کہ لوگ تراویح کے بارے میں مدرسہ میں معلوم کرنے آتے رہتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ جس مدرسہ کی تعمیر میں زکوۃ وغیرہ کا پیسہ لگا ہو، اس میں فرض نماز اور تراویح کی نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: روئے زمین کے ہر پاک حصہ پر نماز جائز ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: **"جعلت لنا الأرض كلها مسجدا"** (صحيح مسلم، كتاب المساجد، ومواضع الصلاة، النسخة الهندية ١/ ١٩٩، بيت الأفكار، رقم: ٥٢٢، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٧/ ٢٦٤، رقم: ٢٨٤٥، صحيح ابن خزيمه، المكتب الإسلامي ١/ ١٦٦، رقم: ٢٦٣) "کہ تمام زمین کو میرے لئے مسجد بنادیا گیا" کی بنا پر؛ لہٰذا فرض، نفل، سنت، تراویح ہر جگہ جائز ہے؛ لیکن مسجد کو چھوڑ کر مدرسہ میں جماعت کر لینے سے مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب حاصل نہیں ہوگا۔

عن جابر بن عبدالله –رضى الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: جعلت لي الأرض مسجدا وطهورا، أينما أدرك رجل من أمتي الصلاة صلى. (سنن النسائي، الصلاة، الرخصة في ذلك، النسخة الهندية ١/ ٨٥، دارالسلام، رقم: ٧٣٧)

إن صلى أحد في البيت بالجماعة لم ينالوا فضل جماعة المسجد. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ۲/ ٤٥، زكريا ۲/ ٤٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦٩٦۷)

مسجد سے متصل مدرسہ میں ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھنا

سوال [۱۱۵۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے مسجد سے متصل مدرسہ میں چھ یوم میں تراویح میں قرآن پاک مکمل کیا، جب کہ مسجد میں ابھی قرآن ہو رہا ہے، اب زید ان مصلیوں کو ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھاتا ہے، جب کہ سارے مصلی فرض نماز مسجد ہی میں ادا کرتے ہیں، مزید زید کی طرف سے تاکید ہے کہ میرے پیچھے صرف وہی لوگ تراویح پڑھیں جنہوں نے چھ یوم میں قرآن مکمل کیا، تو کیا زید کا یہ عمل شریعت کی روشنی میں درست ہے؟ اور کیا مصلیوں کا مسجد چھوڑ کر مدرسہ میں تراویح پڑھنا، جب کہ قرآن سن چکے ہیں شرعاً درست ہے؟

المستفتی: محمد ابصار قاسمی، مدرسہ انوار العلوم، بھیکم پورہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جن لوگوں نے چھ یوم میں قرآن کریم مکمل کرلیا ہے، ان کے لئے فرض نمازوں کے بعد بھی مسجد سے متصل مدرسہ میں ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھنا درست نہیں ہے اور نہ زید کے لئے مسجد سے متصل کمرہ میں بلا کسی عذر شدید کے ''الم ترکیف'' سے تراویح قائم کرنا درست ہے۔ اور کاروباری مشاغل نماز کے اعذار میں شامل نہیں ہیں؛ بلکہ سب لوگوں کو مسجد کی اصل جماعت میں شرکت کرنی چاہئے، جہاں قرآن ہو رہا ہے۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۷/ ۱٦۸، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۳۰٦)

أما قراءة القرآن في التراويح، فمستحب، أي مسنون بل من أجل مقصود التراويح قراءة القرآن فيما يسمع المسلمون كلام الله.
(فتاوى ابن تيميه ۱/ ۱٤۷)

وإنما جعل ذلک في المساجد في رمضان لکی يحصل العامة الناس فضيلة القيام بالقرآن كله، وسماع كلام ربهم في أفضل الشهور.
(كتاب المدخل ۲/ ۸۹، بحواله رحيميه، قديم ٤/ ٤۱۲، جديد زكريا ٦/ ۲۵۳)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/ ۷۳۱۸)

ایک مسجد میں ایک ساتھ الگ الگ دو تراویح کی کراہت

سوال [۳۱۱٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرٹھ میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مسجد میں ایک ساتھ دو تراویح ہوتی ہیں، اوپر کی منزل میں ایک حافظ صاحب پڑھاتے ہیں اور نیچے کی منزل میں ایک حافظ صاحب، اوپر کی منزل میں ۳؍ پارے ہوتے ہیں اور نیچے کی منزل میں ایک پارہ ہوتا ہے، تو اس طرح ایک ہی مسجد میں اوپر نیچے تراویح کی ایک ساتھ دو نمازیں جائز ہیں یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک ہی مسجد میں اوپر نیچے ۲؍ جگہ تراویح کا ہونا خواہ ایک ساتھ ہو یا پے در پے ہو، مکروہ تنزیہی ہے۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱/ ۵۲۱، احسن الفتاوی ۳/ ۵۲٦)

ولو صلی مرتين في مسجد واحد يكره. (خانية على الهندية، الصلاة، قبيل فصل في مقدار التراويح، زكريا ۱/ ۲۳٤، زكريا جديد ۱/ ۱٤۵)

ولو صلی التراویح مرتین في مسجد واحد یکره. (هندیة، الباب التاسع في النوافل، زکریا قدیم ۱/ ۱۱٦، جدید ۱/ ۱۷٦)

صلوها بجماعة، ثم أعادوا إرادتها بالجماعة یکره. (بزازیة، الصلاة، الثالث في التراویح، زکریا جدید ۱/ ۲۲، وعلی هامش الهندیة ٤/ ۲۹)

ولو صلوا التراویح، ثم أرادوا أن یصلوا ثانیا یصلون فرادی.

(تاتارخانیة، کتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر في التراویح، زکریا ۲/ ۳۲۱، رقم: ۲۵٤۳، هندیة، الباب التاسع في النوافل، زکریا قدیم ۱/ ۱۱٦، جدید ۱/ ۱۷٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۲/۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۲۴/۴۰)

ایک مسجد میں بیک وقت دو تین جگہ تراویح

سوال [۳۱۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان المبارک کے مہینہ میں بعض مساجد میں دو یا تین جگہ تراویح ہوتی ہیں، مثلاً زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ نیچے والی منزل میں تو قرآن پاک تراویح میں ہو ہی رہا ہے؛ لیکن بالکل اس کے اوپر دوسری منزل میں بھی دوسرا قرآن پاک اسی وقت ہوتا ہے؛ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا از روئے شرع اوپر والی منزل میں تراویح قرآن پاک کے ساتھ ہوسکتی ہیں؟ کسی طرح کی کوئی کراہت تو نہیں ہے؟ مسئلہ کو واضح فرما کر ممنون فرمائیں اور مکان، کارخانوں وفرم وغیرہ میں تراویح کے سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ واضح فرمائیں۔

المستفتی: محمد حنیف، ولد محمد عاقل مرحوم، کٹارشہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چونکہ مسجد میں تعدد جماعت مکروہ ہے اور اس کے عموم میں

تراویح بھی شامل ہے؛ اس لئے ایک مسجد میں ایک ہی وقت میں تراویح کی دو جماعتیں یا تین جماعتیں اور بھی زیادہ کراہت کا سبب بنیں گی؛ اس لئے شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے۔

(مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۲۶)

وفي القنية: إمام يصلي التراويح على سطح المسجد اختلف في كراهته، والأولى أن لا يصلي فيه عند العذر، فكيف بغيره. الخ (كبيري، الصلاة، تراويح فروع، أشرفيه، جديد: ٤١٠، مكتبه رحيميه ديو بند ٣٩٢)

رمضان جیسے فضیلت کے مہینہ میں مسجد کی جماعت سے اپنے آپ کو محروم کرنا یہ خود اپنی جگہ ایک بڑی کمزوری ہے، نیز فرض نمازوں کو مسجد میں پڑھنے کا تاکیدی حکم ہے، اگر کسی مجبوری کے تحت فرموں میں تراویح کی نماز پڑھی جارہی ہے، تو ضروری ہے کہ پہلے فرض نماز مسجد میں ادا کریں اس کے بعد فرموں میں آکر تراویح کی نماز پڑھی جائے، نیز یہ بات بھی یاد رکھیں کہ تراویح کی نماز مسجد ہی میں پڑھنا مسنون ہے؛ اس لئے فرموں میں پڑھنے سے تراویح کی نماز تو صحیح ہوجائے گی؛ لیکن مسجد میں پڑھنے کی جو سنت ہے اس کا ترک لازم آتا ہے؛ اس لئے رمضان جیسے مبارک مہینہ میں اہم ترین عذر کے بغیر مسجد کی تراویح سے اپنے آپ کو محروم نہ کریں۔

وظاهر كلامهم هنا أن المسنون كفاية إقامتها بالجماعة في المسجد حتى لو أقاموها جماعة فى بيوتهم ولم تقم في المسجد أثم الكل. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچى ٢/ ٤٥، زكريا ٢/ ٤٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
یکم ربیع الاول ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۵۳۷)	۱/۳/ ۱۴۲۳ھ

مسجد میں اوپر نیچے تراویح کی جماعت کا حکم

سوال [۸۱۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: تراویح مسجد کی ہر منزل پر جائز ہے؟ اگر جواب مثبت ہے، تو نماز عشاء بھی ہر منزل پر علیحدہ پڑھ سکتے ہیں؟

المستفتی: عبدالحق فرخ آبادی، مسجد منشی کریم اللہ والی پرنس روڈ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد میں جماعت ثانیہ مطلقاً مکروہ ہے، اس میں تراویح کی جماعت ثانیہ بھی شامل ہے، تراویح کی دو جماعت ہونے کی صورت میں اصل جماعت خواہ اوپر ہو یا نیچے وہ درست ہوگی۔ اور دوسری جماعت مکروہ ہوگی؛ اس لئے ایک مسجد میں تراویح کی ایک جماعت ہی ہونی چاہئے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۵۲۶)

وفي القنية: إمام يصلي التراويح على سطح المسجد اختلف في كراهته، والأولى أن لا يصلي فيه عند العذر، فكيف بغيره. (كبيري، الصلاة، تراويح فروع، أشرفيه، جديد ۲/ ۴۱۰، مكتبه رحيميه ديوبند ۳۹۲)

ولو صلى التراويح مرتين في مسجد واحد يكره. (هندية، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ۱/ ۱۱۶، جديد ۱/ ۱۷۶، قاضيخان على هامش الهندية، الصلاة، قبيل فصل في مقدار التراويح، زكريا ۱/ ۲۳۴، جديد ۱/ ۱۴۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۷/۱۴۲۲ھ

دومنزلہ مسجد میں دو نماز تراویح کی پڑھنا

سوال [۳۱۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسجد دومنزلہ ہے، کیا دونوں منزل میں تراویح دو حافظ سنا سکتے ہیں

یانہیں؟ جواز یا عدم جواز کے ساتھ ممنوع اور غیر ممنوع کی بھی وضاحت فرمائیں، نیز مسجد کے طول وعرض کی قید تو نہیں؟

المستفتی: محمد اشرف بروالان، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک مسجد میں بیک وقت تراویح کی ایک ہی جماعت ہونی ضروری ہے، الگ الگ دو جماعت کرنا مکروہ ہے؛ لہٰذا پہلی جماعت جو مسجد کی اصل محراب میں ہورہی ہے وہ بلا کراہت درست ہے اور اس کے علاوہ دوسری جماعت جو کہ اوپر کی منزل میں ہوئی ہے وہ مکروہ ہوگی۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۵۲۶)

ولو صلى التراويح مرتين في مسجد واحد يكره. (هندية، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ١/ ١١٦، جديد ١/ ١٧٦، خانيه على هامش الهندية، الصلاة، قبيل فصل في مقدار التراويح، زكريا ١/ ٢٣٤، جديد ١/ ١٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/رجب ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۹۰۶/۳۸)

ایک ہی مسجد میں اوپر نیچے تراویح کی نماز ادا کرنا

سوال [۳۱۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے شہر میں ایک مسجد جس کو مرکز کی حیثیت حاصل ہے، مسجد کے نیچے حصے میں سوا پارہ تراویح میں سنانے کا نظام ہے، اوپر کے حصہ میں تین پارے سنانے کا نظام ہے، عشاء کی جماعت ایک ہوگی اور تراویح کی نماز دو ہوں گی، اوپر کے حصے میں تین پاروں کا نظام اس لئے رکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کو رمضان شریف میں سفر درکار ہوتا ہے، ان کو پورا قرآن سننے کی سعادت حاصل ہو جائے، آیا یہ تراویح سنانے کا عمل اوپر اور نیچے کے حصے میں کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عبد الکریم مچھالے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک مسجد میں تراویح کی دو جماعتیں چاہے اوپر نیچے دو منزل میں الگ الگ ہوں یا ایک منزل میں الگ الگ، بہرصورت مکروہ ہے؛ لہٰذا ایک مسجد میں ایک ہی جماعت ہونی چاہئے، جن لوگوں کو سفر وغیرہ کی بنا پر دس دن میں قرآن سننے کی ضرورت ہو وہ کسی دوسری مسجد یا کسی ہال میں تین تین پاروں کا الگ سے انتظام کرلیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۲۶)

ولو صلی التراویح مرتین في مسجد واحد یکرہ. (هندية، الباب التاسع في النوافل، زکریا قدیم ۱/ ۱۱٦، جدید ۱/ ۱۷٦، قاضیخان علی هامش الهندية، الصلاة، قبیل فصل في مقدار التراويح، زکریا ۱/ ۲۳٤، زکریا جدید ۱/ ۱٤٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍شعبان ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۹۷)

تراویح پڑھانے کا زیادہ حقدار کون؟

سوال [۳۱۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر ایک حافظ مسجد کے قریب رہتا ہو اور دوسرا حافظ مسجد سے دور رہتا ہو، یعنی دوسرے محلّہ میں رہتا ہو، تو ان دونوں میں سے اس مسجد میں رمضان المبارک میں قرآن سنانے کا کون زیادہ حقدار ہے؟ جب کہ دونوں باشرع ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن صحیح پڑھتے ہوں، اگر غیر محلّہ کا حافظ قرآن سنانے کے لئے طے ہوجائے تو کیا محلّہ کے حافظ کو حق اعتراض ہے یا نہیں؟ شریعت اس مسئلہ میں کیا کہتی ہے؟

المستفتی: محمد کاشف، مرادآبادی، نئی بستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسجد میں جو شخص مستقل طور پر امام ہو اگر وہ حافظ بھی ہو تو وہی اس مسجد میں تراویح کی امامت کا بھی حقدار ہے، اس کے مقابلہ میں دوسرے حفاظ اس مسجد میں تراویح کی امامت کے حقدار نہیں ہیں۔ اور وہ اگر اپنا حق بخوشی دوسرے کو دینا چاہے تو اس کو اختیار ہے، چاہے اس محلّہ کے حافظ کو حق دےدے یا دوسرے محلّہ کے حافظ کو۔ اور سوال نامہ میں جن دو حافظوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک اسی محلّہ کا ہے اور دوسرا دوسرے محلّہ کا ہے، دونوں باشرع ہیں اور دونوں قرآن بھی صحیح پڑھتے ہیں، ان دونوں میں سے کوئی بھی امام کے مقابلہ میں مستحق نہیں ہے؛ لہٰذا امام کو اختیار ہے چاہے خود پڑھائے یا محلّہ کے حافظ کو حق دےدے یا دوسرے محلّہ کے حافظ کو، یہ کام اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ اور اگر مسجد کا مستقل امام خود حافظ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں بھی وہی امام کسی حافظ کا انتخاب کرنے کا حق رکھتا ہے اور اس معاملہ میں اسی محلّہ اور دوسرے محلّہ کا کوئی امتیاز نہیں ہے؛ بلکہ امام جس کو چاہے تراویح پڑھانے کا حق دے سکتا ہے۔

عن أبي مسعود الأنصاري –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: ...... ولا يؤمن الرجل الرجل في سلطانه، ولا يقعد في بيته على تكرمته إلا بإذنه. (المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، من قال: يؤم القوم أقرؤهم لكتاب الله، موسسة علوم القرآن، جديد ۳/ ۱۸۹، رقم: ۳۴۷۰، المستدرك، الصلاة، مكتبه نزار مصطفى جديد ۱/ ۳۶۱، رقم: ۸۸۷، المعجم الكبير للطبراني دار احياء التراث العربي ۱۷/ ۲۲۲، رقم: ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۷، ۶۲۰، سنن الدار قطني، الصلاة، باب من أحق بالإمامة، دارالكتب العلمية، بيروت ۱/ ۲۸۴، رقم: ۱۰۷۲)

إمام المسجد الراتب أولى بالإمامة من غيره مطلقا. وفي الشامي: وإن كان غيره من الحاضرين من هو أعلم وأقرأ منه. الخ (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچی ۱/ ۵۵۹، زكريا ۲/ ۲۹۷)

دخل المسجد من هو أولى بالإمامة من إمام المحلة، فإمام المحلة أولى.

(عالمگیری، کتاب الصلاۃ، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثاني، زکریا قدیم ۱/ ۸۳، جدید ۱/ ۱٤۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۵/۲۰ھ

مستقل امام تراویح کا زیادہ حقدار ہے یا مقامی حافظ؟

سوال [۳۱۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تراویح میں قرآن پاک سنانے کا حق محلّہ کے حافظوں کا ہے یا مسجد کے امام صاحب کا ہے؟ جو حافظ بھی ہیں اور پورے سال امامت کرتے رہے ہیں اور ان کے ذریعہ دین کی باتیں بھی معلوم ہوتی رہتی ہیں؟

المستفتی: اہلیان محلّہ گلشہید، چاند والی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مسجد میں پہلے ہی سے مستقل امام موجود ہے اور مستقل ومتعین امام حافظ قرآن بھی ہے، تو محلّہ کے حافظوں کے مقابلہ میں مسجد کا مستقل امام ہی اس مسجد میں تراویح اور تراویح میں قرآن سنانے کا زیادہ حقدار ہے، مستقل امام صاحب کے ذریعہ سے دینی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہوں یا نہ ہوں، ہر حال میں اور ہر صورت میں امام ہی قرآن سنانے کا زیادہ حقدار ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۸۲)

حدیث پاک میں آیا ہے کہ امام صاحب کی اجازت اور مرضی کے بغیر اس کی امامت کی جگہ کھڑے ہوکر دوسرا آدمی ہرگز نماز نہ پڑھائے۔

عن أبي مسعود –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: لا يؤم

الـرجل في سلطانه، ولا يجلس على تكرمته في بيته إلا بإذنه. (ترمذي شريف، الصلاة، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۱/ ۵۵، دارالسلام، رقم: ۲۷۷۲)

واعـلـم أن صـاحـب البيت ومثله إمام المسجد الراتب أولى بالإمامة مـن غيـره مـطـلقا، أي وإن كان غيره من الحاضرين من هو أعلم وأقرأ منه. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، کراچی ۱/ ۵۵۹، زکریا ۲/ ۲۹۷) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر شعبان ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۱۱)

محلّہ کی مسجد میں تراویح پڑھانے کا حقدار کون ہے امام مسجد یا اہل محلّہ؟

سوال [۳۱۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسجد میں امام صاحب ہیں، اس مسجد میں خود امام صاحب تراویح سنانے کے متمنی ہیں؛ لیکن محلّہ کے اور بھی کچھ حفاظ دعویدار ہیں، کیا تراویح کا پڑھانا اور سنانا اس مسجد میں امام صاحب کو حق پہنچتا ہے یا نہیں؟ امام صاحب کے متمنی ہونے کے باوجود دوسرے حفاظ کرام کو یہ حق ملتا ہے کہ نہیں؟ نیز اگر امام صاحب تراویح نہ بھی سنائیں تو حافظ کا مقرر کرنا امام صاحب کے دائرہ اختیار میں ہے یا کمیٹی کو؟

المستفتی: محمد جسیم الدین بر والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مستقل امام کے ہوتے ہوئے اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر دوسرے کا نماز پڑھانا ممنوع ہے؛ اس لئے جب مسجد کے مستقل امام صاحب خود تراویح سنانے کے متمنی ہیں تو وہ دیگر حفاظ کے مقابلہ میں قرآن سنانے کے زیادہ حقدار ہیں؛ البتہ اگر امام صاحب کو کوئی عذر ہو تو امام صاحب ہی کو حق ہے کہ قرآن سنانے کے لئے کسی

دوسرے حافظ کا انتخاب کریں، اس میں امام صاحب پر دباؤ ڈالنا درست نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم دیوبند ۴/ ۲۸۲، فتاوی رحیمیہ قدیم ۴/ ۴۲۴، جدید زکریا ۸/ ۲۵۷)

عن أبي مسعود -رضي الله عنه- أن رسول الله ﷺ قال: لا يؤم الرجل في سلطانه، ولا يجلس على تكرمته في بيته إلا بإذنه. (ترمذي شريف، الصلاة، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ١/ ٥٥، دارالسلام، رقم: ٢٧٧٢)

عن أبي مسعود الأنصاري -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: -إلى- ولا يؤمن الرجل الرجل في سلطانه، ولا يقعد في بيته على تكرمته إلا بإذنه. (صحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة، النسخة الهندية ١/ ٢٣٦، بيت الأفكار، رقم: ٦٧٣، مسند أبي داؤد الطيالسي، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٣٤٣، رقم: ٦٥٢، سنن النسائي، كتاب الإمامة، باب من أحق بالإمامة، النسخة الهندية ١/ ٨٩، دارالسلام، رقم: ٧٨١)

واعلم أن صاحب البيت ومثله إمام المسجد الراتب أولى بالإمامة من غيره مطلقا، أي وإن كان غيره من الحاضرين من هو أعلم وأقرأ منه. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچى ١/ ٥٥٩، زكريا ٢/ ٩٧، الفقه الإسلامي وأدلته، صلاة الجماعة وأحكامها، فصل من أحق بالإمامة، هدى انٹر نیشنل دیوبند ٢/ ١٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۰/۶/۱۴۲۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۸۴۹/۳۸)	۱۰/۶/۱۴۲۶ھ

مسجد میں تراویح پڑھانے کا امام حقدار ہے یا مقامی حافظ؟

سوال [۳۱۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جب دو حافظ موجود ہوں اور ان میں ایک پردیسی اور ایک مقامی ہو، پردیسی ایک عرصہ

سے مسجد میں امام ہو اور دوسرا صرف محلّہ کا ہو تو ان دونوں حفاظ میں سے تراویح کے اندر قرآن سنانے کا کون زیادہ حقدار ہے؟

المستفتی: اہل مسجد اڑپورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو حافظ پہلے سے امام ہو خواہ وہ پردیسی ہی کیوں نہ ہو دیگر حافظوں سے تراویح پڑھانے کا زیادہ حقدار ہے۔

أوس بن ضمعج قال: سمعت أبا مسعود يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ولا يؤم الرجل في أهله، ولا في سلطانه، ولا يجلس على تكرمته في بيته إلا بإذن، أو بإذنه. (سنن ابن ماجة، الصلاة، باب من أحق بالإمامة، النسخة الهندية/ ٦٩، دارالسلام، رقم: ٩٨٠، سنن أبي داؤد، الصلاة، باب من أحق بالإمامة، النسخة الهندية ١/ ٨٦، دارالسلام، رقم: ٥٨٢)

واعلم أن ...... إمام المسجد الراتب أولى بالإمامة من غيره مطلقا. وفي الشامية: وإن كان غيره من الحاضرين من هو أعلم وأقرأ منه.

(درمختار علی الشامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، زكريا ٢/ ٢٩٧، كراچی ١/ ٥٥٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍شعبان ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۳۸)

تراویح میں قرآن کریم امام کی اجازت کے بغیر پڑھنا مکروہ ہے؟

سوال [۳۱۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسجد کا مستقل امام ہے، تراویح میں قرآن سنانے کا حق امام مستقل کو ہے یا دوسرے کو ہے؟ شریعت کا کیا حکم ہے؟ آگاہ فرمائیں۔

المستفتی: عزیز الرحمٰن، شریف نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوامام مستقل ہے شرعاً وہی تراویح میں قرآن سنانے کا زیادہ حقدار ہوگا، اس کی اجازت کے بغیر دوسرے حافظ کو تراویح پڑھانا مکروہ ہے۔

عن أبي مسعود الأنصاري –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: –إلی– ولا يؤمن الرجل الرجل في سلطانه، ولا يقعد في بيته على تكرمته إلا بإذنه. (صحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة، النسخة الهندية ۱/ ۲۳۶، بيت الأفكار، رقم: ۶۷۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍رجب ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۸۶۷)

امام صاحب کا دوسری جگہ تراویح سنانے جانا

سوال [۳۱۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسجد کے امام صاحب جو عالم دین بھی ہیں اور پاس میں ایک مدرسہ کے نائب مہتمم اور مدرس بھی ہیں، چند سالوں سے وہ رمضان میں اپنی مسجد میں قرآن نہ سنا کر آٹھ دس دن کا قرآن سنانے کے لئے دوسری جگہوں پر چلے جاتے ہیں، مدرسہ کا مفاد ان کے سامنے رہتا ہوگا اور یقیناً پیسہ وغیرہ بھی وہاں ملتے ہوں گے؛ بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ پیسوں ہی کی وجہ سے جاتے ہوں گے، اب آپ سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) کیا کسی امام عالم دین کا اپنی امامت کی مسجد میں کسی طالب علم وغیرہ کو چھوڑ کر خود ادھر ادھر سنانے کے لئے جانا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) پیسے کے لالچ میں قرآن سنانا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) عالم دین اور امام کو اللہ پر یقین نہ رکھ کر حصول مال کے لئے ادھر ادھر جانا اور رمضان جیسے مہینہ کی عبادت کو خراب کرنا کیسا ہے؟

(۴) جو امام عالم دین ہو اور مذکورہ حرکت کرے، اپنی مسجد میں تراویح نہ پڑھائے تو اس کو امام بنانا، یا کسی مدرسہ کا نائب مہتمم بنانا شرعاً جائز ہے؟

(۵) کیا ایسا شخص ضعیف الایمان ہے یا نہیں؟

(۶) ایسے امام کے پیچھے اگر نماز درست نہیں ہے تو پچھلی نمازوں کا کیا ہوگا؟ جو ہم کئی سال سے ان کے پیچھے پڑھتے چلے آرہے ہیں، کیا ان کا لوٹانا واجب ہے یا نہیں؟ اور ان نمازوں میں امام کے ساتھ مقتدی بھی گنہگار ہوئے یا نہیں؟

(۷) ایسے امام کو فوراً برطرف کردینا مسلمانوں پر لازم ہے یا نہیں؟ اور اگر کچھ لوگ آڑے آئیں، ایسے امام کی طرف داری کریں تو وہ بھی گنہگار رہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبداللہ بستی کرتپور، بجنور، یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عالم دین ہو یا حافظ ہو یا مفتی ہو یا مدرسہ کا ذمہ دار ہو، وہ رمضان میں اپنی جگہ کسی کو قائم مقام بنا کر دوسری جگہ جا کر کے قرآن سنادے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، نیز اگر دوسری جگہ قرآن سنانے میں مدرسہ کا فائدہ ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اور جو ممانعت ہے وہ یہی ہے کہ قرآن سنا کر ذاتی طور پر اجرت لی جائے، تو یہ ناجائز اور حرام ہے؛ لیکن اگر جس مسجد میں قرآن سنایا جائے وہاں کے لوگ مدرسہ میں چندہ دے دیں اور اس کی رسیدیں کاٹی جائیں، تو اس میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہے۔ اور یہ قرآن سنانے کی اجرت بھی نہیں ہے، اس کے علاوہ باقی سوالات میں جتنی باتیں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب ذاتیات پر حملے ہیں، جن کے لئے شرعی ثبوت لازم ہے۔ اور سوال نامہ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا ہے کہ امام صاحب قرآن سنا کر ذاتی طور پر اجرت لیتے ہوں اور اس کے لئے سفر کرتے ہوں۔

عن أنس –رضي اللّٰه عنه– أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم استخلف ابن أم مكتوم يؤم الناس وهو أعمى. (سنن أبي داؤد، الصلاة، باب إمامة الأعمى، النسخة الهندية ۱/ ۸۸، دارالسلام، رقم: ۵۹۵)

عن ابن جريج قال: أخبرني سعد بن إبراهيم، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا سافر استخلف ابن أم مكتوم على المدينة. (مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي ٢/ ٣٩٥، رقم: ٣٨٢٩)

وإذا علمت جواز الاستخلاف للخطبة والصلاة مطلقا بعذر وبغير عذر حال الحضرة والغيبة، وجواز الاستخلاف للصلاة دون الخطبة وعكسه، فاعلم أنه إذا استناب لمرض ونحوه، فالنائب يخطب ويصلي بهم، والأمر فيه ظاهر. (شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة، كراچی ٢/ ١٤٠، زكريا ٣/ ٩)

عن عبدالله بن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده. (بخاري، كتاب الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، النسخة الهندية ١/ ٦، رقم: ٦)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: سباب المسلم فسوق وقتاله كفر.

(ترمذي، أبواب البر والصلة، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ٢/ ١٩، دارالسلام، رقم: ١٩٨٣)

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- أن رسول الله ﷺ قال: إياكم والظن، فإن الظن أكذب الحديث ...... قال سفيان: الظن ظنان، فظن إثم، وظن ليس بإثم، فأما الظن الذي هو إثم، فالذي يظن ظنا، ويتكلم به، وأما الظن الذي ليس بإثم، فالذي يظن ولا يتكلم به. (ترمذي، أبواب البر والصلة، باب ماجاء في ظن السوء، النسخة الهندية ٢/ ١٩، دارالسلام، رقم: ١٩٨٨)

عن أبي بكر الصديق -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله ﷺ: ملعون من ضار مؤمنا أو مكر به. (ترمذي، أبواب البر والصلة، باب ماجاء في الخيانة والغش، النسخة الهندية ٢/ ١٥، دارالسلام، رقم: ١٩٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۹۱)

دو حافظوں کا مل کر تراویح پڑھانا

سوال [۳۱۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نمازتراویح میں دو حافظ مل کر قرآن پاک پورا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جیسے پہلے دس بیس پارے ایک پڑھ لے، باقی دوسرا حافظ، اس میں کوئی قباحت تو نہیں؟

المستفتی: محمد یونس جامع مسجد، احمد گڑھ، پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نمازتراویح میں دو حافظ دس دس رکعت کے حساب سے آدھا آدھا کر کے ایک پارہ، پون پون کر کے ڈیڑھ پارہ، ایک ایک کر کے دو پارہ جس طرح بھی مناسب ہو جائز اور درست ہے، جیسا کہ حرمین شریفین میں ہوتا ہے۔

فإن صلوها بإمامين، فالمستحب أن يكون انصراف كل واحد على كمال الترويحة. (عالمگيرى، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ١/ ١١٦، جديد ١/ ١٧٦، الجوهرة النيرة، الصلاة، باب قيام شهر رمضان، دارالكتاب ديوبند، ص: ١١٨، إمداديه، ملتان ١/ ١١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ر شعبان ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۹۴/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۸/۱۴ھ

ایک ہی شخص کا دو جگہ نماز تراویح پڑھانا

سوال [۳۱۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کوئی آدمی ایک ہی دن ایک جگہ تراویح کی پوری نماز پڑھنے یا پڑھانے کے بعد دوسری جگہ تراویح کی نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبدالعلیم، مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک رات میں تراویح کی نماز مکمل پڑھنے کے بعد دوسری جگہ تراویح کی امامت کرنا جائز نہیں؛ اس لئے کہ ایک رات میں ایک ہی مرتبہ تراویح کی نماز پڑھنا مسنون ہے۔ اگر ایک مرتبہ تراویح پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھے گا تو وہ نفل ہوگی اور نفل نماز جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے، نفل نماز تنہا پڑھنی چاہئے، ہاں البتہ ایک جگہ تراویح کی نماز پڑھنے کے بعد دوسری جگہ پہنچ جائے اس میں ایک آدھ رکعت میں شریک ہوجائے تو کوئی حرج نہیں، مکمل تراویح دوسری جگہ پڑھنا مکروہ ہے۔

إمام يصلي التراويح في مسجدين كل مسجد على وجه الكمال لا يجوز؛ لأنه لا يتكرر، ولو اقتدى بالإمام في التراويح وهو قد صلى مرة لا بأس به، ويكون هذا اقتداء التطوع بمن يصلي السنة، ولو صلوا التراويح، ثم أرادوا أن يصلوا ثانيا يصلون فرادى. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ٢/ ١٢٠، كوئٹه ٢/ ٦٨)

ولا يصلي إمام واحد التراويح في مسجدين في كل مسجد على الكمال، ولا له فعل ولا يحتسب التالي من التراويح، وعلى القوم أن يعيدوا؛ لأن صلاة إمامهم نافلة، وصلاتهم سنة، والسنة أقوى فلم يصح الاقتداء؛ لأن السنة لا تتكرر في وقت واحد. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في التراويح- كراچی قديم ١/ ٢٨٩، زكريا ١/ ٦٤٧)

إمام يصلي التراويح في مسجدين في كل مسجد على الكمال لا يجوز، كذا في محيط السرخسي، والفتوى على ذلك، كذا في المضمرات. (هندية، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ١/ ١١٦، جديد ١/ ١٧٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ رجب ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۰۷۰/۳۸)

دس دن میں ایک جگہ اور دس دن میں دوسری جگہ قرآن سنانا کیسا ہے؟

سوال [۳۱۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان میں ایک حافظ صاحب دوجگہ قرآن سناتے ہیں، دس دن میں ایک جگہ اور دس دن میں دوسری جگہ، تو کیا اس میں کوئی قباحت ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوحافظ صاحب رمضان میں دومرتبہ قرآن کریم اس طرح سنائیں کہ دس دن میں ایک جگہ اور دس دن میں دوسری جگہ تو اس طرح دومرتبہ قرآن کریم سنانے اور ختم کرنے میں کوئی قباحت نہیں؛ بلکہ اس طرح قرآن کریم سنانے میں زیادہ ثواب ہے؛ کیوں کہ اس میں دوبار ختم ہوا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل، ص:۲۲، فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۷/ ۳۱۵، محمودیہ میرٹھ ۱۱/ ۴۴۲)

السنة في التراويح إنما هو الختم مرة، والختم مرتين فضيلة، والختم ثلاث مرات أفضل. (هندية، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ١/ ١١٧، جديد ١/ ١٧٧)

والجمهور على أن السنة الختم مرة فلا يترك لكسل القوم ...... ومرتين فضيلة، وثلاث مرات أفضل. (البحر الرائق، باب الوتر والنوافل، كوئٹه ٢/ ٦٨، مكتبه دارالكتاب ٢/ ١٢٠، البحر الرائق، زكريا ٢/ ١٢٠)

والختم مرة سنة، ومرتين فضيلة، وثلاثا أفضل. (درمختار مع الشامي، الصلاة، مبحث صلاة التراويح، زكريا ٢/ ٤٩٧، كراچی ٢/ ٤٧)

وفي الخانية: وينبغي للإمام وغيره إذا صلى التراويح وعاد إلى منزله وهو يقرأ القرآن أن يصلي عشرين ركعة يقرأ في كل ركعة عشر آيات إحرازا للفضيلة، وهي الختم مرتين، والزهاد وأهل الاجتهاد يختتمون في

كل عشر ليال. (تاتارخانية، الصلاة، الفصل الثالث عشر في التراويح، زكريا ٢/ ٣٢٤، رقم: ٢٥٥٣، خانيه على الهندية، فصل في مقدار القراءة في التراويح، زكريا ١/ ٢٣٨، جديد ١/ ١٤٧، حلبي كبير، التراويح، أشرفي ٤٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۳/۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۶۱/۴۰)

بلوغ کی علامت کیا کیا ہیں؟ اور نابالغ کی تراویح کی امامت کا حکم

سوال [۳۱۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) لڑکے کے بالغ ہونے کے لئے کون کون سی علامت ہیں؟ (۲) امامت کرنے کے لئے بلوغیت کی سبھی علامتیں لازمی ہیں؟ (۳) اگر کوئی لڑکا حافظ قرآن ہے، بلوغیت کی شرطیں اس میں نہیں پائی جاتیں، تو اس کے پیچھے نماز تراویح درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: ابوالہاشم، پورنیہ، بہار

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لڑکے کے بالغ ہونے کی شرائط میں سے اہم شرط یہ ہے کہ اس سے احتلام ہوجائے، یا اس کے جماع کرنے کی وجہ سے بیوی حاملہ ہوجائے؟ اگر اس طرح علامت ظاہر نہ ہو تو پندرہ سال مکمل ہونے پر بالغ ہونے کا حکم ثابت ہوجاتا ہے۔

وبلوغ الغلام بالاحتلام، والإحبال، والإنزال -إلى قوله- فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة. (درمختار، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، زكريا ٩/ ٢٢٦، كراچی ٦/ ١٥٣)

نابالغ کی امامت تراویح میں بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/۲۵۲)

عن ابن عباسؓ قال: نهانا أمير المومنين عمر أن تؤم الناس في المصحف، ونهانا أن يؤمنا إلا المحتلم. (جامع الأحاديث للسيوطي ٢٨/ ٤٩٢،

رقم: ۳۱۵۵۹، کنز العمال، فضل في آداب الأیام قدیم ٤/ ٢٤٦، جدید رقم: ٢٢٨٣٥)

ولا يصح اقتداء رجل بامرأة وصبي مطلقا ولو في جنازة، وتحته: أنه لا يجوز في الصلوات كلها. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب لواجب كفاية هل يسقط بفعل الصبي وحده؟ کراچی ١/ ٥٧٧، ٥٧٨، زکریا ٢/ ٣٢١، ٣٢٢، هندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثالث في في بيان من يصلح إماما لغيره، زكريا قديم ١/ ٨٥، جديد ١/ ١٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/۱۰/۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۶۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۱۰/۱۴۱۴ھ

تراویح میں نابالغ کی امامت

سوال [۳۱۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بچہ جس کے ابھی بلوغیت کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے اور نہ ہی اس کی عمر پندرہ سال کی ہے، تو کیا از روئے شرع اس کو تراویح میں امام بنانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر اس مسئلہ کے بارے میں کوئی اختلاف ہو تو وہ بھی مدلل اور مفصل تحریر فرمائیں اور قول راجح کی بھی وضاحت فرمائیں نوازش ہوگی؟ مفتی عامر صاحب اور مفتی امین صاحب نے علی گڑھ میں جائز کہا ہے جو ساتھ میں منسلک ہے۔

المستفتی: عبداللہ غفرلہ سرائے رحمان علی گڑھ

الجواب: امامت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ نیز امامت کے لئے عمر کی بھی کوئی قید ہے یا نہیں؟ اس مسئلے کی وضاحت کے لئے میں نے درج ذیل احادیث تحریر کی ہیں، اگر ان حدیثوں کا بغور مطالعہ کیا گیا تو مسئلے آسانی سے ہر مسلمان بھائی کی سمجھ میں آجائیں گے۔ انشاء اللہ۔

(۱) پہلی حدیث حضرت ابومسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قوم کی

امامت وہ شخص کرائے جو سب سے زیادہ اچھا قرآن مجید کا پڑھنے والا (یعنی سمجھنے والا) ہو، اگر پڑھنے میں برابر ہوں تو سنت سب سے زیادہ جاننے والا امامت کرائے گا، اگر سنت میں سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرائے گا جو سب سے پہلے ہجرت کر کے آیا ہو، اگر ہجرت میں بھی سب برابر ہوں تو سب سے زیادہ عمر والا امامت کرائے گا۔ (مسلم شریف)

(۲) دوسری حدیث: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو تم میں سے اچھا ہو وہ اذان دے اور جو سب سے زیادہ پڑھا ہوا ہو وہ امام بنے۔ (ابوداؤد شریف)

(۳) تیسری حدیث: حضرت عمرو بن سلمہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مقتدیوں میں سے کوئی قرآن مجید پڑھا ہوا نہیں تھا، چنانچہ لوگوں نے مجھے آگے بڑھا دیا، حالانکہ اس وقت میری چھ یا سات برس کی عمر تھی۔

(۴) چوتھی حدیث: حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہارے بچے سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو ان کو مار مار کر نماز پڑھاؤ اور ان کے بستر الگ کر دو۔ (ابوداؤد)

مذکورہ حدیثوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امامت کا وہی شخص زیادہ مستحق ہے، جو قرآن مجید کو اچھی طرح پڑھنا جانتا ہو، نیز نماز کے تمام مسائل سے واقف ہو اگرچہ عمر میں چھوٹا کیوں نہ ہو۔ اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دس سال کا بچہ بچہ نہیں رہتا؛ بلکہ وہ بالغ ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بستر الگ کرنے کا حکم دیا۔ واللہ اعلم بالصواب

ذاکر حسین امام موتی مسجد پھول چوراہا، علی گڑھ

جواب بعون اللہ الوہاب ومنہ الصدق والصواب: صورت مسئولہ میں واضح ہو کہ علماء، مشائخ شہر بلخ الدولہ وشام کے نزدیک جائز ومعمول بہ ہے۔ اور علمائے ماوراء النہر کے نزدیک ناجائز ہے۔ اور مضمرات میں فتویٰ جواز پر ہی دیا ہے، یعنی روا اور درست ہے۔

اختلف أصحابه في النفل فجوزه مشايخ بلخ وعليه العمل عندهم، وبمصر والشام ومنعه غيرهم وعليه العمل بما وراء النهر ما في المرقاة شرح مشكوة لملا علي القاري.

اور ''صحیح بخاری'' میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک جگہ چھ سات برس کا لڑکا فرضوں کی جماعت کراتا تھا امام بن کر، جس کا نام عمرو بن سلمہ تھا۔ اور اس کے پیچھے پڑھنے والے سب صحابہ تھے۔ ''نیل الاوطار'' میں ہے:

الذين قدموا عمرو بن سلمة كانوا كلهم صحابة قال ابن حزم: ولا نعلم مخالفا.

یعنی جن لوگوں نے عمرو بن سلمہ کو امام بنایا تھا وہ سب کے سب صحابہ تھے۔ ابن حزم نے کہا کہ ان صحابہ کا کوئی مخالف نہیں معلوم ہوتا۔ ''ابوداؤد، احمد'' کی روایت میں اس لڑکے کا یہ بیان ہے کہ: ''**فما شهدت مجمعا من جرم إلا كنت إمامهم**'' یعنی قبیلہ جرم کے جس مجمع میں میں حاضر ہوتا تھا میں ہی اس مجمع کا امام ہوتا تھا۔ عمرو بن سلمہ کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازوں میں چھ، سات برس کے لڑکے کی امامت جائز و درست ہے اور یہی مذہب ہے حسن بصری اور امام شافعی اور اسحاق کا۔ اور جب فرض نمازوں میں اس کی امامت اور اس کے پیچھے نماز کا پڑھنا درست ہے تو تراویح میں اس کی امامت بدرجہ اولیٰ درست ہوگی۔ اور امام احمد اور امام ابوحنیفہ کی دو روایتیں آئی ہیں۔ اور مشہور روایت ان دونوں اماموں سے یہ ہے کہ نوافل میں نابالغ لڑکے کی امامت درست ہے۔ اور فرائض میں نا درست۔ حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ ''فتح الباری'' میں لکھتے ہیں:

وإلى صحة إمامة الصبي ذهب أيضا الحسن البصري، والشافعي، واسحاق، وكرهها مالك والثوري، وعن أبى حنيفة وأحمد روايتان، والمشهور عنهما على الإجزاء في النوافل دون الفرائض. فقط

محمد امین اشرفی محلّہ شیخانی، علیگڑھ
۱۸/ دسمبر ۱۹۹۸ء

الجواب وباللّٰه التوفیق: صورت مسئولہ میں علماء بلخ وخراسان مصر وشام کے نزدیک جائز اور معمول بہ ہے۔

وعلى قول أئمة بلخ يصلح الاقتداء بالصبيان في التراويح والسنن المطلقة. (فتاوی قاضی خان ۱/ ۱۰۹)

یعنی ائمہ بلخ کے نزدیک تراویح اور سنن مطلقہ میں بچے کی اقتداء کرنا صحیح ہے۔

جوزها أكثر علماء خراسان، وفي الفتاوى عن نصير بن يحيى قال: لا بأس بأن يؤم الصبي في شهر رمضان إذا بلغ عشر سنين، يعنى في التراويح، وعن محمد بن مقاتل أنه قال: يجوز فى التراويح خاصة، وكان الحسن بن علي رضي الله عنهما يؤم عائشة رضي اللهعنها في التراويح؛ فإنه صبي وكان القاضي الإمام أبو علي النسفي يفتي بالجواز. (تاتارخانية ۱/ ٦٦٨)

یعنی دس سال کا بچہ رمضان المبارک کے موقع پر تراویح میں امامت کرسکتا ہے۔ صورت مسئولہ میں بچے کی عمر بارہ سال ہے، نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک صحابی چھ سات سال کی عمر میں فرائض کی امامت کیا کرتے تھے اور ان کی اقتداء کرنے والے سب صحابہ تھے، احناف میں علماء بلخ وخراسان کے علاوہ امام محمد کے نزدیک بھی نوافل میں بچے کی امامت درست ہے۔ امام ابوحنیفہ کی بھی اس کے متعلق ایک روایت ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں تمام سنتوں کا شمار نوافل میں ہوتا ہے، جیسا کہ ''درمختار'' میں ہے: ''**كل سنة نافلة ولا عكس** ص: ۹۰، وامامت غیر بالغ بمذہب ابوحنیفہ ومالک درفرائض روانیست ولکن درنوافل رواست وبمذہب شافعی درفرائض ہم رواست''

یعنی نوافل میں امام ابوحنیفہ ومالک -رحمہما اللہ- کے نزدیک بچے کی امامت درست ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک فرائض میں بھی درست ہے، یہی مذہب حسن بصری، اسحاق بن راہویہ اور امام احمد کا ہے۔ (مناح العباد الی المعاد لمحمد بن احمد سعید الدین فرغانی)

وسئل نصير بن يحيى عن إمامة الصبي في التراويح، فقال: يجوز إذا

كان ابن عشر سنين، وعن محمد بن مقاتل أن إمامة الصبي في التراويح تجوز؛ لأن الحسن رضي الله عنه يؤم عائشة رضي الله عنها في التراويح، وكان صبيا، كذا في الفتاوى، وفي الهداية: إمامة الصبي في التراويح والسنن المطلقة جوزها مشايخ بلخ. (الجوهر النيرة/ ۱۲۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت امام حسن کے پیچھے تراویح پڑھا کرتی تھیں؛ حالاں کہ آپ بچے تھے، حضرت عمرو بن سلمہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معمول، علماء خراسان و بلخ ومصر وشام کے فتاوی کے بعد تراویح میں نابالغ بارہ سال کے حافظ کے پیچھے نماز تراویح درست ہے۔ اور مذکورہ ممالک میں آج بھی معمول ہے، عدم جواز کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ واللہ اعلم

عامر ۱۹/ دسمبر ۱۹۹۸ء سرائے رحمان علی گڑھی

منجانب: دارالافتاء مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: فرائض میں نابالغ کی امامت بالاتفاق جائز نہیں اور تراویح وغیرہ نوافل میں فقہاء کرام کے دو قول ہیں: ایک قول ضعیف اور مرجوح ہے اور دوسرا قول قوی اور راجح اور مفتی بہ ہے۔ اور قول ضعیف نابالغ کی امامت تراویح وغیرہ میں جواز کا ہے جو مشائخ بلخ اور خراسان وغیرہ سے مروی ہے۔ اوران کی دلیل بھی کمزور ہے، جس کو مفتی محمد عامر صاحب سرائے رحمان علی گڑھی اور مفتی محمد امین صاحب اثری محلّہ شیخان علی گڑھ نے اپنے اپنے جوابات میں نقل فرمایا ہے۔ اور قول راجح اور مفتی بہ یہی ہے کہ نابالغ کی امامت تراویح اور سنن ونوافل میں بھی جائز نہیں ہے، بالغ لوگوں کی نماز اس کے پیچھے فاسد ہوجاتی ہے۔ اور جناب مفتی محمد عامر صاحب ومفتی محمد امین صاحب نے جہاں جہاں سے جواز کے لئے قول ضعیف نقل فرمایا ہے، وہاں پر صحیح اور مفتی بھی اقوال بھی موجود ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

وفي التراويح والسنن المطلقة جوزه مشايخ بلخ ولم يجوزه مشايخنا، ومنهم من حقق الخلاف في النفل المطلق بين أبي يوسف وبين محمد، والمختار أنه لا يجوز فى الصلوات كلها؛ لأن نفل الصبى دون نفل البالغ حيث لا يلزمه القضاء لإفساد بالإجماع، ولا يبنى القوى على الضعيف. (هدايه، كتاب الصلاة، باب الإمامة، أشرفي ١/ ١٢٤)

''تاتارخانیہ''میں جواز کے ضعیف اقوال نقل کرنے کے بعد راجح اور مفتی بہ اقوال ان الفاظ سے نقل فرمائے ہیں:

كان الشيخ الإمام شمس الأئمة السرخسي يفتى بعدم الجواز، وفي الخانية: هو الصحيح، وكان يقول: الإمام ضامن، والصبي لا يصلح للضمان. وفى المنتقى: لو أن قوما صلوا خلف الصبي لاتجوز صلاتهم.
(الفتاوى التاتارخانية، الصلاة، الفصل الثالث عشر في التراويح زكريا ٢/ ٣٣٥، رقم: ٢٥٨٦، كوئٹه ١/ ٦٦٨، المحيط البرهاني، الصلاة، الفصل الثالث عشر التراويح والتر،المجلس العلمي جديد ٢/ ٢٦٣، رقم: ١٧١٤)

اورصاحب بحر نے ان الفاظ سے نقل فرمائے ہیں:

وأطلق فساد الاقتداء بالصبي، فشمل الفرض والنفل وهو المختار كما في الهداية، وهو قول العامة كما في المحيط، وهو ظاهر الرواية، كما ذكره الاسبيجابي وغيره؛ لأن نفل البالغ مضمون حتى يجب القضاء إذا أفسده، ونفل الصبي ليس بمضمون حتى لا يجب القضاء عليه بالإفساد، فيكون نفل الصبي دون نفل البالغ، فلا يجوز أن يبنى القوي على الضعيف.
(البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الإمامة كوئٹه ١/ ٣٥٩، زكريا ١/ ٦٢٨)

اورصاحب بدائع کی صراحت ملاحظہ فرمایئے:

أما في التطوعات فقد روى عن محمد بن مقاتل الرازي أنه أجاز

ذلک في التراويح، والأصح أن ذلک لا يجوز عندنا لا فی الفريضة ولا في التطوع؛ لأن تحريمة الصبي انعقدت لنفل غير مضمون عليه بالإفساد، ونفل المقتدي البالغ مضمون عليه بالإفساد، فلا يصح البناء. (بدائع الصنائع، الصلاة، بيان شرائط الإقتداء، کراچی قديم ۱/ ۱۴۳، ۱۴۴، زکريا ۱/ ۳۵۹)

اوراسی طرح کی عبارتیں (قاضی خان على هامش الهندية، فصل فيمن يصح الإقتداء به ومن لا يصح، زکريا ۱/ ۹۱، زکريا جديد ۱/ ۵۷، هندية، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، زکريا قديم ۱/ ۸۵، جديد ۱/ ۱۴۳، شامي، کتاب الصلاة، باب الإمامة، زکريا ۲/ ۳۲۲، کراچی ۱/ ۵۷۸، حاشية الطحطاوي على الدر، کتاب الصلاة، باب الإمامة، کوئٹه ۱/ ۲۴۹، حاشية چلپي، کتاب الصلاة، باب الإمامة والحدث في الصلاة، إمداديه ملتان ۱/ ۱۴۰، زکريا ۱/ ۳۵۸، ۳۵۹، الجوهرة النيرة، باب صفة الصلاة، إمداديه ملتان ۱/ ۷۱، دارالکتاب ديوبند ۱/ ۷۲، البناية، کتاب الصلاة، باب الإمامة، اشرفيه ديوبند ۲/ ۳۴۴، فتح القدير، کتاب الصلاة، باب الإمامة، دارالفکر مصري، قديم ۱/ ۳۵۸، کوئٹه ۱/ ۳۰۹، زکريا ۱/ ۳۶۸) **میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔**

لہٰذا نابالغ کی امامت تراویح میں بھی ہرگز جائز نہیں ہے۔ اور مذکورہ دونوں مفتیان نے حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی امامت کو جو دلیل میں پیش فرمایا ہے، اس کی حقیقت بھی دیکھ لیجئے، انہوں نے علامہ شوکانی کی ''نیل الاوطار'' کا حوالہ دیا ہے؛ حالانکہ شوکانی نے خود ان الفاظ سے مسترد کردیا ہے۔

وأما القدح في الحديث بأن فيه كشف العورة في الصلاة، وهو لا يجوز. (نية الأوطار للشوكانی ۲/ ۴۴)

ابن حزم ظاہری نے اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے ان لوگوں پر سختی سے رد فرمایا ہے، جنہوں نے نوافل اور تراویح میں نابالغ کی امامت کو جائز کہا ہے۔ اور انہوں نے صاف

لفظوں میں فرائض ونوافل دونوں میں نابالغ کی امامت کو ناجائز لکھا ہے۔

ولا تجوز إمامة من لم يبلغ الحلم لا في الفريضة ولا نافلة، ولا إذنه (وقوله) وأما الفرق بين إمامة من لم يبلغ في الفريضة، وبين إمامته في النافلة فكلام لا وجه له أصلا؛ لأنه دعوى بلا برهان. (المحلی لابن حزم ۳/ ۱۳۴-۱۳۵)

اور حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ اپنی جگہ صحیح ہے اور صحیح روایات سے ثابت بھی ہے؛ لیکن ان کو ان کی قوم نے اقرء ہونے کی وجہ سے اپنے اجتہاد سے امام بنایا تھا اور نابالغ ہونے کا خیال نہیں رہا، نیز جب وہ نماز پڑھاتے تھے تو ان کی سرین تک پورا ستر کھل جایا کرتا تھا؛ حالانکہ کشف عورۃ کے ساتھ نماز کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے، وہ خود فرماتے ہیں:

وعلي بردة لي صغيرة صفراء، فكنت إذا سجدت تكشفت عني، فقالت امرأة من النساء: واروا عنا عورة قارئكم، فاشتروا لي قميصا عمانيًّا.

(أبوداؤد، الصلاة، باب من أح بالإمامة، النسخة الهندية ۱/ ۸۶، دارالسلام، رقم: ۵۸۵، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ۷/ ۴۹، رقم: ۶۳۵)

اس حدیث کا جواب تمام علماء امت نے یہ دیا ہے کہ ان کی قوم نے اپنے اجتہاد سے ان کو امام بنایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر نہیں ہوئی اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے جواز کی بات مروی ہے؛ بلکہ یہ صرف ان کی قوم کا اجتہاد اور ان کا ذاتی عمل ہے اور اس کے مقابلہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے عدم جواز کی روایات مروی ہیں؛ اس لئے ان کے عمل کو کسی طرح مستدل نہیں بنایا جاسکتا۔

فعلوا ذلک باجتهادهم ولم يطلع النبي صلى الله عليه وسلم على ذلک (قوله) والعجب أنهم لم يجعلوا قول أبي بكر الصديق، وعمر الفاروق، وكبار الصحابة وأفعالهم حجة، واستدلوا بفعل صبي ست سنين، ولا يعرف فرائض الوضوء والصلاة، فكيف يتقدم في الإمامة، ومنعه أحوط

في الدين، وعن ابن عباس: لا يؤم الغلام حتى يحتلم، وعن ابن مسعود: لا يؤم الغلام الذي لا تجب عليه الحدود (وقوله) فإن الحديث صريح بأن رسول الله صلى الله عليه وسلم: وليؤمكم أكثركم قرآنا، أو أقرأكم، فاجتهدوا وفهموا الخطاب عاما، فهذا ظهر أن جعلهم عمرو بن سلمة إماما كان باجتهاد منهم، ولم يصرح رسول الله صلى الله عليه وسلم بإمامته، حتى يكون نصا ومع هذا، فهذا منع لاستدلال المستدلين. (بذل المجهود، الصلاة، باب من أحق بالإمامة، مطبع سهارن پور ١/ ٣٢٧، دارالبشائر الإسلامية، جديد ٣/ ٤٥٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٩/١٠/١٤١٩ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٤/ ٥٨٩٥)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٩/١٠/١٤١٩ھ

ساڑھے تیرہ سالہ عمر کے لڑکا کا تراویح میں قرآن سنانا

سوال [٣١٣٢]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حافظ قرآن جن کی عمر ساڑھے تیرہ سال یعنی قریب البلوغ ہیں، کیا وہ حافظ قرآن صرف تراویح کے لئے امام بن کر تراویح کی نماز پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور ایسا حافظ قرآن عورتوں کا امام بن کر تراویح پڑھا سکتا ہے؟

المستفتی: حافظ عبدالرحیم، کیا تلہ تھانہ باروئی پور، ٢٤/ پرگنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جس حافظ قرآن کا ذکر کیا گیا ہے، اگر اس کی داڑھی مونچھ وغیرہ نہیں نکلی ہے، بلوغیت کے آثار نمایاں طور پر ظاہر نہیں ہوئے ہیں اور اس کی عمر ساڑھے تیرہ سال ہے، تو وہ نابالغ ہے، اس کی امامت صرف تراویح کے لئے بھی جائز

نہیں ہے، بالغ لوگوں کی نماز تراویح اس کے پیچھے درست نہ ہوگی، ایسے ہی بالغ عورتوں کی نماز تراویح بھی اس کے پیچھے درست نہیں ہے۔

ولا يصح اقتداء رجل بامرأة وصبي مطلقا، قال الشامي: وفي التراويح والسنن المطلقة جوزه مشايخ بلخ، ولم يجوزه مشايخنا، والمختار أنه لا يجوز فی الصلوات كلها. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب الواجب كفاية هل يسقط بفعل الصبي وحده؟ کراچی ۱/ ۵۷۹، زکریا ۲/ ۳۲۱)

لا يجوز أن يؤم البالغين في التراويح أيضا، وهو المختار. (حلبی کبیر، كتاب الصلاة، تراويح، أشرفيه ديوبند، ص: ۴۰۸)

وفي التراويح والسنن المطلقة جوزه مشايخ بلخ، ولم يجوزه مشايخنا، ومنهم من حقق الخلاف في النفل المطلق بين أبي يوسف وبين محمد، والمختار أنه لا يجوز في الصلوات كلها؛ لأن نفل الصبي دون نفل البالغ حيث لا يلزمه القضاء بالإفساد بالإجماع، ولا يبنى القوي على الضعيف.
(هداية، كتاب الصلاة، باب الإمامة، أشرفي ديوبند ۱/ ۱۲۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ رجب ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰؍ ۷؍ ۱۴۳۳ھ

۱۴؍ سال ۸؍ ماہ کا لڑکا تراویح پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

سوال [۳۱۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حافظ صاحب کی تاریخ پیدائش ۳۱؍ جنوری ۱۹۹۱ء ہے، اس تاریخ کے اعتبار سے رمضان تک عمر ۱۴؍ سال ۸؍ مہینہ ہوئی، کیا حافظ صاحب اتنی عمر میں قرآن کریم تراویح میں سنا سکتے ہیں یا نہیں؟ نوٹ: ظاہری طور پر کوئی علامت بلوغ میں سے ظہور میں نہیں آئی ہے، اور ماشاء اللہ صحت اچھی ہے۔

المستفتی: احقر علی احمد گمن پورہ، تحصیل سوار، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب لڑکے میں بلوغیت کی صریح علامات ظاہر نہ ہوں، تو بلوغیت کا حکم لگانے کے لئے پندرہ سال کی عمر پوری ہونا لازم ہے۔ اور سوال نامہ میں جس حافظ کا ذکر ہے، اس کی عمر ابھی پندرہ سال پوری نہیں ہوئی ہے اور بلوغیت کی علامات بھی صراحت سے ظاہر نہیں ہوئی ہیں؛ اس لئے تراویح میں یا عام نمازوں میں اس کی امامت بالغوں کے لئے درست نہیں ہے۔

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. الحديث (صحيح البخاري، الشهادات، باب بلوغ الصبيان، النسخة الهندية ١/ ٣٦٦، رقم: ٢٥٩٠، ف: ٢٦٦٤)

بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال (وقوله) وقالا: إذا تم للغلام والجارية خمس عشرة سنة فقد بلغا. (هداية، كتاب الحجر، باب الحجر للفساد، فصل في حد البلوغ، أشرفي ديوبند ٣/ ٣٥٧)

وإمامة الصبي المراهق (وقوله) المختار أنه لا يجوز في الصلاة كلها.
(هندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، زكريا قديم ١/ ٨٥، جديد ١/ ١٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ شعبان ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۹۲۹)

پندرہ سال سے کم عمر والے حافظ کی تراویح کا مسئلہ

سوال [۳۱۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک لڑکا جس کی عمر قمری اعتبار سے پندرہ سال میں دو ماہ باقی ہیں اور موئے زیر ناف اگ آئے ہیں، ایسی حالت میں اس لڑکے کو رمضان المبارک میں تراویح کا امام بنانا جائز ہے یانہیں؟ بالغ ہونے کی جو علامت پائی جاتی ہے احتلام کا ہونا وہ بھی پائی نہیں جاتی۔

المستفتی: محمد سلیم الدین، امام جامع مسجد سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں پندرہ سال سے کم عمر کے اس بچہ کو امام بنانا جائز نہیں، محض موئے زیر ناف بلوغیت کی علامت قرار نہیں دی جاسکتی ہے؛ اس لئے کسی بالغ کو تراویح کا امام بنائیں؛ البتہ سامع بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۴۷)

بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال، والإنزال، فإن لم يوجد فيهما فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتي. (درمختار) ومفاده: أنه لا اعتبار لنبات العانة، وكذا شعر الساق والإبط والشارب. (شامي، كتاب الحجر، فصل في بلوغ الغلام بالاحتلام كراچی ٦/ ١٥٣، زكريا ٩/ ٢٢٦)

بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال إذا وطي، فإن لم يوجد ذلک فحتى يتم له ثماني عشرة سنة عند أبي حنيفة...... وقالا: إذا تم للغلام والجارية خمس عشرة سنة فقد بلغا، وهو رواية عن أبي حنيفة ...... وقيل: فيه اختلاف الرواية، أما العلامة فلأن البلوغ بالإنزال حقيقة والحبل والإحبال لا يكون إلا مع الإنزال. (هداية، كتاب الحجر، باب الحجر للفساد، فصل في حد البلوغ، أشرفي ديوبند ٣/ ٣٥٧، ٣٥٨) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۵۶)

پندرہ سالہ بے ریش لڑکے کے پیچھے تراویح

سوال [۳۱۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایسا لڑکا جس کی عمر پندرہ سال ہوچکی ہے، دیکھنے میں پندرہ سال سے کم عمر کا معلوم ہوتا ہے، داڑھی بھی نہیں نکلی ہے، اس کے پیچھے تراویح ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبداللطیف طویلہ اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جس لڑکے کی عمر پندرہ سال مکمل ہوچکی ہے، اس کے پیچھے تراویح کی نماز ادا کرنا بلا کراہت جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/ ۳۶۰، فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۴۷)

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. الحديث (صحيح البخاري، الشهادات، باب بلوغ الصبيان، النسخة الهندية ١/ ٣٦٦، رقم: ٢٥٩٠، ف: ٢٦٦٤)

فإن لم يوجد فيهما شيء فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى. (شامي، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، زكريا ٩/ ٢٢٦، كراچی ٦/ ١٥٣)

والسن الذي يحكم ببلوغ الغلام والجارية، إذا انتهيا خمس عشرة سنة عند أبي يوسف ومحمد والشافعي، وهو رواية عن أبي حنيفة، وعليه الفتوى. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الحجر، الفصل الثاني في بيان أنواع الحجر، زكريا ١٦/ ٢٨٠، رقم: ٢٤٩١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/۷/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۷/۱۴۱۵ھ

بے ریش پندرہ سالہ حافظ کی تراویح

سوال [۳۱۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا بیٹا مسعود جمال جس کی پیدائش انگریزی تاریخ کے مطابق 20/12/88 ہے، چاند کی بالکل صحیح تاریخ معلوم نہیں، یہ صحیح معلوم ہے کہ رجب کا مہینہ تھا، الحمد للہ اس چھوٹی سی عمر میں ہی اللہ تعالیٰ نے حافظ قرآن بنا دیا ہے، لوگوں میں یہ مانا جاتا ہے کہ ایک حافظ کی داڑھی ہونا ضروری ہے، یہ بھی سنا گیا ہے کہ ۱۵/سال سے پہلے محراب نہیں سنا سکتے، جہاں تک سوال داڑھی کا ہے، رواں بھی نہیں ہے، استرا تک نہیں لگا ہے، قدرتی طور پر صرف اس کی مسیں بھیگی ہیں، جتنی آج تک اس کی عمر ہوئی ہے، پیدائش کی تاریخ اوپر درج ہے، یہ بتانے کی زحمت فرمائیں کہ شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا پندرہ سال کا ہونا ضروری ہے؟ کیا بچے کے لئے داڑھی کا ہونا ضروری ہے؟ جب کہ قدرتی طور پر رواں بھی نہیں ہے، عزیزوں کی خواہش یہ ہے کہ بچہ اسی سال محراب سنائے۔

المستفتی: آفاق جمال دولت باغ، گلی نمبر۹، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پندرہ سال سے کم عمر کا لڑکا جب کہ اس کی داڑھی وغیرہ بھی نہ نکلی ہوں، اس کی امامت تراویح میں جائز نہیں ہے۔ اور اگر پندرہ سال پورے ہوجائیں تو شرعی طور پر بالغ ہے، چاہے داڑھی نہ نکلی ہو اور تراویح میں اس کی امامت شرعاً جائز ہے۔

عن ابن عمر قال: عرضني رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم أحد في القتال، وأنا ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو يومئذ خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد

بين الصغير والكبير. الحديث (صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب سن البلوغ، النسخة الهندية ۲/ ۱۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۸٦۸)

ولا يصح إقتداء البالغ غير البالغ في الفرض وغيره، وهو الصحيح.
(غنية المستملي، كبيري، الصلاة، من لا يصح الإقتداء أشرفي/ ۵۱٦)

والسن الذي يحكم ببلوغ الغلام والجارية، إذا انتهيا إليه خمس عشرة سنة عند أبي يوسف ومحمد، وهو رواية عن أبي حنيفة، وعليه الفتوى. (هندية، كتاب الحجر، الباب الثاني في الحجر للفساد، الفصل الثاني في معرفة حد البلوغ، زكريا قديم ۵/ ٦۱، جديد ۵/ ۷۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍محرم الحرام ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/ ۷۸۹٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸؍۱؍۱۴۲۴ھ

قمری اعتبار سے پندرہ سالہ حافظ کی تراویح

سوال [۳۱۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک لڑکے کی عمر قمری اعتبار سے ۱۵؍سال ہو چکی ہے، شمسی اعتبار سے نہیں ہوئی، تو یہ لڑکا تراویح پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت میں قمری سال کا اعتبار ہے۔ اور شریعت میں پندرہ سال کا لڑکا بالغ ہی سمجھا جاتا ہے؛ اس لئے مذکورہ لڑکا شریعت کی رو سے چونکہ بالغ ہو چکا ہے؛ اس لئے وہ تراویح پڑھا سکتا ہے۔

عن ابن عمر قال: عرضني رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم أحد في القتال، وأنا ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق

وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو يومئذ خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. الحديث (صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب سن البلوغ، النسخة الهندية ۲/ ۱۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۸٦۸)

فإن لم يوجد فيهما شيء، فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى. (شامي، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، زكريا ۹/ ۲۲٦، كراچی ٦/ ۱۵۳)

والسن الذي يحكم ببلوغ الغلام والجارية، إذا انتهيا إليه خمس عشرة سنة عند أبي يوسف ومحمد، وهو رواية عن أبي حنيفة، وعليه الفتوى. (هندية، كتاب الحجر، الباب الثاني في الحجر للفساد، الفصل الثاني في معرفة حد البلوغ، زكريا قديم ٥/ ٦١، جديد ٥/ ٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر شعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۱۶ھ

پندرہ سالہ حافظ کی تراویح

سوال [۳۱۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک لڑکا حافظ ہے، اسلامی چاند کے حساب سے اس کی عمر پندرہ سال ہورہی ہے، وہ رمضان شریف میں تراویح باجماعت میں قرآن پاک سناسکتا ہے یانہیں؟

المستفتی: اکبر حسین خادم مدرسہ ترغیب العلوم، سرجن نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلام میں قمری سال کا ہی اعتبار ہے؛ لہٰذا قمری سال کے اعتبار سے جب پندرہ سال عمر ہوجائے تو شریعت میں اسے بالغ تسلیم کیا جاتا ہے؛ لہٰذا

اس کا تراویح میں امام بن کر قرآن کریم سنانا جائز اور درست ہے۔ اور بالغ لوگوں کا اس کے پیچھے مقتدی بن کر اقتداء کرنا صحیح ہے۔

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير، وكتب إلى عماله أن يفرضوا لمن بلغ خمس عشرة. (صحيح البخاري، الشهادات، باب بلوغ الصبيان، النسخة الهندية ١/ ٣٦٦، رقم: ٢٥٩٠، ف: ٢٦٦٤، صحيح مسلم، باب الإمارة، باب سن البلوغ، النسخة الهندية ٢/ ١٣١، بيت الأفكار، رقم: ١٨٦٨)

بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال (إلى قوله) والإنزال، فإن لم يوجد فيهما أي في الغلام والجارية شيء، فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتي. (درمختار مع الشامي، كتاب الحجر، فصل في بلوغ الغلام بالاحتلام، كراچی ٦/ ١٥٣، زكريا ٩/ ٢٢٦)

والسن الذي يحكم ببلوغ الغلام والجارية، إذا انتهيا خمس عشرة سنة عند ابي يوسف ومحمد والشافعي، وهو رواية عن أبي حنيفة، وعليه الفتوى. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الحجر، الفصل الثاني في بيان أنواع الحجر، زكريا ١٦/ ٢٨٠، رقم: ٢٤٩١١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ رجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/ ۷/ ۱۴۲۳ھ

پندرہ سالہ لڑکے کی تراویح

سوال [۳۱۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: عزیزم حافظ سید محمد سالم سلمہ عارفی جن کی تاریخ پیدائش ۲۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۶/ مارچ ۱۹۸۶ء ہے، یہ امسال رمضان المبارک کو تراویح میں قرآن پاک سنا سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: سید محمد سرور عارفی، مسجد مولویان، چاندپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب لڑکے کے اندر بلوغیت کی کوئی علامت نہ پائی جائے اور پندرہ سال مکمل ہوجائیں، تو وہ شرعاً بالغوں میں شمار کیا جاتا ہے، ایسا لڑکا اگر حافظ ہے، تو تراویح میں قرآن بھی سنا سکتا ہے اور عام حالات میں بالغوں کی امامت بھی کرسکتا ہے۔ اور مذکورہ لڑکے کی تاریخ پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ کو اس کی عمر پندرہ سال پوری ہوجائے گی؛ لہٰذا اس کے بعد سے وہ ہر نماز میں بالغوں کی امامت کرسکتا ہے۔

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. (صحيح البخاري، الشهادات، باب بلوغ الصبيان، النسخة الهندية ۱/ ۳٦٦، رقم: ۲۵۹۰، ف: ۲٦٦٤)

والسن الذي يحكم ببلوغ الغلام والجارية، إذا انتهيا إليه خمس عشرة سنة عند أبي يوسف ومحمد رحمهما الله تعالىٰ، وهو رواية عن أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ، وعليه الفتوى. (هندية، كتاب الحجر، الباب الثاني في الحجر للفساد، الفصل الثاني في معرفة حد البلوغ، زكريا قديم ۵/ ٦۱، جديد ۵/ ۷۳)

بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال، والجارية بالاحتلام، والحيض، والحبل، فإن لم يوجد فيهما شيء، فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتي. (درمختار مع الشامي، كتاب الحجر، فصل في بلوغ الغلام

بالاحتلام، کراچی ٦/ ١٥٣، زکریا ٩/ ٢٢٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۵۹۰/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۱۹ھ

کیا پندرہ سال کا لڑکا تراویح پڑھا سکتا ہے؟

سوال [۳۱۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک لڑکا جس کی عمر تقریباً ۱۵؍سال ہوچکی ہے، یعنی ۱۷؍جولائی ۱۹۸۹ء کی پیدائش ہے، وہ لڑکا حافظ قرآن ہے، کیا وہ مسجد میں تراویح پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ کیوں کہ صحت نہ ہونے کی وجہ سے کم عمر معلوم ہوتی ہے۔

المستفتی: محمد موسیٰ مدرسہ ازہر العلوم، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ کے مطابق اگر مذکورہ لڑکے کی عمر پندرہ سال ہوگئی ہے، تو وہ شرعی طور پر بالغ ہوچکا ہے؛ لہٰذا وہ نماز تراویح پڑھا سکتا ہے، گرچہ صحت کی کمزوری کی وجہ سے کم عمر کیوں نہ معلوم ہو۔

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. (صحيح البخاري، الشهادات، باب بلوغ الصبيان، النسخة الهندية ١/ ٣٦٦، رقم: ٢٥٩٠، ف: ٢٦٦٤)

والسن الذي يحكم ببلوغ الغلام والجارية، إذا انتهيا خمس عشرة سنة عند أبي يوسف ومحمد والشافعي، وهو رواية عن أبي حنيفة –رحمه

الله تعالیٰ– وعلیه الفتوی. (الفتاوی التاتارخانیة، کتاب الحجر، الفصل الثاني في أنواع الحر، زکریا ١٦/ ٢٨٠، رقم: ٢٤٩١١)

فإن لم یوجد فیهما شيء، فحتی یتم لکل منهما خمس عشرة سنة به یفتي.

(درمختار مع الشامي، کتاب الحجر، فصل في بلوغ الغلام بالاحتلام، کراچی ٦/ ١٥٣، زکریا ٩/ ٢٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ ؍رجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۷/ ۱۴۲۵ھ

بلا ریش ساڑھے سولہ سالہ حافظ کی تراویح

سوال [۳۱۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عزیزم شمشاد جس کی تاریخ پیدائش مارچ ۱۹۹۶ء ہے، عمر تقریباً ساڑھے سولہ سال ہورہی ہے، ماشاء اللہ حافظ ہے، عزیزم کے داڑھی نہیں نکلی ہے، تو کیا عزیزم کے پیچھے نماز تراویح پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمشاد عرفان بھٹی اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: جو بچہ مارچ ۱۹۹۶ء میں پیدا ہوا ہے، جولائی ۲۰۱۲ء میں اس کی عمر کا سترہواں سال چل رہا ہے، لہٰذا اگرچہ داڑھی مونچھ وغیرہ نہ نکلی ہو، تب بھی اس عمر کا بچہ شرعاً بالغ شمار ہوتا ہے، اس کی امامت بلا شبہ جائز ہے اور اس کے پیچھے بالغ لوگوں کی اقتداء تراویح کی نماز میں بلا شبہ جائز ہے۔

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ عرضه یوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة، فلم یجزني، ثم عرضني یوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني،

قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. (صحيح البخاري، الشهادات، باب بلوغ الصبيان، النسخة الهندية ۱/ ۳٦٦، رقم: ۲٥۹۰، ف: ۲٦٦٤)

إذا تم للغلام والجارية خمس عشرة سنة، فقد بلغا. (هداية، كتاب الحجر، باب الحجر للفساد، فصل في حد البلوغ، اشرفی دیوبند ۳/ ۳٥۸)

والبلوغ بالسن عند عدم وجود علامة من علامات البلوغ قبل ذلك يكون بتمام خمس عشرة سنة قمرية للذكر والأنثى. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۸/ ۱۹۱-۱۹۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍شعبان ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۷۸۴)

سولہ سال کے لڑکے کے پیچھے نماز تراویح

سوال [۳۱۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا سولہ سال کا لڑکا مسئلہ کے اعتبار سے بالغ ہے یا نہیں؟ اور اس کے پیچھے تراویح نماز درست ہوجائے گی یا نہیں؟ تشفی بخش جواب سے سرفراز فرمائیں کرم ہوگا۔

المستفتی: شمشاد حسین نواب پورہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر علامات بلوغ میں سے کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی ہو تو پندرہ سال مکمل ہونے پر بالغ قرار دیا جائے گا؛ لہٰذا وہ لڑکا تراویح میں امامت کے قابل ہوگا۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۲/۶۴)

عن ابن عمر قال: عرضني رسول الله ﷺ يوم أحد في القتال وأنا

ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، وعرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو يومئذ خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير.

(صحيح مسلم، كتاب الإمامة، باب سن البلوغ، النسخة الهندية ۲/ ۱۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۸٦۸)

وسن البلوغ على المفتى به خمس عشرة سنة في الغلام والجارية.

(شامي، كتاب الطهارة، مطلب في رطوبة الفرج، کراچی ۱/ ۱٦۸، زكريا ۱/ ۳۰۸)

ولمن بلغ بالسن، وهو خمس عشرة سنة على المفتى به في الغلام والجارية. (حاشية الطحطاوی، كتاب الطهارة، دارالکتاب دیو بند جدید/ ۱۰۸) **فقط**
واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ رجب ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۴۰۰/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ رجب ۱۴۱۸ھ

کیا سترہ سال کا لڑکا تراویح کی نماز پڑھا سکتا ہے؟

سوال [۳۱۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے بیٹے عزیزم نور البدر کی پیدائش ۲/۱۲/۱۹۸۹ء کی ہے، جو تقریباً ۱۷/سال کے قریب ہے؛ لیکن قد اور صحت کے اعتبار سے دیکھنے میں عمر کم لگتی ہے، معلوم کرنا یہ ہے کہ عزیزم کی ایک مسجد میں تراویح پڑھانے کی بات طے ہورہی ہے، کچھ لوگوں کو اعتراض ہے کہ عزیزم حافظ صاحب ابھی عمر کے اعتبار سے تراویح پڑھانے کے اہل نہیں ہیں؛ لہٰذا تراویح میں قرآن سنا سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: بدرالقمر، تمبا کو والان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لڑکے کی عمر جب پندرہ سال پوری ہوجائے، تو وہ شرعاً بالغ سمجھا جاتا ہے، اگرچہ بلوغت کی کوئی علامت ظاہر نہ ہو۔ اور سوال نامہ میں مذکورہ حافظ صاحب کی عمر چونکہ تقریباً سترہ سال کی ہوچکی ہے؛ اس لئے وہ شرعی طور پر بالغ ہیں اور ان کی امامت بھی بلا تردد جائز ہے؛ لہٰذا تراویح میں بالغین کا امام بن کر قرآن سنانا بلاشبہ جائز ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی، قدیم ۳/۴۱، جدید زکریا ۳/۸۲، جدید زکریا مطول ۴/۲۰۸)

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. (صحيح البخاري، الشهادات، باب بلوغ الصبيان، النسخة الهندية ١/ ٣٦٦، رقم: ٢٥٩٠، ف: ٢٦٦٤)

وقد روى عن سيدنا عمر –رضي الله عنه– أنه عرض على رسول الله صلى الله عليه وسلم غلام، وهو ابن أربع عشرة سنة، فرده، وعرض وهو ابن خمس عشرة فأجازه، فقد جعل صلى الله عليه وسلم خمس عشرة حدا للبلوغ. (بدائع الصنائع، كتاب الحجر، فصل في بيان ما يرفع الحجر؟ زكريا ٦/ ١٧٧، قديم كراچى ٧/ ١٧٢)

فإن لم يوجد فيهما شيء، فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتي. (درمختار مع الشامي، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، كراچى ٦/ ١٥٣، زكريا ٩/ ٢٢٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رجمادی الثانیہ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۰۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۶/۲۳ھ

سترہ سال کے لڑکے کا تراویح میں امامت کرنا

سوال [۳۱۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے بیٹے حافظ محمد زکریا کی تاریخ پیدائش ۲۲/فروری ۱۹۹۳ء ہے، اس اعتبار سے اس کی عمر سولہ سال ہوئی، اب سترھویں سال میں چل رہا ہے؛ لیکن ابھی داڑھی بھی نہیں نکلی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں میرا بچہ محلّہ کی مسجد میں قرآن کریم سنائے؛ لیکن مصلیان مسجد بلوغت کے بارے میں شک وشبہ کررہے ہیں، اسی لئے یہ تحریر پیش ہے، جواب تحریر فرمادیں، میرا بچہ قرآن کریم سناسکتا ہے یا نہیں؟ اور پنجوقتہ نمازوں کی امامت کرسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اکبر متصل سائرہ مسجد، اسلام نگر، کرولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سولہ سال کا بچہ شریعت اسلامی کے نزدیک بالغ شمار ہوتا ہے، اگر ایسا لڑکا حافظ قرآن ہوچکا ہے، تو اس کا تراویح میں امام بننا بالغ اور بڑے لوگوں کا اس کے پیچھے اقتدا کرنا بلاکراہت جائز اور درست ہے۔

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. (صحيح مسلم، باب الإمامة، باب سن البلوغ، النسخة الهندية ۲/ ۱۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۸۶۸)

بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال، ...... فإن لم يوجد فيهما شيء، فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتي. (درمختار على شامي، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، كراچی ۶/ ۱۵۳، زکریا ۹/ ۲۲۶)

والسن الذي يحكم ببلوغ الغلام والجارية، إذا انتهيا خمس عشرة

سنة عند أبي يوسف ومحمد والشافعي، وهو رواية عن أبي حنيفة –رحمه الله تعالیٰ– وعليه الفتوى. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الحجر، الفصل الثاني في أنواع الحر، زكريا ١٦ / ٢٨٠، رقم: ٢٤٩١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍شعبان ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۷۸۵)

اٹھارہ سالہ بے ریش لڑکے کے پیچھے تراویح

سوال [۳۱۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید حافظ قرآن ہے اور پولیو سے معمولی طور پر متأثر ہے، نماز کھڑے ہوکر پڑھتا ہے، عمر ۱۸؍سال ہے، مگر ابھی داڑھی نہیں آئی ہے، صحت مند بھی ہے، اس کے رمضان میں تراویح پڑھانے کے سلسلے میں بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلا قرآن نفلوں میں ہونا چاہئے، مندرجہ بالا باتوں سے متعلق شرعی حیثیت کی وضاحت فرمادیں۔

المستفتی: شرافت حسین، محلّہ مقبرہ دوئم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید جو حافظ قرآن ہے اور اس کی عمر بھی ۱۸؍سال ہے، تو اس کی امامت درست ہے؛ کیوں کہ جس کی عمر پندرہ سال ہوجائے وہ شرعاً بالغ سمجھا جاتا ہے، داڑھی کا نکلنا کوئی ضروری نہیں ہے اور نہ داڑھی علامت بلوغ میں سے ہے؛ بلکہ جب پندرہ سال ہوجائے تو وہ شرعاً بالغ مان لیا جائے گا، داڑھی نکلے یا نہ نکلے؛ لہٰذا زید تراویح پڑھا سکتا ہے۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پہلا قرآن نفلوں میں ہونا چاہئے یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ اور قرآن وحدیث سے بھی ثابت نہیں ہے۔

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة

سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. (صحيح البخاري، الشهادات، باب بلوغ الصبيان، النسخة الهندية ١/ ٣٦٦، رقم: ٢٥٩٠، ف: ٢٦٦٤)

ويشترط كونه مسلما، حرا، ذكرا، عاقلا، بالغا، قادرا. (درمختار مع الشامي، باب الإمامة، مطلب شروط الإمامة الكبرى، كراچی ١/ ٥٤٨، زكريا ٢/ ٢٨٠)

بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال، ...... فإن لم يوجد فيهما شيء، فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتي. (درمختار) وفي الشامي: قوله: فإن لم يوجد فيهما شيء، وتحته في الشامية: مفاده أنه لا اعتبار لنبات العانة خلافا للشافعي، ورواية عن أبي يوسف ولا اللحية وكذا شعر الساق، والإبط، والشارب. (شامي، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، كراچی ٦/ ١٥٣، زكريا ٩/ ٢٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۱/۸/۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۳۴/۶۳۱۵)	۱۱/۸/۱۴۲۰ھ

کیا ۱۸؍ سال ۱۰؍ ماہ کا لڑکا تراویح میں قرآن سنا سکتا ہے؟

سوال [۳۱۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا بیٹا محمد بلال جس کی تاریخ پیدائش 26/6/ 1992 ہے، جو اس وقت ۱۸؍ سال ۱۰؍ مہینے کا ہے، میرا بیٹا حافظ قرآن ہے، تراویح میں قرآن سنانا چاہتا ہے، داڑھی، مونچھ ابھی نہیں آئی ہے، تو کیا اس عمر میں قرآن پاک سنا سکتا ہے؟ شرعی حکم کیا ہے؟ جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور رہوں۔ فقط

المستفتی: محمد حکمت اللہ، طویلہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمد بلال کے باپ نے بلال کی سرکاری تاریخ پیدائش پیش فرمائی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی عمر ۱۸؍سال پوری ہوگئی۔ اور شریعت میں اگر پندرہ سال سے پہلے بلوغیت کے آثار ظاہر نہ ہوں تو پندرہ سال پورے ہونے پر بچہ بالغ شمار کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اٹھارہ سال کی عمر کا بچہ لازمی طور پر بالغ شمار ہوگا۔ اور شرعاً شریعت کے ہر حکم کا مکلّف ہوگا؛ اس لئے محمد بلال کی امامت، فرض اور تراویح کی نماز میں بلا کراہت جائز اور درست ہے، محض قد کے چھوٹا ہونے کا شریعت میں اعتبار نہیں۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: عرضني رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم أحد في القتال، وأنا ابن أربع عشرة سنة، فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة، فأجازني، قال نافع: فقدمت على عمر بن عبدالعزيز، وهو خليفة، فحدثته هذا الحديث، فقال: إن هذا لحد بين الصغير والكبير. (صحيح مسلم، باب الإمامة، باب سن البلوغ، النسخة الهندية ٢/ ١٣١، بيت الأفكار، رقم: ١٨٦٨)

جمهور الفقهاء على أنه يشترط لصحة الإمامة فى صلاة الفرض أن يكون الإمام بالغا. (الموسوعة الفقهية ٦/ ٢٠٣)

بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال، والإنزال، والأصل هو الإنزال، فإن لم يوجد فيهما شيء، فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتي. (شامي، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، زكريا ٩/ ٢٢٥-٢٢٦، كراچى ٦/ ١٥٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۵/۱۴۳۲ھ

داڑھی کٹانے والے کا نماز تراویح پڑھانا

سوال [۳۱۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) داڑھی کی شرعی حد کیا ہے؟ (۲) داڑھی کترے ہوئے (ایک مشت سے کم) حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ (۳) کیا ایسے حافظ کو تراویح کے لئے مقرر کرنے میں کمیٹی مسجد پر بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ (۴) اگر شرعی داڑھی والا حافظ میسر نہ ہو تو بہتر کیا ہے؟ ایسے حافظ کے پیچھے پڑھیں یا ''الم ترکیف'' سے پڑھیں؟

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) داڑھی کی شرعی حد اور مقدار ایک مشت ہے، اس سے کم داڑھی رکھنا اور کٹانا قطعاً جائز نہیں ہے؛ البتہ ایک مشت سے جو زائد ہو اسے اکسار اور برابر کرنے کی اجازت ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم۵/ ۱۰۸، جدید ڈابھیل۱۹/ ۳۹۷، کفایت المفتی، قدیم۹/ ۱۶۳، جدید، زکریا۹/ ۱۷۲، زکریا مطول۱۲/ ۳۲۳)

السنة فيها القبضة، وهو أن يقبض الرجل لحيته، فما زاد منها على قبضة قطعه، كذا ذكره محمد في كتاب الآثار عن الإمام، قال: وبه نأخذ.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، کراچی ٦/ ٤٠٧، زكريا ٩/ ٥٨٣)

(۲) داڑھی منڈانا اور کتروانا حرام ہے، ایسا شخص شرعاً فاسق ہے؛ لہٰذا ایسے شخص کو تراویح کے لئے امام بنانا جائز نہیں؛ بلکہ ایسے امام کے پیچھے تراویح پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

يحرم على الرجل قطع لحيته. (درمختار، زكريا ٩/ ٥٨٣، کراچی ٦/ ٤٠٧)

وكره إمامة الفاسق العالم لعدم اهتمامه بالدين، فتجب إهانته شرعا، فلا يعظم بتقديمه للإمامة ...... ومفاده كون الكراهة في الفاسق تحريمية.

(طحطاوى على المراقي، الصلاة، فصل في بيان الأحق بالإمامة، دار الكتاب ديوبند ٣٠٣،

قديم ١٦٥، شامي، باب الإمامة، قبيل مطلب البدعة خمسة أقسام، كراچی ١/ ٥٦٠، زكريا ٢/ ٢٩٨)

(۳) مسجد کی کمیٹی پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے امام کومقرر کریں جو دیندار متقی اور پرہیز گار ہو اور ایسے حافظ وامام کوامامت کی ذمہ داری نہ سونپیں جو فاسق اور خلاف شرع امور کا مرتکب ہو، یہ ذمہ داری مسجد کی کمیٹی پر ہے؛ اس لئے کہ لوگوں نے ان ہی لوگوں کو ذمہ دار بنایا ہے؛ لہٰذا کمیٹی کو اپنی ذمہ داری بحسن خوبی انجام دینی چاہئے۔

يجب أن يكون إمام القوم في الصلاة أفضلهم في العلم، والورع، والتقوى، والقراءة. (تاتارخانية، الصلاة، الفصل السادس من هو أحق بالإمامة؟ زكريا ٢/ ٢٤٧، رقم: ٢٣١٩، قديم ١/ ٦٠٠)

(۴) اگر شرعی داڑھی والا حافظ نہ ملے تو داڑھی منڈانے اور کتروانے والے حافظ کے پیچھے نماز پڑھنے کے بجائے "الم تر کیف" سے سورہ تراویح پڑھنا بہتر ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ۲۹، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۷)	۱۴۲۱/۵/۲۵ھ

داڑھی کٹانے والے کے پیچھے نماز تراویح

سوال [۳۱۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی داڑھی کٹواتا ہے، تو اس کے پیچھے تراویح پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: العارض چنے ٹھیکیدار، بھوڑا کا چوراہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص داڑھی کٹوا کے ایک مشت سے کم کرا لیتا ہو، اس

کی امامت تراویح میں مکروہ ہے؛ لہٰذا اس کے پیچھے تراویح پڑھنے والے سب لوگوں کی نماز مکروہ ہوجائے گی۔

وأما الأخذ منها، وهي دون القبضة، فلم يبحه أحد. (شامي، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم، مطلب في الأخذ من اللحية، كراچی ۲/ ٤١٨، زكريا ۳/ ۳۹۸)

ولو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم، لعدم اعتنائه بأمور الدين. (كبيري، فصل في الإمامة، الأولى بالإمامة، أشرفيه ديوبند ٥١٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍شعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۷۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۱۷ھ

داڑھی کٹانے والے حافظ کے پیچھے تراویح

سوال [۳۱۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید حافظ قرآن ہے اور موئے ریش نکل آئے ہیں؛ لیکن منڈا دیتا ہے، اب وہ ماہ رمضان المبارک میں محراب سنانا چاہتا ہے، کیا اس کے پیچھے تراویح پڑھنا جائز ہوگا؟

المستفتی: محمود احمد، سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داڑھی منڈانے والے حافظ کے پیچھے تراویح کی نماز مکروہ تحریمی ہے، ایسے حافظ کو تراویح میں امام بنانا ممنوع ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۸)

وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه -إلى- بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديم كراهة تحريم؛ لما ذكرنا. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچی ۱/ ٥٦٠، زكريا ۲/ ۲۹۹)

کو ن الکراهة في الفاسق تحریمیة. (طحطاوي علی المراقي، الصلاة، فصل في بیان الأحق بالإمامة، دارالکتاب دیوبند ۳۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍شعبان ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۹۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍۸؍۱۴۱۷ھ

داڑھی منڈے حافظ کے پیچھے نماز تراویح

سوال [۳۱۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسجد میں ایک حافظ قرآن کریم تراویح میں سنانا چاہتا ہے؛ لیکن داڑھی منڈواتا ہے، تو کیا ایسے حافظ کے پیچھے نماز تراویح پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: افضال احمد میڈیکل اسٹور، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داڑھی منڈانا حرام اور گناہ کبیرہ ہے، ایسا شخص شریعت کے نزدیک فاسق ہوتا ہے، ایسوں کو تراویح کے لئے امام بنانا ممنوع ہے، اس کے پیچھے تمام مقتدیوں کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی؛ اس لئے ایسے شخص کو تراویح کا امام بنانے کے بجائے باشرع شخص کو تراویح کا امام بنانا چاہئے، جس کی کم از کم ظاہری وضع قطع اور حلیہ شریعت کے مطابق ہو۔

في شرح المنیة: علی أن کراهة تقدیمه کراهة تحریم. (شامي، کتاب الصلاة، باب الإمامة، کراچی ۱/ ۵۶۰، زکریا ۲/ ۲۹۹)

کو ن الکراهة في الفاسق تحریمیة. (طحطاوي علی مراقي الفلاح، کتاب الصلاة، فصل في بیان الأحق بالإمامة، جدید، دارالکتاب دیوبند ۳۰۳، قدیم ۱۶۵)

یحرم علی الرجل قطع لحیته. (درمختار، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البیع، کراچی ۶/ ۴۰۷، زکریا ۹/ ۵۸۳)

وأما الأخذ منها وهي دون ذلک کما یفعله بعض المغاربة ومخنثة

الرجال، فلم يبحه أحد، وأخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم.

(شامي، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم؟ مطلب في الأخذ من اللحية، كراچی ۲/ ۴۱۸، زكريا ۳/ ۳۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۶/۱۷ھ

داڑھی کترنے والے حافظ کے پیچھے نماز تراویح

سوال [۳۱۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید حافظ قرآن ہے اور ماشاء اللہ پنجگانہ نماز بھی پڑھتا ہے؛ لیکن شریعت کے مطابق داڑھی نہیں رکھتا ہے؛ بلکہ قینچی سے کترتا ہے؛ لیکن بالکل جڑ سے نہیں کترتا ہے، وہ حافظ تراویح پڑھانا چاہتا ہے اور گذشتہ کئی رمضانوں میں اس نے تراویح پڑھائی بھی ہے، جب کہ دوسرا حافظ قرآن جس کی شریعت کے مطابق داڑھی بھی ہے اور نماز کا بھی پابند ہے، موجود ہے، ان دونوں میں سے امامت کا کون زیادہ مستحق ہے؟

(۲) ماہ رمضان میں جو مستقل امام ہے اس کے لئے ہدیہ لینا دینا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد یوسف مدرسہ مفید الاسلام، نور گڑھ، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت واقعہ دوسرے حافظ صاحب جن کی داڑھی شریعت کے موافق ہے، تراویح پڑھانے کے حقدار ہیں، داڑھی کٹانے والے کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/ ۳۹، جدید زکریا مطول ۴/ ۱۹۴)

يكره إمامة فاسق، وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه؛ بأنه لا يتهم لأمر دينه، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم.

(شامي، الصلاة، باب الإمامة، قبيل مطلب البدعة خمسة اقسام، زكريا ۲/ ۲۹۹، كراچی ۱/ ۵۶۰)

(۲) جو شخص مستقل امام ہے اس کو ہدیہ لینا اور ہدیہ دینا دونوں امر جائز ہیں۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبی صلى الله عليه وسلم يقول: تهادو، تحابوا. (الأدب المفرد، باب قبول الهدية، دارالكتب العلمية، بيروت، ص: ۱۸۰، رقم: ۵۹٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/۷/۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۵۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۱۶ھ

داڑھی کٹانے والے کے پیچھے نماز تراویح

سوال [۳۱۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اکثر مساجد میں یہ ہدایات تحریراً دیکھنے میں آئی ہیں کہ اگر کوئی امام داڑھی کترواتا یا منڈواتا ہے، تو اس کے پیچھے نہ اقامت جائز نہ امامت جائز، نہ موذن کا ہونا جائز، ایسے اماموں کی قیادت میں نماز کا ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے، اس مسئلہ پر تمام ہی عقائد کے مفتیان حضرات کا متفقہ فیصلہ ہے، مگر رمضان المبارک کے موقع پر اکثر حافظ حضرات ایسے دیکھنے کو ملتے ہیں جو اکثر تو روزہ ہی نہیں رکھتے اور نماز کے بھی پابند نہیں ہوتے اور اکثر داڑھی منڈواتے اور کترواتے ہیں، منڈوانے والے حضرات صرف رمضان المبارک کے موقع پر فیرنچ کش بہت باریک داڑھی رکھ لیا کرتے ہیں، شرعی صوم وصلاۃ کے پابند حضرات بہت کم دستیاب ہوتے ہیں، ایسے دور میں رمضان المبارک کے واسطے حافظ حضرات کا انتظام کیسے کیا جائے؟ کیا اگر صحیح حافظ دستیاب نہ ہو تو رمضان المبارک کے موقع پر ایسے حافظ سے تراویح میں کلام پاک سنا جائے یا نہیں؟

المستفتی: کاتب ابرار حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: داڑھی منڈانے والے حافظ کے پیچھے تراویح یا فرض

نمازمکروہ تحریمی ہے۔ اوراگر باشرع متبع شریعت حافظ میسر نہ ہوتو کسی متبع شریعت غیر حافظ کے پیچھے ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھ لیا کریں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۸، ایضاح المسائل ۲۸)

وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه -إلى- بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديم كراهة تحريم؛ لما ذكرنا. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچی ۱/ ۵٦۰، زکریا ۲/ ۲۹۹)

كون الكراهة في الفاسق تحريمية. (طحطاوي على المراقي، الصلاة، فصل في بيان الأحق بالإمامة، دارالكتاب ديوبند ۳۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ۷/ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۲۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/ ۷/ ۱۴۱۳ھ

فاسق امام کے پیچھے نماز تراویح کا حکم

سوال [۳۱۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک حافظ صاحب اپنی بیوی کے ہمراہ فلم دیکھتے ہیں اور گھر میں رنگین ٹی وی بھی رکھوا رکھی ہے، جس میں گندی گندی فلمیں دیکھتے ہیں، ان کو لوگوں نے منع بھی کیا، لیکن وہ اپنی گندی حرکت سے باز نہ آئے، تو کیا ایسی صورت میں ان کے پیچھے تراویح کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور ایسی حالت میں ان کی امامت درست ہوگی یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب عنایت فرمائیں۔ فقط والسلام

المستفتی: کلیم اللہ خان، محلّہ پیرغیب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گھر سے باہر یا گھر میں ٹی وی رکھ کر فلمیں دیکھنا حرام

ہے، فلموں اور گندے پروگراموں سے دلچسپی رکھنے والا اور منع کرنے کے بعد بھی اس سے باز نہ آنے والا حافظ فاسق وفاجر ہے، ایسے حافظ کے پیچھے تراویح کی نماز ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے، کسی باشرع حافظ کا انتظام ہونا چاہئے۔

وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، ووجب عليهم إهانته -إلى- بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديم كراهة تحريم؛ لما ذكرنا. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچی ۱/ ۵٦٠، زكريا ۲/ ۲۹۹، صغيري مطبع مجتبائي دهلي ص: ۲٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رشعبان ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۸/۲ھ

کیا حضور ﷺ نے پورے رمضان تراویح کی نماز ادا فرمائی ہے؟

سوال [۳۱۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا حضور ﷺ نے پورے رمضان المبارک تراویح ادا فرمائی ہیں؟

المستفتی: عبداللطیف عبدالملک، نجیب آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پورے رمضان المبارک تراویح پڑھنے کا ثبوت حدیث سے نہیں ملتا، ہاں تین رات مسلسل آپ نے تراویح کی نماز ادا فرمائی۔ اور تمام صحابہ نے آپ کی اقتداء کی ہے، اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ سلسلہ موقوف کردیا، تراویح کے سلسلہ کو موقوف کرنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے سوال کیا، تو صحابہ کے سوال پر آپ نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے واجب کردیئے جانے کا خطرہ ہے؛ اس لئے منقطع کردیا ہے۔

عن عائشة –رضي الله عنها– زوج النبي صلى الله عليه وسلم أن النبي صلى الله عليه وسلم صلى في المسجد، فصلى بصلاته ناس، ثم صلى من القابلة، فكثر الناس، ثم اجتمعوا من الليلة الثالثة فلم يخرج إليهم رسول الله صلى الله عليه وسلم، فلما أصبح قال: قد رأيت الذي صنعتم فلم يمنعني من الخروج إليكم إلا أني خشيت أن تفرض عليكم، وذلک في رمضان. (أبو داؤد، النسخة الهندية ١/ ١٩٤، دارالسلام، رقم: ١٣٧٣، بخاري شريف، صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، النسخة الهندية، ١/ ٢٦٩، رقم: ١٩٦٧، ف: ٢٠١١)

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں باضابطہ پورے رمضان تراویح کی سنت جاری فرمائی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بالاتفاق خلیفہ راشد ہیں۔ اور حدیث صحیح میں حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کا ارشاد ہے:

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ. (ابن ماجة، باب إتباع الخلفاء الراشدين المهديين، النسخة الهندية ١/ ٥، دارالسلام، رقم: ٤٢)

پھر تم میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھام لو؛ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جاری کردہ یہ سنت سنت رسول کی طرح ہے، اگر آقا نے پورے رمضان تراویح کی نماز پڑھ لی ہوتی اور اس کا جو حکم ہوتا، وہی حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جاری کردہ پورے رمضان کی تراویح کا بھی ہے۔

عن عبدالرحمن بن عبدالقاري أنه قال: خرجت مع عمر بن الخطاب ليلة في رمضان إلى المسجد، فإذا الناس أوزاع متفرقون يصلي الرجل لنفسه، ويصلي الرجل، فيصلي بصلاته الرهط، فقال عمر: إني أرى لو جمعت هولاء على قارئ واحد لكان أمثل، ثم عزم، فجمعهم على أبي بن

کعب –رضی الله عنه–. (بخاري شريف، باب فضل من قام رمضان، النسخة الهندية ١/ ٢٦٩، رقم: ١٩٦٦، ف: ٢٠١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/۱۱/۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/٧٨٦١)

پورے رمضان میں مروج تراویح کا آپ ﷺ سے ثبوت

سوال [۳۱۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جیسا کہ مروج ہے کہ ماہ رمضان میں ایک بار قرآن شریف پڑھنا اور سننا سنت مؤکدہ ہے، تو یہ تو معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں جماعت سے الگ بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین نے اسی طرح پڑھیں ہیں، جس طرح آج مروج ہے، مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح بیس رکعت جماعت کے ساتھ پڑھنا اور پورا قرآن پڑھنا اور پورا قرآن سننا جس طرح آج مروج ہے، یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟ یا نہیں۔

المستفتی: محمد ادریس رام پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: رمضان المبارک میں مکمل قرآن کریم تراویح میں سننا اور سنانا سنت ہے۔ اور بیس رکعت تراویح پورے رمضان جماعت کے ساتھ پڑھنا یہ بھی سنت مؤکدہ ہے، مگر خلفائے راشدین سے اب تک بیس رکعت تراویح تسلسل کے ساتھ پورے رمضان با جماعت ادا کرنے کا جو طریقہ ہے وہ اس شکل اور اس نوعیت کے ساتھ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانہ میں پورے رمضان جاری نہیں تھا، بیس رکعت پڑھنا مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک روایت سے ثابت ہے، مگر اس میں پورے رمضان پڑھنے کا ذکر نہیں ہے؛ بلکہ پورے رمضان موجودہ طریقہ سے پڑھنے کا سلسلہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی

اللہ عنہ کے زمانہ میں جاری ہوا۔ اورآقائے نامدار علیہ الصلاۃ والسلام نے خود فرمایا کہ خلفائے راشدین کی سنت اور طریقے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو، وہی میری سنت ہے، ورنہ تم گمراہی میں مبتلا ہو جاؤ گے؛ اس لئے موجودہ طریقہ عین سنت کے مطابق شمار کیا جاتا ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن عبدالرحمن القاري أنه قال: خرجت مع عمر بن الخطاب ليلة في رمضان إلى المسجد، فإذا الناس أوزاع متفرقون يصلي الرجل لنفسه، ويصلي الرجل، فيصلي بصلاته الرهط، فقال عمر: إني أرى لو جمعت هولاء على قارئ واحد لكان أمثل، ثم عزم، فجمعهم على أبي بن كعب –رضي الله عنه– الحديث. (صحيح البخاري، باب فضل من قام رمضان، النسخة الهندية ۱/ ۲٦۹، رقم: ۱۹٦٦، ف: ۲۰۱۰)

عن حسن، عن عبدالعزيز بن رفيع، قال: كان أبي بن كعب –رضي الله عنه– يصلي بالناس في رمضان بالمدينة عشرين ركعة، ويؤتر بثلاث. (المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، كم يصلي في رمضان من ركعة، قديم ۲/ ۳۹۳، مؤسسة علوم القرآن، جديد ٥/ ۲۲٤، رقم: ۷۷٦٦)

عبدالرحمن بن عمرو السلمي وحجر بن حجر قالا: ...... فقال قائل: يا رسول الله صلى الله عليه وسلم كأن هذه موعظة مودع ...... فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين، تمسكوا بها، وعضوا عليها بالنواجذ. (سنن أبي داؤد، باب في لزوم السنة، النسخة الهندية ۲/ ٦۳٥، دارالسلام، رقم: ٤٦۰۷، سنن الترمذي، باب ماجاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع، النسخة الهندية ۲/ ۹٦، دارالسلام، رقم: ۲٦۷٦، سنن ابن ماجة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين، النسخة الهندية ۱/ ٥، دارالسلام، رقم: ٤۲، مسند الدارمي، دار المغني ۱/ ۲۲۸، رقم: ۹٦، مسند أحمد بن حنبل ٤/ ۱۲٦، رقم: ۱۷۲۷۲، ۱۷۲۷٤، مسند البزار، مكتبة

العلوم والحكم ١٠/ ١٣٧، رقم: ٤٢٠١، صحيح ابن حبان، دارالفكر ١/ ٧٥، رقم: ٥، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ١٨/ ٢٤٥، رقم: ٦١٧، ٦١٨، ٦٢٢، المستدرك، كتاب العلم، مكتبه نزار مصطفى جديد ١/ ١٤٠، ١٤١، ١٤٢، رقم: ٣٢٩، ٣٣٠، ٣٣١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۵/۳ھ

کیا آٹھ رکعت تراویح ثابت ہیں؟

سوال [۳۱۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی امام کے نزدیک تراویح کی صرف آٹھ رکعت ہیں؟ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ امام مالک علیہ الرحمہ کے نزدیک آٹھ رکعت ثابت ہیں۔

المستفتی: شفیع احمد اعظمی، بحرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: آٹھ رکعت تراویح غیر مقلدین کے یہاں ہیں۔ اور ائمہ اربعہ اور جمہور امت کے نزدیک تراویح کی نماز بیس رکعت ہیں۔ (بدایۃ المجتہد ۱/ ۲۱۰، بذل المجہود ۲/ ۳۰۵، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۱/ ۲۴۲)

نیز بیس رکعت تراویح کی حدیث عمل رسول ﷺ کے ساتھ ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر. (المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، كم يصلي في رمضان من ركعة، قديم ٢/ ٣٩٤، مؤسسة علوم القرآن، جديد ٥/ ٢٢٥، رقم: ٧٧٧٤، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ١١/ ٣١١، رقم: ١٢١٠٢)

حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کے نزدیک آٹھ رکعت کے بارے میں کوئی قول نظر سے نہیں گذرا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۱۶)

آٹھ رکعت تراویح سلف سے ثابت نہیں

سوال [۳۱۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی مسلک حنفی سے متعلق آدمی کسی غیر مقلد کے پیچھے تراویح کی ۸/ رکعت نماز پڑھتا ہے، تو کیا اس کی نماز ہوجائے گی؟ مفتیان عظام سے گزارش ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کا جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: ذمہ داران میل وشارم تامل ناڈو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرات ائمہ اربعہ کے نزدیک ۲۰/ رکعات تراویح حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مواظبت اور اجماع امت کی وجہ سے سنت مؤکدہ ہیں، جو دور صحابہ سے آج تک امت میں تواتر وتوارث کے ساتھ جاری ہیں؛ لہٰذا بغیر کسی شرعی عذر کے اگر کوئی ۲۰/ رکعات چھوڑ کر ۸/ رکعت پر اکتفا کرتا ہے، تو ایسی صورت میں وہ باقی ۱۲/ رکعت کے بارے میں تارک سنت اور قابل ملامت شمار ہوگا۔ اور پھر کسی حنفی مقلد کے لئے کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے کہ وہ سستی میں اس غیر مقلد کی اقتداء کرے، جو صحابہ کی سنت اور اجماع امت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے ۲۰/ رکعت تراویح کا منکر ہے؛ اس لئے حنفی مقلد کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمہور صحابہ اور جمہور امت جو اہل سنت والجماعت ہیں، ان کی اتباع کرے اور ۲۰/ رکعات تراویح کو ہی لازم پکڑے۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱/ ۵۱۷، فتاوی

محمودیہ ڈابھیل ۷/ ۲۵۸، کفایت المفتی ۳/ ۳۹۸، جدید زکریا مطول ۴/ ۱۸۸، فتاوی حقانیہ ۳/ ۲۷۸، غیر مقلدین کے چھپن اعتراضات مع مجموعہ رسائل غیر مقلدیت/ ۴۱۶)

عن ابن عباس – رضي الله عنهما – كان النبي صلى الله عيه وسلم يصلي في شهر رمضان في غير جماعة بعشرين ركعة والوتر. (السنن الكبرى للبيهقي، باب ما روي في عدد ركعات القيام في شهر رمضان، دارالفكر جديد ٤/ ٦٠، رقم: ٤٧٢٠)

وفي الحديث: أنهم كانوا يقومون على عهد عمر رضي الله عنه بعشرين ركعة، وعلى عهد عثمان وعلي مثله، فصار إجماعا. (السنن الكبرى للبيهقي، قديم ٢/ ٤٩٦)

مالك عن يزيد بن رومان أنه قال: كان الناس يقومون في زمان عمر ابن الخطاب رضي الله عنه في رمضان بثلاث وعشرين ركعة. (مؤطا إمام مالك، باب ماجاء في قيام رمضان، أشرفي ص: ٤٠)

عن حسن عن عبدالعزيز بن رفيع قال: كان أبي بن كعب رضي الله عنه يصلي بالناس في رمضان بالمدينة عشرين ركعة، ويؤتر بثلاث. (مصنف ابن أبي شيبة، الصلاة، كم يصلي في رمضان من ركعة قديم ٢/ ٣٩٣، موسسة علوم القرآن، جديد ٥/ ٢٢٤، رقم: ٧٧٦٦)

عن يحيى بن سعيد أن عمر بن الخطاب رضي الله عنه أمر رجلا يصلي بهم عشرين ركعة. (مصنف ابن أبي شيبة، الصلاة، كم يصلي في رمضان من ركعة، قديم ٢/ ٣٩٣، مؤسسة علوم القرآن جديد ٥/ ٢٢٣، رقم: ٧٧٧٤)

التراويح سنة مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين للرجال والنساء، ...... وهي عشرون ركعة هو قول الجمهور، وعليه عمل الناس شرقا وغربا.

(درمختار، الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ٢/ ٤٣-٤٥، زكريا ٢/ ٤٩٣)

وسن في رمضان عشرون ركعة بعشر تسليمات بعد العشاء قبل

الـوتر، وهي عشرون ركعة. (تبيين الحقائق، الصلاة، باب الوتر والنوافل، إمداديه ملتان ١/ ١٧٨، زكريا ١/ ٤٤٣)

فقيام رمضان بعشرين ركعة والوتر هو السنة المؤكدة يضلل تاركها ويلام من نقص عنها. (إعلاء السنن، باب التراويح، دارالكتب العلمية بيروت ٧/ ٨٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/۶/۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۶/۱۴۳۵ھ

تراویح ۲۰/ رکعت یا آٹھ رکعت

سوال [۳۱۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح کی نماز کتنی رکعات ہیں؟ ہمارے یہاں تو بیس رکعت پڑھی جاتی ہیں، بعض لوگ آٹھ رکعت پڑھنے کو کہتے ہیں؟ صحیح مسئلہ کیا ہے؟

المستفتی: آصف اقبال رازی متعلم مدرسہ کاشف العلوم، چھٹمل پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ائمۂ اربعہ یعنی چاروں امام: حضرت امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور امت کے نزدیک تراویح کی نماز بیس رکعات ہیں۔ اور حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا اجماع بھی بیس رکعت تراویح پر ہے؛ اس لئے بیس رکعت تراویح جمہور امت کے نزدیک سنت مؤکدہ ہیں۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۴۱، نظام الفتاوی ۲/ ۱۷۳، غیر مقلدین کے ۵۶/ اعتراضات کے جوابات ۱۱۰-۱۱۷)

عن ابن عباس –رضي الله عنهما– أن رسول الله صلى الله عيه وسلم كان يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر. (مصنف ابن أبي شيبة، باب الصلاة

کم يصلي في رضمان من ركعة ۲/ ۳۹٤، جديد مؤسسة علوم القرآن ٥/ ۲۲٥، رقم: ۷۷۷٤، المعجم الكبير للطبراني دار احياء التراث العربي ۱۱/ ۳۱۱، رقم: ۱۲۱۰۲)

عن ابن عباس -رضي الله عنهما- كان النبي ﷺ يصلي في شهر رمضان في غير جماعة بعشرين ركعة والوتر. (السنن الكبرى للبيهقي، باب ما روي في عدد ركعات القيام في شهر رمضان، دارالفكر جديد ٤/ ٦۰، رقم: ٤۷۲۰)

وهي عشرون ركعة بعشر تسليمات. (درمختار) وهو قول الجمهور، وعليه عمل الناس شرقا وغربا. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ۲/ ٤٥، زكريا ۲/ ٤۹٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر شعبان ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۶۵)

بیس رکعت تراویح کا ثبوت

سوال [۳۱۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بیس رکعت تراویح پڑھنا حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

المستفتی: مولانا محمد حارث ندیم، صدر بازار دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیس رکعت تراویح کے ثبوت سے متعلق زیرنظر کتاب دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، اس میں ذکر کردہ تمام دلائل بھی اچھی طرح دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور سب صحیح اور معتبر ہیں، نیز مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیس رکعت تراویح اور الگ سے وتر پڑھنا ثابت ہے۔ حدیث شریف درج کی جارہی ہے:

عن ابن عباس -رضي الله عنهما- أن رسول الله ﷺ كان يصلي في

رمضان عشرين ركعة والوتر. (مصنف ابن أبي شيبة، باب الصلاة كم يصلي في رمضان من ركعة ۲/ ۳۹٤، جديد مؤسسة علوم القرآن ٥/ ۲۲٥، رقم: ۷۷۷٤، المعجم الكبير للطبراني دار احياء التراث العربي ۱۱/ ۳۹۳، رقم: ۱۲۱۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۲۸)

بیس رکعت تراویح کا ثبوت

سوال [۳۱۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح کی نماز سنت مؤکدہ ہے، تو اس کا ثبوت ادلۂ اربعہ میں سے ہے یا نہیں؟ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کی نماز پڑھی ہے یا نہیں؟ اگر پڑھی ہے تو کتنی رکعتیں ادا کی ہیں اور اس کی کیا حقیقت ہے؟

المستفتی: محمد اطہر جاوید، متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح کی نماز حضور ﷺ سے بیس رکعت پڑھنا ثابت ہے۔ ’’مصنف ابن ابی شیبہ‘‘ حدیث کی بہت بڑی کتاب ہے، جو سولہ جلدوں میں شائع ہے، اس میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث شریف مروی ہے:

عن ابن عباس –رضي الله عنهما– أن رسول الله ﷺ كان يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر. (مصنف ابن أبي شيبة، باب الصلاة كم يصلي في رمضان من ركعة ۲/ ۳۹٤، جديد مؤسسة علوم القرآن ٥/ ۲۲٥، رقم: ۷۷۷٤، المعجم الكبير للطبراني دار احياء التراث العربي ۱۱/ ۳۱۱، رقم: ۱۲۱۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍صفر المظفر ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۳۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۲/۲۴ھ

۲۰؍رکعت تراویح کا مسئلہ

سوال [۳۱۶۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعت تراویح پڑھی، آج تک بیس کا سلسلہ جاری ہے، یعنی کعبۃ اللہ اور مدینہ منورہ میں جس طرح نماز صحابہ کرامؓ کے دور سے آپؐ نے مشروع کی تھی فی الحال بھی ایسی ہی ہے، تو ساری دنیا میں الگ الگ طریقہ سے نماز کیوں؟ حالانکہ حرمین کو مرکزیت حاصل ہے، کوئی تراویح میں آٹھ، کوئی اور پڑھتا ہے، آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

المستفتی: محمد فاروق اسماعیل، محمد جعفر بلڈنگ، بمبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ساری دنیا میں تراویح کی نماز الگ الگ نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ جو لوگ ائمہ اربعہ اور فقہ کو نہیں مانتے ہیں، وہ آٹھ رکعت پر اکتفا کرتے ہیں، چاہے وہ لوگ کہیں بھی رہتے ہوں۔ اور حرمین شریفین میں بھی دور صحابہ سے اب تک ۲۰؍ ہی رکعت پڑھی جاتی ہیں۔ اور ۲۰؍رکعت سے کم کا ائمۂ جمہور فقہاء ومحققین علماء میں سے کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

عن عبدالرحمن القارئ قال: خرجت مع عمر بن الخطاب ليلة في رمضان إلى المسجد، فإذا الناس أوزاع متفرقون يصلي الرجل لنفسه، ويصلي الرجل، فيصلي بصلاته الرهط، فقال عمر: إني أرى لو جمعت هولاء على قارئ واحد لكان أمثل، ثم عزم، فجمعهم على أبي بن كعب –رضى الله عنه– الحديث. (صحيح البخاري، باب فضل من قام رمضان، النسخة الهندية ۱/ ۲۶۹، رقم: ۱۹۶۶، ف: ۲۰۱۰)

عن حسن، عن عبدالعزيز بن رفيع، قال: كان أبي بن كعب –رضي الله عنه– يصلي بالناس في رمضان بالمدينة عشرين ركعة، ويؤتر

بثلاث. (المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، كم يصلي في رمضان من ركعة، قديم ٢/ ٣٩٣، مؤسسة علوم القرآن، جديد ٥/ ٢٢٤، رقم: ٧٧٦٦)

فالمسنون عند أبي حنيفة والشافعي وأحمد عشرون ركعة -إلى قوله- فإن السنة عندهم ما واظب عليه النبي صلى الله عليه وسلم، أو الخلفاء الراشدون لتصريحهم بسنية الجماعة في التراويح، وعشرين ركعة فيها بمواظبتهم على ذلك، وهذا هو متمسك الأئمة المجتهدين في المسألة، ويؤيد ذلك قول النبي صلى الله عليه وسلم: عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين، عضوا عليه بالنواجذ. الحديث (إعلاء السنن، باب التراويح، دارالكتب العلمية بيروت ٧/ ٨٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۳۱۸/۲۵)

تراویح سے متعلق سوالات وجوابات

سوال [۳۱۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح کی نماز سنت مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟ نیز رمضان شریف میں تراویح میں ایک قرآن مجید ختم کرنا سنت مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟ نیز دس پارہ تک لگاتار تراویح میں قرآن سنا، پھر دنیاوی ضرورتوں کے پیش نظر دو چار پارہ نہ سن سکا، پھر دو چار پارہ سنا، پھر دو چار پارے چھوٹ گئے، تو کیا تراویح میں پورے قرآن سننے کی سنت ادا ہوگئی یا محروم رہے؟ نیز تراویح میں قرآن شریف سننے کے لئے روپیہ کا نذرانہ دے کر حافظ رکھنا ضروری ہے یا مقررہ امام، عالم قاری غیر حافظ کے پیچھے سورہ تراویح پڑھنا بہتر ہے۔

المستفتی: مصلیان مسجد ضلع جھنجھنوں راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: تراویح کی نماز سنت مؤکدہ ہے۔

التراويح سنة مؤكدة؛ لمواظبة الخلفاء الراشدين. (درمختار، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٣، زكريا ٢/ ٤٩٣)

التراويح سنة مؤكدة للرجال والنساء جميعا بإجماع الصحابة، ومن بعدهم من الأئمة. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، دار الكتب العلمية، بيروت جديد ٢/ ٢٠٢، مصري قديم ١/ ١٣٥)

اورکم ازکم ایک مرتبہ قرآن ختم کرنا بھی سنت ہے؛ لیکن اس میں قدرے مقتدیوں کی رعایت کی جائے۔

والختم في التراويح مرة واحدة سنة ...... فإن كان القوم يملون من القراءة في التراويح فلا بأس به، لكن يكون لهم ثواب الصلاة، لا ثواب الختم، وقد ذكرنا أن السنة هو الختم في التراويح. (حلبي كبير، فصل في النوافل، جديد ٤٠٦، ص: ٤٠٧)

اور تراویح میں جس مقتدی کی قرآن سننے کے دوران دوچار روز ناغہ ہوگئی تو اس کی ختم قرآن کی سنت پوری نہیں ہوئی۔

والختم مرة سنة، أي قراءة الختم في صلاة التراويح سنة، وصححه في الخانية وغيرها، وعزاه في الهداية إلى أكثر المشايخ، وفي الكافي: إلى الجمهور. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٦، زكريا ٢/ ٤٩٧)

اور ختم قرآن کے لئے بلا اجرت سنانے والا کوئی حافظ تلاش کرنا چاہئے، ورنہ ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھ لینی چاہئے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۷/ ۱۷۱، جدید ڈابھیل ۷/۱/ ۲۶۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۰/۸/۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۸/۸ھ

قرآن سنانے کے لئے سفر کرنا

سوال [۳۱۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح پڑھانے کے لئے حفاظ کرام کا دور دراز کا سفر شرعاً کیسا ہے؟ جب کہ اگر تراویح میں قرآن سنانا ہی مقصود ہو تو کسی بھی فرم دوکان یا مکان وغیرہ میں سنا سکتے ہیں، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا محض تراویح سنانے کے لئے دور دراز کا سفر کرنا شرعاً جائز ہے یا کوئی قباحت ہے؟

المستفتی: احمد جان پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح پڑھانے کے لئے حفاظ کرام کا سفر کرنا شرعاً درست ہے؛ لیکن تراویح سنا کر اجرت لینا جائز نہیں ہے، اس بات کا ضرور خیال رکھیں، عام طور پر جو حفاظ دور دراز تراویح سنانے کے لئے جاتے ہیں ان کا مقصد کمانا ہوتا ہے؛ لہٰذا اگر اسی ارادے سے سفر کیا جائے کہ وہاں تراویح سنانے پر کچھ ملے گا، تو اس مقصد سے سفر کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۳۲، جدید ڈابھیل ۱۷/۶۴)

ويمنع القارئ للدنيا والآخذ والمعطي آثمان، فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز؛ لأن فيه الأمر بالقراءة وإعطاء الثواب للآمر والقراءة لأجل المال. الخ (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/٥٦، زكريا ٩/٧٧، رسائل ابن عابدين، شفاء العليل وبل الغليل في حكم الوصية بالختمات والتهاليل، ثاقب بك ڈپو ديوبند ١/١٦٧)

وقراءة القرآن للدنيا مكروهة، والأفضل أن لا يعطي القارئ شيئا، وفي الواقعات: يمنع القارئ والآخذ والمعطي آثمان. (بناية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفيه ديوبند ١٢/ ٢٣٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۵۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۸/۲ھ

تراویح کی صحت کے لئے سامع کا ہونا ضروری نہیں ہے؟

سوال [۳۱۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تراویح میں قرآن پاک سنانے کے لئے سامع کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر سامع نہیں ہے تو تراویح میں کوئی نقص ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: جابر حسین موضع بھینسیہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حافظ صاحب کو اچھا یاد ہے، تو سامع کا ہونا ضروری اور لازم نہیں ہے۔ بغیر سامع کے نماز ہر حال میں صحیح اور درست ہو جاتی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۵۲۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۱۹۷۹)

تراویح کی ہر دو رکعت کے لئے نیت کرنا

سوال [۳۱۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح کی ہر دو رکعت کے لئے نیت ضروری ہے یا ایک ہی دفعہ بیس رکعات کے لئے نیت کر لینا کافی ہے؟

المستفتی: محمد سعید مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک ہی دفعہ بیس رکعت کے لئے نیت کر لینا کافی ہے؛ لیکن افضل اور احوط یہ ہے کہ ہر دو رکعت کے لئے الگ الگ نیت کرے۔

وهل يحتاج لكل شفع من التراويح أن ينوي التراويح؟ الأصح أنه لا يحتاج؛ لأن الكل بمنزلة صلاة واحدة، فإذا صلى التراويح مع الإمام ولم يجدد لكل شفع نية جاز. (عالمگیری، الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ١/ ١١٧، جديد ١/ ١٧٧، شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٥، زكريا ٢/ ٤٩٤، تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر التراويح، زكريا ٢/ ٣٢٣، رقم: ٢٥٥، كوئٹه قديم ١/ ٦٥٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۰۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۱۵ھ

تراویح کی نماز بیٹھ کر ادا کرنا

سوال [۳۱۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا کہنا ہے کہ جو شخص بالکل صحت مند ہو قیام پر قدرت رکھتا ہو اور وہ اس کے باوجود تراویح کی نماز بیٹھ کر پڑھے، تو اس کی نماز نہیں ہوگی جیسا کہ ''فتاوی رحیمیہ'' میں لکھا ہے کہ جو شخص قیام پر قدرت رکھتا ہو اس کے باوجود فرض نماز بیٹھ کر پڑھے، تو اس کی نماز باطل ہوجائے گی۔ اور تراویح سنت مؤکدہ واجب کے قریب ہے، کیا زید کا کہنا صحیح ہے؟ جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

المستفتی: شاہد جمال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح کی نماز فرض یا واجب نہیں؛ بلکہ سنت مؤکدہ ہے۔ اور سنت مؤکدہ معمولی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر ادا کرنا جائز ہے اور بغیر عذر کے بھی جائز ہے؛ لیکن کھڑے ہوکر ادا کرنے کا جو ثواب ہوتا ہے اس کا آدھا ثواب ملے گا۔

عن عمران بن حصين -رضي الله عنهما- قال: سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صلاة الرجل وهو قاعد، فقال: من صلى قائما فهو أفضل، ومن صلاها قاعدا فله نصف أجر القائم. (سنن الترمذي، الصلاة، باب ماجاء أن صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم، النسخة الهندية ١/ ٨٥، دارالسلام، رقم: ٣٧١)

لو صلى التراويح قاعدا بلا عذر، قيل: لا يجوز قياسا على سنة الفجر -إلى قوله- يجوز، والقياس على سنة الفجر غير تام، فإن التراويح دونها في التأكيد، فلا تجوز التسوية بينهما في ذلك، قال قاضيخان: وهو الصحيح. (شامي، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، كراچی ١/ ٤٤٥، زكريا ٢/ ١٣٢، مبسوط السرخسي، الصلاة، فصل أداء صلاة التراويح قاعدا من غير عذر، دار الكتب العلمية، بيروت ٢/ ١٤٧، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر في التراويح، زكريا ٢/ ٣٢٧، رقم: ٢٥٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۴؍ صفر ۱۴۲۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۷۶)	۱۴۲۶/۲/۵ھ

دوران تراویح آیت سجدہ کا اعلان کرنا

سوال [۳۱۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز سے قبل آیت سجدہ کے بتلانے کے سلسلہ میں کہ پہلی یا دوسری رکعت میں آیت سجدہ ہوگی، یہ بتلانا درست ہے یا نہیں؟ جیسا کہ آج کل تراویح کے موقع پر بتلایا جاتا ہے؟

المستفتی: مجیب اللہ گونڈوی، گرام ٹنگینہا، پوسٹ جیدہا، گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز تراویح میں سجدہ کے اعلان کا ثبوت نہیں؛ اس لئے ترک ضروری ہے۔ اور پابندی غلط ہے؛ البتہ اگر مجمع کثیر ہو اور مغالطہ کا قوی احتمال ہو کہ لوگ بجائے سجدہ کے رکوع میں چلے جائیں گے، تو ایسے موقع پر بموجب ''الضرورۃ تبیح المحضورات'' کے اعلان کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۱/ ۲۴۵ تا ۲۴۶، جدید زکریا ۵/ ۱۹۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۶۶)

سجدۂ تلاوت کے بعد بغیر کچھ پڑھے رکوع میں جانا

سوال [۳۱۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حافظ صاحب نے تراویح میں آیت سجدہ پڑھ کر سجدۂ تلاوت کیا، پھر کھڑے ہوکر کچھ پڑھے بغیر رکوع میں چلے گئے اور اس طرح نماز پوری کرلی اور سجدۂ سہو نہیں کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت سے کھڑے ہوکر کچھ پڑھے بغیر رکوع میں چلے جانے سے نماز ہوئی یا نہیں؟ اور اس صورت میں سجدۂ سہو لازم ہوا یا نہیں؟

المستفتی: عبد اللہ، مظفر نگری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سجدۂ تلاوت سے کھڑے ہوکر کچھ پڑھے بغیر رکوع میں چلا گیا، تو ایسی صورت میں نماز بلا کراہت درست ہوگئی اور سجدۂ سہو لازم نہیں ہوا؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت سے کھڑے ہوکر کچھ آیتیں پڑھ لینی چاہئیں۔

ولو كانت بختم السورة، فالأفضل أن يركع بها، ولو سجد ولم

یرکع فلا بد من أن یقرأ شیئا من السورة الأخری بعد ما رفع رأسه من السجود، ولو رفع ولم یقرأ شیئا ورکع جاز. (هندیة، کتاب الصلاة، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، زکریا قدیم ۱/ ۱۳۲، جدید ۱/ ۱۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/۳/۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۵۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۳/۱۴۲۱ھ

تراویح میں مقتدیوں کی رعایت کی جائے یا امام کی ضعف عمری کی؟

سوال [۳۱۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید حافظ صاحب عرصہ تقریباً ۲۰؍سال سے بازار کی ایک مسجد میں ماہ رمضان کے دوران قرآن شریف سناتے آرہے ہیں، وہ اس مسجد میں سال گذشتہ تک تین پارے یومیہ سناتے تھے،اب ان کی عمر اور صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ یومیہ تین پارے پڑھ سکیں، وہ روز دو پارے سنانا چاہتے ہیں، بازار کی تقریباً چار اور مساجد میں بھی جو کہ قریب قریب واقع ہیں، تین پارے یومیہ پڑھے جاتے ہیں، چند بازار والوں کی خواہش ہے کہ یہاں بھی تین پارے ہی ہونے چاہئیں، ایسی صورت میں انتظامیہ کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟ امام صاحب جو کہ ۲۰؍سال سے اس مسجد میں کلام پاک سناتے آرہے ہیں، ان کی عمر اور کمزوری صحت کو دیکھتے ہوئے دو پارے پڑھوانا چاہئے، یا پھر بازار والوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حافظ صاحب کو بدل دینا چاہئے؟

المستفتی: مطیع الرحمٰن شمسی، پیر غیب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت کا منشاء یہ ہے کہ رمضان میں پورے رمضان تراویح میں قرآن سننے سنانے کا سلسلہ جاری رہے؛ لہٰذا اگر پہلے عشرہ میں تین تین پارہ کرکے

ایک قرآن پورا کیا جاتا ہے، تو بقیہ دوعشروں میں ڈیڑھ ڈیڑھ پارہ کرکے دوسرا قرآن سنانا چاہئے۔ اور اگر شروع میں دودو پارہ کرکے پندرہ دن میں ایک قرآن سنایا جائے تو آخر کے پندرہ دن میں بھی دودو پارہ کرکے دوسرا قرآن سننے سنانے کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے، اگر آپ شریعت کا منشاء معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو شریعت کا منشا یہی ہے اور شریعت آپ کو اس کا مشورہ نہیں دے گی کہ دس دن میں تین تین پارہ یا پندرہ دن میں دودو پارہ کرکے قرآن ختم ہونے کے بعد پھر مسجد میں قرآن سننے سنانے کا سلسلہ ختم کردیں؛ اس لئے کہ رمضان کے تینوں عشروں میں سے آخری عشرہ کی فضیلت زیادہ ہے؛ اس لئے اس میں قرآن سننے سنانے کا سلسلہ ضرور باقی رہنا چاہئے؛ لہٰذا آپ اگر منشاء شریعت چاہتے ہیں تو اس کا حل یہی ہے کہ پورے رمضان میں دو ختم قرآن کو تقسیم کردیا جائے۔ اور ایک ختم کے لئے مذکورہ حافظ صاحب کو بھی موقع دیا جائے۔ اور دوسرے ختم کے لئے دوسرے حافظ کا انتظام کرلیا جائے۔

عن سلمان قال: خطبنا رسول الله ﷺ في آخر يوم من شعبان –إلى– وهو شهر: أوله رحمة، وأوسطه مغفرة، وآخره عتق من النار. الحديث (صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ٢/ ٩١١، رقم: ١٨٨٧، شعب الإيمان، دارالكتب العلمية، بيروت ٣/ ٣٠٥-٣٠٦، رقم: ٣٦٠٨)

السنة في التراويح إنما هو الختم مرة فلا يترك لكسل القوم، كذا في الكافي...... والختم مرتين فضيلة، والختم ثلاث مرات أفضل، كذا في السراج الوهاج. (عالمگيرى، فصل في التراويح، الباب التاسع في النوافل، زكريا قديم ١/ ١١٧، جديد ١/ ١٧٧، شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٧، زكريا ٢/ ٤٩٧)

ومنهم من استحب الختم في ليلة السابع والعشرين رجاء أن ينالوا ليلة القدر؛ لأن الأخبار تظاهرت عليها. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٧، زكريا ٢/ ٤٩٧)

ولو عجل الختم له أن يفتتح من أول القرآن في بقية الشهر.

(فتاوى قاضي خان على هامش الهندية، فصل في مقدار القراءة في التراويح ۱/ ۲۳۸،
زكريا جديد ۱/ ۱٤۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۱ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۰۵)	۱۴۲۳/۶/۲۱ھ

روزانہ تراویح میں کتنے پارے پڑھے جائیں؟

سوال [۳۱۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسجد میں پانچ پارہ تراویح میں پڑھنے سے متعلق کچھ آپس میں کشیدگی پیدا ہوگئی، کچھ مقتدی حضرات چاہتے ہیں کہ دو دو پارے ہوں اور کچھ چاہتے ہیں کہ پانچ پارے ہوں، تو شرعاً کتنے پارے پڑھنے چاہئیں، سنت طریقہ کیا ہے؟ پانچ پارہ ہونے میں بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ادھر تراویح ہورہی ہے ادھر لوگ بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے ہیں، تو بہتر کیا ہے؟

المستفتی: ابوالفرح، امام مسجد شان مصطفیٰ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تراویح میں قرآن کریم پورے رمضان المبارک میں ایک مرتبہ ترتیب وار ختم کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ اور روزانہ دو پارے کرکے دو ختم کرنا فضیلت اور تین پارے کرکے تین ختم کرنا افضل اور باعث خوش نصیبی ہے؛ لیکن لوگوں کا بیٹھ کر باتیں کرتے رہنا اور جب امام رکوع میں جانے لگے تو جلدی سے امام کے ساتھ شریک ہوجانا مکروہ ہے، مگر پورے رمضان ختم کا سلسلہ باقی رکھا جائے، اب آپ ان تین شکلوں میں جونسی مناسب سمجھیں اختیار کریں، پانچ پارے پڑھنے میں قرآن کا حق ادا نہیں ہوتا؛ اس لئے پانچ نہ پڑھیں تو بہتر ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/۲۲)

السنة الختم مرة، فلا يترك لكسل القوم، ومرتين فضيلة، وثلاث مرات في كل عشر مرة أفضل، ويكره للمقتدي أن يقعد في التراويح، فإذا أراد الإمام أن يركع يقوم. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ۲/ ۱۲۰-۱۲۲، كوئٹه ۲/ ۶۹-۶۸، قاضي خان على هامش الهندية، فصل في مقدار القراءة في التراويح، زكريا ۱/ ۲۳۸، جديد ۱/ ۱۴۷، الهندية، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ۱/ ۱۱۷، جديد ۱/ ۱۷۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۴۰۸/۳۳)

روزمرہ تراویح میں پارہ کی مقدار

سوال [۳۱۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں محلّہ کی مسجد میں روزانہ کتنا پارہ پڑھنا چاہئے؟ اگر دس دن میں ایک کلام پاک تراویح میں سن لیں اس کے بعد نیچے مسجد میں دوسرا قرآن ہوتا ہے اور بالائی مسجد میں ”الم ترکیف“ سے تراویح پڑھتے ہیں اور اس میں بھی پابندی نہیں کرتے، نیز زیریں مسجد میں لوگ کم ہوتے ہیں اور ”الم ترکیف“ سے پڑھنے میں زیادہ ہوتے ہیں اور تین پارہ ہونے کی صورت میں محلّہ کے پنجوقتہ نمازی تین پارہ زیادہ ہونے کی وجہ سے محلّہ کی مسجد چھوڑ کر دوسری جگہ تراویح پڑھنے چلے جاتے ہیں، تو محلّہ کی رعایت نہ رکھ کر دوسری جگہ سے آنے والوں کے لئے تین پارہ کرانا کیسا ہے؟ اور تین پارہ پڑھنے پڑھوانے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد ظفر، گلشہید مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پورے رمضان کے مہینہ میں تراویح میں ایک قرآن ختم

کرنا سنت ہے، دومرتبہ فضیلت ہے اور تین مرتبہ ختم کرنا افضل ہے، مگر دومرتبہ یا تین مرتبہ ختم کرنے کے لئے متقدیوں کی رضامندی ضروری ہے۔

وفي الفتاوى: الختم في التراويح مرة سنة، والختم مرتين فضيلة، والختم ثلاث مرات في كل عشر ليال مرة أفضل. (الجوهرة النيرة، كتاب الصلاة، باب قيام شهر رمضان، إمداديه ملتان ١/ ٩٥، دارالكتاب ديوبند ١/ ١١٨، الفتاوى التاتارخانية، الصلاة، الفصل الثالث عشر، زكريا ٢/ ٣٢٤، رقم: ٢٥٥٢)

عن الحسن قال: من أم الناس في رمضان فليأخذ بهم اليسر، فإن كان بطيئ القراءة فليختم القرآن ختمة، وإن كان قراءة بين ذلك، فختمة ونصف، وإن كان سريع القراءة فمرتين. (المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، في صلاة رمضان، موسسة علوم القرآن جديد ٥/ ٢٢٢، رقم: ٧٧٦١)

سوال نامہ میں جولکھا گیاہے کہ محلّہ کے لوگ اس مسجد کوچھوڑ کر دوسری مسجدوں میں چلے جاتے ہیں، یا اکثر لوگ اس مسجد میں نماز پڑھتے ہیں اور چندافراددوسری مسجدوں میں چلے جاتے ہیں اس سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے یہ مراد ہے کہ محلّہ کے تمام نمازی اپنی مسجد چھوڑ کر دوسری مسجدوں میں چلے جاتے ہیں یا اکثر لوگ اس مسجد میں نماز پڑھتے ہیں اور چندافراد دوسری مسجدوں میں چلے جاتے ہیں، اگر محلّہ کے تمام نمازی اپنی محلّہ کی مسجد چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، تو اس کوسوال میں واضح کرکےلکھاجائے، اس کے بعد حکم شرعی لکھا جاسکتا ہے۔ اوراگر اکثر لوگ محلّہ کی مسجد میں تین پارہ سنتے ہیں، تو اکثر کا اعتبار رہے، چندافرادکا اعتبار نہیں۔

والأفضل في زماننا أن يقرأ بما لا يؤدي إلى تنفير القوم عن الجماعة لكلهم. (الهندية، الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ١/ ١١٨، جديد ١/ ١٧٧)

والاختيار أن الأفضل أن يقرأ فيها مقدار ما لا يؤدي إلى تنفير القوم في زماننا؛ لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراءة. (البحر الرائق، الصلاة، باب الوتر والنوافل، دارالكتاب ديوبند ٢/ ١٢١، زكريا ٢/ ١٢١، كوئٹه ٢/ ٦٨، شامي،

كتاب الصلاة، بـاب الـوتـر والـنـوافل، مبحث في صلاة التراويح، كراچی ۲/ ٤٧، زكريا ۲/ ٤٩٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍شعبان ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۸۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۸/۱۶ھ

کم از کم کتنی مدت میں تراویح میں قرآن ختم کرنا مسنون ہے؟

سوال [۳۱۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب رمضان المبارک میں پانچ یوم میں قرآن کریم تراویح میں سناتے ہیں، صفیں، مائک اور ختم قرآن کے موقع پر شیرینی وغیرہ کا انتظام خود کرتے ہیں اور ختم قرآن ہی کی رات کچھ حضرات یہ کہہ کر پیسہ اکٹھا کرتے ہیں کہ امام صاحب نے مائک اور شیرینی وغیرہ کا انتظام کیا ہے؛ لہٰذا متقدی حضرات اپنی حیثیت کے مطابق پیسہ دے دیتے ہیں، تو امام صاحب کے لئے یہ پیسہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: یہ بات واضح رہے کہ امام صاحب ہی مائک اور شیرینی وغیرہ کا انتظام اپنی ذاتی ملکیت سے کرتے ہیں، جب کہ امام صاحب ابھی طالب علم ہیں، اپنا کوئی کاروبار نہیں ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب عنایت فرمائیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد سفیان، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک آدمی جب تنہا نماز پڑھے تو بخاری ومسلم اور ابوداؤد کی روایت میں وارد ہوا ہے کہ سات دن سے کم میں قرآن ختم نہیں کرنا چاہئے۔ حضور ﷺ نے اس سے کم میں قرآن ختم کرنے سے ممانعت فرمائی ہے؛ البتہ ترمذی کی روایت کے مطابق تنہا نماز پڑھنے میں جب زیادہ قوت اور ہمت والا ہو تو اس کے لئے پانچ دن یا تین

دن کی بھی گنجائش ہے؛ لیکن جماعت کے ساتھ تراویح کی نماز پڑھنے میں مقتدیوں میں بوڑھے بھی ہوتے ہیں، کمزور بھی ہوتے ہیں اور نئے مزاج کے بھی ہوتے ہیں، ان کے لئے ڈیڑھ دو پارہ قرآن سننا بھی مشکل اور بھاری ہوجاتا ہے؛ اس لئے ایک دن میں زیادہ سے زیادہ تین سوا تین پارہ پڑھنے کی گنجائش ہوسکتی ہے، اس سے زیادہ پڑھنے میں مقتدیوں میں اکتاہٹ کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے، جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں پانچ دن میں قرآن ختم کرنے کی جو بات لکھی گئی ہے، اس سے باز رہنا ضروری ہے۔

حدثني عبدالله بن عمرو بن العاص، قال: كنت أصوم الدهر، وأقرأ القرآن كل ليلة -إلى- قال: واقرأ القرآن في كل شهر، قال: قلت: يا نبي الله! إني أطيق أفضل من ذلك، قال: فاقرأه في كل عشرين، قال: قلت: يا نبي الله! إني أطيق أفضل من ذلك، قال: فاقرأه في كل عشر، قال: قلت: يا نبي الله! إني أطيق أفضل من ذلك، قال: فاقرأه في كل سبع ولا تزد على ذلك، فإن لزوجك عليك حقا، ولزورك عليك حقا، ولجسدك عليك حقا، قال: فشددت، فشدد علي. (مسلم شريف، كتاب الصيام، باب النهي عن صوم الدهر ١/ ٣٦٦، رقم: ١١٥٩، أبو داؤد شريف، كتاب الصلاة، أبواب قراءة القرآن وتحزيبه وترتيله ١/ ١٩٧، دارالسلام، رقم: ١٣٨٨، ترمذي شريف، باب في كم أقرأ القرآن؟ النسخة الهندية ٢/ ١٢٣، دارالسلام، رقم: ٢٩٤٦)

عن عبدالله بن عمرو قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اقرأ القرآن في شهر، قلت: إني أجد قوة حتى قال: فاقرأه في سبع ولا تزد على ذلك. (بخاري شريف، كتاب فضائل القرآن، باب في كم يقرأ القرآن؟ النسخة الهندية ٢/ ٧٥٦، رقم: ٤٨٦٣، ف: ٥٠٥٤)

اور یہ جو طریقہ لکھا گیا ہے کہ مائک شیرینی وغیرہ کا خرچ حافظ صاحب دیتے ہیں، یہ طریقہ غلط ہے، ان سب چیزوں کا نظم محلے والوں کو کرنا چاہئے اور پھر قرآن سنا کر کے ختم قرآن کے

موقع پر پیسہ اکٹھا کر کے حافظ صاحب کو پیش کرنا اور حافظ صاحب کا ان کو قبول کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، یہ قرآنی آیت :''لَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلاً'' کی وعید میں داخل ہو کرنا جائز اور حرام ہے۔

قال أبو العالية: لا تأخذوا عليه أجرا. (تفسير ابن كثير ۱/ ۲۲۲)

''لَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلاً''. يقول: لا تأخذوا عليه أجرا.

(الدرالمنثور، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۱۵۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰/ ۱۱۱۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۲۳ھ

نماز تراویح میں ہر سورت کے شروع میں جہراً ''بسم اللہ'' پڑھنا

سوال [۳۱۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تراویح کے اندر ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کو بآواز بلند پڑھنا کیسا ہے؟ اگر جائز ہے تو ہم بآواز بلند پڑھیں یا نہیں؟ اس کے بارے میں اپنے امام ابو حنیفہؒ کیا فرماتے ہیں؟ اور امام عاصم الکوفی کیا فرماتے ہیں؟ اور اپنے اکابرین دار العلوم دیوبند کا اس پر کیا عمل رہا ہے؟ ہم کس پر عمل کریں؟ ہم سورت کے شروع میں بآواز بلند تراویح کے اندر پڑھیں یا نہیں؟ اگر ہم با آواز بلند پڑھتے ہیں تو امام ابوحنیفہؒ کا اس کے بارے میں کوئی اختلاف تو نہیں ہے؟ اگر اس کے بارے میں امام صاحب کا اتفاق ہے تو اس کی بھی وضاحت فرمائیں، تاکہ ہم صحیح عمل کرسکیں، آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں

المستفتی: نجیب الرحمٰن بھاگلپور، امام گملے والی مسجد پیر زادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حضرات حنفیہ کے نزدیک ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ'' شریف کا پڑھنا مشروع ہے؛ البتہ ہر سورت کے شروع میں جہراً پڑھنا مسنون نہیں ہے، نیز حضرت امام عاصمؒ کے نزدیک ہر سورت کے شروع میں پڑھنا ضروری تو ہے؛ لیکن جہراً پڑھنا ان کے یہاں بھی ضروری نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/۲۳۱، فتاوی دارالعلوم ۴/ ۸ ۲۷)

إن الفتوى على قول أبي يوسفؒ أنه يسمي في أول كل ركعة ويخفيها، وذكر في المحيط: المختار قول محمد، وهو أن يسمى قبل الفاتحة، وقبل كل سورة في كل ركعة. (شامي، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، قبيل مطلب لفظة الفتوى آكدو أبلغ من لفظة المختار، زكريا ٢/ ١٩٢، كراچی ١/ ٤٩٠)

وأما الموضع الرابع: فإنه يخفى عندنا ...... وروى الطبراني، ثنا محمد بن أبي السرى، ثنا معتمر بن سليمان عن أبيه عن الحسن عن أنس – رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يسر ببسم الله الرحمن الرحيم، وأبا بكر وعمر وعثمان وعليا. (المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ١/ ٢٥٥، رقم: ٧٣٩)

وهو مذهب الثوري وابن المبارك، وقال ابن عبدالبر وابن المنذر: هو قول ابن مسعود وابن الزبير، وعمار بن ياسر، وعبد الله بن المغفل، والحاكم، والحسن بن أبي الحسن، والشعبي، والنخعي، والأوزاعي، وعبدالله بن المبارك، وقتادة، وعمر بن عبدالعزيز، والأعمش، والزهري، ومجاهد، وحماد، وابن عبيد، وأحمد، واسحاق رحمهم الله. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، أشرفيه ديوبند ٣٠٧، ٣٠٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۳۹۸)

ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ'' جہراً پڑھنے سے متعلق تحقیقی فتویٰ

سوال [۳۱۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) بکر کہتا ہے کہ ''بسم اللہ'' امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قرآن کا مطلقاً جزو ہے، ہر سورت کا جزو نہیں، تو اس لحاظ سے بسم اللہ کا ایک مرتبہ تراویح میں زور سے پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کسی نے پورے ختم قرآن میں کہیں بھی بسم اللہ زور سے نہیں پڑھی تو اس صورت میں قرآن کریم مکمل ہوگا یا ناقص؟ مدلل ومفصل جواب مطلوب ہے۔

(۲) امام عاصمؒ کے مذہب کے مطابق ہر دو سورتوں کے درمیان ''بسم اللہ'' پڑھنا ضروری ہے، جو قراءت متعارف ہند کے مطابق ہے۔ اور امام اعظم کے مذہب میں تراویح کے اندر ''بسم اللہ'' ہر سورت کے شروع میں زور سے نہیں پڑھتے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ'' مرسوم نہیں ہے؛ اس لئے پڑھنا بھی مشروع نہیں؛ بلکہ ایک مرتبہ کسی غیر معین سورت کے اول میں پڑھی جاتی ہے، تو اس صورت میں ختم کلام مجید بروایت حفص عن العاصم کس طرح پورا ہوگا؛ کیوں کہ امام عاصمؒ ''بسم اللہ'' کو ہر سورت کا جزو مانتے ہیں، ورنہ تو ان قاریوں کی روایت پڑھنی چاہئے جن کے یہاں ''بسم اللہ'' ہر سورت کا جزو نہیں ہے، تا کہ قرآن ناقص نہ رہے، نیز ان لوگوں پر تنقید کرنا جو تراویح میں ''بسم اللہ'' ہر سوت کے شروع میں بالجہر پڑھتے ہیں، کہاں تک درست ہے؟ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: اخلاق حسین قاسمی، خادم القرآن مدرسہ شاہی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) بکر کا یہ کہنا کہ ''بسم اللہ'' حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قرآن کریم کا مطلقاً جزو ہے، ہر سورت کا جزو نہیں، درست اور صحیح ہے؛ لہٰذا پوری تراویح میں ختم قرآن کے لئے کسی بھی غیر معین سورت کے شروع میں ایک مرتبہ ''بسم اللہ'' جہراً پڑھنا لازم اور ضروری ہے، ورنہ قرآن ناقص رہ جائے گا، اگر امام نے بجائے جہراً کے سراً

پڑھ دیا تو اس سے صرف امام کا ختم پورا ہوگا، سامعین کے ختم میں ایک آیت کی کمی رہ جائے گی؛ لہٰذا امام کو چاہئے کہ قرآن کریم کی دیگر آیتوں کی طرح ''بسم اللہ'' بھی ایک دفعہ جہراً پڑھے، تاکہ امام اور سامعین دونوں کا قرآن مکمل ہوجائے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۶۲، امداد الاحکام ۲/ ۲۴۴، امداد الفتاوی ۱/ ۴۹۵)

وهی آية واحدة من القرآن كله أنزلت للفصل بين السور. (الدرالمختار على هاشم رد المحتار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، مطلب قراءة البسملة بين الفاتحة والسورة ١/ ٤٩١، كراچی ٢/ ١٩٣، زكريا ديوبند، فتاوى عالمگيرى، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، الفصل الثالث في سنن الصلاة، زكريا قديم ١/ ٧٤، جديد ١/ ١٣١، طحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب سنن الصلاة، دارالكتاب ديوبند ٢٦، قديم ١٤١، أحكام القرآن، القول فى أنها من فاتحة الكتاب، مطبع سهيل اكيڈمی لاهور ١/ ٩)

ولو قرأ تمام القرآن في التراويح، ولم يقرأ البسملة في ابتداء سورة من السور، سوا ما فى النملة لم يخرج عند عهدة السنية، ولو قرأها سرا خرج عن العهدة، لكن لم يخرج المقتدون عن العهدة. (أحكام القنطرة، ص: ٢٧٣، بحواله فتاوى محموديه قديم ١٦/ ٤٣٨، جديد ڈابهيل ٧/ ٣٠١)

(۲) امام عاصم یا قراءت حفص کی تقلید صرف قرآن کریم کی تلاوت اور وجوہ قرأت میں کی جاتی ہے، باقی نماز کے احکام میں ان کی تقلید نہیں کی جاتی ہے، اس میں صرف فقہاء کرام کی تقلید کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ کے ماننے والے امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کریں، امام شافعیؒ کے مقلدین امام شافعیؒ کی تقلید کریں اور امام احمدؒ کے مقلدین امام احمدؒ کی تقلید کریں۔ رہی بات ''بسم اللہ'' کے ہر سورت کے شروع میں زور سے پڑھنے کی تو چونکہ ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ'' کا جہراً پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین سے ثابت نہیں ہے؛ اس لئے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ'' جہراً پڑھنا مسنون

نہیں ہے؛ البتہ آہستہ پڑھنا ثابت ہے، اگر کوئی حنفی مسلک کا آدمی ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ جہراً پڑھتا ہے، تو اس کو مسئلہ بتا دیا جائے کہ ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ'' جہراً پڑھنا امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا نہیں؛ لہٰذا حنفی آدمی کو بسم اللہ آہستہ پڑھنی چاہئے، زور سے نہیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی، قدیم ۳/۴۲۱، ۳/۴۲۳، جدید زکریا ۳/ ۴۶۷، زکریا مطول ۳/۵۹۰، فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۶۸، ۴/ ۲۷۸، احسن الفتاویٰ، زکریا ۳/۷۴، ایضاح المسائل/۳۰)

عن أنس – رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يسر ببسم الله الرحمن الرحيم، وأبا بكر وعمر وعثمان وعلي رضى الله عنهم. (المعجم الكبير، دار احياء التراث العربي ١/ ٢٥٥، رقم: ٧٣٩، أحكام القرآن، وأما قراء تها في الصلاة، سهيل اكيڈمى لاهور ١/ ١٣)

ولا تسن بين الفاتحة والسورة مطلقا ولو سرية، ولا تكره إتفاقا –إلى قوله– وليست من الفاتحة، ولا من كل سورة. (الدرالمختار على هامش رد المحتار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، مطلب لفظ الفتوى آكد وأ بلغ من لفظ المختار، كراچى ١/ ٤٩٠، زكريا ٢/ ١٩٢، ٢/ ١٩٣)

ولا يسمى بين الفاتحة والسورة هكذا فى الوقاية والنقاية، وهو الصحيح. (فتاوى عالمگيرى، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، الفصل الثالث في سنن الصلاة، زكريا قديم ١/ ٧٤، جديد ١/ ١٣١، طحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، باب سنن الصلاة، دارالكتاب ديو بند ٢٦١، قديم ١٤٢)

وروى هشام عن أبي يوسف قال: سألت أبا حنيفةؒ يجزيه قرائتها قبل الحمد. (أحكام القرآن، سهيل اكيڈمى لاهور ١/ ١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/۸ھ

ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ'' جہراً پڑھی جائے یا سراً؟

سوال [۳۱۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نمازتراویح میں ہر سورت کے شروع میں جہراً بسم اللہ پڑھنا کیسا ہے؟ اور حنفیہ کے نزدیک کیا حکم ہے؟

المستفتی: عرفان حیدرآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احناف کے نزدیک تراویح میں ہر سورت کے شروع میں ''بسم اللہ'' جہراً پڑھنا خلاف سنت ہے اور سراً پڑھنا افضل اور مستحسن ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۷/ ۲۹۹، میرٹھ ۱۱/ ۳۷۷، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۹، کفایت المفتی، زکریا ۳/ ۴۶۸، قدیم ۳/ ۴۲۱، زکریا مطول ۳/ ۵۹۰، ایضاح المسائل ۳۰، امداد الفتاوی ۱/ ۴۹۵)

عن أنس –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبو بكر، وعمر، وعثمان يفتتحون القراءة بالحمد لله رب العالمين...... والعمل على هذا عند أهل العلم من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم والتابعين، ومن بعدهم كانوا يستفتحون القراءة بالحمد لله رب العالمين. (ترمذي، كتاب الصلاة، باب في افتتاح القراءة بالحمد لله رب العالمين، النسخة الهندية ١/ ٥٧، دارالسلام، رقم: ٢٤٦، صحيح مسلم، الصلاة باب حجة من قال: لا يجهر بالبسملة، النسخة الهندية ١/ ١٧٢، بيت الأفكار، رقم: ٣٩٩)

قد صح عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان يفتتح الصلاة، أي القراءة بالحمد لله رب العالمين، ولا يجهر ببسم الله، أقول: ولا يبعد أن يكون جهر بها فى بعض الأحيان ليعلمهم سنة الصلاة، والظاهر أنه كان يخص بتعليم

هـذه الأذكـار الـخـواص مـن الـصـحابة، ولا يجعلها بحيث يؤاخذ بها العامة ويلامون على تركها. (حجة الله البالغة، مکتبہ حجاز ۲/ ۴۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ صفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۴۲)

تراویح میں ہر سورۃ کے شروع میں ''بسم اللہ'' جہراً پڑھنا

سوال [۳۱۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح کے اندر ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ جہراً ہے یا سراً؟ اگر سراً ہے تو بظاہر امام عاصم کے قول کے خلاف معلوم ہوتا ہے؛ چونکہ امام عاصم کے نزدیک جن کی روایت حفص ہر جگہ پڑھی جاتی ہے، ان کے یہاں بسم اللہ ہر سورت کا جزو ہے، اب یہاں زیرِ غور بات یہ ہے کہ ہم کس کے قول پر عمل کریں گے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے یا امام عاصم کے؟ حالانکہ کسی کہنے والے نے کہا کہ امام ابوحنیفہ قراءت میں خود امام عاصم کے شاگرد ہیں، خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر حافظ ایک جگہ بسم اللہ جہراً پڑھتا ہے اور بقیہ جگہ میں سر کرتا ہے، بقول امام عاصم سامع کی اتنی آیتیں ناقص رہ جاتی ہیں، اس کی صورت حال کیا ہے؟ اس کی بھی وضاحت کریں، مفتی بہ قول جہراً پڑھنے کا ہے یا سراً؟

المستفتی: عبداللہ طارق، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہم نماز میں ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں، حضرت امام عاصم کے مقلد نہیں، ہم کو امام اعظم کے مسلک پر عمل کرنا چاہئے، امام عاصم کے قول پر نہیں، نیز حنبلی مسلک میں بھی ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ جہراً مسنون نہیں ہے؛ اس لئے امام حرم بھی ہر سورت کے شروع میں جہراً نہیں پڑھتے ہیں اور بعض کیسٹوں میں امام حرم کی قرأت بھرنے

والوں نے اپنی طرف سے اضافہ کردیا ہے، اس کا اعتبار نہیں؛ لہٰذا پورے قرآن میں صرف ایک جگہ بسم اللہ پڑھے گا تو قرآن کے مکمل ہونے میں کوئی کمی باقی نہیں رہے گی۔ (مستفاد: کفایت المفتی، قدیم ۳/۴۲۱، جدید زکریا ۳/۴۶۷، زکریا مطول ۳/۵۹۰، فتاوی دارالعلوم ۴/۲۶۸)

عن أنس -رضي الله عنه- قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبو بكر، وعمر، وعثمان يفتتحون القراءة بالحمد لله رب العالمين...... والعمل على هذا عند أهل العلم من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم والتابعين، ومن بعدهم كانوا يستفتحون القراءة بالحمد لله رب العالمين.

(ترمذي، كتاب الصلاة، باب في افتتاح القراءة بالحمد لله رب العالمين، النسخة الهندية ١/ ٥٧، دارالسلام، رقم: ٢٤٦)

ثم عن أبي حنيفة رحمة الله عليه أنه لا يأتي بها في أول كل ركعة، كالتعوذ. (هدايه، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، أشرفى ديوبند ١/ ١٠٤)

عن أنس -رضي الله عنه- أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يسر ببسم الله الرحمن الرحيم، وأبا بكر، وعمر، وعثمان، وعليا رضى الله عنهم ومن تقدم من التابعين، وهو مذهب الثوري وابن المبارك، وهو قول ابن مسعود وابن الزبير، وعمار ابن ياسر، وعبدالله بن المغفل، والحكم والحسن، والشعبي، والنخعي، والأوزاعي، وقتادة، وعمر بن عبدالعزيز، والأعمش، والزهري، ومجاهد، وحماد، وأبي عبيد، وأحمد، وإسحاق. الخ

(فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، كوئٹه ١/ ٢٥٤، ٢٥٥، زكريا ١/ ٢٩٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/۱/۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۶۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۱/۱۴۱۷ھ

تراویح میں سورت ملانے کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھنا؟

سوال [۳۱۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حافظ صاحب نے ختم تراویح کی شب ۱۹ر رکعات میں سورۂ کافرون تک پڑھا اور بیسویں رکعات میں سورۂ فاتحہ اور ''قل اعوذ برب الناس'' تک پڑھ کر پھر سورۂ فاتحہ پڑھی، اسی رکعت میں اور ایک رکوع سورۂ بقرہ کا بھی پڑھا، تو سورۂ فاتحہ کا تکرار لازم آیا، تو تکرار کی صورت میں سجدہ سہو لازم آئے گا یا نہیں؟ اگر آئے گا تو کیوں؟ اور اگر نفی میں جواب ہو تو مدلل ومفصل جواب تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، عین کرم ہوگا۔

المستفتی: محمد فضل الرحمٰن سکونت بھاگلپور، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تکرار نام ہے بلا فصل دہرانے کا۔ اور سوال نامہ کی درج شدہ صورت میں تکرار نہیں ہے؛ بلکہ اعادہ ہے اور اعادہ سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا؛ لہٰذا مذکورہ شکل میں سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا۔

ولو قرأ الفاتحة، ثم السورة، ثم الفاتحة لا سهو عليه، كذا في الظهيرية، وهكذا في التجنيس، وهو الأصح. (فتاوی عالمگیری، الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثاني في واجبات الصلاة، زكريا قديم ١/ ٧١، جديد ١/ ١٢٨)

ولو قرأ فاتحة الكتاب، وسورة، ثم قرأ فاتحة الكتاب، فلا سهو عليه. (المحيط البرهاني، الصلاة، الفصل السابع عشر، سجود السهو، المجلس العلمي، جديد ٢/ ٣١٠، رقم: ١٨٥١، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر في سجود السهو، زكريا ٢/ ٣٩١، رقم: ٢٧٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر شعبان ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۳۷۶)

تراویح میں ایک سورت کا تکرار

سوال [۳۱۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کی بارے میں: ایک روز میں نے اور کچھ دوستوں نے نماز تراویح اہل حدیث حضرات کے امام کی اقتداء میں ادا کی، جب وہ آٹھ رکعت سے فارغ ہوکر وتر پڑھنے لگے،تو ہم الگ ہوگئے، بعد میں ہم نے باجماعت بارہ رکعت تراویح اور پڑھیں، امام نے ایک بار ایک ہی نیت میں دو رکعت کی نماز میں دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت پڑھ دی، کیا نماز صحیح ہوگئی؟ کیا ہم امام اہل حدیث کے ساتھ وتر پڑھ کر الگ سے بارہ رکعت پڑھ سکتے ہیں باجماعت؟

المستفتی: اقتدار انیس صدیقی، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح ودیگر نوافل میں سورتوں کا تکرار مکروہ نہیں ہے؛ بلکہ فرائض میں مکروہ ہے۔

ویکره تكرار السورة في ركعة واحدة في الفرائض، ولا بأس بذلك في التطوع. الخ (فتاوی عالمگیری، الباب السابع فیما یفسد الصلاة، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، زكريا قديم ١/ ١٠٧، جديد ١/ ١٦٦)

وينبغي أن يقيد ذلك بالفرائض؛ لأن تكرار الفاتحة في النوافل لم يكره كما في القهستاني. (مجمع الأنهر، الصلاة، باب سجود السهو، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٢٢٠، حاشية الطحطاوي على المراقي، الصلاة، فصل في بيان واجب الصلاة، دارالكتاب ديوبند ٢٥٥)

نیز اہل حدیث کے ساتھ باجماعت وتر پڑھنے کے بعد بقیہ تراویح ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ بلکہ جائز ہے۔

فلو فاته بعضها وقام الإمام إلى الوتر أوتر معه ثم صلى ما فاته.

(الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٤، زكريا ٢/ ٤٩٤)

وإذا فاتته ترويحة أو ترويحتان، فلو اشتغل بها يفوته الوتر بالجماعة يشتغل بالوتر، ثم يصلي مافات من التراويح، وبه كان يفتي الشيخ الإمام الأستاذ ظهير الدين. (هندية، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ١/ ١١٧، جديد ١/ ١٧٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ شوال ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۴۷)

نمازِ تراویح میں سورتیں مکرر پڑھنا

سوال [۳۱۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں بعد ختم قرآن پاک کے سورۂ الم ترکیف سے پڑھا جاتا ہے، کیا ایسے میں سورت یا سورتیں مکرر کر کے پڑھنے اور پڑھانے کی جو ممانعت آئی ہے وہ لاگو نہ ہوگی؟

المستفتی: اقتدار انیس صدیقی اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں اس میں لاگو نہ ہوگی۔

ويكره تكرار السورة في ركعة واحدة في الفرائض، ولا بأس بذلك في التطوع. (فتاوى عالمگيرى، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، زكريا قديم ١/ ١٠٧، جديد ١/ ١٦٦)

وينبغي أن يقيد ذلك بالفرائض؛ لأن تكرار الفاتحة في النوافل لم يكره كما في القهستاني. (مجمع الأنهر، الصلاة، باب سجود السهو، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٢٢٠)

ذكر في فتاوى العتابي: أن تكرار الفاتحة في التطوع لا يكره، لورود الخبر في مثله. (حاشية چلپی، الصلاة، فصل وإذا أراد الدخول في الصلاة كبر، إمداديه

ملتان، قديم ۱/ ۱۲۸ زكريا ۱/ ۳۲۹، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، الصلاة، فصل في بيان واجب الصلاة، دارالكتاب ديوبند، ص: ۲۵۵)

البتہ باجماعت پڑھنے میں خلاف اولی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۰۹) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ شوال ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۴۷)

تراویح میں دو تین آیات چھوٹ جائیں تو کس طرح اعادہ کریں؟

سوال [۳۱۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید تراویح کی نماز پڑھا رہا تھا، اتفاقاً کسی رکعت میں دو تین آیتیں چھوٹ گئیں، تو اب سوال یہ ہے کہ ان آیتوں کے اعادہ کا طریقہ کیا ہے؟ جب کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو آیتیں چھوٹ گئی ہیں، ان کو اگلی رکعت میں پڑھ کر اسی پر رکوع کرلے، آگے نئی قراءت نہ ملائے، پھر اس کے بعد کی رکعتوں میں آگے سے قراءت کرے، اس کے برخلاف زید یہ کہتا ہے کہ ان چھوٹی ہوئی آیتوں کے ساتھ نئی قراءت بھی ملا سکتا ہے، ان ہی پر رکوع کرنا ضروری نہیں، اب بتایئے کہ ان میں صحیح قول کس کا ہے؟ اگر دونوں غلط ہیں تو چھوٹی ہوئی آیتوں کے دہرانے کا طریقہ کیا ہے؟

المستفتی: قیام الدین، اشرف العلوم بڈا بازار، بستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں قراءت کے دوران دو تین آیتیں چھوٹ جائیں اور بعد میں یاد آئیں تو دوسری رکعت میں ان آیتوں کے ساتھ نئی قراءت ملا کر پڑھ سکتے ہیں۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۹۴)

وإذا غلط في القراءة في التراويح، فترك سورة أو آية، وقرأ ما بعدها، فالمستحب له أن يقرأ المتروكة، ثم المقروءة ليكون على

الترتيب. (هندية، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ١/ ١١٨، جديد ١/ ١٧٧، تاتارخانية، الصلاة، الفصل الثالث في التراويح، زكريا ٢/ ٣٢٦، رقم: ٢٥٦٠، كوئٹه ١/ ٦٦٠، خانيه مع الهندية، فصل في مقدار قراءة في التراويح، زكريا ١/ ٢٣٨، جديد ١/ ١٤٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦٦٦٨)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۰ھ

ترویحہ کی مقدار

سوال [۳۱۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ترویحہ میں صرف ایک یا دو بار ’’سبحان اللہ‘‘ پڑھنے کے بقدر ہی بیٹھتے ہیں، ترویحہ میں کتنی دیر بیٹھنا چاہئے؟ برائے کرم ہر دونوں سوالات پر جواب سے مطلع فرما کر مشکور فرمائیے۔

المستفتی: عبدالرشید شیر کوئی، حال ساکن مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ترویحہ میں اتنی دیر بیٹھنا مستحب ہے جتنی دیر چار رکعت میں گذر جائے، اور بالکل مختصر بیٹھنا خلاف مستحب ہے۔

يجلس ندبا بين كل أربعة بقدرها، وكذا بين الخامسة والوتر.

(شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٦، زكريا ٢/ ٤٩٦)

وكلما يصلي ترويحتين، ينتظر بين الترويحتين قدر ترويحة ...... فالانتظار بين كل ترويحتين مستحب بمقدار ترويحة واحدة عند أبي حنيفة، وعليه عمل أهل الحرمين. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل

الثالث عشر التراويح، زكريا ٢/ ٣١٨، رقم: ٢٥٣٤، المحيط البرهاني، الصلاة، الفصل الثالث عشر التراويح والوتر، المجلس العلمي جديد ٢/ ٢٥٠، رقم: ١٦٧٨)

ويستحب الجلوس بين الترويحتين قدر ترويحة. (هندية الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل فى التراويح، زكريا قديم ١/ ١١٥، جديد ١/ ١٧٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ رمضان ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۸۳۰)

ترویحہ کتنی دیر کا ہونا چاہئے؟

سوال [۳۱۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز تراویح میں ترویحہ کتنی دیر کا ہونا چاہئے؟

المستفتی: مفتی رضوان صاحب استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح کے ہر ترویحہ یعنی چار رکعت پڑھ کر چار رکعت کے بقدر جلسہ واستراحت مستحب ہے۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۷/ ۲۸۳، میرٹھ ۱۱/ ۳۴۶)

ويستحب الجلوس بين الترويحتين قدر ترويحة، وكذا بين الخامسة والوتر. (هندية، فصل في التراويح، زكريا قديم ١/ ١١٥، جديد ١/ ١٧٥)

يجلس ندبا بين كل أربعة بقدرها، وكذا بين الخامسة والوتر.

(شامي، مبحث صلاة التراويح، زكريا ٢/ ٤٩٦، كراچی ٢/ ٤٦)

فيجلس بين كل ترويحتين مقدار ترويحة أي بين كل أربع ركعات، وهو مخير فيه إن شاء جلس ساكتا، وإن شاء هلل، سبح،

وهـذا الانتظار مستحب لعادة أهل الحرمين. (حلبي كبير، الصلاة، فصل في التـراويـح، اشـرفيه /٤٠٤، تاتارخانية، الصلاة، الفصل الثالث عشر التراويح ۲/ ۳۱۸، رقم: ۲۰۳٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۵/۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۵۲۳/۴۰)

ترویحہ میں ''سبحان ذی العزۃ'' پڑھنا

سوال [۳۱۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں مسجد میں رمضان شریف میں تراویح کی ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں: ''**سبحان ذی العزۃ الخ**'' تو اس کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟۔

المستفتی: محمد خرم میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نماز تراویح کی چار رکعت کے بعد ترویحہ میں ہر قسم کی دعا واستغفار ودرود شریف پڑھنے کا اختیار ہے، کوئی خاص دعا پڑھنا ضروری نہیں۔ (فتاوی محمودیہ، قدیم ۲/ ۳۵۹، جدید ڈابھیل ۷/ ۳۴۳)

يجلس ندبا بين كل أربعة، وكذا بين الخامسة والوتر، ويخيرون بين تسبيـح وقـراء ة، وسكوت، وصلاة فرادىٰ. (شـامي، كتـاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، كراچی ۲/ ٤٦، زكريا ۲/ ٤٩٦)

ويستحب الجلوس بعد صلاة كل أربع ركعات بقدرها، وكذا يستحب الجلوس بقدرها بين الترويحة الخامسة والوتر؛ لأنه المتوارث عن السلف ...... وهم مخيرون في الجلوس بين التسبيح والقراء ة والصلاة

فرادیٰ. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلاة، فصل في صلاة التراويح، دارالكتاب ديوبند ٤١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۵/۵/۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۵/۲۵ھ

تراویح میں دو رکعت پر "سبحان اللہ" پڑھنا اور چار رکعت پر خلفائے راشدین کا نام لینا

سوال [۳۱۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح کی ہر دو رکعت کے بعد "سبحان فافعل من اللہ ونعمہ" پڑھنا اور ہر چار رکعات کے بعد خلفائے راشدین کا نام لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ایاز احمد، تمل ناڈو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہر دو رکعت کے بعد دعائے مذکورہ خاکسار کی نظر سے نہیں گذری اور ہر چار رکعت پر خلفائے راشدین کا نام لینا بے اصل ہے؛ بلکہ ہر چار رکعت کے بعد یہ دعا پڑھنا ثابت ہے: (مستفاد: فتاوی محمودیہ، ڈابھیل ۷/۳۶۱)

سبحان ذي الملک والملكوت، سبحان ذي العزة، والعظمة والقدرة، والكبرياء، والجبروت، سبحان الملک الحي الذي لا يموت، سبوح قدوس رب الملائكة والروح، لا إله إلا الله نستغفر الله نسألک الجنة، ونعوذبک من النار. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل مبحث صلاة التراويح، كراچی ۲/ ٤٦، زكريا ۲/ ٤٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رشوال ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۲۹۳)

تراویح میں ہر دو رکعت کے بعد ”فضل من اللہ“ پڑھنا

سوال [۳۱۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں مروجہ تسبیح یعنی ہر دو رکعت کے بعد ”**فضل من الله و نعمه**“ اور ہر چار رکعت کے بعد خلفائے اربعہ کے فضائل پر مشتمل تسبیح یا ”سبحان الملک القدوس“ کو زور زور سے پڑھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے، جب کہ بعض لوگ پڑھنے پر مصر ہیں اور بعض لوگ اس کے مخالف ہیں؟ ازروئے شرع جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: جوہر الاسلام دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ دعاؤں میں سے ہر دعا پڑھنے کی اجازت ہے، مگر زور سے پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ اور انفرادی دعائیں آہستہ پڑھنا بہتر ہے۔

قال الله تعالیٰ: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً. [سورة الأعراف، آيت: ٥٥]

وينبغي له أن يجتنب ما أحدثوه بعد كل تسليمتين من صلاة التراويح من رفع أصواتهم بذلك، والمشي على صوت واحد، فإن ذلك كله من البدع والحدث في الدين. (مدخل ٢/ ٢٩٣)

ويجلس ندبا بين كل أربعة بقدرها، وكذا بين الخامسة والوتر، ويخيرون بين تسبيح وقراءة، وسكوت. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٦، زكريا ٢/ ٤٩٦)

خير الذكر الخفي. (شامي، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، مطلب في رفع الصوت بالذكر، كراچی ١/ ٦٦٠، زكريا ٢/ ٤٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۳۰ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۳۸)	۱۴۲۳/۴/۶ھ

تراویح کے ہر ترویحہ میں جہراً تسبیح پڑھنا

سوال [۳۱۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض جگہوں پر نماز تراویح میں یعنی دو رکعت کے بعد تسبیح پکار پکار کر پڑھتے ہیں اور ہر چار رکعت کے بعد بآواز بلند تسبیح پڑھ کر بآواز بلند دعا ہوتی ہے، تو اس طریقہ سے تسبیحات کا پڑھنا از روئے شرع کیسا ہے؟ تفصیل کے ساتھ جواب سے نوازیں؟

المستفتی: محمد اقرار، ساکن ملک منڈی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: تراویح میں ہر دو رکعت کے بعد کوئی تسبیح ثابت نہیں اور نہ ہی زور سے پکار کر پڑھنا ثابت ہے، ہاں البتہ ہر چار رکعت کے بعد بیٹھنا اور تسبیح ثابت ہے، مگر زور سے پکار کر پڑھنا ہر چار رکعت کے بعد بھی ثابت نہیں ہے۔

قال اللّٰه تعالىٰ: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً. [سورة الأعراف، آيت: ٥٥]

خير الذكر الخفي. (شامي، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، مطلب في رفع الصوت بالذكر، كراچی ١/ ٦٦٠، زكريا ٢/ ٤٣٤)

ويستحب الجلوس بعد أربع بقدرها، وكذا بين الترويحة الخامسة والوتر. الخ (نور الإيضاح، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، إمداديه ديوبند ١٠٠)

ويجلس ندبا بين كل أربعة، وكذا بين الخامسة والوتر، ويخيرون بين تسبيح وقراءة، وسكوت. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٦، زكريا ٢/ ٤٩٦) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذیقعدہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۱۱/۲۴ھ

تنہا عشاء پڑھنے والے شخص کا تراویح اور وتر باجماعت پڑھنا

سوال [۳۱۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی شخص کی رمضان میں عشاء کی نماز فرض فوت ہوجائے تو کیا وہ تراویح اور وتر امام کے ساتھ باجماعت ادا کرسکتا ہے؟ اور کوئی شخص صرف تراویح یا تراویح اور فرض دونوں جماعت کے ساتھ نہ پڑھ سکا تو وہ وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یامین اصغر رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر رمضان میں کسی شخص نے عشاء کی نماز جماعت سے چھوٹ جانے کی وجہ سے تنہا پڑھی تو صحیح یہ ہے کہ وہ وتر اور تراویح امام کے ساتھ باجماعت ادا کرے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۳۵۲، رحیمیہ ۱/ ۳۵۵، ۴/۳۸۶)

ولو تركوا الجماعة في الفرض لم يصلوا التراويح جماعة؛ لأنها تبع فمصليه وحده يصليها معه قضية التعليل في المسألة السابقة بقولهم: لأنها تبع، أن يصلي الوتر بجماعة في هذه الصورة؛ لأنه ليس بتبع للتراويح ولا للعشاء عند الإمام. (طحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كوئٹه ۱/ ۲۹۷، صغيري، مكتبه مجتبائي، دهلي قديم/ ۲۱۰)

اسی طرح صرف تراویح یا فرض اور تراویح دونوں جماعت کے ساتھ نہ پڑھ سکا ہو، تب بھی وتر جماعت کے ساتھ پڑھے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی/۲۳۹)

قال أبو يوسف الباني: إذا صلى مع الإمام شيئا من التراويح يصلي معه الوتر، وكذا إذا لم يدرك معه شيئا منها، وهو الصحيح ذكره

أبو الليث. (كبيري، الصلاة، فصل في التراويح، فروع، مكتبه رحيميه ديوبند قديم: ۳۹۱، جديد، مكتبه اشرفيه ديوبند: ٤١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۷۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۷/۴ھ

وتر باجماعت پڑھنے کے بعد تراویح کی نماز پڑھنا

سوال [۳۱۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص تراویح کی نماز باجماعت نہیں پڑھ سکا اور ایسے وقت میں حاضر ہوا کہ وتر کی نماز ہو رہی تھی، اس نے عشاء کی نماز تو پڑھ لی تھی؛ لیکن تراویح جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی، اب اس نے وتر جماعت کے ساتھ پڑھ لی، تو کیا حکم ہے؟ تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: مفتی فرقان مہاراشٹری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب اس شخص نے عشاء کی نماز پڑھ لی، اب اس کے لئے وتر کی جماعت میں شریک ہونا جائز ہے، اگرچہ تراویح نہ پڑھ سکا ہو۔ اور وتر باجماعت پڑھ لینے کے بعد اپنی تراویح کی نماز پڑھ لے۔ (مستفاد: کفایت المفتی جدید ۳/۳۹۳، قدیم ۳/۳۴۹، زکریا مطول ۴/۶۱۱، ایضاح المسائل/۳۰ محمودیہ ڈابھیل ۷/۲۷۰، میرٹھ ۱۱/ ۳۶۹)

ووقتها بعد صلاة العشاء إلى الفجر قبل الوتر وبعده في الأصح، فلو فاته بعضها وقام الإمام إلى الوتر أوتر معه، ثم صلى ما فاته. (درمختار على الشامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ۲/ ٤٣، زكريا ۲/ ٤٩٤، بدائع الصنائع، الصلاة، فصل في مقدار التراويح، زكريا ۱/ ٦٤٤، كراچی ۱/ ۲۸۸)

وأكثر المشايخ على أن وقتها ما بين العشاء إلى طلوع الفجر، حتى

لو صلاها قبل العشاء لايجوز، ولو صلاها بعد الوتر يجوز؛ لأنها نوافل سنة بعد العشاء، فأشبهت التطوع المسنون بعد العشاء فی غير شهر رمضان، قال أبو علي النسفي: هذا القول أصح، قال القاضی الإمام: هنا أراد مشايخ بلدتنا. (المحيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر التراويح والوتر، المجلس العلمي، جديد ٢/ ٢٥٢، رقم: ١٦٨٢، رشيديه، كوئٹه قديم ٢/ ٨، الفتاوى التارخانية، الصلاة، الفصل الثالث عشر التراويح، زكريا ٢/ ٣٢٢، رقم: ٢٥٤٥)

ووقتها ما بعد صلاة العشاء، أي الوقت الذي هو بعد صلاة العشاء على الصحيح إلى طلوع الفجر، ويصح تقديم الوتر على التراويح، وتأخيره عنها، وهو أفضل. (حاشية الطحطاوي على المراقي، فصل في صلاة التراويح، دارالكتاب ديوبند جديد، ص: ٤١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۵/۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۵۱۲/۴۰)

عشاء کی نماز فاسد ہونے کی صورت میں تراویح اور وتر کے اعادہ کا حکم

سوال [۳۱۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عشاء کی نماز کے بعد امام نے تراویح اور وتر پڑھائی، اس کے بعد پتہ چلا کہ امام صاحب کے کپڑے ناپاک تھے، جس سے امام کی نماز نہ ہوئی، اب سب کی نماز کا اعادہ ضروری ہے؛ لیکن ایسا ہوا کہ امام نے عشاء کی نماز کے بعد اپنے کپڑے بدل لئے اور تراویح اور وتر پاک کپڑے میں پڑھائی، اب صرف عشاء کی نماز لوٹائیں گے یا تراویح اور وتر بھی لوٹائیں گے، جو بھی حکم ہو مدلل جواب مرحمت فرمائیں؟

المستفتی: محمد محبوب اناوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب صرف عشاء کی نماز کا فساد معلوم ہوا، تو اب عشاء کی نماز مع تراویح کے لوٹا نا ضروری ہے اور وتر کا لوٹا نا ضروری نہیں؛ کیوں کہ تراویح عشاء کے تابع ہے اور وتر عشاء کے تابع نہیں، عشاء اور وتر دونوں میں ترتیب ضروری ہے، وہ ترتیب عذر کی وجہ سے ساقط ہوگئی۔ (مستفاد: آپ کے مسائل اوران کاحل ۳/۵۹۴)

لو صلى الوتر قبل العشاء ناسيا، أو صلاهما، فظهر فساد العشاء دون الوتر، فإنه يصح الوتر ويعيد العشاء وحدها عند أبي حنيفة؛ لأن الترتيب يسقط بمثل هذا العذر. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الأول في المواقيت، زكريا قديم ١/ ٥١، جديد ١/ ١٠٨)

إمام صلى العشاء على غير وضوء، وهو لا يعلم، ثم صلى بهم إمام آخر التراويح، ثم علموا فعليهم أن يعيدوا العشاء والتراويح. (التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر فى التراويح، زكريا ٢/ ٣٢٢، رقم: ٢٥٤٦)

لو تبين فساد العشاء دون التراويح والوتر أعادوا العشاء، ثم التراويح دون الوتر عند أبي حنيفة بوقوعها نافلة مطلقة بوقوعها في غير محلها، هو الصحيح. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، الصلاة فصل في صلاة التراويح، دارالكتاب ديوبند، ص: ٤١٣، هندية، كتاب الصلاة، الباب التاسع فى النوافل، فصل التراويح، زكريا ١/ ١١٥، جديد ١/ ١٧٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۵/۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۵۱۲/۴۰)

حافظ کی موجودگی میں غیر حافظ کا ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھانا

سوال [۳۱۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) جو ابھی حفظ کرتا ہو وہ لڑکا ''الم ترکیف'' کی تراویح پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) خالد مکمل حافظ ہے اور زید مکمل حافظ نہیں اور خالد نے زید کو نماز پڑھانے کی اجازت دے دی، تو زید نے ''الم تر کیف'' سے تراویح پڑھا دی۔ اور زید نے پہلے سے ''الم تر کیف'' کی تراویح پڑھائی ہے، تو کیا زید کو خالد سے اجازت لینی پڑے گی یا نہیں؟ اور دوسرے آدمی نے زید سے کہا کہ تمہیں اس کا مسئلہ معلوم نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے: زید تراویح نہیں پڑھا سکتا ہے، تو اس سلسلے میں کیا مسئلہ ہے؟

المستفتی: محلّہ کچا باغ مسجد حافظ یعقوب والی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زید صحیح پڑھتا ہے، تو ''الم تر کیف'' سے اس کا تراویح پڑھانا بلا کراہت جائز اور درست ہے، اگرچہ کامل حافظ موجود کیوں نہ ہو۔

لا ینبغي للقوم أن یقدموا في التراویح الخوشخوان، ولکن یقدموا الدرستخوان. (هندیة، کتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراویح، زکریا قدیم ۱/ ۱۱٦، جدید ۱/ ۱۷٦، کذا في الحلبي الکبیر، کتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر في التراویح في بیان القراءة في التراویح، سهیل اکیڈمی/ ٤٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ رمضان ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳٦۴۰)

نماز تراویح میں مکمل قرآن نہ سنا کر اس کو عشاء فجر اور تہجد میں تقسیم کرنا

سوال [۳۱۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض جگہ پر بعض امام حضرات نماز وتراویح میں مکمل قرآن کریم سنانے کے بجائے اس کو عشاء، فجر اور تہجد میں اقساط پر ختم کرتے ہیں، کیا اس طرح کرنے سے تراویح میں ختم قرآن کی سنت ادا ہو جائے گی؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد عبد السبحان، کیلی فورنیا، امریکہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نمازتراویح میں دوسنتیں الگ الگ ہیں: (۱) نماز تراویح کا باجماعت پڑھنا (۲) نماز تراویح میں مکمل قرآن کریم کا ختم۔ لہٰذا جو حضرات اقساط کرتے ہیں یعنی عشاء، تہجد، فجر اور نماز تراویح میں قرآن کریم کو تقسیم کردیتے ہیں، تو ایسا کرنے سے مکمل قرآن کریم تراویح میں ختم کرنے کی سنت ادا نہیں ہوگی۔

والختم سنة في التراويح. (المبسوط للسرخسي، كتاب التراويح، الفصل السادس في حق قدر القراء ة، مكتبه دارالكتب العلمية ٢/ ١٤٦)

وأكثر المشايخ على أن السنة فيها الختم مرة، فلا يترك لكسل القوم. (هداية، باب النوافل، فصل في قيام شهر رمضان، مكتبة البشرىٰ ١/ ٣١٢، أشرفى ١/ ١٥١)

وقيل: يقرأ في كل ركعة من عشرين إلى ثلاثين؛ لأنه روي أن عمر -رضي الله عنه- دعا بثلاثة من الأئمة فاستقرأهم وأمر أولهم أن يقرأ في كل ركعة بثلاثين -إلى- إذ السنة أن يختم القرآن مرة في التراويح. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في سنن التراويح، زكريا ١/ ٦٤٦، كراچی ١/ ٢٨٩)

والختم مرة سنة، ومرتين فضيلة، وثلاثا أفضل، ولا يترك الختم لكسل القوم. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، كراچی ٢/ ٤٦، زكريا ٢/ ٤٩٧)

والحاصل أن السنة فى التراويح إنما هي الختم مرة الخ. (التاتارخانية ٢/ ٣٢٤، رقم: ٢٥٥٢)

عن الحسن قال: من أم الناس في رمضان فليأخذ بهم اليسر، فإن كان بطيء القراء ة فليختم القرآن ختمة، وإن كان قراء ة بين ذلك فختمة ونصف، وإن كان سريع القراء ة فمرتين. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة،

باب كم يصلي في رمضان من ركعة؟ موسسة علوم القرآن جديد ٥/ ٢٢٢، رقم: ٧٧٦١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۳/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۳۰۳/۴۰)	۱۴۳۴/۱۱/۱۳ھ

کیا پہلے عشرہ میں قرآن سن کر بقیہ ایام کی تراویح ساقط ہو جاتی ہیں؟

سوال [۳۱۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کہتا ہے کہ اگر کسی نے تین دن یا پانچ دن یا دس دن وغیرہ میں مکمل قرآن سن لیا تو اب مابقیہ دنوں میں اس کو تراویح پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور دلیل میں شامی کی یہ عبارت پیش کرتا ہے:

لا يكره له ترك التراويح فيما بقي؛ لأنها شرعت لأجل ختم القرآن مرة. (شامي، زكريا ٢/ ٤٩٧، طحطاوي على المراقي /٤١٤، حلبي كبير/٤٠٧)

تو کیا اس سلسلہ میں کوئی گنجائش ہے؟ اگر نہیں ہے تو شامی کی مذکورہ عبارت کا کیا مطلب ہے؟ جب کہ ان ایام میں تراویح پڑھنے کے قول کو بھی ”قیل“ سے بیان کیا گیا ہے؟

المستفتی: محمد اکرم ٹانڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فقہاء کی عبارت جو سوال نامہ میں نقل کی گئی ہے وہ اپنی جگہ ایسے ہی ہے جیسا کہ سوال نامہ میں نقل کی گئی ہے؛ لیکن یہ قول، قول مرجوح ہے اور قول راجح اور قول مفتی بہ یہی ہے کہ مابقیہ دنوں میں تراویح کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور نفس تراویح بھی مسنون ہے۔ اور تراویح کا سلسلہ منقطع کردینا مکروہ ہے۔ اور جس شخص نے فقہاء کا مذکورہ جزئیہ نقل کرکے استدلال کیا ہے وہ شاید فقہ کی تمام جزئیات پر واقف نہیں؛ اس لئے

ہر شخص کے لئے فتوی لکھنا بھی درست نہیں، نیز قول راجح یہ بھی ہے کہ اگر پہلے عشرہ میں یا نصف رمضان تک پہلا قرآن کریم ختم کرلیا ہے، تو رمضان کے دوسرے عشرہ میں دوسرا قرآن کریم پڑھا جائے، فقہاء کے جزئیات ملاحظہ ہوں:

لو حصل الختم في ليلة التاسع عشر، أو الحادي والعشرين لا تترك التراويح في بقية الشهر؛ لأنها سنة في جميع الشهر، كذا في الجوهرة النيرة: الأصح أنه يكره له الترك، كذا في السراج الوهاج. (عالمگيري، كتاب الصلاة، الفصل التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ۱/ ۱۱۸، جديد ۱/ ۱۷۷، الجوهرة النيرة، كتاب الصلاة، باب فضل قيام شهر رمضان، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۱۱۹، إمداديه ملتان ۱/ ۱۱۹)

ولو عجل الختم له أن يفتتح من الأول القرآن في بقية الشهر. (فتاوى خانيه على الهندية، الصلاة، فصل في مقدار القراءة في التراويح، زكريا ۱/ ۲۳۸، زكريا جديد ۱/ ۱۴۷)

والختم مرة سنة، ومرتين فضيلة، وثلاثا أفضل. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراويح، كراچی ۲/ ۴۷، زكريا ۲/ ۴۹۷، عالمگیری، فصل في التراويح، زكريا قديم ۱/ ۱۱۷، جديد ۱/ ۱۷۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۲۸ھ

ختم کے بعد تراویح ''الم ترکیف'' سے پڑھی جائے؟

سوال [۳۱۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں قرآن پورا ہوگیا دس یوم میں، بقیہ تراویح ''الم ترکیف'' سے پڑھنا افضل ہے

یا قرآن کی دوسری سورت سورۂ ''رحمٰن'' میں بیس رکعت تراویح پڑھی جاسکتی ہے یا سورہ ''ملک،ق،مراسلات'' وغیرہ؟

المستفتی: صاحبزادہ سفیان حافظ عبدالرحمٰن تمبا کو والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ''الم ترکیف'' سورہ ''رحمٰن، ملک، ق، مرسلات'' ہر طرح، ہر ایک سے پڑھنا ئز ہے۔ اور افضل یہی ہے کہ اگر ایک ختم کرنا ہے تو پورا رمضان ایک سوا سوا پارہ پڑھ کر ۲۷ر رمضان المبارک کو ختم کیا جائے، اور اگر ایک قرآن دس روز میں ختم کیا جاتا ہے اور لوگ اس کو شاق محسوس نہیں کرتے ہیں، تو تین ختم کرنا افضل ہے۔ اور اگر پندرہ دن میں ایک ختم آسانی سے کیا جاسکتا ہے تو دو ختم کرنا افضل ہے۔

عن الحسن قال: من أم الناس في رمضان فليأخذ بهم اليسر، فإن كان بطيء القراء ة فليختم القرآن ختمة، وإن كان قراء ة بين ذلک فختمة ونصف، وإن كان سريع القراء ة فمرتين. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، باب كم يصلي في رمضان من ركعة؟ موسسة علوم القرآن جديد ٥/ ٢٢٢، رقم: ٧٧٦١)

والختم مرة سنة ومرتين فضيلة، وثلاثا أفضل. وتحته في الشامي: حتى يحصل الختم في ليلة السابع والعشرين. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، زكريا ٢/ ٤٩٧، كراچی ٢/ ٤٦)

السنة في التراويح إنما هو الختم مرة ...... والختم مرتين فضيلة، والختم ثلاث مراة أفضل، كذا في السراج الوهاج (هنديه، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ١/ ١١٧، جديد ١/ ١٧٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴ر رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۹۶۳/۲۶)

نماز تراویح میں امام کا قرآن کو ہاتھ میں لے کر پڑھنا

سوال [۳۱۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض امام تراویح اور قیام اللیل میں قرآن ہاتھ میں لے کر دیکھ کر پڑھتے ہیں، کیا نماز میں ایسا کرنا درست ہے؟

المستفتی: شفیع احمد اعظمی، بحرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح اور قیام لیل میں قرآن کریم ہاتھ میں لے کر دیکھ کر پڑھنا عمل کثیر کی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مفسد صلاۃ ہے، اور حضرت امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، امام مالکؒ، امام سعید بن المسیبؒ، امام حسن بصریؒ، امام مجاہد بن جبیرؒ، امام ربیعۃ الرائےؒ وغیرہ کے نزدیک نماز مکروہ ہوجاتی ہے۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ ۳۸/۱۱)

لا تجوز القراء ة في مصحف، ولا في غيره لمصل إماما كان أو غيره، فإن تعمد ذلك بطلت صلاته، وقد روينا هذا عن جماعة من السلف منهم سعيد بن المسيب، والحسن البصري، والشعبي، وعبدالرحمن السلمي، وهو مذهب أبي حنيفة، والشافعي. (المحلی بالآثار ۲/ ۳٦٥)

ہاں البتہ حنبلی مسلک میں جائز ہے، جیسا کہ جزیرۃ العرب میں اکثر حنبلی لوگ رہتے ہیں، ان سے یہ عمل دیکھنے میں بھی آتا ہے اور اسی طرح غیر مقلدین کے یہاں یہ عمل جائز ہے اور یہ لوگ جواز میں امام بخاریؒ کی "**إمامة العبد**" کے عنوان کے ذیل میں ترجمۃ الباب کی عبارت پیش کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام حضرت ذکوان قرآن سے دیکھ کر امامت کرتے تھے، عبارت ملاحظہ ہو:

وكانت عائشة يؤمها عبدها ذكوان من المصحف. (بخاري شريف، باب إمامة العبد تعليقا، النسخة الهندية ۱/ ۹٦)

اب امام بخاریؒ کی ترجمۃ الباب کی اس عبارت پرغور کرکے دیکھنا چاہئے، اس میں صرف اتنی بات ہے کہ ''**یؤمها عبدها ذکوان من المصحف**'' کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام ذکوان مصحف سے دیکھ کر امامت فرماتے تھے، اس میں صرف اتنی بات واضح ہے کہ مصحف سے دیکھ کر امامت فرماتے تھے، اس میں قرآن کریم ہاتھ میں لینے کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے؛ لہٰذا اس عبارت کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ ہر دو رکعات یا چار رکعات کے بعد ترویحہ کے دوران آگے کی رکعتوں میں جو پڑھنا ہے، اس کو قرآن کریم سے ایک نظر دیکھ لیتے تھے اور اسی کو ''**من المصحف**'' الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پیچھے لقمہ دینے والا کوئی حافظ نہیں تھا؛ اس لئے ترویحہ کے درمیان دیکھ لیا کرتے تھے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم کو باضابطہ ہاتھ میں لے کر دیکھ کر پڑھتے تھے، جس سے عمل کثیر لازم آتا ہے۔ اور عمل کثیر نماز کے اندر کسی کے نزدیک مشروع نہیں ہے۔

يحتمل أن يكون معنى يؤمها في رمضان في المصحف أنه لم يكن خلفه حافظ يفتح عليه في الصلاة، بل كان يراجع المصحف مرة بعد مرة فى جلسات ترويحاته، فهذا يطلق عليه الإمامة من المصحف عرفا.

(إعلاء السنن، الصلاة، باب فساد الصلاة بالقراءة من المصحف، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٦٢، كراچی ٥/ ٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ صفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۵۲۲/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۲۴ھ

تراویح میں قرآن دیکھ کر پڑھنا

سوال [۳۱۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں شافعی امام کی اکثریت ہے، کہیں امام مسجدوں میں تراویح کی نماز میں

قرآن دیکھ کر پڑھتے ہیں، پیچھے کچھ مقتدی بھی قرآن دیکھتے ہیں، اس طرح نماز جائز ہوگی یانہیں؟ جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: شفیع احمد الاعظمی بحرین، بمعرفت محمد عمر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قرآن کریم سے دیکھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں نماز فاسد ہوجاتی ہے، حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے۔

وإن قرء المصلي القرآن من المصحف، أو من المحراب تفسد صلاته عند أبی حنیفة (إلی قوله) وعند الشافعي لا یکره أیضا. (غنیة المستملی، فصل فیما یفسد الصلاة، أشرفیه دیوبند: ٤٤٧)

حضرات شوافع جس حدیث سے استدلال کرتے ہیں اس کا جواب محدثین کرام نے یوں دیا ہے کہ حضرت ذکوان رضی اللہ عنہ حافظ قرآن تھے، رمضان المبارک میں تراویح پڑھایا کرتے تھے؛ لیکن پیچھے لقمہ دینے کے لئے کوئی سامع نہیں ہوتا تھا، تو وہ قرآن کریم سامنے رکھ لیا کرتے تھے، اور ترویحات کے جلسات میں قرآن کریم سے دیکھ لیا کرتے تھے، اس کو عرف میں ''**إمامة من المصحف**'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وتقریر الجواب أن ذکوان کان حافظا لما یقرأه فلم یوجد التلقن بل إنما وجدت الاستعانة بالمصحف في الجملة (إلی قوله) بل کان یراجع المصحف مرة بعد مرة في جلسات ترویحاته، فهذا یطلق علیه الإمامة من المصحف عرفا. (إعلاء السنن، الصلاة، باب فساد الصلاة، بالقراءة من المصحف، کراچی ٥/ ٥١، دارالکتب العلمیة بیروت ٥/ ٦٢)

لہٰذا اس صورت میں شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز نہیں ہوگی، حنفی کو علیحدہ پڑھ لینا چاہئے۔ اور شوافع سے معارضہ بھی نہ کیا جائے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۴۰۲)

قرآن کریم دیکھ کر امامت کرنا

سوال [۳۱۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اس وقت ایک ضروری امر کے لئے جناب کو تکلیف دے رہا ہوں کہ یہاں کنیڈا اور امریکہ میں حفاظ اور علماء کی بہت کمی ہے، کئی مساجد میں قرآن پاک دیکھ کر تراویح پڑھائی جاتی ہے، میرے دو بیٹے الحمدللہ عالم اور حافظ ہیں، ان میں سے ایک عزیزم ابراہیم سلمہ نے ایک مسجد میں تراویح پڑھائی، یہاں کئی سال سے قرآن پاک میں دیکھ کر تراویح پڑھائی جاتی تھی، امسال بھی ایک صاحب قرآن پاک میں دیکھ کر پیچھے جماعت میں تراویح پڑھتے تھے اور لقمہ بھی دیتے تھے، جب ان کو منع کیا گیا تو انہوں نے دلیل کے طور پر عبارتیں پیش کیں:

(۱) فأما ذكوان مولى عائشة كان يؤمها في رمضان من المصحف. رواه مالک، وهذا مذهب الشافعية، قال النووي: ولو قلب أوراقه أحيانا في صلاته لم تبطل، ولو نظر في مكتوب غير القرآن دى ددما فيه في نفسه لم تبطل صلاته، وإن طال لكن يكره نص عليه الشافعي في الاملاء. (من كتاب فقه السنة للسيد السابق)

(۲) يجوز للمصلي أن يقرأ من المصحف نظرا، وهو في الصلاة لم تبلغ نكرات حركات مستواليات في الركعة الواحدة عند الشافعية، وعند المالكية لا تبطل الصلاة بالحركات ما دامت الحركات لا تشعر بخروج المصلي من صلاته. (من كتاب الفتوى للمكوب عبدالرحيم محمود سيكم الأزهر)

یہاں کے لوگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں؛ اس لئے یہ جواب تو ان کے لئے کافی نہیں ہے کہ یہ فلاں امام کا مسلک ہے؛ بلکہ ان کو احادیث سے یا شروح احادیث سے جواب دینا ضروری ہے؛ لہٰذا براہ کرم مفصل ہمارے دلائل مع حوالجات ونقول عبارات ارسال فرمائیں تو کرم ہوگا، چونکہ یہاں کتابیں دستیاب نہیں ہوتی؛ اس لئے محض حوالہ تحریر فرمانا کافی نہ ہوگا،

جناب کوتکلیف دے رہا ہوں؛ لیکن اس سے بہت فائدہ کی توقع ہے اور لوگوں کی نماز خراب ہونے سے بچائیں گے، اللہ آپ کو بڑی جزاء خیر عطا فرمائیں۔

المستفتی: ڈاکٹر اسماعیل موتی تورن وال کنیڈا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: حدیث میں مصحف دیکھ کر امامت کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: نهانا أمير المؤمنين عمر –رضي الله عنه– أن نؤم الناس في المصحف، ونهانا أن يؤمنا إلا المحتلم.

(رواه ابن أبي داؤد، كنز العمال، فصل فى آداب الإمام ٤/ ٢٤٦، رقم: جامع الأحاديث: ٣١٥٥٩، إعلاء السنن، الصلاة، باب فساد الصلاة بالقراءة من المصحف، بيروت ٥/ ٦١، كراچى ٥/ ٤٩)

جوعبارت آپ نے پیش کی ہے، اس سے ملتی جلتی بخاری شریف ا/ ۹۶ کے ترجمۃ الباب میں بھی آئی ہے ،حدیث کے شارحین نے اس کا مطلب یہ بتلایا ہے کہ حضرت ذکوان حافظ قرآن تھے، رمضان المبارک میں تراویح پڑھاتے تھے اوران کے پاس لقمہ دینے کے لئے کوئی حافظ سامع نہیں ہوتا تھا، تو وہ قرآن کریم کو اپنے سامنے رکھ لیتے تھے اور ترویحات کے جلسہ میں مصحف سے دیکھ لیا کرتے تھے، اورعرف میں اس کو امامت ’’**من المصحف**‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وتقرير الجواب أن ذكوان كان حافظا لما يقرأه، فلم يوجد التلقن، بل إنما وجدت الاستعانة بالمصحف في الجملة، وبها لا تفسد وأيضا يحتمل أن يكون معنى يؤمها فى رمضان فى المصحف أنه لم يكن خلفه حافظ يفتح عليه في الصلاة، بل كان يراجع المصحف مرة بعد مرة في جلسات ترويحاته، فهذا يطلق عليه الإمامة من المصحف عرفا. (إعلاء السنن، الصلاة، باب فساد الصلاة، بالقراءة من المصحف ٥/ ٥١، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٦٢)

لہٰذا قرآن کریم سے دیکھ کر پڑھنے سے نماز فاسد ہوجائے گی، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ

کی روایت سے ظاہر ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷رذیقعدہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۳۳۰)

تراویح کی نماز بریلویوں کی مسجد میں پڑھی جائے یا غیر مقلدین کی؟

سوال [۳۱۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کہتا ہے کہ میں ایسی جگہ نوکری کرتا ہوں جہاں دو مسجدیں ہیں: (۱) رضاخانیوں کی (۲) اہل حدیث کی۔ موصوف عالم دین کے ساتھ حافظ قرآن بھی ہیں، موصوف کا کہنا ہے کہ رضاخانیت کا عقیدہ زیادہ بگڑا ہوا ہے، جس کی وجہ سے غیر مقلدین کی مسجد میں آٹھ رکعت تراویح پڑھتا ہوں اور بارہ رکعت اکیلے کمرہ میں پڑھتا ہوں۔ اور موصوف کا یہ عمل مسلسل تین سال سے جاری ہے، تو کیا اس طرح کرنا درست ہے اور اگر اس طرح کرنا درست نہیں ہے، تو اس سے غیر مقلد کی ہمت افزائی تو نہیں ہورہی ہے؟ بہر صورت جواب مدلل مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: عبدالباری، ڈگھی، مہگاواں، ضلع گڈا جھارکھنڈ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح کی نماز غیر مقلدین کی مسجد میں آٹھ رکعت پڑھنے کے بجائے بریلویوں کی مسجد میں بیس رکعت پڑھنا بہتر ہے؛ اس لئے کہ تراویح کی بیس رکعت ہی مسنون ہے۔ اور بریلوی حنفی مسلک کے مقلد بھی ہیں۔ اور غیر مقلدین کسی امام کے بھی مقلد نہیں ہیں؛ لہٰذا غیر مقلدین بریلویوں سے زیادہ گمراہ ہیں۔

فیا للعجب من أین یسمون أنفسهم الموحدین المخلصین وغیرهم بالمشرکین المبتدعین، وهم أشد الناس تعصبا وغلوا في الدین. (الحطة فی

ذکر الصحاح الستة، ص: ۱۵٤، بحواله محمودیه میرٹھ ٤/ ۳۳۳)

هذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم في المذاهب الأربعة، وهم الحنفيون، والمالكيون، والشافعيون، والحنبليون رحمهم الله، ومن كان خارجا عن هذه الأربعة في هذا الزمان، فهو من أهل البدعة والنار. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار، كتاب الذبائح، كوئٹه ٤/ ١٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۲۴ھ

چھوٹی ہوئی تراویح وتر کے بعد پڑھنا

سوال [۳۱۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کی چار رکعت تراویح شروع کی رہ گئی ہیں، وتر کی جماعت کھڑی ہوگئی، یہ شخص وتر کی جماعت میں شامل ہوجائے اور بعد میں بقیہ چار رکعت ادا کرے، تو کیسا ہے؟ عمر کا کہنا ہے کہ تراویح صبح صادق سے قبل ادا کی جاسکتی ہے؛ اس لئے وتر کے بعد پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

المستفتی: افضال احمد سہس پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عمر کا کہنا درست ہے پہلے وتر باجماعت ادا کرے اس کے بعد مابقیہ تراویح پوری کرے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/ ۴۹۶، فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۵۲، ایضاح المسائل/ ۳۰)

وإذا فاتته ترويحة، أو ترويحات فلو اشتغل بها يفوته الوتر بالجماعة يشتغل بالوتر، ثم يصلى ما فات من التراويح، وبه كان يفتي الشيخ الإمام الأستاذ ظهير الدين. (فتاوى عالمگيري، كتاب الصلاة، الباب التاسع

في النوافل، فصل فی التراویح، زکریا قدیم ۱/ ۱۱۷، جدید ۱/ ۱۷۶)

فلو فاته بعضها وقام الإمام إلى الوتر أوتر معه، ثم صلى مافاته.

(الدرالمختار علی هامش رد المحتار، کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراویح، کراچی ۲/ ۴۵، زکریا ۲/ ۴۹۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۲/۱۱/۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۳۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/۷ھ

تراویح کی چھوٹی ہوئی رکعت وتر سے قبل ادا کریں یا بعد میں؟

سوال [۳۱۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید تراویح کی نماز میں ایسے وقت شامل ہوا کہ تراویح کی چار رکعتیں ہوچکی تھیں، اب تراویح ختم ہونے کے بعد امام نے فوراً صلاۃ الوتر شروع کردی، تو کیا زید پہلے اپنی چھوٹی ہوئی چار رکعتیں ادا کرے گا یا امام صاحب کے ساتھ وتر میں شریک ہوگا؟

المستفتی: محمد سعید مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب امام صاحب نے تراویح کے فوراً بعد وتر کی نماز شروع کردی تو زید کو بھی امام کے ساتھ وتر میں شریک ہوجانا چاہئے اور اپنی چھوٹی ہوئی چار رکعتیں بعد میں ادا کرلے؛ اس لئے کہ تراویح اور وتر میں ترتیب ضروری نہیں۔

وإذا فاتته ترويحة أو ترويحتان، فلو اشتغل بها يفوته الوتر بالجماعة يشتغل بالوتر، ثم يصلي مافاته من التراويح. (عالمگیري، کتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراویح، زکریا قدیم ۱/ ۱۱۷، جدید ۱/ ۱۷۶، حلبي کبیر، فصل في التراویح، أشرفي، ص: ۴۱۰، درمختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل،

مبحث في صلاۃ التراویح، کراچی ۲/ ٤٥، زکریا ۲/ ٤٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۴/۵/۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۰۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۱۵ھ

تراویح میں ایک رکعت پر سلام پھیرنا

سوال [۳۲۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حافظ صاحب نے رمضان المبارک میں تراویح پڑھائی، تو ایک رکعت پر سلام پھیر دیا، تو مقتدیوں کے کہنے پر ایک ہی رکعت ہوئی، امام صاحب نے کوئی دھیان نہیں دیا، دوسری مرتبہ واپس تراویح کی نیت باندھ کر نماز شروع کی، پھر بھی ایک ہی رکعت پر سلام پھیر دیا، جب امام صاحب نے کوئی دھیان نہیں دیا کہ ایک رکعت پر ہی سلام پھیرا گیا ہے، تو ایک ہی رکعت نماز ہوئی یا نہیں؟ یہاں تک کہ یہ بیس رکعت تراویح میں شمار کی جائیں گی یا نہیں؟ امام یہ کہتا ہے کہ یہ رکعتیں صحیح ہوئی ہیں، اس کے لئے امام صاحب وحافظ صاحب کے لئے شرع کا حکم کیا ہے؟

المستفتی: عبد الحفیظ مکرانہ ناگور، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: صرف ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیرنے کی وجہ سے وہ رکعت کسی بھی نماز میں شامل نہیں ہوئی نہ وہ نفل ہوئی اور نہ ہی تراویح؛ لہٰذا دو مرتبہ امام صاحب نے ایک ایک رکعت پر جو سلام پھیرا ہے، ان رکعتوں کا شرعاً اعتبار نہیں۔ اور اگر ختم قرآن کے ساتھ تراویح پڑھی جارہی تھی، تو ان رکعتوں میں جو قرآن پڑھا گیا ہے، وہ ختم قرآن میں شامل نہیں ہوگا؛ لہٰذا اگر قرآن کے اس حصے کو دوبارہ لوٹ کر نہیں پڑھا گیا ہے، تو قرآن مکمل نہیں ہوا۔ اور امام اور حافظ صاحب کا یہ کہنا کہ یہ رکعتیں صحیح ہوگئیں غلط ہے۔

إن صلاة ركعة فقط باطلة لا أنها صحيحة مكروهة. (شامي، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، مطلب صلاة ركعة واحدة باطلة، كراچی ۲/ ۵۲، زكريا ۲/ ۵۰۵، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، دارالكتاب ديوبند، ص: ۴۴۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ رشوال ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۵۸۲/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۱۰/۲۷ھ

دو رکعت پر قعدہ کئے بغیر چار رکعت پڑھا دیں تو بعد کی دو رکعت معتبر ہوں گی

سوال [۳۲۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: امام تراویح کی نماز میں دوسری رکعت پر نہیں بیٹھا تیسری رکعت کے سجدہ کے بعد امام کو یاد آیا کہ اس نے قعدہ نہیں کیا ہے، چنانچہ اس نے چار رکعت مکمل کرکے سجدہ سہو کرلیا، تو ایسی صورت میں یہ چار رکعت صحیح ہوں گی یا اخیر کی دو رکعتیں صحیح ہیں؟ شروع کی صحیح نہیں ہیں؟ اور ان میں جو قرآن پڑھا گیا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب امام صاحب نے ایک سلام سے چار رکعت پڑھیں اور قعدہ اولیٰ نہیں کیا اور اخیر میں سجدہ سہو کرلیا، تو صرف اخیر کی دو رکعتیں معتبر ہوں گی اور پہلی دو رکعتیں باطل ہیں، ان کا لوٹانا واجب ہے۔ اور جو قرآن ان دو رکعتوں میں پڑھا گیا اسے لوٹانا مستحب ہے۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱/۵۲۲، فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۷/۲۶۰، میرٹھ ۱۱/۳۶۳)

وإن صلى أربع ركعات بتسليمة واحدة، والحال أنه لم يقعد على ركعتين منها قدر التشهد تجزئ الأربع عن تسليمة واحدة أي عن ركعتين عند أبي حنيفة وأبي يوسف، وهو المختار ...... قال قاضي خان: وهو الصحيح.

(حلبي كبير، فصل في التراويح، أشرفيه، ص: ٤٠٨، شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، كراچی ۲/ ۳٦، زكريا ۲/ ٤٨٣، التاتارخانية، الصلاة ۲/ ۳۳۰، رقم: ۲٥٧١)

وإذا فسد شفع وقد قرأ فيه هل يعيد ما قرأ؟ اختلف المشايخ، قال بعضهم: لا يعيد؛ لأن المقصود هو القراءة، ولا فساد في القراءة، وقال بعضهم: يعيد؛ ليكون الختم في صلاة صحيحة. (التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر في التراويح، زكريا ۲/ ۳۲٦، رقم: ۲٥٦١، خانية على هامش الهندية، فصل في مقدار القراءة في التراويح، زكريا ۱/ ۲۳۸، جديد ۱/ ۱٤٧، هندية، فصل في التراويح، زكريا قديم ۱/ ۱۱۸، جديد ۱/ ۱٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۵/۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۱۷)

تراویح میں دو رکعت پر قعدہ بھول گیا

سوال [۳۲۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز تراویح سے متعلق مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں معلومات کرنی ہے، تراویح کی نماز میں دوسری رکعت کے بعد امام صاحب تیسری رکعت پوری کر لیتے ہیں، اس درمیان کسی نے ٹوکا بھی نہیں (جب کہ نیت دو رکعت کی باندھی تھی) تیسری رکعت پوری کرنے کے بعد امام صاحب کو خود ہی خیال آیا کہ میں نے غلطی سے تین رکعت پڑھ لی ہیں؛ لہٰذا اب چار ہی کر لی جائیں۔ چوتھی رکعت پر کھڑے ہونے پر پیچھے سے لقمہ دیا گیا، جس کو امام صاحب نے نظر انداز کر دیا (چوتھی رکعت پوری کرنے کے لئے) چوتھی رکعت پر سجدہ سہو بھی کیا گیا، کچھ صاحبان نے یہ چار رکعتیں دوبارہ سے پڑھوائیں، جب کہ کچھ صاحبان نے کہا کہ پہلے ہی ٹھیک ہوگئی تھیں، محترم صحیح مسئلہ سے آگاہ کریں۔

المستفتی: سید نوشاد علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دوسری رکعت پر قعدہ کرلیا ہے، تو چاروں رکعتیں صحیح ہوگئیں۔ اور اگر دوسری رکعت پر قعدہ نہیں کیا ہے، تو صرف آخر کی دو رکعتیں صحیح ہوگئیں اور شروع کی دو رکعتیں باطل ہوگئیں۔ اور ان دونوں رکعتوں میں قرآن کریم کا جو حصہ پڑھا گیا ہے اس کو کسی اور تراویح میں لوٹا لینا لازم ہے، ورنہ تراویح میں قرآن مکمل نہ ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح المسائل، ص: ۲۹، کفایت المفتی قدیم ۳/ ۳۴۹، جدید، زکریا ۳/ ۳۹۴، زکریا مطول ۴/ ۶۱۱)

وإن صلى أربع ركعات بتسليمة واحدة، والحال أنه لم يقعد على ركعتين منها قدر التشهد تجزئ الأربع عن تسليمة واحدة، أي عن ركعتين عند أبي حنيفة وأبي يوسف، وهو المختار، اختاره الفقيه أبو جعفر، وأبو بكر محمد بن الفضل، قال قاضي خان: وهو الصحيح. (حلبي كبير، فصل في التراويح، أشرفيه، ص: ٤٠٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ / رمضان ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۸۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۹/۸ھ

ایک سلام سے پڑھی گئی تراویح کی چار رکعت میں دو رکعت صحیح ہونے کی وجہ

سوال [۳۲۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں دو رکعت پر قعدہ نہ کر کے تین رکعت پڑھ لے، تو تینوں رکعتیں یا کل نماز نہیں ہوتی ہے، چار پڑھ لے تو اخیر کی دو رکعت صحیح شمار ہوتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

المستفتی: محمد صابر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں دوسری رکعت میں نہ بیٹھ کر تیسری رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا ہے، چاہے سجدہ سہو کیا ہو یا نہ کیا ہو، دونوں صورتوں میں یہ نماز باطل ہوجائے گی۔ اور اعادہ لازم ہوگا؛ کیوں کہ دو رکعت پر بیٹھنا فرض ہے اور ترک فرض سے نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ اور تینوں رکعتوں میں پڑھا ہوا قرآن بھی لوٹانا ضروری ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۱/۴۹۷)

إن صلی ثلاث رکعات بتسلیمة واحدة ولم یقعد في الثانیة ساهیا، أو عامدا تفسد صلاته، ویلزمه قضاء رکعتین، وهو الصحیح. (خانیة علی هامش الهندیة، الصلاة، فصل في السهو، زکریا قدیم ۱/ ۲٤۱، جدید ۱/ ۱٤۹)

اور اگر دوسری رکعت پر قعدہ چھوڑ کر چار رکعت مکمل کرنے کے بعد قعدہ کرکے سلام پھیرا ہے، تو اخیر کی دو رکعتیں صحیح ہوجائیں گی۔ اور شروع کی دو رکعتیں باطل ہوجائیں گی؛ لہٰذا شروع کی دو رکعتوں میں جو قرآن پڑھا گیا ہے اس کا اعادہ لازم ہوگا۔

وقلنا بفساد الشفع الأول، وأخذنا بالاستحسان في حق بقاء التحریمة، وإذا بقیت التحریمة صح شروعه في الشفع الثاني، وقد أتمها بالقعدة فجاز عن تسلیمة واحدة. (خانیة علی هامش الهندیة، الصلاة، فصل في الشك في التراویح، زکریا ۱/ ۲٤۰، جدید ۱/ ۱٤۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۴/۱۴۲۱ھ

چار رکعت نماز تراویح کی نیت باندھی پھر قعدہ اخیرہ بھول گیا اور دو رکعت مزید پوری کیں تو کتنی رکعت ہوئیں؟

سوال [۳۲۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صورت مسئلہ یہ ہے کہ امام نے چار رکعت نماز تراویح کی نیت باندھی؛ لیکن قعدہ اخیرہ

بھول گیا، مقتدی نے لقمہ دیا، مگر امام بغیر لقمہ لئے پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہوگیا اور چھ رکعت پوری کی؛ لہٰذا اس صورت میں نماز ہوئی یا فاسد ہوگئی؟

المستفتی: محمد معروف سیتاپوری متعلم جامع الہدیٰ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر قعدہ اولیٰ کر چکا تھا، تو اول دو رکعت بالاتفاق صحیح ہوں گی اور اب قعدہ اخیرہ نہ کرنے کی وجہ سے بقیہ چار رکعتوں میں سے صرف دو رکعت صحیح ہوئیں اور دو رکعت کا اعادہ لازم ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ چھ رکعتوں میں چار رکعت معتبر ہوئیں اور دو رکعت کا اعادہ لازم ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۳۳۰)

إذا صلى ترويحة بتسليمة واحدة، فهذه المسألة على وجهين، الأول: أن يقعد على رأس الركعتين، وفي هذا الوجه اختلاف المشايخ قال بعض المتقدمين: لا يجزيه إلا عن تسليمة واحدة، وقال بعض المتقدمين وعامة المتأخرين: إنه يجزيه عن تسليمتين، قال القاضى الإمام أبو على النسفي: هو الصحيح، ولو صلى ستا أو ثمانيا. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر في التراويح، زكريا ۲/ ۳۲۹، رقم: ۲۵۶۹)

لكن صححوا في التراويح أنه لو صلاها كلها بقعدة واحدة، وتسليمة أنها تجزئ عن ركعتين. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا ۲/ ۴۸۳، كراچی ۲/ ۳۶، حلبي كبير، فصل في التراويح، اشرفيه، ص: ۴۰۸)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۴۷۱)

ختم تراویح کا مسنون طریقہ

سوال [۳۲۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ختم تراویح کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ ہمارے یہاں ایک حافظ صاحب نے ختم تراویح میں ''مفلحون'' تک پڑھنے کے بعد قیام ہی میں قرآنی دعائیہ آیتیں اور دیگر مختلف دعائیں پڑھی ہیں، اور جب ان سے پوچھا گیا تو کہتے ہیں کہ حرم شریف میں اس طرح پڑھتے ہیں، نیز اور بہت سے لوگ اس طرح ختم تراویح میں پڑھتے ہیں۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ ایسا کرنا صحیح ہے یا اس میں کوئی قباحت ہے، یا افضل ہے؟ اور نیز مسنون طریقہ کیا ہے؟

المستفتی: عبداللہ طارق، ناتھ نگر، بھاگل پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ختم قرآن کریم کا مسنون اور مستحب طریقہ یہ ہے کہ 'مفلحون' پر ختم کیا جائے، اس کے بعد مختلف مقامات سے دعائیہ آیتیں پڑھنے کو فقہاء ممنوع لکھتے ہیں۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۶۵، ۴/۲۷۳)

اور امام حرم شریف کا عمل ہمارے لئے حجت نہیں ہے، وہ حنبلی مسلک کے لوگ ہیں، ان کے یہاں اس عمل کی اجازت ہے، حنفی مسلک میں نہیں۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال رجل: يا رسول الله! أي العمل أحب إلى الله؟ قال: الحال المرتحل. قال: وما الحال المرتحل؟ قال: الذي يضرب من أول القرآن إلى آخره كلما حل ارتحل. (سنن الترمذي، قبيل أبواب تفسير القرآن، النسخة الهندية ۲/ ۱۲۳، دارالسلام، رقم: ۲۹٤۸)

قراء أهل مكة إذا ختموا القرآن بالتلاوة ابتدأوا وقرأوا الفاتحة وخمس آيات من أول سورة البقرة إلى وأولئک هم المفلحون، ثم يقطعون القراءة ويسمون فاعل ذلک الحال المرتحل. (النهاية في غريب الحديث والأثر، تحت لفظ حلل، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ٤۱۳-٤۱٤)

ولو ختم القرآن في الأولى يقرأ من البقرة في الثانية؛ لقوله صلى الله عليه وسلم: خير الناس الحال المرتحل، يعني الخاتم المفتتح. (حاشية

الطحطاوي على مراقي الفلاح، الصلاة فصل في المكروهات، دارالکتاب دیوبند، ص: ۳۵۲، شامي، کتاب الصلاة، کراچی ۱/ ۵٤٦، زکریا ۲/ ۲٦۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/۱/۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۶۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۱/۱۴۱۷ھ

تراویح میں دورکعت کے قعدہ کے بعد کھڑے ہوکر مزید دورکعت پڑھنا

سوال [٦ ۳۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح کی نماز میں امام صاحب دورکعت پر بیٹھ گئے، پھر سلام پھیرے بغیر کھڑے ہوگئے اور مزید دورکعت پڑھ لی اور سجدہ سہو نہیں کیا، تو نماز درست ہوئی یا نہیں؟ تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب امام صاحب نے دورکعت پر قعدہ کرکے مزید دو رکعت پڑھ لی اور سلام پھیر دیا، تو چاروں رکعتیں صحیح ہے۔ اور سجدہ سہو بھی لازم نہ ہوگا۔
(مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۲۹، حاشیہ امداد الفتاویٰ ۱/ ۴۹۸)

وإن صلى أربع ركعات بتسليمة واحدة ...... لو قعد على رأس الركعتين جازت عن تسليمتين بالاتفاق. (حلبي كبير، فصل في التراويح، اشرفي/ ٤٠٨)

وإن قعد في الثانية قدر التشهد اختلفوا فيه، فعلى قول العامة: يجوز عن تسليمتين، وهو الصحيح. (هندية، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ۱/ ۱۱۸، جدید ۱/ ۱۷۸، خانية على هامش الهندية، باب التراويح، فصل في السهو وأحكامه، زكريا ۱/ ۲٤۰، جدید ۱/ ۱٤۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۵/۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۵۲۳)

ختم قرآن کے موقع پر ''سورۂ اخلاص'' کو تین مرتبہ پڑھنا

سوال [۳۲۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض لوگ ختم قرآن پر ''سورہ اخلاص'' تین مرتبہ پڑھتے ہیں، شرعاً کہیں اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ختم قرآن کے موقع پر ''سورۂ اخلاص'' کا تین بار پڑھنا بعض نے اس کو ''لاباً س بہ'' کہا ہے۔ اور بعض نے اس کو غیر مستحسن اور خلاف اولیٰ کہا ہے؛ لہٰذا اس کا ترک ہی اولیٰ اور افضل ہے، اور اس اہتمام کو لازم بنالینا مکروہ ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/۲۹۱، آپ کے مسائل اور ان کا حل نعیمیہ ۴/۱۹۲، محمودیہ ڈابھیل ۷/۳۱۲، میرٹھ ۱۱/۳۸۳)

قراءة ''قل هو الله احد'' ثلاث مرات عند ختم القرآن لم يستحسنها بعض المشايخ، وقال الفقيه أبو الليث هذا شيء استحسنه أهل القرآن، وأئمة الأمصار فلا بأس به. (حلبي كبير، الصلاة، القراءة خارج الصلاة، أشرفي/٤٩٦)

قراءة ''قل هو الله احد'' ثلاث مرات عقيب الختم لم يستحسنها بعض المشايخ، واستحسنها أكثر المشايخ لجبر نقصان دخل في قراءة البعض. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الرابع في الصلاة، والتسبيح .... زكريا قديم ٥/ ٣١٧، جديد ٥/ ٣٦٦)

من أصر على أمر مندوب وجعله عزما ولم يعمل بالرخصة قد أصاب منه الشيطان من الإضلال، فكيف من أصر على بدعة ومنكر. (مرقاة المفاتيح، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، إمداديه ملتان ٢/ ٣٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/صفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۴۱)

ختم قرآن کے موقع پر آخر میں دعائیہ آیتوں کا پڑھنا

سوال [۳۲۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ختم قرآن کے موقع پر ختم کے بعد مختلف آیتوں سے دعائیہ کلمات پڑھنا کیسا ہے؟ حضرات حنفیہ کے نزدیک کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قرآن ختم کرنے کے بعد آخری رکعت میں مختلف دعائیہ آیات کا پڑھنا احناف کے نزدیک مشروع نہیں ہے، فقہاء نے صرف اس موقع پر سورۂ بقرہ کے شروع کا حصہ ''مفلحون'' تک پڑھنے کو افضل کہا ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۷۳، ایضاح المسائل، ص: ۳۱)

عن زرارة بن أوفى، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم سئل أي العمل أفضل؟ قال: الحال المرتحل، قيل: وما الحال المرتحل؟ قال: صاحب القرآن يضرب من أول القرآن إلى آخره، ومن آخره إلى أوله، كلما حل ارتحل. (مسند الدارمي دارالمغني ٤/ ٢١٨٠، رقم: ٣٥١٩، سنن الترمذي، قبيل أبواب تفسير القرآن، النسخة الهندية ٢/ ١٢٣، دارالسلام، رقم: ٢٩٤٨، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ١١/ ٤٤٤، رقم: ٥٣٠٦، المعجم الكبير للطبراني دار احياء التراث العربي ١٢/ ١٦٨، رقم: ١٢٧٨٣)

وكذلك قراء أهل مكة إذا ختموا القرآن بالتلاوة ابتدأوا وقرأوا الفاتحة وخمس آيات من أول سورة البقرة إلى :وأولئك هم المفلحون، ثم يقطعون القراءة، ويسمون فاعل ذلك الحال المرتحل، أي ختم القرآن وابتدأ بأوله ولم يفصل بينهما بزمان. (النهاية في غريب الحديث والأثر،

دارالکتب العلمية بيروت، تحت لفظ حلل ۱/ ۴۱۳-۴۱۴)

إذا ختم فيقرأ من البقرة "وفي الشامي": قال في شرح المنية: من يختم القرآن فى الصلاة إذا فرغ من المعوذتين في الركعة الأولى يركع، ثم يقرأ في الثانية بالفاتحة وشيء من سورة البقرة؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم قال: خير الناس الحال المرتحل. (شامي، الصلاة، قبيل باب الإمامة، كراچی ۱/ ۵۴۶، زكريا ۲/ ۲۶۹)

الحال المرتحل، فسره بالخاتم المفتتح، وهو من يختم القرآن بتلاوته، ثم يفتتح التلاوة من أوله ...... ولذا قراء مكة إذا ختموا القرآن ابتدؤا، وقرؤا الفاتحة، وخمس آية من البقرة. (حاشية ترمذي، قبيل أبواب تفسير القرآن ۲/ ۱۲۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ صفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۴۲)

تراویح کی قضاء

سوال [۳۲۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا تراویح کی قضاء ہوتی ہے؟ کسی دن کی تراویح چھوٹ جانے پر کیسے ادا ہو؟

المستفتی: احقر اقتدار انیس صدیقی، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ایک دن کی تراویح فوت ہوجائے تو دوسرے دنوں میں اس کی قضاء لازم نہیں ہے۔

ولا تقضى إذا فاتت (أصلاً) ولا وحده فى الأصح، فإن قضاها كان نفلا مستحبا، وليس بتراويح كسنة مغرب وعشاء. (الدرالمختار، كتاب

الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراويح، زكريا ٢/ ٤٩٤-٤٩٥)

إذا فات التراويح عن وقتها هل يقضى؟ -إلى- وقال بعضهم: لا يقضي أصلا، وهو أصح. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر في التراويح، زكريا ٢/ ٣٣٥، رقم: ٢٥٨٧، المحيط البرهاني، الصلاة، الفصل الثالث عشر التراويح والوتر، المجلس العلمي، جديد ٢/ ٢٦٣، رقم: ٧١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۴۷)

ختم کے دن مسجد اور اس کے درختوں کو لائٹوں سے سجانا

سوال [۳۲۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز تراویح کے لئے روشنی کا کثرت کے ساتھ استعمال کرنا کیسا ہے؟ نیز ختم قرآن کے روز مسجد کو بجلی کے جھار فانوسوں سے آراستہ کرنا، مسجد کے دروازہ پر چھوٹی چھوٹی بجلیوں کی بیل لٹکانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عقیل، ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ختم کے دن رات میں ضروریات سے زیادہ روشنی کرنا فضول خرچی ہے؛ اس لئے جائز نہیں ہے، نیز چھوٹی چھوٹی بجلیوں کی بیل لٹکانا سراسر نمائش اور فضول خرچی ہے، اس کا عبادت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن کریم میں فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْن. [سورة بني إسرائيل، آيت: ٢٧]

لا تبذر، أى لاتسرف فى الإنفاق في غير حق، قال الشافعي: والتبذير

إنفاق المال في غير حقه، ولا تبذير في عمل الخير، وهذا قول الجمهور، وقال أشهب عن مالک: التبذير هو أخذ المال من حقه ووضعه فی غير حقه، وهو الإسراف، وهو حرام؛ لقوله تعالى: اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْن. (تفسير قرطبي ۱۰/ ۱۶۱، تحت بني إسرائيل، الآية: ۲۷، مكتبه عباس أحمد الباز) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۰۸۳)

تراویح میں ختم قرآن کے بعد امام صاحب سے پھونک مروانا

سوال [۳۲۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان المبارک میں جس روز ختم قرآن ہوتا ہے، ختم کے بعد امام صاحب تمام مقتدیوں کے پھونک مارتے ہیں، یہ عمل مقتدی حضرات تبرکاً کراتے ہیں، از روئے شرع یہ عمل کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عقیل، ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ختم کے بعد امام صاحب سے دم کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ البتہ اس کو رسم نہ بنایا جائے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ڈابھیل ۹/ ۱۰۸)

ولا بأس بالمعاذات إذا كتب فيها القرآن، أو أسماء الله تعالىٰ قالوا: وأما من القرآن أو شيء من الدعوات فلا بأس به. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، كراچی ۶/ ۳۶۳، زكريا ۹/ ۵۲۳، كذا في الهندية، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر فی التداوي والمعالجات، زكريا قديم ۵/ ۳۵۶، جديد ۵/ ۴۱۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۰۸۳)

دورانِ تراویح اور ختم کے دن شیرینی تقسیم کرنا

سوال [۳۲۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ذیل میں شریعت کی رہنمائی مطلوب ہے، ضرورت پڑنے پر ان کو طبع بھی کرایا جا سکتا ہے؛ اس لئے گزارش ہے کہ شریعت مطہرہ کی روشنی میں مفصل ومدلل جواب سے نوازیں۔
پوری بستی میں معمول ہے کہ نماز تراویح پڑھانے والے حضرات ہبہ میں دو چار مرتبہ حسب منشا مٹھائی تقسیم کرتے ہیں اور ختم قرآن کریم کے روز تو شیرینی تقسیم کرنا لازمی ہے؛ اس لئے معلوم کرنا ہے کہ:
(الف) مٹھائی تقسیم کرنا کیسا ہے؟ (ب) مسجد میں مٹھائی تقسیم کرنا کیسا ہے؟ (ج) مٹھائی وتروں سے پہلے تقسیم کرتے ہیں، شور نہیں ہوتا، ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے اور وہیں پر اس کو مٹھائی مل جاتی ہے۔

المستفتی: محمد عقیل، ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مٹھائی تقسیم کرنے کو لازم سمجھنا یا التزام کے ساتھ اس کی پابندی کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۱/ ۳۷۷)
ہاں البتہ بلا التزام اور بلا چندہ کے کوئی شخص اپنی طرف سے بخوشی تقسیم کرتا ہے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر اس کا چندہ کرنا جائز نہیں ہے۔ (فتاوی رشیدیہ، مکتبہ زیا دیوبند/ ۵۱۹)
اگر کوئی شخص اپنی جیب سے خرچ کر کے تقسیم کرتا ہے، تو ایسے وقت میں تقسیم کرنا چاہئے جس میں نماز میں کسی قسم کا خلل لازم نہ آتا ہو، نیز مسجد کی بھی بے حرمتی لازم نہ آتی ہو۔ فقط واللہ

سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۰۸۴)

تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر شیرینی تقسیم کرنا

سوال [۳۲۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:
(۱) ماہ رمضان المبارک میں اختتام قرآن شریف کے موقع پر شیرینی تقسیم کرنا کیسا ہے؟ شیرینی تقسیم کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے جاتے ہیں، مثلاً دو تین روز قبل ہی مسجد میں بعد نماز عشاء یا تراویح میں اعلان کردیا جاتا ہے کہ فلاں دن تراویح ختم ہوگی اور قرآن پورا ہوگا؛ اس لئے جس سے جتنا ہوسکے روپئے جمع کردے، تاکہ شیرینی خریدی اور تقسیم کی جاسکے۔
(۲) دو تین روز قبل ہی چندہ وصول کرنے کے لئے ذمہ دار قسم کے لوگ مصلیان کرام کے گھر جاتے ہیں اور سابقہ وجہ بتاکر روپئے جمع کرلیتے ہیں۔
(۳) محلّہ اور گاؤں میں ایک یا چند مالدار قسم کے لوگ ازخود یہ ذمہ داری لے لیتے ہیں کہ جتنی شیرینی کی ضرورت ہوگی ہم اس کا انتظام کردیں گے، چندہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان تمام صورتوں میں شیرینی تقسیم کرنا کیسا ہے، آیا مباح ہے یا نہیں؟ کیا عہد صحابہ اور تابعین سے یہ عمل ہو رہا تھا؟ جو حضرات شیرینی تقسیم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ایسا کرنا قرآن کے اختتام کی خوشی میں ہے، ان حضرات کا یہ نظریہ اور تاویل کہاں تک درست ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل ومدلل جواب عنایت فرمائیں، تاکہ پورے عوام کو سمجھ میں آجائے۔

المستفتی: خلیل الرحمٰن اعظمی، متعلم مدرسہ امدادیہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رمضان المبارک میں تراویح میں ختم قرآن شریف کے لئے عوام سے چندہ کرکے شیرینی تقسیم کرنا بدعت ہے، اس کا صحابہ وتابعین سے کوئی ثبوت نہیں ملتا؛ البتہ اگر کوئی شخص اپنی جیب خاص سے تقسیم کرتا ہے، تو اس شرط کے ساتھ گنجائش ہے کہ مسجد میں اور نہ اس کے دروازہ پر کسی قسم کا شور وشغب اور نہ آداب مسجد کے خلاف کوئی بات ہو۔

إن اتخاذ الطعام عند قراء ة القرآن لأجل الأكل يكره. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت، كراچی ۲/ ۲٤٠، زكريا ۳/ ۱٤۸) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۹؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
۱۴۲۱/۳/۹ھ	(الف فتویٰ نمبر: ۶۵۳۴/۳۵)

ختم تراویح کے دن حافظ صاحب سے دم کروانے کی شرعی حیثیت

سوال [۳۲۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان المبارک میں نماز تراویح میں جو قرآن پاک پڑھا جاتا ہے، اس کی تکمیل والے دن پانی سرمہ اور اپنے جسموں پر دم کرانے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور اس فعل کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، بعض جگہ تو سنانے والے حافظ صاحب اپنی جگہ مسجد میں بیٹھے رہتے ہیں، لوگ آتے جاتے ہیں اور پانی سرمہ وغیرہ پر دم کرواتے جاتے ہیں۔ اور بعض جگہ تو حافظ صاحب خود ہی صف اول تا آخر سبھی حضرات پر دم کرکے آتے ہیں، نیز ختم قرآن پاک کی عوام میں کتنی زبردست اہمیت ہے یہ علماء کرام سے مخفی نہیں؛ لہٰذا اس کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمائیں نوازش ہوگی؟

المستفتی: محمد عمران جامع مسجد انصاران، ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قرآن کریم تمام نوع انسانی کے لئے ذریعہ ہدایت ہے اور روحانی وجسمانی امراض کے لئے شفاء کا بھی ذریعہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِيْنَ. [بني إسرائيل: ۸۲]

اس لئے ختم قرآن کے دن سنانے والے حافظ صاحب کے ذریعہ سے پانی وغیرہ پر پھونک مروانے میں کوئی حرج نہیں، ہاں البتہ پھونک مروانے کے لئے اتنے تکلفات اختیار کرنا جو الگ سے ایک نیا طریقہ ہو جائے مناسب نہیں؛ بلکہ جہاں پر حافظ صاحب بیٹھے ہیں، وہاں پر پانی رکھ دیا جائے، حافظ صاحب ان پانیوں پر پھونک ماردیں اس میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن نمازیوں کا اپنے اوپر دم کرانے کے لئے بھیڑ لگانا یہ غیر مناسب ہے۔

قال اللّٰه عز وجل: قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاء. [سورة حم السجدة: ٤٤]

عن عبداللّٰه بن مسعود –رضي اللّٰه عنه– قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: عليكم بالشفائين، العسل والقرآن. (المستدرك، كتاب الطب، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ۸/ ۲۹۲۳، رقم: ۸۲۲۵، ۷/ ۲٦٥٥، رقم: ۷٤۳٥، مشكوة، كتاب الطب والرقى، الفصل الثالث، أشرفي، ص: ۳۹۱)

قوله: ’’الشفائين‘‘ أحدهما للأمراض الحسية، والآخر للعوارض المعنوية، أو لعموم البلايا البدنية والدينية. (حاشية مشكوة شريف، كتاب الطب والرقى، الفصل الثالث، أشرفي، ص: ۳۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۱/۲۷ھ

شبینہ

سوال [۳۲۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: موجودہ دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے شبینہ پڑھنا ازروئے شرع کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالماجد سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس زمانہ میں شبینہ کا جو رواج ہو چکا ہے، وہ مختلف خرافات کی بنا پر ناجائز اور ممنوع ہے، مثلاً ادھر قرآن پڑھا جارہا ہے اور ادھر کچھ لوگ باتیں کررہے ہیں اور کچھ لوگ کھانا، شیرینی وغیرہ میں اور کچھ لوگ انتظام میں لگے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ یوں ہی پھرتے رہتے ہیں اور قرآن کی آواز سب کے کانوں میں پہنچ رہی ہے؛ لیکن اس طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی ہے، نیز حافظ صاحب قرآن کریم کو صحیح مخارج کے ساتھ نہیں پڑھ پاتے ہیں۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ۲۶، احسن الفتاوی ۳/ ۵۴۱، امداد الفتاوی ۱/ ۳۲۲)

عن عبدالله بن عمرو قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يفقه من قرأ القرآن في أقل من ثلاث. (مسند الدارمي، دارالمغني ۲/ ۹۳۶، رقم: ۱۵۲۴، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۱۸۹، رقم: ۶۷۷۵)

عن ابن مسعود –رضي الله عنه– أنه قال: ما يدري من قرأ القرآن في أقل من ثلاث ما يقرأ. (كتاب الآثار للإمام أبي يوسف ۱/ ۴۵، رقم: ۲۴۸)

ثم القراءة على ثلاثة أوجه ...... وفي التراويح يقرأ بقراءة الأئمة بين التؤدة والسرعة. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني القراءة، زكريا ۲/ ۶۷، رقم: ۱۶۶۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۵۹۲)

ایک رات یا تین رات میں قرآن ختم کرنا کیسا ہے؟

سوال [۳۲۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک رات میں ختم قرآن کرنا کیسا ہے؟ اسی طرح تین دن میں ختم کرنا کیسا ہے؟ اس میں لازمی بات یہ ہے کہ سب لوگ کھڑے ہوکر اطمینان کے ساتھ قرآن سن نہیں سکتے؛ بلکہ بہت سے لوگ چائے وغیرہ میں لگ جاتے ہیں اور کچھ دوسرے کسی کام میں؛ اس لئے کہ اتنی لمبی قراءت کی اقتداء کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک رات میں ختم قرآن کرنا اسی طرح تین دن میں ختم قرآن کرنا مختلف خرافات ومفاسد کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے؛ اس لئے کہ لوگ قرآن سننے کے بجائے ادھر ادھر کے کام اور چائے وغیرہ میں لگ جاتے ہیں، سامعین کی توجہ اور یکسو باقی نہیں رہ سکتی ہے، جو قرآن کے ادب واحترام کے خلاف ہے، ایسی صورت میں بجائے ثواب کے سخت گناہ کا خطرہ ہے؛ اس لئے اس سے اجتناب لازم ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل، ص:۲۶، احسن الفتاوی، زکریا ۳/۵۲۱، امداد الفتاوی، زکریا ۱/۴۸۶)

عن عبدالله بن عمرو عن النبي صلى الله عليه وسلم، أنه قال: من قرأ القرآن في أقل من ثلاث، لم يفقهه. (مسند أحمد بن حنبل ٢/ ١٩٥، رقم: ٦٨٤١، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٦/ ٤٠٦، رقم: ٢٤٣٠)

والاختيار أن الأفضل أن يقرأ فيها مقدار ما لا يؤدي إلى تنفير القوم فى زماننا؛ لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراءة. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، دارالكتاب ٢/ ١٢١، زكريا ٢/ ١٢١، كوئٹه ٢/ ٦٨)

الأفضل في زماننا قدر ما لا يثقل عليهم، وتحته في الشامية، لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراءة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراويح، زكريا ٢/ ٤٩٧، شامي، كراچی ٢/ ٤٧)

والأفضل في زماننا أن يقرأ بما لا يؤدي إلى تنفير القوم عن الجماعة لكسلهم؛ لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراءة، والمتأخرون كانوا

يفتون في زماننا بثلاث آيات قصار أو آية طويلة حتى لا يمل القوم، ولا يلزم تعطيل المساجد، وهذا أحسن. (هندية، كتاب الصلاة، الباب التاسع فى النوافل، زكريا قديم ۱/ ۱۱۸، جديد ۱/ ۱۷۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/۳/۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۶۱/۴۰)

تین روزہ شبینہ پڑھنا

سوال [۳۲۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان المبارک میں مسجد میں ختم قرآن ہونے کے بعد ''الم تر'' سے نماز تراویح سنتوں میں ادا کرنے کے بعد مسجد ہذا میں شبینہ مبارکہ تین روزہ بحساب دس پارہ یومیہ سے نفلوں میں کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: احقر فریدالدین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شبینہ کا جواز چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے:

(۱) لوگوں میں اکتاہٹ نہیں ہونی چاہئے۔

(۲) بوقت نماز بعض لوگ بیٹھے رہتے ہیں اور گفتگو میں مشغول رہتے ہیں یہ نہیں ہونا چاہئے۔

(۳) تراویح میں ہونا چاہئے۔

(۴) نفلوں میں جائز نہیں؛ اس لئے کہ نفلوں کی جماعت مکروہ تحریمی ہے۔

(۵) قرآن کریم صحت الفاظ کے ساتھ پڑھنا لازم ہے، حروف نہ کٹنے چاہئیں۔ ان پانچ شرطوں میں سے اگر کوئی ایک بھی شرط پوری نہ ہوئی تو جائز نہیں، اگر پانچوں شرطیں پوری کی جا سکتی ہیں تو قرآن کریم تین دن کے اندر تراویح میں ختم کرنے کی گنجائش ہے، نفلوں میں

جائز نہیں۔اور تین دن سے کم میں ختم کرنے کی گنجائش نہیں۔

عن عبداللہ بن عمرو أن النبي صلی اللہ علیه وسلم قال: لم یفقه من قرأ القرآن في أقل من ثلاث. (سنن الترمذي، أبواب القراء ة، قبیل أبواب تفسیر القرآن، النسخة الهندیة ۲/ ۱۲۳، دارالسلام، رقم: ۲۹۴۹، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۱٦٤، رقم: ٦٥٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۸۲)

لاؤڈ اسپیکر میں شبینہ کا حکم

سوال [۳۲۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قرآن شریف کا شبینہ بذریعہ لاؤڈ اسپیکر کے چار پانچ حافظ مل کر پڑھیں تو اس کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور جہاں پر مسجد نہیں ہے، تو کیا حکم ہے؟ دن یا رات میں شبینہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شہزاد علی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: لاؤڈ اسپیکر میں چار پانچ حافظوں کے یکے بعد دیگرے شبینہ پڑھنے میں نہ تجوید وترتیل کا اہتمام باقی رہتا ہے اور نہ سامعین سماعت کا ادب بجالا سکتے ہیں؛ اس لئے یہ صورت جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/ ۳۲۲، فتاوی رحیمیہ ۴/ ۳۸۶)

نیز اگر ریا ونمود مقصود ہو یا کچھ لوگ سننے میں شریک ہوں اور کچھ کھانے پینے کا انتظام کریں اور کچھ لوگ باتیں کریں وغیرہ وغیرہ مفاسد ہوں تو یہ حرام ہے، اس کا ترک واجب ہے۔

عن عبداللہ -یعنی ابن عمرو- قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه

وسلم: لا يفقه من قرأ القرآن في أقل من ثلاث. (سنن أبي داؤد، الصلاة، باب تحزيب القرآن، النسخة الهندية، ١/ ...... دارالسلام، رقم: ١٣٩٤)

ثم القراءة على ثلاثة أوجه...... وفي التراويح: يقرأ بقراءة الأئمة بين التؤدة والسرعة. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في القراءة، زكريا ٢/ ٦٧، رقم: ١٧٦٢)

قال في القنية نقلا عن ظهير الدين التمرتاشي: لا يقرأ جهرا عند المشتغلين بالأعمال، ومن حرمة القرآن أن لا يقرأ في الأسواق، ومواضع اللغو. (حاشية چلپي على تبين الحقائق، كتاب الطهارة، باب الحيض زكريا ١/ ١٦٧، إمداديه، ملتان قديم ١/ ٥٨، هندية كتاب الكراهية، زكريا قديم ٥/ ٣١٦، جديد ٥/ ٣٦٥) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/محرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۰۸۲)

رمضان یا غیر رمضان میں نفلوں کے اندر شبینہ پڑھنا

سوال [۳۲۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان المبارک میں نفلوں میں شبینہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ غیر رمضان کسی کے مکان پر یا مسجد میں دن کے ٹائم شبینہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شہزاد علی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: رمضان میں نفلوں میں چار سے زائد مقتدیوں کے ساتھ مکروہ ہے، ایسا ہی غیر رمضان میں بھی مکروہ ہے۔ اور اگر مفاسد ہوں تو درجہ حرمت کو پہنچ

جائے گا۔(مستفاد:امداد الفتاوی ۱/۳۲۲، فتاوی دار العلوم ۴/۲۸۴، فتاوی رحیمیہ ۳۸۷)

وكان على سبيل التداعي بأن يجتمع جمع كثير فوق الثلاثة، حتى لو اقتدى به واحد أو اثنان لا يكره، وفي الثلاثة اختلاف المشايخ، وفي الأربعة يكره اتفاقا. (حلبي كبيري، الصلاة، تتمات من النوافل، مكتبه رحيميه قديم ۳۹۸، أشرفيه جديد ۴۰۸، شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچی ۲/ ۴۸، زكريا ۲/ ۵۰۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍محرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۴/۱۰۸۲)

شبینہ متعارفہ کا حکم

سوال [۳۲۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) نفلوں کی جماعت جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟

(۲) اگر شبینہ تراویح میں پڑھا جائے تو کیسا ہے؟ کیوں کہ حفاظ صاحبان تراویح پڑھ کر یا پڑھا کر آتے ہیں، تو اپنی دو چار تراویح چھوڑ کر آئیں گے اور مقتدی صاحبان بھی تراویح پڑھ لیتے ہیں، تو ان کی نیت نفلوں کی ہوگی اور شبینہ سے پہلے تراویح بھی پوری پڑھ لی جاتی ہیں، ان سب کی دلیل کیا ہے؟

المستفتی:عتیق الرحمٰن، محلہ تمباکو والان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حضرات فقہاء نے نفلوں کی جماعت کو مکروہ قرار دیا ہے؛ اس لئے نفلوں کی جماعت سے احتراز کرنا لازم ہے۔(مستفاد:احسن الفتاوی ۳/ ۴۶۸)

اور شبینہ متعارفہ مختلف خرابیوں کی بنا پر ناجائز ہے، مثلاً عام حاضرین شروع سے حافظ صاحب کے ساتھ شرکت نہیں کرتے ادھر قرآن کریم کی تلاوت ہوری ہے اور دوسری طرف گفتگو

ہورہی ہے، قرآن کریم کوتوجہ سے سننا سب پر لازم ہے؛ لیکن اکثر دوسری چیزوں میں مصروف ہوتے ہیں، بعض جگہ شیرینی، چائے وغیرہ میں مصروف ہوتے ہیں، نیز حافظ صاحب اس قدر عجلت سے قرآن پڑھتے ہیں کہ حروف کی ادائے گی کما حقہ نہیں ہو پاتی اور قرآن کریم کا پورا احترام باقی نہیں رہتا ہے؛ اس لئے متعارف شبینہ ہرگز جائز نہیں ہے اور شبینہ میں تعاون کرنے والے اور شرکت کرنے والے سب عند اللہ سخت گنہگار ثابت ہوں گے بجائے ثواب کے ان مبارک راتوں میں گناہ کمانا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۳۲۲، احسن الفتاوی ۳/ ۵۲۱، فتاوی دار العلوم ۴/ ۴۵۶)

عن عبدالله بن عمرو، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لم يفقه من قرأ القرآن في أقل من ثلاث. (سنن ابن ماجة، الصلاة، باب في كم يستحب يختم القرآن، النسخة الهندية، دارالسلام، رقم: ١٣٤٧، صحيح ابن حبان دارالفكر ٢/ ٥٢، رقم: ٧٥٥)

ثم القراءة على ثلاثة أوجه ...... وفي التراويح بقراءة الأئمة بين التؤدة والسرعة، وفي النوافل بالليل له أن يسرع بعد أن يقرأ كما يفهم، وذلک مباح. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في القراءة، زكريا ٢/ ٦٧، رقم: ١٧٦٢)

تصحيح الحروف أمر لازم لا بد منه، ولا تصير قراءة إلا بعد تصحيح الحروف. (المحيط البرهاني، الصلاة، الفصل الثاني في الفرائض، المجلس العلمي، جديد ٢/ ٣٨، رقم: ١١٧٣)

لا يقرأ جهرا عند المشتغلين بالأعمال، ومن حرمة القرآن أن لا يقرأ في الأسواق، ومواضع اللغو. (حاشية چلپى على تبيين الحقائق، كتاب الطهارة، باب الحيض، إمداديه ملتان ١/ ٥٨، زكريا ١/ ١٦٧)

وتطوع على سبيل التداعي مكروهة. (درمختار) قال الطحطاوي: والتداعي أن يجتمع أربعة فأكثر على إمام ودون ذلک لا يكره إذا صلوا

في ناحية من المسجد، كذا في القهستاني، ونقله في البحر عن الصدر الشهيد، وظاهر إطلاقه الكراهة أنها التحريمية. (حاشية الطحطاوي على الدر الصلاة، باب الإمامة، كوئٹه ۱/ ۲٤۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ ر رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۴۰۲)

مروجہ شبینہ کا حکم

سوال [۳۲۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں بریلوی حضرات آخری عشرہ میں ایک رات میں شبینہ کے نام سے نماز تراویح میں پورا قرآن مجید ختم کراتے ہیں، امسال رمضان ۱۴۰۷ھ میں جامع مسجد متعلقہ احیاء العلوم مبارک پور میں جب لوگوں نے دو راتوں میں ختم کرانے کا ارادہ کیا تو بعض حضرات نے اس کی شدید مخالفت کی اور یہ کہا کہ نہ ایک رات یعنی شبینہ میں ختم قرآن کرانا جائز ہے اور نہ دو راتوں میں؛ اس لئے اس مسجد میں یہ پروگرام نہ ہوسکا، مخالفت اس قدر شدید ہوگئی کہ لوگوں کو پروگرام ختم کرنا پڑا، دو راتوں میں ختم کرانے والے حضرات اس کے جائز ہونے میں حضرت مفتی یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عمل پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس جامع مسجد میں حضرت مفتی صاحب کی موجودگی میں دو راتوں میں ختم قرآن مجید ہوا ہے، اور حضرت مفتی صاحب اس میں شریک ہوئے، اگر یہ کام ناجائز ہوتا تو حضرت مفتی صاحب نہ اس مسجد میں اس کو کرنے دیتے نہ اس میں شریک ہوتے، مزید جواب کے لئے وہ لوگ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا ''فتاوی رشیدیہ ص: ۳۰۴'' کا حوالہ بھی پیش کرتے ہیں، جس میں شبینہ یعنی ایک رات میں قرآن ختم کرنا جائز لکھا ہے، یہاں اس وقت عدم جواز کے سلسلے میں کافی بحثیں ہورہی ہیں، اس لئے آپ سے سوال ہے کہ کیا ایک رات یا دو راتوں میں ختم قرآن مجید نماز تراویح میں کرانا ناجائز اور بدعت ہے؟ اگر ناجائز اور بدعت ہے تو ان

حفاظ کرام اور علماء کے بارے میں کیا کہا جائے، جنہوں نے اس میں شرکت فرمائی ہے، یا آج تک برابر شرکت فرما رہے ہیں؟ کیا ایسے حفاظ کرام علماء دین اور مفتیان کرام کی امامت میں نماز پڑھنی جائز ہے۔ اور اگر دو راتوں میں ختم قرآن مجید کرنا جائز ہے، تو ان لوگوں کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے اس کو ناجائز کہہ کر اس کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اس کو جامع مسجد میں کرنے نہیں دیا۔

المستفتی: مختار احمد ٹیلر ماسٹر، محلّہ پورہ رانی، قصبہ مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آج کل کے مروجہ شبینہ میں بہت خرافات ہوتی ہیں: (۱) کچھ مقتدی امام کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں، کچھ بیٹھے رہتے ہیں، کچھ باتیں کرتے رہتے ہیں، امام کے رکوع کے وقت جلدی سے نیت باندھ کر شریک ہوجاتے ہیں۔ بعض شریک بھی نہیں ہوتے، بعض مٹھائی، چائے دیگر لوازمات میں مصروف رہتے ہیں جو جماعت اور قرآن کریم کے احترام کے خلاف ہے۔ (۲) امام اس طرح تیز پڑھتے ہیں کہ یعلمون تعلمون کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا، جو ممنوع ہے۔

ویجتنب المنکرات هذرمة القراء ة، وترک تعوذ وتسمية وطمأنينة، وتسبيح، واستراحة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل نعمانيه ١/ ٤٧٥، كراچى ٢/ ٤٧، زكريا ٢/ ٤٩٩)

اور اگر نفل کی جماعت کی جائے تو نفل نماز باجماعت علی سبیل التداعی مکروہ ہے۔

ويكره إذا كان الإمام والمتقدي معا متنفلين به، وكان على سبيل التداعي، بأن يجتمع جمع كثير فوق الثلاثة، حتى لو اقتدى به واحد أو اثنان لا يكره، وفي الثلاثة اختلاف المشايخ، وفي الرابعة يكره إتفاقا. (حلبي كبيري، الصلاة، تتمات من النوافل، مكتبه رحيميه ديوبند قديم/ ٣٨٩، أشرفيه، ٤٠٨)

حضرت گنگوہی اور حضرت مفتی یاسین صاحب و دیگر حضرات کے یہاں مذکورہ خرافات کی عدم کی صورت میں جائز ہوسکتا ہے۔ اور جو حضرات ناجائز کہتے ہیں وہ مذکورہ خرافات کے ساتھ

مقید کر کے کہتے ہیں؛ لہٰذا اب تعارض نہ رہا اور نہ کسی پر اشکال۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر شوال ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۰۴/۲۳)

مروجہ شبینہ کا شرعی حکم

سوال [۳۲۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) شبینہ پڑھنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

(۲) دوسرے یہ کہ اگر شبینہ لاؤڈ اسپیکر پر پڑھا جائے تو کیسا ہے؟

(۳) تیسرے یہ کہ سامعین حضرات پہلی رکعت جب ختم ہونے والی ہو تب شامل ہوتے ہیں، کیا وہ مستحق ثواب ہیں یا نہیں؟

المستفتی: شمشاد علی، ملی گلاس اسٹور، محلہ مانپور، کھڑہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) مروجہ شبینہ مختلف وجوہ سے ناجائز اور واجب الترک ہے۔ (الف) لوگ یکسوئی کے ساتھ قرآن کریم نہیں سنتے ہیں، کوئی کھانا، مٹھائی، چائے وغیرہ کے انتظام میں لگا رہتا ہے، کوئی بیٹھ کر باتیں کرتا ہے۔

(ب) کچھ لوگ بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہتے ہیں، اور جب امام رکوع میں جانے لگے تو جلدی سے نیت باندھ کر شریک ہوتے ہیں، یہ سب باتیں احترام قرآن کے خلاف اور حرام ہیں؛ اس لئے بجائے ثواب کے عذاب الٰہی کا سخت خطرہ ہے۔

(۲) لاؤڈ اسپیکر میں ہرگز جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس کی وجہ سے جو لوگ اپنے ذاتی کاموں میں مصروف رہتے ہیں وہ لوگ قرآن کریم کی آواز سننے کے باوجود سننے کی طرف توجہ نہیں دے سکتے، نیز جو لوگ آرام کرتے ہیں، ان کے آرام میں خلل ہوتا ہے، نیز اس میں ریا کاری بھی ہے۔

(۳) یہ احترام قرآن کے خلاف اور ناجائز ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۲/۵۲۱، امداد الفتاوی ۱/۳۲۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ شعبان ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۳۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۸/۱۴۱۱ھ

عورتوں کے لئے تراویح کی نماز

سوال [۳۲۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عورتوں کے لئے تراویح کی نماز ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو نفل کی نیت سے یا پھر سنت کی نیت سے؟

المستفتی: عبد المتین، قصبہ بھنگا شراوستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کے لئے بھی تراویح کی بیس رکعات سنت مؤکدہ ہیں، اگر طاقت نہ ہو بیٹھ کر پڑھیں، اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو جتنی پڑھ سکیں پڑھیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۲۵)

التراويح سنة مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين للرجال والنساء إجماعا. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، كراچی ۲/ ۴۳، زكريا ۲/ ۴۹۳)

التراويح سنة مؤكدة للرجال والنساء جميعا بإجماع الصحابة، ومن بعدهم من الأئمة. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، دار الكتب العلمية، بيروت جديد ۱/ ۲۰۲، مصري قديم ۱/ ۱۳۵)

التراويح سنة مؤكدة ولم يتخرصه عمر من تلقاء نفسه، ولم يكن فيه مبتدعا، ولم يأمر به إلا عن أصل لديه، وعهد من رسول الله صلى الله عليه

وسلم وهي سنة عين مؤكدة على الرجال والنساء. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، فصل في صلاة التراويح، دارالكتاب ديوبند جديد ۲/ ۴۱۲، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۷/ ۱۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ ۴/ ۱۴۲۱ھ

عورتوں کا تراویح میں قرآن سنانا

سوال [۳۲۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جماعت زنان کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے، مگر حافظات عورتوں کے لئے بقائے حفظ قرآن کی خاطر تراویح میں پارہ سنانا ضروری ہے، تراویح میں پارہ نہ سنانے پر اکثر وبیشتر حفظ ضائع ہوجاتا ہے؛ اس لئے اگر بلا کسی اہتمام کے صرف گھر ہی کی عورتیں اپنا پارہ تراویح میں پڑھ لیں تو کراہت سے بچنے کی کیا شکل ہے؟

المستفتی: محمد صابر مدرس مدرسہ تعلیم القرآن، مظفر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرات فقہاء نے عورتوں کی جماعت کو جس میں عورت ہی امام ہو مکروہ تحریمی لکھا ہے؛ لیکن امام محمد علیہ الرحمہ نے ''کتاب الآثار'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے رمضان میں تراویح میں عورتوں کی امامت کرنے کی روایت کے ذریعہ سے استدلال کرکے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل فرمایا ہے کہ جب عورت دوسری عورتوں کی امام بنے تو صف کے بیچ میں کھڑی ہوجائے، مردوں کی جماعت کی طرح تنہا آگے کھڑی نہ ہو، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تراویح کی نماز میں عورت کی امامت

اگرچہ خلاف اولیٰ ہے؛ لیکن بغیر کراہت تحریمی کے تراویح کے اندر درست ہوجاتی ہے اور فقہاء نے جو عورت کی امامت کو مطلقاً مکروہ تحریمی لکھا ہے وہ فرض نمازوں کی امامت پر محمول ہوگا اور بعض فقہاء نے ''ولو فی التراویح'' کی بھی قید لگائی ہے؛ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی امامت کی روایت کے ہوتے ہوئے کراہت تحریمی کا حکم لگانا ہم کو سمجھ میں نہیں آتا؛ اس لئے فقہاء کی ان تصریحات کے مقابلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمل کی روایت کو ترجیح ہونی چاہئے؛ لہٰذا جو خاتون حافظ قرآن ہوں گھر اور خاندان کی عورتوں کی تراویح میں صف کے درمیان میں کھڑی ہوکر امامت کرے، تو اس میں شدت نہیں ہونی چاہئے۔ اور تراویح میں قرآن سنانا قرآن کریم کے یاد ہونے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

عن عائشة –رضي الله عنها– أنها كانت تؤم النساء في شهر رمضان، فتقوم وسطا، قال محمد: لا يعجبنا أن تؤم المرأة، فإن فعلت قامت فی وسط الصف مع النساء كما فعلت عائشة –رضي الله تعالىٰ عنها– وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (كتاب الآثار، باب المرأة تؤم النساء، وكيف تجلس في الصلاة؟ كراچی ۱/ ۲۰۸، رقم: ۲۱۷)

عن إبراهيم والشعبي، قالا: لا بأس أن تصلي المرأة بالنساء في شهر رمضان، تقوم في وسطهن. (مصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب المرأة تؤم النساء، المجلس العلمي ۳/ ۱۴۰، رقم: ۵۰۸۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۹۸۶)

عورت کا نماز تراویح پڑھانا

سوال [۳۲۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عورت حافظہ ہے، وہ قرآن کریم تراویح میں سنانا چاہتی ہے، اس کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ مثلاً عورت تلاوت بالجہر تراویح میں کرسکتی ہے، اگر کرسکتی ہے، تو کتنی آواز سے؟ نیز حافظہ عورت کے ساتھ تراویح میں ایک یا اس سے زائد کتنی عورتیں شرکت کرسکتی ہیں؟ اس حافظہ عورت کے لئے ان عورتوں کے ساتھ تراویح میں کھڑے ہونے کی ہیئت کیا رہے؟ شریعت کا کیا حکم ہے، امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے ائمہ کرام کے یہاں جواز کی کوئی صورت ہے ؟ اور فتویٰ ائمہ حضرات میں سے کن کے قول پر ہے؟

المستفتی: محمد اشرف مدرسہ جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ، بلاسپور مظفر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حافظہ عورت اپنا قرآن یاد رکھنے کی غرض سے اگر تراویح میں سنانا چاہے، تو اس کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ اپنے گھر میں اپنے ہی گھر کی عورتوں کو تراویح میں قرآن سنائے گرچہ یہ بھی خلاف اولیٰ ہے؛ لیکن قرآن یاد رکھنے کی غرض سے گھر کی عورتوں کو سنانے کی گنجائش ہے۔ اور گھر والوں کے علاوہ دیگر گھروں یا محلوں کی خواتین کا اجتماع نہ ہونا چاہئے؛ کیوں کہ دیگر گھروں کی عورتوں کے اجتماع سے فتنہ وغیرہ کا اندیشہ ہے، اور اس طرح کی عورتوں کی جماعت میں عورت صف کے درمیان کھڑے ہوکر اتنی آواز کے ساتھ قراءت کرے گی کہ اس کی آواز جماعت میں شریک عورتوں کے کانوں تک پہنچے اور در ودیوار کے کانوں تک نہ پہنچے۔

عن عائشة أم المؤمنين –رضي الله عنها– أنها كانت تؤم النساء في شهر رمضان، فتقوم وسطا، قال محمد: لا يعجبنا أن تؤم المرأة، فإن فعلت قامت في وسط الصف مع النساء كما فعلت عائشة –رضي الله تعالىٰ عنها– وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (كتاب الآثار، باب المرأة تؤم النساء، و كيف تجلس في الصلاة؟ كراچی ۱/ ۲۰۸، رقم: ۲۱۷)

عن إبراهيم والشعبي، قالا: لا بأس أن تصلي المرأة بالنساء في شهر رمضان، تقوم في وسطهن. (مصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب المرأة تؤم النساء، المجلس العلمي ۳/ ۱٤۰، رقم: ۵۰۸٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۸/۴ھ

عورتوں کا تراویح پڑھنے کے لئے جانا

سوال [۳۲۲٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو تین گاؤں میں سے بہت سی عورتیں ایک جگہ جمع ہوکر سنڈیل بنا کر کسی حافظ جی کو بلا کر رمضان شریف میں عشاء کی فرض نماز تراویح اور وتر جماعت کے ساتھ پڑھتی ہیں، یہ سب عورتیں اس حافظ جی کی غیر محرمات ہیں، صرف ایک نانی اور خالہ محرمات میں سے ہیں، تو یہ صورت مسئلہ جائز ہے یا نہیں؟

اور اگر ''الم تر کیف'' کے ساتھ پڑھنا ہے تو کیا حکم ہے؟ بعض آدمیوں کی رائے ہے کہ ''یصف الرجال'' والے مسئلہ سے عورتوں کو جماعت سے نماز ادا کرنا ثابت ہے، تو کون روکنے والا ہوتا ہے جب کہ یہ ثواب کا کام ہے؟ بندہ کو بالتفصیل جواب سے نوازیں عین کرم ہوگا۔

المستفتی: غلام مصطفیٰ مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب امامت کرنے والے مرد کی محرم عورت موجود ہے، تو اس کے لئے امامت کرنا جائز ہے، مگر دوسرے محلوں سے رات کو جماعت میں شرکت کے لئے عورتوں کا آنا جانا جائز نہیں ہے۔

ويكره حضورهن الجماعة ولو لجمعة، وعيد، ووعظ مطلقا، ولو عجوزا ليلا على المذهب المفتى به لفساد الزمان. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، زكريا ۲/ ۳۰۷، كراچی ۱/ ۵٦٦)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فتنہ نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کو جماعت سے نماز پڑھنے کی اجازت تھی؛ لیکن جب بعد میں فتنہ ہونے لگا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اس سلسلے کو بند کروا دیا اور تمام صحابہ نے اس پر اتفاق کرلیا، جب صحابہ کرام کے دور میں فتنہ کی وجہ سے ممانعت ہوگئی ہے، تو کیا ہمارے اس پرفتن دور میں عورتیں فتنہ سے محفوظ رہ سکتی ہیں؛ اس لئے اب مختلف محلوں اور گلیوں سے عورتوں کا آکر جماعت میں شریک ہونا جائز نہ ہوگا۔

عن عائشة –رضي الله عنها– قالت: لو أدرك رسول الله صلى الله عليه وسلم ما أحدث النساء لمنعهن المسجد كما منعت نساء بني إسرائيل، قلت لعمرة: أو منعن؟ قالت: نعم. (صحيح البخاري، الصلاة، باب خروج النساء إلى المساجد بالليل والغلس، النسخة الهندية ۱/ ۱۲۰، رقم: ۸٦۱، ف: ۸٦۹، صحيح مسلم، الصلاة، باب خروج النساء إلى المسجد إذا لم يترتب عليه فتنة، النسخة الهندية، ۱/ ۱۸۳، بيت الأفكار، رقم: ٤٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۱/۲۹ھ

بالغ لڑکے کا تراویح میں عورتوں کی امامت کرنا

سوال [۳۲۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں تراویح میں عورتوں کی جماعت ہوتی ہے، جس میں ایک بالغ لڑکا

پردہ میں رہ کر پیچھے کھڑی ہوئی عورتوں کی امامت کرتا ہے۔ اور امام کے علاوہ مردوں میں کوئی نہیں ہوتا ہے، تو آیا تراویح سے قبل جو عشاء کی نماز جماعت سے پڑھی جاتی ہے اس میں اقامت کوئی عورت کہے گی یا امام صاحب خود ہی اقامت کہیں گے؟ نیز اس طرح فقط مقتدیوں میں عورتوں ہی کا ہونا درست ہے یا نہیں؟ اور فی نفسہ عورتوں کی اذان واقامت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

المستفتی: ذکوان زیدی، شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عورتوں کے لئے اذان واقامت مشروع نہیں ہے، ان کے لئے کسی بھی حالت میں اذان واقامت کی ذمہ داری لینا جائز نہیں ہے اور عورتوں کے لئے جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے کے بجائے اپنے اپنے گھروں میں تنہا تنہا تراویح پڑھنے کا حکم ہے، ہاں البتہ اگر عورتوں کو تراویح میں قرآن سننے کا شوق ہے، تو خاندان یا گھر کا کوئی محرم مرد حافظ ہو وہ قریب کی مسجد میں عشاء کی فرض نماز پڑھنے کے بعد گھر کی عورتوں کو تراویح میں قرآن سنائے تو اس کی گنجائش ہے، اور اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ محلّہ یا شہر کی غیر محرم عورتیں ان کے گھر میں تراویح پڑھنے کے لئے نہ آئیں؛ اس لئے کہ عورتوں کو جماعت میں شرکت کی غرض سے باہر آنے جانے سے منع کیا گیا ہے اور جب فرض نماز کی جماعت کے لئے آنے جانے سے منع کیا گیا ہے، تو تراویح کی نماز کے لئے بطریق اولیٰ ممانعت ہوگی۔ اور اگر خاندان میں کوئی حافظ محرم مرد نہیں ہے اور تنہا کسی غیر محرم حافظ کو امام بنادیں اور پیچھے سب کی سب غیر محرم عورتیں ہوں، تو ایسا کرنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر گھر کے ایک دو محرم مرد بھی اس حافظ کے ساتھ نماز میں شریک ہوں اور عورتوں کے لئے پردہ کا نظم ہو تو گھر کی عورتوں کا محرم مردوں کے ساتھ میں ہوتے ہوئے قرآن سننے کی گنجائش ہے۔

عن أسماء -رضي الله عنها- قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس على النساء أذان، ولا إقامة. الحديث (السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر ٢/ ١٧٠، رقم: ١٩٦٠)

ويكره حضورهن الجماعة مطلقا على المذهب، كما تكره إمامة الرجل لهن في بيت ليس معهن رجل غيره، ولا محرم منه، كأخته أو زوجته. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچى ١/ ٥٦٦، زكريا ٢/ ٣٠٧)

أما النساء فيكره لهن الأذان، وكذا الإقامة. (شامي، كتاب الصلاة، باب الأذان، كراچى ١/ ٣٨٤، زكريا ٢/ ٤٨)

قال في الأصل: وليس على النساء أذان ولا إقامة. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في الأذان، زكريا ٢/ ١٤٤، رقم: ١٩٨٢، قديم ١/ ٥٢٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۲۵ھ

عورتوں کا تراویح کی نماز باجماعت پڑھنا

سوال [۳۲۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) عورتوں کا جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنا کیسا ہے؟ جب کہ ان کی امامت کوئی عورت ہی کرے؟

(۲) اگر کوئی مرد ان کی امامت کر رہا ہے اور جماعت میں صرف عورتیں عورتیں شامل ہیں، مرد اقتداء کرنے والے جماعت میں شامل نہیں ہیں، تو اس امامت اور جماعت کا کیا حکم ہے؟ باحوالہ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: مہرالدین میہا پور، ضلع دیوریا (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) عورتوں کا حفظ قرآن کی خاطر تراویح کی جماعت کرنا جس میں گھر کی عورتیں ہوں، خلاف اولیٰ ہے؛ لیکن جب عورت امامت کرے گی تو درمیانی صف میں کھڑی ہوگی، مردوں کی طرح تنہا آگے صف میں کھڑی نہ ہوگی۔

عن عائشة أم المؤمنين –رضي الله عنها– أنها كانت تؤم النساء في شهر رمضان، فتقوم وسطا، قال محمد: لا يعجبنا أن تؤم المرأة، فإن فعلت قامت في وسط الصف مع النساء كما فعلت عائشة –رضي الله تعالىٰ عنها– وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (كتاب الآثار، باب المرأة تؤم النساء، و كيف تجلس في الصلاة؟ كراچی ۱/ ۲۰۸، رقم: ۲۱۷)

(۲) اگر بالغ مرد صرف نامحرم عورتوں کی امامت کرتا ہے، تو مکروہ تحریمی ہے، ہاں البتہ امام کی محرم عورتیں بھی موجود ہوں، جب کہ غیر محرم تمام عورتیں پردہ میں ہوں، تو مکروہ نہیں، مگر اس فتنہ کے دور میں پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۲۸۴)

وكذلک يكره أن يؤم النساء في بيت، وليس معهن رجل، ولا محرم منه مثل زوجته، وأمته، واخته، فإن كانت واحدة منهن فلا يكره. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب الإمامة، زكريا ۱/ ۶۱۶، كوئٹه، ۱/ ۳۵۲، درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة، كراچی ۱/ ۵۶۶، زكريا ۲/ ۳۰۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۵۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۴/۱۴۲۱ھ

عورتوں کی تراویح کی جماعت کا حکم

سوال [۳۲۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

عورتوں کی جماعت تراویح رمضان المبارک میں کرنا کیسا ہے؟ جب کہ امام حافظہ عورت ہو، اور سننے والی عورتیں ہوں؟ نیز امام حافظہ عورت کہاں کھڑی ہو؟ حافظہ عورت کے ساتھ مقتدین مرد شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ مرد امام حافظ کے پیچھے عورتیں تراویح کی جماعت میں شریک ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ مسجد میں یا گھروں میں؟ قابل ذکر بات یہ ہے کہ حافظہ عورت تراویح میں قرآن سنانے کے توسط سے قرآن کریم کو باقی رکھ سکتی ہے، ورنہ بھول جانے کا قوی امکان ہے، امید ہے احادیث نبویہ اور قرآن کریم کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب سے نوازیں گے؟

المستفتی: مطیع الرحمٰن ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں تنہا عورتوں کی جماعت خلاف اولیٰ ہے اور جماعت کرنے کی صورت میں ان کی نماز درست ہوجائے گی، اور تراویح بھی صحیح ہوجائے گی؛ البتہ امامت کرنے والی عورت صف کے بیچ میں کھڑی ہو آگے بڑھ کر نہ کھڑی ہو اور عورتوں کی جماعت میں مردوں کا شریک ہونا اور عورت کی اقتداء کرنا درست نہیں۔ اور اگر مرد کسی گھر وغیرہ میں امامت کرے، تو مردوں کے ساتھ پردے میں عورتیں بھی اس مرد کی اقتداء کرسکتی ہیں، مسجد میں جاکر عورتوں کا تراویح پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

قال محمد: لا يعجبنا أن تؤم المرأة، فإن فعلت قامت في وسط الصف مع النساء كما فعلت عائشة –رضي الله تعالىٰ عنها– وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (كتاب الآثار، باب المرأة تؤم النساء، كراچی ۱/ ۲۰۸، رقم: ۲۱۷)

عن ابن عباس –رضي الله عنه قال: تؤم المرأة النساء، تقوم في وسطهن.

(مصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب المرأة تؤم النساء، المجلس العلمي ۳/ ۱۴۰، رقم: ۵۰۸۳)

عن جابر بن عبدالله قال: خطبنا رسول الله ﷺ: ...... ألا! لا تؤمن امرأة رجلا. الحديث (سنن ابن ماجة، الصلاة، باب في فرض الجمعة، النسخة الهندية، دارالسلام، رقم:

۱۰۸۱، السنن الکبری للبیهقي، الصلاة، باب لا یأثم رجل بامرأة، دارالفکر ٤/ ٢٣٨، رقم: ٥٢٣٣)

ولو أمهن رجل فلا کراهة إلا أن یکون في بیت لیس معهن فیه رجل أو محرم من الإمام، أو زوجته، فإن کان واحد ممن ذکر معهن فلا کراهة. (طحطاوي علی المراقي، الصلاة، فصل في بیان الأحق بالإمامة، دارالکتاب دیوبند جدید/ ٣٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍شعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۶۹۸/۳۸)

تراویح میں سورۂ فاتحہ کو ایک سانس میں پڑھنا

سوال [۳۲۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سورۂ فاتحہ کو ایک یا دو سانس میں پڑھنے کا معمول بنا لینا جب کہ آپ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر آیت کا جواب دیتا ہے، تراویح اگر حدر میں پڑھی جاتی ہے تو بھی کم از کم تین سانسوں میں پڑھنا سنت ہے، اس مسئلہ پر آپ کے مدرسہ کے اکثر علماء عمل کیوں نہیں کرتے اور فرماتے ہیں کہ ہو جاتی ہے، مسئلہ یہ ہے جب ایک فارغ عالم ایسا کرے تو ایک حافظ صاحب سے کیا توقع کی جا سکتی ہے، صاف طور پر ارشاد فرمائیں، تراویح میں سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید کس انداز میں پڑھنا چاہئے۔

المستفتی: ماسٹر عبد الحق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں حدر کے ساتھ جب قراءت ہو تو سورۂ فاتحہ کو ایک سانس میں پڑھنا یا دو سانس میں پڑھنا بلا کراہت جائز اور درست ہے، اسی طرح تین سانس میں پڑھنا یا ہر آیت پر وقفہ کرتے ہوئے پڑھنا یہ بھی جائز ہے؛ البتہ فرض نمازوں میں

ہر آیت پر وقفہ کرتے ہوئے پڑھنا بہتر اور افضل ہے اور تراویح میں بین بین کا راستہ اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے، اگر کوئی لمبی سانس والا پوری سورۂ فاتحہ ایک سانس میں واضح الفاظ کے ساتھ پڑھتا ہے، تو اس پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں اور تراویح میں تین سانس میں پڑھنا سنت ہے، یہ ہم کو کہیں نہیں ملا۔

عن أم سلمة -رضي الله عنها- قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقطع قراء ته يقول: الحمد لله رب العالمين، ثم يقف، ثم يقول: الرحمن الرحيم، ثم يقف. (ترمذي شريف ١/ ١٤١)

يقرأ في الفرض بالترسل حرفا حرفا، وفي التراويح بين بين، أي بأن تكون بين الترسل والاسراع، وفي النفل ليلا له أن يسرع بعد أن يقرأ كما يفهم. (شامي زكريا ٤/ ٤٦٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶؍ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۲۴۰)	۱۴۳۶/۱۱/۸ھ

دس پندرہ روز میں قرآن ختم کر کے الم ترکیف سے تراویح پڑھنا

سوال [۳۲۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چاند دیکھ کر تراویح پڑھنا شوال کی چاند رات تک ایک سنت ہے، پورا قرآن مجید تراویح میں سننا دوسری سنت ہے، مگر دس دن میں، پندرہ دن میں پورا قرآن مجید رواں دواں فرافرسن کر تراویح پڑھنا چھوڑ دینا ایک رواج بنتا چلا جارہا ہے اور تراویح جو رمضان شریف کی شان ہے، اور اللہ سے قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، سب کچھ ایک رسم سا ہوتا چلا جارہا ہے، اس بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

المستفتی: ماسٹر عبدالحق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: یہ بات درست ہے کہ شروع رمضان سے آخر رمضان تک تراویح کی نماز پڑھنا ایک مستقل سنت ہے اور نماز تراویح میں پورا قرآن سننا الگ سے دوسری سنت ہے اور دس دن میں یا پندرہ دن میں قرآن مجید ختم کرنے کے بعد پھر تراویح پڑھنا چھوڑ دینا انتہائی غلط عمل ہے؛ بلکہ تراویح کی نماز پورے رمضان پڑھنا سنت ہے، نیز جن مسجدوں میں دس یا پندرہ دن میں قرآن ختم ہو چکا ہوتا ہے ان میں اس کے بعد بھی آدھا پارہ، ایک پارہ، پاؤ پارہ پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھنا بہتر ہے۔ اور اگر لوگوں میں اکتاہٹ ہے تو ”الم ترکیف“ سے دو مرتبہ میں بیس رکعتیں پڑھنے کا سلسلہ آخر رمضان تک جاری رکھنا چاہئے اور لوگوں کی اکتاہٹ کی وجہ سے فقہاء نے اس کو افضل کہا ہے۔ اور تراویح ہی پڑھنا چھوڑ دینا انتہائی محرومی کی بات ہے۔

التراويح سنة مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين للرجال والنساء إجماعا. (شامي زكريا ٢/ ٤٩٣)

والختم مرة سنة، ومرتين فضيلة، وثلاثا أفضل. (در مختار، زكريا ٢/ ٤٩٢)

واختار بعضهم سورة الإخلاص في كل ركعة، وبعضهم سورة الفيل أي البداية منها ثم يعيدها، وهذا أحسن لئلا يشتغل قلبه بعدد الركعات. (شامي، زكريا ٢/ ٤٩)

أي آخر القرآن في عشر ركعات ثم يعيد من سورة الفيل إلى الآخر في العشر الثاني. (تقريرات رافعي، ص: ٩٤)

ذكر في المحيط: والاختيار أن الأفضل أن يقرأ فيها مقدار ما لايؤدى إلى تنفير القوم في زماننا؛ لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراء ة، والمتأخرون كانو يفتون في زماننا بثلاث آيات قصار و آيات طويلات حتى لا يمل القوم ولا يلزم تعطيلها ...... وبعضهم اختاروا قراءة سورة الفيل إلى آخر القرآن، وهذا أحسن. (البحرالرائق ٢/ ١٢١)

ولو عجل الختم له أن يفتتح القرآن في بقية الشهر. (الفتاوى التارخانية، فصل التراويح ۲/ ۳۲۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۲۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۱۱/۸ھ

جو دعا ہر چار رکعت کے بعد پڑھی جاتی ہے اس کی کیا حیثیت؟

سوال [۳۲۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح ترویحہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہر چار رکعت کے بعد آرام کرنے کے ہیں، جس میں تسبیح پڑھنا ہے، مگر دیکھا گیا ہے کہ اکثر مقتدیوں کو تو یاد ہی نہیں ہوتی اور خود حافظ صاحب بھی رواں دواں فرافر اس انداز میں پڑھتے ہوں گے کہ نہ پڑھنے کا گمان ہوتا ہے، آپ فرمائیں گے بدگمانی اچھی نہیں تو اس کا واضح طور پر اظہار کیوں نہیں ہوتا؟ اس کو پڑھنے کا ماحول کیوں نہیں بنایا جاتا؟ کیا اتنی ہی جلدی کرنے کا حکم ہے کہ کوئی مقتدی پانی بھی پینے لگے تو دو تین سعادتوں سے محروم ہو جائے۔

المستفتی: ماسٹر عبدالحق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ہر چار رکعت کے بعد ترویحہ مستحب ہے اور ترویحہ میں تسبیح، ذکر، دعا وغیرہ کچھ بھی پڑھ سکتا ہے اور اس موقع پر کوئی خاص دعا منقول نہیں ہے اور اس درمیان پڑھنے کے لئے جو دعا اشتہار وغیرہ میں لکھی ہوئی ہوتی ہے وہ اس موقع پر پڑھنے کے بارے میں منقول نہیں ہے؛ البتہ اس میں اللہ تعالیٰ کی شان عالی کے متعلق اچھے الفاظ ہیں، اس لئے لوگ اس کو پڑھتے ہیں، مگر وہ خاص کر اس موقع پر پڑھنے کی نہیں ہے اور اس موقع پر کوئی بھی چھوٹی بڑی دعا پڑھنا جائز ہے، اگر کوئی صرف سبحان اللہ پڑھتا ہے، تو اس کی بھی

گنجائش ہے۔ (مستفاد: کتاب النوازل)

ویجلس ندبا بین کل أربعة بقدرها ویخیرون بین تسبیح وقراء ۃ وسکوت وصلاۃ فرادی. (در مختار زکریا ۲/ ۳٦۹، کراچی ۲/ ٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۲۲۴۴/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۱۱/۸ھ

۲۵/ باب التراويح

الفصل الثاني في أجرة التراويح

تراویح کی اجرت سے متعلق چند سوالات کے جواب

سوال [۳۲۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک شخص مسجد میں مستقل امام ہے، وہ تراویح بھی پڑھاتا ہے، تو اس کے لئے مزید امامت تراویح پر اجرت لینا کس طرح جائز ہوگا؟ یعنی اس کے جائز ہونے کے لئے اس کو ذمہ داران مسجد سے کیا طے کرنا ہوگا، مثلاً کسی امام صاحب کو ہر ماہ تین ہزار روپے تنخواہ ملتی ہے، تو کیا رمضان شریف آتے ہی امامت تراویح کی الگ سے تنخواہ اور مدت طے کرنا واجب ہے، اگر نہ طے کرے تو کیا حکم ہے؟

(۲) ایک شخص صرف رمضان میں تراویح پڑھاتا ہے، مستقل امام نہیں، تو رقم پانے کے لئے اس کو امامت تراویح پر کیا اجرت مقرر کرنا واجب ہوگا؟ اور کیا یہ بھی طے کرنا ضروری ہوگا کہ اتنے روز تراویح پڑھاؤں گا؟

(۳) جو شخص تراویح کی امامت پر اجرت اور مدت مقرر نہ کرے اور ختم قرآن ہونے پر متولی مسجد بطور اجرت اور عام لوگ اپنی خوشی سے بطور ہدیہ وتحفہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق رقم یا کپڑے وغیرہ دیں تو کیا یہ دی گئی رقم امامت تراویح کی اجرت شمار ہوگی یا ختم قرآن کا ہدیہ وتحفہ شمار ہوگا؟ اور کیا یہ ہدیہ وتحفہ حلال ہوگا یا حرام؟ اگر اس آخری شکل میں امام تراویح کے اس ہدیہ وتحفہ کو اجرت تراویح خیال کر کے لے لے تو کیا یہ حلال ہوگا؟

برائے کرم جواب جلد مدلل ومفصل مع عبارات کتب احادیث وفقہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد عامل محلہ مفتی سرائے چاند پور، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: متقدمین نے تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو ناجائز لکھا ہے، اسی طرح امامت واذان پر اجرت لینے کو بھی ناجائز لکھا ہے، جو اس طرح کی روایات سے واضح ہوتا ہے:

عن الطفيل بن عمرو –رضي الله عنه– اقرأني أبي بن كعب رضي الله عنه القرآن، فأهديت إليه قوسا، فغدا إلى النبي عليه السلام وقد تقلده، فقال له النبي عليه السلام: من سلمک هذه القوس يا أبي؟ فقال الطفيل بن عمرو الدوسي: اقراته القرآن، فقال له رسول الله –صلى الله عليه وسلم– تقلدها شلوة من جهنم. (المعجم الأوسط، قديم ١٠/ ٢٧٤، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ١٣٧، رقم: ٤٣٩، كنز العمال ١/ ٢٣١، حياة الصحابة ٣/ ١١٧)

عن عبادة بن الصامت –رضي الله عنه– قال: علمت ناسا من أهل الصفة الكتاب والقرآن، فأهدى إلي رجل منهم قوسا، فقلت: ليست بمال، وأرمى عليها في سبيل الله عز وجل، لآتين رسول الله فلأسألنه، فأتيته، فقلت: يا رسول الله! رجل أهدى إلي قوسا ممن كنت أعلمه الكتاب والقرآن، وليست بمال وأرمي عنها في سبيل الله؟ قال: إن كنت تحب أن تطوق طوقا من نار فاقبلها. (سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في كسب المعلم، النسخة الهندية ٢/ ٤٨٥، دارالسلام، رقم: ٣٤١٦، المستدرك، كتاب البيوع، مكتبه نزار مصطفى الباز جديد ٣/ ٨٦٠، ٨٦١، رقم: ٢٢٧٧)

عن عبادة بن الصامت –رضي الله عنه– قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يشغل، فإذا قدم رجل مهاجر على رسول الله صلى الله عليه وسلم دفعه إلى رجل منا يعلمه القرآن، فدفع إلي رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلا، فكان معي في البيت أعشيه عشاء أهل البيت، فكنت أقرئه

القرآن فانصرف انصرافة إلى أهله، فرأى أن عليه حقا، فأهدى إلي قوسا لم أر أجود منها عودا، ولا أحسن منها عطفا، فأتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقلت: ما ترى يا رسول الله فيها؟ قال: جمرة بين كتفيک تقلدتها، أو تعلقتها. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٣٢٤، رقم: ٢٣١٤٦، المستدرك، كتاب معرفة الصحابة، مكتبه نزار مصطفى الباز ٦/ ٢٠٣٥، رقم: ٥٥٢٧)

لیکن متأخرین نے ضرورت کی وجہ سے ان سب پر اجرت لینے کو جائز لکھا ہے، مگر تلاوت قرآن اور ختم قرآن پر اجرت لینے کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، جیسا کہ: ”**لاتشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا**“۔ [سورۃ البقرۃ: ٤١] میں واضح ہے؛ اس لئے متأخرین نے بھی تلاوت قرآن اور ختم قرآن پر اجرت لینے کو ہمیشہ کے لئے ناجائز لکھا ہے، اب اس کے بعد اصل سوالات کے جوابات ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) جو شخص مستقل امام ہے اس کے لئے یہ شرط لگانا جائز ہے کہ ماہ رمضان میں چھٹی رکھیں گے اور چھٹیوں کی تنخواہ بھی عام دنوں کی طرح مکمل ملا کرے گی، اسی طرح رمضان میں اضافہ تنخواہ کی شرط لگانا بھی جائز ہے اور ایسی صورت میں یہ ختم قرآن کی اجرت نہیں ہوگی؛ بلکہ مستقل امامت کی اضافی تنخواہ ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ مدارس میں مدرسین کے لئے رمضان میں کام کرنے کی صورت میں ڈبل تنخواہ چھٹی کرنے کی صورت میں پوری تنخواہ کی شرط لگانا جائز ہوتا ہے اور ایسا عمل بھی ہوتا ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۶۷، ۱۵/ ۵۲۵-۵۲۶)

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (ترمذي شريف، الأحكام، باب ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

ویفتي الیوم بصحتها لتعلیم القرآن والفقه والإمامة. (شامي، کتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار علی الطاعات، کراچی ٦/ ٥٦، زکریا ٩/ ٧٦)

وبعضهم استثنی تعلیم الفقه والإمامة ...... الخیزاخبزي یقول: في زماننا یجوز للإمام والمؤذن والمعلم أخذ الأجر. (تاتارخانیه،، کتاب الأجارة، الفصل الخامس عشر في الاستئجار علی الطاعات، زکریا ١٥/ ١٢٨، رقم: ٢٢٤٢٢)

فحیث کانت البطالة معروفة في یوم الثلثاء والجمعة، وفي رمضان والعیدین یحل الأخذ. (شامي، کتاب الوقف، مطلب فی استحقاق القاضی والمدرس الوظیفة في یوم البطالة، زکریا ٦/ ٥٦٨، کراچی ٤/ ٣٧٢)

(۲) رمضان میں پورے رمضان تراویح پڑھانے کی دوشکلیں ہیں:

(۱) جو شخص رمضان میں صرف تراویح پڑھاتا ہے، جس میں ختم قرآن نہ ہو؛ بلکہ ''الم ترکیف'' وغیرہ چھوٹی سورتوں یا مایجوز بہ الصلاۃ قراءت کے ذریعہ سے صرف بیس رکعت تراویح کی نماز پڑھادیتا ہے اوراس پر اجرت لیتا ہے، تو یہ جائز اور درست ہے؛ اس لئے کہ یہ عام نمازوں کی امامت کی طرح تراویح کی امامت کی اجرت ہے۔

وفي الروضة: وفي زماننا یجوز للإمام والمعلم أخذ الأجرة. (البحر الرائق، کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زکریا ٢/ ٣٥، کوئٹه ٨/ ٢٠)

ویفتي الیوم بصحتها لتعلیم القرآن، والفقه، والإمامة. (شامي، کتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار علی الطاعات، کراچی ٦/ ٥٦، زکریا ٩/ ٧٦)

(۲) اگراس تراویح میں قرآن ختم کرنے کی شرط پر اجرت طے ہوتی ہے، تو **''لا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا''** کی وعید میں داخل ہوکر ناجائز اور حرام ہوگا۔

(۳) اس شکل میں متولی اور ذمہ داران مسجد کی طرف سے جو رقم دی جاتی ہے، وہ **''المعروف کالمشروط''** کی بنیاد پر دراصل ختم قرآن ہی کی اجرت ہے اور وہ **''لا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا''** کے دائرہ میں داخل ہوکر ناجائز ہے، اسی طرح اگر ختم

قرآن کے لئے عام لوگوں سے چندہ اکٹھا کیا جائے اور جمع کرکے حافظ کو پیش کیا جائے تو یہ بھی ناجائز ہے؛ اس لئے کہ یہ بھی اجرت ہے، نیز اگر کوئی سرمایہ دار ہر سال ختم کے موقع پر حافظ کو کوئی رقم دیا کرتا ہو اور یہ معروف ہو تو اس کا لینا دینا بھی ممنوع ہوگا؛ البتہ اگر کسی جگہ یہ شکل پیش آئے کہ کوئی شخص حافظ صاحب سے تعلق اور محبت کی بنیاد پر بلا کسی شرط کے اتفاقا خاموشی سے خلوص ومحبت کے ساتھ انفرادی طور پر ہدیہ پیش کرے، جس میں ختم پر اجرت کا کوئی شبہ نہ پایا جاتا ہو، تو اس انفرادی ہدیہ کو قبول کرنے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا، تاہم بہتر یہی ہے کہ یہ ہدیہ عین ختم والے دن نہ دیا جائے، تاکہ اجرت کا شائبہ نہ پایا جائے۔

يجوز للإمام والمفتي قبول الهدية، وإجابة الدعوة الخاصة ...... والأولىٰ في حقهم إن كانت الهدية لأجل ما يحصل منهم من الإفتاء، والوعظ، والتعليم عدم القبول ليكون علمهم خالصا لله تعالىٰ، وإن أهدى إليهم تحببا وتوددا لعلمهم وصلاحهم، فالأولى القبول. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في حكم الهدية للمفتي، زكريا ٨/ ٤٩، كراچی ٥/ ٣٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۶۱)	۱۵/ ۴/ ۱۴۳۴ھ

تراویح میں ختم قرآن پر اجرت کا شرعی حکم

سوال [۳۲۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تمام حفاظ اور علماء ہمارے انہیں اداروں میں تیار ہوتے ہیں اور انہیں اداروں سے نکل کر ملک بھر میں ماہ مبارک میں تراویح میں قرآن پاک سنانے کے لئے پھیل جاتے ہیں اور اکثر وبیشتر کو کچھ نہ کچھ کیا بہت کچھ رقوم وہدایا ملتے ہیں جو پیش نظر فتاوؤں کی رو سے سب اجرت قرآن کی بنا پر حرام ہیں، نہ تو عارضی امامت کرنے کی صورت میں حلال ہے اور نہ ہی

بلا طے کئے، نہ ہی ہدایا کی صورت میں پیش نظر اشتہار پر حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانویؒ، مفتی عزیز الرحمٰن مہراج دیو بند، مفتی کفایت اللہؒ، اور مولانا ظفر عثمانیؒ کی عبارات ملاحظہ فرمائیں۔ تمام ملک میں علماء اور حفاظ قرآن پاک سنتے سناتے ہیں، تو سب ہی حرام مال کے حصول کے مرتکب ہیں، کیا یہ حرمت سود، جوے جیسی ہے یا اس کی اور قسم ہے؟ اہل مدارس اس طرف کیوں توجہ مبذول نہ فرما کر اساتذہ اور طلباء کی اصلاح نہیں فرما رہے ہیں، اشکال دور فرما کر مشکور فرمائیں۔

المستفتی: محمد یونس امام جامع مسجد احمد گڑھ، پنجاب

تراویح میں ختم قرآن پر اجرت کا شرعی حکم

مرتبہ: خادم صوفی جلال الدین صدیقی کیرانوی

پیر مرشد شیخ السالکین حضرت مولانا مفتی شاہ افتخار الحسن صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم

حدیث شریف: حضرت بریرہؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے، تاکہ اس کی وجہ سے کھاوے لوگوں سے، قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا چہرہ محض ہڈی ہوگا، جس پر گوشت نہ ہوگا۔ (بیہقی فی شعب الایمان) یعنی جو لوگ قرآن شریف کو طلب دنیا کی غرض سے پڑھتے ہیں، ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ (فضائل قرآن ص: ۵۵)

عبارات اکابر

(۱) فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں: قرآن شریف پڑھانے کی اجرت لینا درست ہے، مگر رمضان شریف میں جو قرآن پاک تراویح و نوافل میں سنایا جاتا ہے، اس کی اجرت دینی لینی دونوں حرام ہیں۔ اور آمدنی مساجد سے یہ خرچ اور بھی زیادہ برا ہے؛ بلکہ متولی پر اس کا ضمان آوے گا۔ (فتاوی رشیدیہ، ص: ۱۹۶)

(۲) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بعض حفاظ کی عادت ہے کہ اجرت لے کر قرآن شریف سناتے ہیں، طاعت پر اجرت لینا حرام ہے، اسی طرح دینا بھی حرام ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے پہلے سے مقرر نہیں کیا؛ اس لئے یہ معاوضہ نہیں ہوا، جواب یہ ہے کہ گو پہلے سے مقرر نہیں لیکن نیت دونوں کی یہی ہے اور نیت بھی مرتبۂ خطرو خیال میں نہیں؛ بلکہ مرتبۂ عزم میں، اگر کسی طور سے یہ معلوم ہو جاوے کہ یہاں کچھ وصول نہ ہوگا، تو ہرگز ہرگز وہاں پڑھیں نہیں۔ اور فقہ کا قاعدہ ہے کہ معروف مثل مشروط کے ہے، جب اس کا رواج ہو گیا اور دونوں کی نیت یہی ہے بلاشک وہ معاوضہ ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب بلا اجرت پڑھنے والا تو ہم کو ملتا نہیں اور اجرت دے کر سننا جائز نہیں، تو پھر کیوں کر قرآن سنیں، جواب یہ ہے کہ قرآن پورا سننا فرض نہیں ایک امر مستحب کے لئے مرتکب حرام ہونا، ہرگز جائز نہیں ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھ لو ایسی حالت میں قرآن مجید ختم ہونا ضروری نہیں۔ (اصلاح الرسوم، ص:۱۴۳)

(۳) عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ اس سوال کے جواب میں کہ آیا تراویح میں حافظ قرآن کو اجرت قرآن شریف دے کر اس سے قرآن شریف سننا جائز ہے یا نہیں؟ آیا اجرت دہندگان کو ثواب ملتا ہے اور اس سے سنت ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور حافظ کو ایسی صورت میں اجرت لینی جائز ہے یا نہیں؟ تحریر فرماتے ہیں

الجواب: اجرت دینا اور لینا قرآن شریف کے سننے اور پڑھنے کے لئے جائز نہیں ہے۔ اور اس میں کسی کو ثواب نہیں ہوتا، نہ پڑھنے والوں کو اور نہ سننے والوں کو۔ اور سنت ختم قرآن کی اس طرح ادا نہیں ہوتی۔ (عزیز الفتاویٰ ص:۲۶۳)

(۴) مفتی اعظم ہند حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عبارات ملاحظہ ہوں: ''اجرت دے کر قرآن شریف پڑھوانا درست نہیں، اگر بے اجرت لئے ہوئے پڑھنے والا حافظ نہ ملے تو سورت سے تراویح پڑھنا بہتر ہے''۔ (کفایت المفتی ۳/۳۶۳، زکریا مطول ۱۱/۵۳۴)

لیکن قرآن مجید تراویح میں سنانے کی اجرت دینا لینا جائز نہیں، اگر معاملہ قرآن مجید سنانے کے لئے ہوا تھا تو ناجائز تھا۔ واللہ اعلم (۳/ ۳۶۵)

روپیہ دینا جب تراویح کے معاوضہ میں جائز نہیں تو اس کو ثواب کیا ملے گا۔ (۳/ ۳۶۷)

(۵) فقیہ الملت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں: ’’عبارت مذکورسے معلوم ہوا کہ اجرت لے کر قرآن پڑھنا اور پڑھوانا گناہ ہے؛ اس لئے تراویح میں چند مختصر سورتوں سے بیس رکعت پڑھ لینا بلا شبہ اس سے بہتر ہے کہ اجرت دے کر پورا قرآن پڑھوائیں؛ کیوں کہ پورا قرآن تراویح میں پڑھنا مستحب ہے اور اجرت دے کر قرآن پڑھوانا اور پڑھنا گناہ ہے اور بچنا بنسبت مستحب پر عمل کرنے کے زیادہ ضروری ہے؛ البتہ اگر کسی نے پڑھ لی تو نماز کے اعادے کی ضرورت نہیں، نماز ہوگئی، اگر چہ مکروہ ہوئی۔ (امداد المفتیین، ص: ۳۶۵) واللہ اعلم

(۶) شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا فتویٰ: ’’اجرت پر اور نابالغ حافظ کے پیچھے بھی تراویح نہ پڑھی جائیں۔ (امداد الاحکام ۱/ ۳۶۵)

(۷) فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم سے استفسار کیا گیا، تو فرمایا: ’’میرے نزدیک یہ رسم دو گناہوں کا مجموعہ ہے: (۱) قرآن پر اجرت (وہ بھی غیر متعین ہونے کی بنا پر) اور (۲) اجارہ فاسدہ‘‘۔

قرآن سنانے کی اجرت

مسئلہ: تراویح میں قرآن کریم سنانے والے حافظ کو اجرت دینا اور حافظ صاحب کا اجرت لینا دونوں ناجائز اور حرام ہیں اور قرآن کریم سننے اور سنانے کا ثواب کسی کو بھی نہ ملے گا؛ بلکہ سب گنہگار ہوں گے۔ (شامی کراچی ۶/ ۵۶، فتاوی رشیدیہ، ص: ۳۹۴، احسن الفتاوی ۱/ ۵۱۵، فتاوی محمودیہ ۷/ ۱۷۱، جواہر الفقہ ۱/ ۳۸۲)

سامع کی اجرت

مسئلہ: جس طرح تراویح میں قرآن شریف سنانے والے کو اجرت دینا اور لینا دونوں ناجائز ہیں، اسی طرح لقمہ دینے والے سامع کو اجرت دینا ولینا بھی ناجائز وحرام ہے۔ (فتاوی دارالعلوم جدید ۲/ ۲۹۵، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۶)

حضرت تھانویؒ کا رجوع

اور حضرت تھانویؒ نے سامع کے لقمہ دینے کو تعلیم سمجھ کر ''امدادالفتاوی'' میں جواز اجرت کا فتویٰ دیا تھا؛ لیکن بعد میں حضرت رحمہ اللہ نے اس فتوی سے رجوع کر کے عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمایا ہے، جو ''التذکیر والتہذیب ۳/ ۸۳'' میں شائع ہو چکا ہے؛ اس لئے لقمہ دینا تعلیم نہیں ہے؛ بلکہ تذکیر ہے۔

بنام ہدیہ پیش کرنا

مسئلہ: اگر اجرت طے نہ کرے؛ بلکہ بطور تحفہ ونذرانہ حافظ کو دیا جائے اور حافظ صاحب بطور نذرانہ کے اس کو قبول کرلیں تو جائز ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو یہ شرعی طور پر ''**المعروف کالمشروط**'' کے دائرہ میں داخل ہو کر نام کا نذرانہ ہے؛ لیکن درحقیقت اجرت ہے؛ اس لئے کہ حافظ صاحب کو معلوم ہے کہ لوگ مجھے قرآن سنانے کی بنا پر کچھ دیں گے اور لوگوں کے دل میں بھی یہی ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کو جاتے وقت کچھ دینا ہے اور اس طرح دینا اور لینا عادت اور معروف بھی ہے؛ لہٰذا یہ بھی جائز نہیں ہے۔ (شامی کراچی ۶/ ۵۵، فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۶۳)

عارضی امام بنا کر ختم کی اجرت

مسئلہ: اگر حافظ کے ذمہ ایک وقت یا ایک ماہ کی امامت کردی جائے تو وہ اجرت لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: یہاں مقصود امامت نہیں ؛ بلکہ تراویح میں قرآن سنانا ہے؛ اس لئے یہ بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۳۲۲)

آمدورفت کا کرایہ و مہمانداری

مسئلہ: حافظ صاحب کی مہمانداری کرنا اور آمدورفت کا کرایہ دینا شرعاً اجرت میں داخل نہیں ہے ؛ اس لئے جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/۲۹۴)

نابالغ کی امامت

مسئلہ: نابالغ حافظ کے پیچھے بالغ مردوں کی نماز تراویح صحیح نہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۳/۵۲۵، درمختار کراچی ۱/۵۷۶)

داڑھی کٹانے والے کی امامت

مسئلہ: داڑھی کٹانے والے مشخشی داڑھی رکھنے والے اور داڑھی منڈانے والے حافظ کے پیچھے تراویح کی نماز جائز نہیں ہے، تراویح پڑھنے والے حضرات اپنی تراویح کی خیر منائیں، ایسے حافظ کے پیچھے نماز پڑھنے کے بجائے چھوٹی سورتوں سے تراویح پڑھنا بہتر ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۳/ ۵۱۸، درمختار کراچی ۱/ ۴۱۸، فتاوی رحیمیہ ۱/۳۵۳)

سوال: جس طرح پنجوقتہ نمازوں کے لئے امام کو مقرر کیا جاتا ہے، اسی طرح ماہ رمضان میں تراویح کے لئے امام مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ مسئلہ ہے "**الأمور بمقاصدها**" اور یہ بھی ہے: "**المعروف کالمشروط**" پس اگر کسی حافظ کو ختم قرآن شریف کے لئے تراویح کا امام بنایا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے مقصود امامت نہیں ہے؛ بلکہ قرآن شریف کا ختم ہے؛ لہٰذا اس پر جو کچھ اجرت دی، لی جائے گی وہ ختم قرآن شریف کی وجہ سے ہے نہ کہ بوجہ امامت محضہ کے، پس حسب قاعدہ تراویح میں ختم قرآن شریف پر اجرت لینا دینا جائز نہ ہوگا؛ بلکہ بلا اجرت مقرر کرنا امام تراویح کا درست وافضل ہے؛ البتہ اجرت پر ہرگز جائز نہیں۔
(مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/۲۷۳)

آخری گزارش

خدارا ذرا حفاظ کرام ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا میں کتنی بڑی دولت سے نوازا ہے، اس کا حق تو یہ تھا کہ دنیا وآخرت کی تمام بھلائیاں ہم اس کے ذریعہ حاصل کر لیتے؛ لیکن ہم چند کوڑیوں پر اکتفا کر بیٹھے اور اسے اپنے لئے سامان نجات وذریعہ شفاعت بنانے کے بجائے اپنے اوپر حجت بنا دیا اور یقین کیجئے، اگر ہماری یہی روش رہی تو قیامت کے روز قرآن ضرور ہمارا گریبان گیر ہوگا، خدا ہم سب کو اتباع شریعت کی توفیق بخشیں آمین۔ **والحمد لله أولاً وآخرًا.**

تراویح سے متعلق حکیم الامتؒ کا ایک عمل

عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ تحریر فرماتے ہیں: ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ رمضان المبارک کے زمانہ میں تقریباً چھ سات حافظ اور دس بارہ عالم مقیم خانقاہ تھے، حضرت والا (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ اپنے ضعف واضمحلال کی وجہ سے گھر ہی پر تراویح پڑھا کرتے تھے، ایک حافظ صاحب کو مسجد میں تراویح کے لئے مقرر فرما دیا تھا، ان کو غیر معمولی اور بالکل غیر متوقع طور پر یہ تاکید فرمائی کہ:

''تراویح تمام مہینہ صرف سورۂ الم ترکیف سے پڑھائی جائیں، ایک دن حافظ صاحب نے دوسری سورتیں پڑھیں، حضرتؒ کو جب علم ہوا تو حافظ صاحب کوفہمائش کی کہ انہوں نے ہدایت کے مطابق عمل کیوں نہیں کیا۔ ایک دن مجلس یومیہ کے وقت حضرات علماء نے ادباً حضرت والا سے عرض کیا کہ آخر کیا وجہ اور کیا مصلحت ہے کہ تراویح میں بجائے قرآن شریف ختم کئے جانے کے حضرت نے خصوصی طور پر صرف الم ترکیف سے پڑھے جانے کی اس طرح تاکید فرمائی۔ حضرت والا نے جو جواب ارشاد فرمایا، اس کا ماحصل یہ ہے کہ: میں ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں اور سن بھی رہا ہوں کہ اکثر مقامات میں خصوصاً بڑے شہروں میں یہ رواج عام طور پر ہوگیا ہے الا ماشاء اللہ کہ لوگوں نے تراویح کو ختم قرآن شریف ہی پر موقوف کرلیا ہے اور اسی کو خاص اہمت دے رکھی ہے، جہاں قرآن شریف ختم ہوا سمجھے کہ تراویح بھی ختم ہوگئی، خواہ قرآن مجید چند دنوں میں ہی ختم کرلیا جائے، اس کے بعد مسجد میں نماز عشاء کی جماعت بھی مختصر رہ جاتی ہے؛ حالانکہ تراویح سنت مؤکدہ ہے اور قرآن مجید کا پڑھا جانا محض سنت ہے، مگر خاص اور بڑی فضیلت کا درجہ رکھتا ہے؛ لیکن واجب نہیں اور تراویح بیس رکعت سنت مؤکدہ ہیں، عمداً جس کا ترک کرنا سخت گناہ ہے؛ اس لئے اس کوتاہی کی اور غلط عقیدہ کی اصلاح واجب ہے، میں نے اس مسئلہ کو تحریراً وتقریراً واضح بھی کردیا اور عملاً وتمثیلاً اپنی مسجد میں رائج بھی کردیا ہے۔ **وما علینا الا البلاغ المبین وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم.** (مآثر حکیم الامت، ص:۹۷، تراویح میں ختم قرآن پر اجرت کا شرعی حکم، ص:۷-۱۴، مصنفہ فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آنجناب نے جن اکابر ومشائخ اور معتبر مفتیانِ کرام کے حوالے سے اشتہار پیش فرمایا ہے وہ اپنی جگہ صحیح اور درست ہے۔ اور مدارس میں اساتذہ، طلبہ کو اس طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں اور یہ کہنا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اہل مدارس اور ذمہ دار اساتذہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتے، ہم جس ماحول میں ہیں، ہمارے یہاں تو توجہ زبانی اور

تحریری ہر اعتبار سے دلائی جاتی ہے، اس سلسلہ میں ندائے شاہی میں ایک لمبی تحریر شائع ہوچکی ہے، پھر ہماری کتاب ''انوار رحمت'' میں مستقل مضمون کی صورت میں ایک لمبا فتوی شائع ہوچکا ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند کے اہم اساتذہ اور مفتیان کرام کے دستخط بھی ہیں، باقی عمل نہ کرنے والوں کی ذمہ داری ہم لوگوں پر نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۲۲ھ

تراویح کی اجرت کے جواز کے پمفلٹ کا تحقیقی جواب

سوال [۲۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرض تحریر یہ ہے کہ جو پرچہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، جس نے ہمارے علاقہ میں ائمہ کے ذہنوں میں عجیب الجھنیں پیدا کی ہیں اور خصوصاً اس وقت اور بھی فکر لاحق ہوئی جب فتوی نمبر: ۵ پر آپ کا بھی اسم مبارک دیکھنے میں آیا اور اخیر میں یہاں تک کہ نذرانۂ تراویح کو حرام کہنے والے کو بددین اور فتنہ پرور تک کہا گیا۔

مفتی صاحب! ہماری آپ سے یہ گزارش ہے کہ آخر یہ نذرانۂ تراویح کا اختلافی سلسلہ کب تک چلے گا؟ ہم آپ سے یہ امید کرتے ہیں کہ آپ اس مسئلہ کے بارے میں ہمیں اپنا مفصل جواب دے کر انشاء اللہ عند اللہ ماجور ہوں گے اور ہمیں ممنون ومشکور فرمائیں گے۔

دلی دعا ہے کہ اللہ آپ کو دونوں جہاں میں عافیت عطا فرمائے۔ (آمین) فقط والسلام

المستفتی: حافظ محمد مختار نعمانی، امام جامع مسجد آسٹی تعلقہ پرتور، ضلع جالندھر مہاراشٹر

ماہ رمضان میں امامت تراویح پر اجرت دینا اور لینا جائز ہے

دارالعلوم دیوبند ومفتیان کرام کے اہم فتاوے

(۱) مفتی اعظم محمود الحسن گنگوہیؒ ''فتاوی محمودیہ'' میں فرماتے ہیں: اگر کوئی باتنخواہ امام ہے اور

مضان شریف میں تراویح کی بھی امامت کرے گا، تو اس کی اجرت میں اضافہ کر دیا جائے تو متأخرین کے فتویٰ کے مطابق کوئی اشکال نہیں۔

(۲) حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ (مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند): تراویح میں قرآن سنانے سے متعلق وہی توسیع پیدا کی جائے جو تعلیم قرآن حدیث وفقہ وامامت اور اذان واقامت کے متعلق دی گئی ہے، بھاؤ تاؤ نہ کریں؛ لیکن سننے والوں کا فریضہ ہے کہ وہ قرآن سنانے والے کی خدمت اپنی حیثیت سے زیادہ کریں؛ لہٰذا حافظ قرآن کے لئے نذرانہ لینا جائز ہے اور نذرانہ لینے والے حافظ کے پیچھے قرآن سننا بھی باعث اجر وثواب ہے، نیز نذرانہ لینے والے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنا بالکل صحیح ہے اور اس کا پورا ثواب بھی ملے گا۔ (جواب نمبر: ۱۱۶۲)

(۳) حضرت مولانا منت اللہ صاحب۔ (امیر شریعت بہار واڑیسہ) مذکورہ بالا فتویٰ کی تصدیق فرماتے ہیں۔

(۴) شیخ اسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں: اس سے پہلے دینی کاموں پر جو رقم دی جاتی تھی، وہ اجارہ نہیں تھا؛ بلکہ بیت المال سے وظیفہ تھا، اب چونکہ بیت المال نہیں رہے؛ اس لئے مسلمانوں کو ضروری ہے کہ ہر دینی خدمت پر معاوضہ دیں۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۲۰۹)

(۵) حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی (مفتی اعظم مدرسہ شاہی مرادآباد): صرف تراویح میں ختم قرآن پر ہی اجرت کی بحث نہیں؛ بلکہ نفس تراویح پر اجرت کا معاملہ ہے، اگر کسی جگہ ''الم ترکیف'' سے تراویح کی نماز ہوتی ہو اور امام اس پر اجرت لیتا ہے، تو فقہائے متأخرین اور اہل فتویٰ میں سے کسی نے بھی اس کو ناجائز نہیں کہا ہے۔ (ماہنامہ ندائے شاہی ستمبر ۲۰۰۴ء)

(۶) حضرت مولانا مفتی سلیم الدین صاحب قاسمی (مفتی اعظم شادرہ دہلی): اسی سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ: تراویح کی نماز کی حفاظت کرنا ہر مسلمان کے لئے واجب اور ضروری ہے، جس کی امامت کے لئے اگر کسی کو بااجرت متعین کیا جائے تو اس زمانے میں بھی

ضرورتاً ایسا معاملہ کرنا جائز ہے؛ اس لئے رمضان میں تراویح وتر کی امامت کے بدلہ بطور رقم اجرت لینا جائز ہے۔

(۷) حضرت مولانا مفتی مکرم احمد صاحب (شاہی امام مسجد فتح پوری دہلی) فرماتے ہیں کہ تراویح کی امامت کا نذرانہ لینا جائز ہے، متأخرین فقہاء کی یہی رائے ہے۔

(۸) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ العالی (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) فرماتے ہیں کہ: اس مسئلے میں خوشی کے موقع پر کمیٹی اور مصلیوں کو چاہئے کہ وہ امام کی اضافی خدمت کا اہتمام کریں، یہ ایک طرح کا انعام ہے۔ (مفتی سعید احمد ۲۲/رجب ۱۴۳۲ھ)

دستخط مفتی حبیب الرحمٰن صاحب (مفتی دارالعلوم دیوبند)

دستخط مولانا ریاست علی بجنوری (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند)

دستخط مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند)

نوٹ: مفسر قرآن حضرت مولانا انیس احمد صاحب قاسمی بلگرامی نے دارالعلوم دیوبند سے قدیم اور جدید فتوؤں پر تفصیلی بات چیت کرکے ایک تحقیقی کتاب: ''معاوضہ علی الطاعت'' یا معاوضہ علی الخدمت'' لکھی ہے۔ اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اب اگر اس کے بعد کوئی بھی اجرت اور نذرانۂ تراویح کو حرام کہتا ہے، تو وہ شخص بددین اور فتنہ پرور ہے۔

شائع کردہ زیر اہتمام:

حضرت الحاج مفتی خلیل الرحمٰن صاحب قاسمی دامت برکاتہم نانڈیڑ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں دو سنتیں بالکل الگ الگ ہیں: (۱) نفس نماز تراویح جو مایجوز بہ الصلاۃ قراءت کے ساتھ ادا ہوسکتی ہے، جس قراءت کے ذریعہ سے نماز صحیح ہوجائے، اس کے ذریعہ سے بھی نفس تراویح ادا ہوسکتی ہے، عام طور پر دیہات کے علاقوں میں ''الم ترکیف'' سے دس سورتوں کے ذریعہ سے بیس رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، نفس تراویح کی

ادائے گی کی سنت اپنی جگہ مستقل ہے، اس کے لئے کسی حافظ قرآن کی ضرورت نہیں جس کو ''الم ترکیف'' سے آخر تک سورتیں یاد ہوں وہ بھی پڑھا سکتا ہے، اس کی امامت میں اگر اجرت لی جاتی ہے، تو کوئی بھی یہ کہہ نہیں سکتا کہ قرآن پر یا ختم قرآن پر اجرت لی گئی ہے۔

(۲) تراویح کی نماز میں قرآن کریم ختم کرنے کی سنت یہ اپنی جگہ مستقل دوسری سنت ہے، اس سنت کی ادائے گی حافظ قرآن کے بغیر نہیں ہوسکتی، اب اگر اس سنت کی ادائے گی میں حافظ قرآن کو اجرت دی جائے تو ''وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا'' [سورۃ البقرۃ: ۴۱] کی وعید میں داخل ہوکر ناجائز وحرام ہوجائے گی، اب اس تمہید کے بعد سائل نے اپنی تحریر کے ساتھ جو پرچی بھیجی ہے اس کے متعلق وضاحت یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے ایک مفتی، مفتی غلام رحمٰن صاحب نے ۲/ ۸/ ۱۴۲۴ھ میں ایک فتویٰ لکھا تھا، جس میں تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا بلا تکلف جائز لکھا تھا اور انہوں نے امامت اور اذان وغیرہ کی اجرت پر قیاس کرکے اس کو صاف طور پر جائز اور حلال لکھا تھا۔ اور اس جواب کو لے کر دارالعلوم دیوبند کے ایک طالب علم نے احقر کے پاس سوال بھیجا تھا، اور احقر نے جواب میں مفتی صاحب موصوف کے فتوی کی تردید پر ایک مفصل جواب لکھا تھا، جس میں ختم قرآن پر اجرت کے عدم جواز کو مدلل طور پر ثابت کیا گیا تھا اور اس میں احقر نے ضمنی طور پر ایک عبارت لکھی تھی، جو بعینہٖ آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے: ''اگر کسی جگہ الم ترکیف سے تراویح کی نماز ہوتی ہے اور امام اس پر اجرت لیتا ہے، تو میری معلومات میں فقہائے متأخرین اور اکابر اہل فتویٰ میں سے کسی نے بھی اس کے عدم جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے'' احقر کا یہ مفصل فتویٰ ندائے شاہی میں بھی شائع ہوا اور احقر کی کتاب ''انوار رحمت'' ص: ۴۷۷ سے ۴۹۶ تک وضاحت کے ساتھ موجود ہے، جس پر دارالعلوم دیوبند کے مفتیان کرام کے دستخط بھی ہیں اور حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کے وضاحتی دستخط بھی موجود ہیں، وہاں سے ملاحظہ فرمائیے۔ اور آنجناب نے جس پرچی کے ساتھ سوال نامہ ارسال فرمایا ہے اس پرچی کو منسلک کرکے چند سوالات ہمارے پاس آئے تھے، جن کے جوابات میں ہمارے

مدرسہ شاہی کے دار الافتاء کا جو موقف ہے، اس کو مفصل تحریر کے ساتھ ۲۹/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ میں واضح کر کے جواب لکھا گیا تھا، وہ بعینہٖ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، اور اس جواب میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، وہی ہمارے یہاں کا موقف ہے، باقی اس موقف کے خلاف کہیں سے کوئی بھی تحریر آپ لوگوں کی نظر سے گزرتی ہو وہ ہمارے یہاں کا موقف نہیں ہے، اب وہ تفصیلی جواب ملاحظہ فرمائیے:

اولاً یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ رمضان المبارک میں بیس رکعت تراویح با جماعت پڑھنا سنت مؤکدہ ہے اور بلا عذر تراویح کو چھوڑنا موجب گناہ ہے، اس اعتبار سے اس نماز کو شعائر اسلام میں سے شمار کیا جاسکتا ہے، پھر نماز تراویح میں پورا قرآن پڑھنا یہ الگ سے ایک سنت ہے، مگر اس کا درجہ نفس تراویح کی حیثیت سے کم ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر لوگ بوجھ محسوس کریں تو ختم کا اہتمام ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یعنی اگر تراویح میں قرآن مکمل نہ کیا جائے تو اس سے نفس تراویح کے ثواب میں کوئی کمی نہیں آتی ہے، اس تفصیل کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ طاعات پر اجرت لینا متقدمین احناف کے نزدیک ناجائز ہے؛ لیکن ضرورت کی وجہ سے متاخرین فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے اور ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ اجرت کی اجازت نہ دینے کی صورت میں دینی نقصان کا اندیشہ ہو، چنانچہ دینی تعلیم وتعلم اور امامت واذان وغیرہ امور میں جواز اجارہ کی علت فقہاء نے یہی بتلائی ہے کہ اگر ان امور میں جواز کی بات نہ کہیں تو دینی شعائر کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہوجائے گا، اب سنت مؤکدہ ہونے کی حیثیت سے نفس تراویح (جو ختم قرآن پر مشتمل نہ ہو) کو امامت فرائض کے ساتھ ملحق اور تابع کر کے جائز قرار دیا جاسکتا ہے؛ لیکن اگر مقصود ختم قرآن ہو تو اسے امامت فرائض کے ساتھ ملحق نہیں کیا جائے گا؛ کیوں کہ تراویح میں ختم قرآن محض ایک سنت ہے، اس کے نہ ہونے سے دین میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوتا، خلاصہ یہ ہے کہ شعائر دین کے تحفظ کے لئے مطلق امامت تراویح (جو ختم قرآن کی شرط کے ساتھ مشروط نہ ہو، مثلاً ''الم ترکیف'' یا ''مایجوز بہ الصلاۃ'' قراءت سے تراویح میں امامت کی جائے) کو امامت فرائض کے ساتھ

شامل کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن اگر اس کے ساتھ صراحتاً یا عرفاً ختم قرآن کی شرط لگا دی جائیگی تو اس کا عوض لینا جائز نہ ہوگا اور ہمارے علاقوں میں عرف یہی ہے کہ حافظ کو نفس تراویح کے بدلے کوئی عوض نہیں دیتا؛ بلکہ ختم قرآن ہی پر عوض دیا جاتا ہے، چنانچہ اگر کوئی حافظ ختم کئے بغیر کہیں چلا جائے تو اسے کوئی معاوضہ دینے کو تیار نہیں ہوتا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ معاشرہ میں معاوضہ دینے کا رواج نفس تراویح پر نہیں ہے؛ بلکہ ختم قرآن پر ہے، جس کی اجازت نہیں؛ اس لئے کہ یہ آیت قرآنی: ”وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا“ [سورة البقرة: ٤١] کی ممانعت کے تحت صراحتاً داخل ہے اور اس کے متعلق جو حیلہ آپ نے سوال میں درج کیا ہے وہ جواز کے لئے کافی نہیں؛ کیوں کہ جب مقصود ختم قرآن ہوگا تو فیما بینہ وبین اللہ یہ عوض درست نہ ہوگا۔ اور دیانت والے معاملے میں حیلے مفید حل واقعی نہیں ہوتے۔

(فتاوی دار العلوم ۱۵/ ۲۱۸-۲۸۲، امداد الفتاوی ۱/ ۴۷۴-۴۸۴، فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۵۱-۷۴)

قال الله سبحانه وتعالیٰ: ”وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا“ [البقرة: ٤١]

قال أبو العالية: لا تأخذوا عليه أجرا. (تفسير ابن كثير ١/ ٢٢٢، زكريا ديو بند، الدر المنثور، دار الكتب العلمية بيروت ١/ ١٢٥)

عن عبدالله بن شبل قال: قال رسول الله ﷺ: اقرؤا القرآن، ولا تأكلوا به، ولا تستكثروا به، ولا تجفوا عنه، ولا تغلوا فيه. (مصنف ابن أبي شيبة، الصلاة، فى الرجل يقوم بالناس في رمضان، فيعطى، موسسة علوم القرآن، جديد ٥/ ٢٤٠، رقم: ٧٨٢٥، مسند أحمد حنبل ٣/ ٤٢٨، رقم: ١٥٦١٤، ٤/ ٤٤٤، رقم: ١٥٧٥٦، ١٥٧٥٨، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٣/ ٢٥٣، رقم: ١٠٤٤)

عن سليمان بن بريدة عن أبيه قال: قال رسول الله ﷺ: من قرأ القرآن يتأكل به الناس جاء يوم القيامة ووجهه عظم ليس عليه لحم. (شعب الإيمان، دار الكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٣٣، رقم: ٢٦٢٥)

عن عمران بن حصين، أنه مر على قارئ يقرأ، ثم سأل، فاسترجع، ثم قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من قرأ القرآن فليسأل الله

بـه، فإنه سيجئ أقوام يقرؤن القرآن، يسألون به الناس. (ترمذي شريف، أبواب فضـائل القرآن، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۱۱۹، دارالسلام، رقم: ۲۹۱۷، مسند أحـمـد بـن حنبل ٤/ ٤٤٩، رقم: ۲۰۱۸٦، ٤/ ٤٣٢، رقم: ٢٠١٢٦، مسند البزار، مكتبة العلـوم والحكم ۹/ ۳٦، رقم: ٣٥٥٣، المعجم الكبير للطبراني، داراحياء التراث العربي ١٨/ ١٦٦، رقم: ٣٦٠)

وقـال عبـدالله بـن مسـعود: إنه سيجيء زمان يسئل فيه بالقرآن، فإذا سألوكم فلا تعطوهم. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٤٣، رقم: ٢٦٣١)

عـن عبدالله بن معقل أنه صلى بالناس في شهر رمضان، فلما كان يوم الـفـطر بعث إليه عبيد الله بن زياد بحلة وبخمس مائة درهم، فردها، وقال: إنـا لا نـأخذ على القرآن أجرا. (الـمـصـنف لابـن أبي شيبة، الصلاة، في الرجل يقوم بالناس في رمضان فيعطي، موسسة علوم القرآن جديد ٥/ ٢٣٧، رقم: ٧٨٢١)

قـال عـمر –رضى الله عنه– اقرؤوا القرآن وسلوا الله به قبل أن يقرأه قـوم يسـألون الناس به. (مـصـنف ابـن أبـي شيبة، الـصلاة، في الرجل يقوم بالناس في رمضان فيعطي، موسسة علوم القرآن جديد ٥/ ٢٤٠، رقم: ٧٨٢٦)

التـراويـح سنة مؤكدة، ومن لم يرها سنة فهو رافضي يقاتل كمن لم ير الـجـمـاعة، وقـال أهـل السـنة والـجماعة: إنها سنة رسول الله صلى الله عليه وسـلـم، فـعـلهـا ثـلاث ليـال، وفـي الـخانية: سنة مؤكدة توارثها الخلف عن السـلف مـن لـدن تـاريخ رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى يومنا هذا، هكذا روى الـحسن عن أبي حنيفة رحمه الله، وقد واظب عليها الخلفاء الراشدون.

(تاتارخانية، الصلاة، الفصل الثالث عشر التراويح، زكريا ٢/ ٣١٦، رقم: ٢٥٣١)

التـراويـح سـنة مـؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين للرجال والنساء إجـمـاعـا، ووقتها بعد صلاة العشاء، قال الشامي: سنة مؤكدة، صححه في

الهداية وغيرها، وهو المروي عن ابي حنيفةؒ، وفي شرح منية المصلي: وحكى غير واحد الإجماع على سنيتها. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراويح، كراچی ۲/ ۴۳، زكريا ۲/ ۴۹۳)

التراويح سنة بإجماع الصحابة، ومن بعدهم من الأئمة منكرها مبتدع ضال مردود الشهادة، كما في المضمرات...... وإنما ثبت العشرون بمواظبة الخلفاء الراشدين ماعدا الصديقؓ، ففي البخاري: فتوفي رسول الله صلى الله عليه وسلم، والأمر على ذلک في خلافة أبي بكر وصدر من خلافة عمر حين جمعهم عمر على أبي بن كعب، فقام بهم في رمضان، فكان ذلک أول اجتماع الناس على قارئ واحد في رمضان كما في فتح الباري. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، الصلاة، فصل في التراويح، دارالكتاب ديوبند، ص: ۴۱۱)

والختم مرة سنة، ومرتين فضيلة، وثلاثا أفضل، ولا يترک الختم لكسل القوم لكن في الاختيار الأفضل في زماننا قدر مالا يثقل عليهم وأقره المصنف وغيره، قال الشامي: لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراءة حلية عن المحيط، وفيه إشعار بأن هذا مبني على اختلاف الزمان، فقد تتغير الأحكام لاختلاف الزمان في كثير من المسائل على حسب المصالح، ولهذا قال في البحر: فالحاصل أن المصحح في المذهب أن الختم سنة لكن لا يلزم منه عدم تركه إذ لزم منه تنفير القوم، وتعطيل كثير من المساجد خصوصا في زماننا، فالظاهر اختيار الأخف على القوم. (شامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث في صلاة التراويح، كراچی ۲/ ۴۷، زكريا ۲/ ۴۹۸، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثالث عشر في التراويح، زكريا ۲/ ۳۲۴، رقم: ۲۵۵۲، هندية، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ۱/ ۱۱۷، جديد ۱/ ۱۷۷، بدائع الصنائع، الصلاة، فصل في سنن التراويح، زكريا ۱/ ۶۴۶، كراچی ۱/ ۲۸۹)

قال في الهداية: الأصل أن كل طاعة يختص بها المسلم لا يجوز الاستئجار عليها عندنا؛ لقوله عليه السلام: "اقرؤا القرآن ولا تأكلوا به" فالاستئجار على الطاعات مطلقا لا يصح عند أئمتنا الثلاثة، ولا شك أن التلاوة المجردة عن التعليم من أعظم الطاعات التي يطلب بها الثواب، فلا يصح الاستئجار عليها؛ لأن الاستئجار بيع المنافع، وليس للتالي منفعة سوى الثواب، ولا يصح بيع الثواب، وقال القارئ: ويمنع القارئ للدنيا والآخذ والمعطي آثمان. (تنقيح الفتاوى الحامدية ۲/ ۱۳۸)

ولا تصح الإجارة لأجل الطاعات مثل الأذان والحج، والإمامة، وتعليم القرآن، والفقه، ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن، والفقه، والإمامة، والأذان. (الدرمع الرد، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، کراچی ٦/ ٥٥، زكريا ٩/ ٧٧)

وقال العلامة فخر الدين الزيلعي: والفتوى اليوم على جواز الاستئجار لتعليم القرآن، وهو مذهب المتأخرين من مشايخ بلخ، استحسنوا ذلک وقالوا: بنى أصحابنا المتقدمون الجواب على ماشاهدوا من قلة الحفاظ ورغبة الناس فيهم، وكان لهم عطيات من بيت المال، وأما اليوم، فذهب ذلک كله واشتغل الحفاظ بمعاشهم، وقل من يعلم حسبة، ولا يتفرغون له أيضا، فإن حاجتهم تمنعهم من ذلک فلو لم يفتتح لهم باب التعلم بالأجر لذهب القرآن فأفتوا بجواز ذلک. (تبيين الحقائق، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ٦/ ١١٧، إمداديه ملتان ٥/ ١٢٤، البحر الرائق، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ٨/ ٣٤، کوئٹہ ٨/ ١٩، هدايه، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفي ٣/ ٣٠١)

وقد اتفقت كلمتهم جميعا على التصريح بأصل المذهب من عدم

الجواز، ثم استثنوا بعده ما علمته، فهذا دليل قاطع وبرهان ساطع على أن المفتي به ليس هو جواز الاستئجار على كل طاعة، بل على ماذكروه فقط مما فيه ضرورة ظاهرة تبيح الخروج عن أصل المذهب. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٥، زكريا ٩/ ٧٦)

والمعروف عرفا كالمشروط شرطا. (شامي، كتاب الوقف، مطلب فيما يأخذه المتولي من العوائد العرفيه، زكريا ٦/ ٦٧٢، كراچی ٤/ ٤٥٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٥/ ١١٣، ٦/ ٣٠٦، البناية، كتاب الصلح، باب الصلح في الدين، اشرفيه ١٠/ ٢٩، كتاب الإجارة، باب مايجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها (١٠/ ٢٥٩)

(۲) جوامام مستقل ہواوروہ یہ شرط لگائے کہ میں رمضان میں تنخواہ زائدلوں گااوروہ اضافہ بھی متعین ہو، یا یہ کہے کہ سال بھر ہرمہینہ میری تنخواہ میں اتنا اضافہ کردیا جائے اورمسجد کی منتظمہ کمیٹی اسے قبول کرلےاوراس اضافہ میں ختم کی کوئی شرط نہ ہو،تو یہ معاملہ شرعاً درست ہے، ایسی صورت میں وہ امام خودقرآن سنائے یا دوسرا کوئی حافظ قرآن پڑھے بہرحال امام اضافہ کا مستحق ہوگا۔اوراگرمنتظمہ کمیٹی نے ختم قرآن کی شرط کے ساتھ اضافہ منظورکیا ہےتو اس معاوضہ کالین دین بہرحال جائز نہ ہوگا۔

ويفتى اليوم بصحتها (أي الإجارة) لتعليم القرآن، والفقه، والإمامة، والأذان. (الدرمع الرد، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، كراچی ٦/ ٥٥، زكريا ٩/ ٧٦)

وبعضهم استثنى تعليم الفقه، والإمامة. (رسائل ابن عابدين، ثاقب بکڈپو ١/ ١٦٣)

(۳) اگرکوئی شخص تراویح میں قرآن سنانے کے ساتھ ساتھ تفسیر بھی کرتا ہےاوراس کا واقعی مقصد تفسیر ہی ہے، ختم قرآن مقصودنہیں ہے،تو تفسیری بیان کے عوض رقم لینا درست ہے؛ کیوں کہ یہ بھی تعلیم کی ایک شکل ہے، تاہم یہ اجرت متعین ہونی چاہئے اوراس کی ادائیگی ختم قرآن کےموقع پر نہ ہونی چاہئے ،تاکہ اشتباہ نہ ہو۔

وزاد بعضهم الأذان والإقامة والوعظ. (شامي، زكريا ۹/ ۷۷، کراچی ۶/ ۵۵)

(۴) مسئولہ صورت میں جمع شدہ رقم ہدیہ یا اضافہ کے طور پر مستقل امام یا مؤذن کو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اگر حافظ قرآن امام مؤذن کے علاوہ ہو تو ختم قرآن کے بدلے حافظ قرآن کو دینا درست نہیں ہے۔

ويفتى اليوم بصحتها، أي الإجارة لتعليم القرآن، والفقه، والإمامة، والأذان. (الدرمع الرد، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، كراچی ۶/ ۵۵، زكريا ۹/ ۷۶)

وبعضهم استثنى تعليم الفقه، والإمامة. (رسائل ابن عابدين، ثاقب بکڈپو ۱/ ۱۶۳)

(۵) اگر کسی جگہ سورہ تراویح پڑھانے کے لئے بلا معاوضہ امام دستیاب نہ ہوسکے، تو ایسی صورت میں تراویح کو فرائض کے ساتھ ملحق اور تابع بنا کر اس کی امامت کا معاوضہ دینے کی گنجائش ہوگی۔ (دیکھئے حوالہ بالا)

(۶) جس طرح قرآن سنانے والے کے لئے معاوضہ جائز نہیں ہے، اسی طرح سامع کے لئے بھی معاوضہ لینا جائز نہیں ہے، اس مسئلہ میں پہلے حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے تعلیم قرآن پر قیاس کر کے جواز کا قول ارشاد فرمایا تھا، پھر بعد میں اس سے رجوع کر کے عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو: (التذکیر والتھذیب ۳/ ۸۳، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۶)

ہمارے نزدیک یہی رائے احوط ہے؛ کیوں کہ سماع میں تعلیم کا پہلو مغلوب اور عبادت کا پہلو غالب ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱/۱۳ھ

اجرت ختم قرآن سے متعلق ایک اہم فتویٰ

حضرت مفتی صاحب الجامعۃ الاسلامیہ دار العلوم خولنا بنگلہ دیش، دامت برکاتہم

سوال [۳۲۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعد سلام مسنون گزارش ہے کہ ہم لوگ رمضان شریف میں ختم تراویح پڑھ کر حافظ صاحب کو پیسہ دیا کرتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ یہ پیسہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور جائز نہ ہوتو کوئی ایسی صورت ہے کہ جس کی وجہ سے جائز ہو، دلیل کے ساتھ جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: حافظ محمد قطب الدین محمود نواپاڑا، متعلم کڑیا مدرسہ خولنا، بنگلہ دیش

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رمضان کے مہینہ میں ختم تراویح پڑھ کر اجرت دینا جائز ہے، چاہے وہ امام حافظ ہو یا قاری، تھوڑا پڑھا ہو یا پورا ختم پڑھا ہو؛ کیوں کہ رمضان کے مہینہ کی تراویح میں قرآن پاک کو ختم کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ اور تراویح خاص طور سے ختم قرآن ہی کے لئے ہے، جیسا کہ تراویح کی جماعت سنت مؤکدہ یعنی واجب کے قریب قریب ہے، ویسا ہی پانچ وقت کی نماز کے لئے اذان دینا وامامت کرنا، سنت مؤکدہ ہے، تو اس کے لئے اجرت لینے میں جیسے کوئی منع نہیں ہے، اسی طرح تراویح کی نماز میں بھی اجرت لینے میں کوئی منع اور رکاوٹ نہیں ہے؛ کیوں کہ دونوں ہی ضروریات دین میں شامل ہیں اور تراویح کی نماز میں قرآن ختم کرنا صرف تلاوت مجردہ نہیں ہے، اس کے متعلق مندرجہ اقوال علماء متأخرین کے یہ ہیں:

مسلمانوں پر جس عبادت کو فرض کیا گیا ہے، اس عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، یہی متقدمین کا فتویٰ ہے؛ کیوں کہ متقدمین حضرات کے زمانہ میں معلم اور استاذ قرآن اور حدیث کو نیکی سمجھ کر تعلیم دیا کرتے تھے اور طلبہ و متعلمین حضرات ان لوگوں کے احسان کا بدلہ

احسان ہی کے ذریعہ دیا کرتے تھے اوران دونوں فریق یعنی استاذ اورشاگرد کے درمیان کوئی شرط نہیں ہوتی تھی ،بعد میں یہ حالت پیش آئی کہ مذکورہ چیز امت سے رخصت ہونے لگی،جس کی وجہ سے نہ اس قسم کے استاذ ملتے ہیں نہ اس قسم کے طلبہ کہ بلا اجرت دین کا کام کریں،اسی وجہ سے متأخرین میں سے بعض حضرات نے عبادت مؤکدہ پر اجرت لینے کی اجازت کواچھا سمجھا اوراس پرفتویٰ دیا۔

صاحب ہدایہ شیخ الاسلام برہان الدین مرغینانی نے لکھا ہے:

ولا الاستئجار على الأذان والحج، وكذا الإمامة وتعليم القرآن، والفقه (وبين السطور هذا على رأى المتقدمين) لقوله عليه السلام: اقرؤا القرآن، ولا تأكلوا به، وفي آخر ماعهد رسول الله عليه السلام إلى عثمان بن أبي العاص، وإن اتخذت مؤذنا فلا تأخذ على الأذان أجرًا وبعض مشايخنا (وبين السطور مشايخ بلخ) استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم؛ لأنه ظهر التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع يضيع حفظ القرآن، وفي الحاشية على الامتناع فإن المتقدمين من أصحابنا بنوا جوابهم على ما شهدوا في عصرهم من رغبة الناس في التعليم بطريق الحسبة، ومروة المتعلمين في مجازاة الإحسان بالإحسان من غير شرط، وأما في زماننا فقد انعدم المغيان جمعيا. (هدايه أشرفى ٣/ ٣٠٣)

عمدۃ المتأخرین علامہ ابن عابدین نقل کرتے ہیں:

ولا لأجل الطاعات مثل الأذان، والحج، والإمامة، وتعليم القرآن، والفقه، ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن، والفقه، والإمامة، والأذان.

(الدرالمختار، کراچی ٦/ ٥٥، زکریا ٩/ ٧٦)

ان قولوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں امامت واذان اورتعلیم قرآن دے کر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں ہے،رمضان شریف میں نمازتراویح کی امامت دوسری نماز کی امامت سے الگ کوئی نماز نہیں ہے۔

(۱)دلیل: **الأذان سنة (وبين السطور مؤكدة).** (هداية اشرفی ۱/ ۸۷)

(۲) **الجماعة سنة مؤكدة؛ لقوله عليه السلام: الجماعة من سنن الهدى.** (هداية اشرفی ۱/ ۱۲۱)

(۳) **الجماعة سنة مؤكدة، أي تشبيه الواجب في القوة.** (الكفاية ۱/ ۲۹۹)

(٤) **لأن المؤكدة في حكم الواجب في لحقوق الإثم بالترك.** (ردالمحتار ۱/ ۸٤)

(٥) **والسنة فيها (في ترويحة) الجماعة.** (هداية اشرفی ۱/ ۱٥۱)

(٦) **وأكثر المشايخ على أن السنة فيها الختم مرة، فلا يترك لكسل القوم، وفي الحاشية: والختم مرة سنة مؤكدة.** (هدايه اشرفی ۱/ ۱٥۱)

تراویح ختم قرآن کے لئے ہے: عمدۃ المتأخرین علامہ ابن عابدین نقل کرتے ہیں:

ثم إذا ختم قبل آخر الشهر قيل: لا يكره له ترك التراويح فيما بقي؛ لأنها شرعت لأجل ختم القرآن مرة، قاله أبو علي النسفي: وقيل يصليها ويقرأ فيها ماشاء ذكره في الذخيرة. (الدرالمختار، کراچی ۲/ ٤۷، زکریا ۳/ ٤۹۷)

غلط فہمی کا ازالہ: تلاوت مجردہ اور ایصال ثواب پر تراویح کا قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے؛ کیوں کہ تلاوت مجردہ اور ایصال ثواب میں ختم قرآن ہوتا ہے۔ اور تراویح کی نماز دوسری نماز کی طرح ہے، رکوع سجدہ اور ارکان کے اعتبار سے جس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی، اس کے باوجود اس کو کس طرح تلاوت مجردہ پر قیاس کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے تلاوت مجردہ کی طرح اجرت لینے کو ناجائز کہنے کا کوئی حق نہیں ہے؛ کیوں کہ تلاوت مجردہ کے معنی صرف تلاوت کر کے اس کا ثواب پہنچانا اجرت لے کر جو تراویح کے ساتھ کسی قسم کی مشابہت نہیں رکھتی؛ بلکہ پانچ وقت کی نماز، جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھانے والے امام کو ضروریات دین کے خاطر اگر اجرت دینا جائز ہے، تو تراویح کی نماز پڑھانے والے امام کو اجرت دینا کس طرح ناجائز ہوسکتا ہے؟

نماز تراویح سنت مؤکدہ اور ختم قرآن بھی سنت مؤکدہ ہے، اگر حافظ کو اجرت نہ دی جائے تو وہ قرآن بھول جائے گا اور صرف تراویح کے لئے کوئی حافظ نہیں ملے گا، اگر مل بھی جائے تو عدد کے اعتبار سے بہت ہی کم، اب ہر جگہ حافظ کو اجرت دی جارہی ہے، تو اس کو عموم بلویٰ ”الضرورات تبیح المحظورات“ دو اصول کے تحت ضروریات دین کی خاطر وقتیہ نماز کی طرح تراویح پڑھانے والے حافظ کو بھی اجرت دینا جائز ہے۔ واللہ أعلم وعلمہ أتم وأحکم.

غلام رحمٰن، خادم دارالافتاء دارالعلوم مدرسہ خولنا بنگلہ دیش
۲/۸/۱۴۲۴ھ

مذکورہ فتویٰ سے متعلق دارالعلوم دیوبند کے ایک طالب علم کا استفتاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت مفتیان کرام دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون گزارش ہے کہ مذکورہ فتویٰ کے بارے میں آپ حضرات کی کیا رائے ہے، اگر یہ مسئلہ صحیح ہے تو تائید فرمائیں، اور اگر غلط ہے تو مدلل اور مفصل تحریر فرماکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ فقط والسلام

المستفتی: مصطفیٰ کمال بنگلہ دیش، متعلم دارالعلوم دیوبند

اجرت ختم قرآن کے عدم جواز پر دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد کی طرف سے ایک جامع اور مفصل فتویٰ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برادر عزیز جناب مولوی مصطفیٰ کمال صاحب متعلم دارالعلوم دیوبند! آں عزیز نے ختم قرآن پر اجرت کے جواز پر جناب مفتی غلام رحمٰن کا مفصل فتویٰ روانہ فرمایا ہے، اس فتویٰ کو بار بار پڑھا گیا اور اس کے بالمقابل حضرات فقہاء کرام اور

اکابر اہل فتاویٰ کی عبارات اور ان کی آراء پر بھی بار بار نظر ڈالی گئی، آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ مذکورہ فتویٰ فقہائے عظام، اکابر اہل فتاوی اور جمہور امت کے خلاف ہے اور جتنے قیاس واستدلال سے کام لیا گیا ہے وہ بھی درحقیقت برمحل نہیں ہیں؛ اس لئے مذکورہ فتویٰ صحت پر محمول نہیں ہے، اور نہ ہی تراویح میں قرآن سنا کر اجرت لینا جائز اور درست ہے، لینے والے اور دینے والے دونوں گنہگار ہوں گے، مذکورہ فتویٰ سے متعلق چند مخصوص مسامحت کی نشاندہی کی جاتی ہے:

(۱) مذکورہ فتویٰ میں تراویح کے ختم قرآن کو تعلیم قرآن پر قیاس کیا گیا ہے، یہ قیاس درست نہیں؛ کیوں کہ ختم قرآن ایک مستقل چیز ہے اور تعلیم قرآن اس سے الگ دوسری چیز، اس لئے کہ تراویح میں قرآن پڑھنے اور استاذ وشاگرد کے درمیان قرآن کی تعلیم دینے میں بہت بڑا فرق ہے؛ کیوں کہ تعلیم قرآن میں سیکھنا سکھانا مقصود ہوتا ہے، ایک ایک آیت کو بار بار پڑھ کر اور پڑھا کر استاذ کی طرف سے شاگرد کو سکھانے اور یاد کرانے میں محنت ہوتی ہے اور تراویح میں قرآن پڑھنے والے اور سننے والے کے درمیان یہ محنت اور سیکھنا سکھانا لازم نہیں آتا؛ بلکہ وہ محض تلاوت مجردہ کے مشابہ ومرادف اور اسی کے حکم میں ہے۔

ثم استثنوا تعليم القرآن من الطاعات، وبعضهم استثنى أيضا تعليم الفقه والإمامة، والأذان، والإقامة، كما علمت ذلك مما نقلناه عن المتون وغيرها، وهذا من أقوى الأدلة على ما قلنا من أن ما أفتوا به ليس عاما في كل طاعة، بل هو خاص بما نصوا عليه مما وجد فيه علة الضرورة والاحتياج. (رسائل ابن عابدين، الرسالة السابعة، ثاقب بكڈپو ديوبند ۱/ ۱۶۳)

لہٰذا فاضل مفتی صاحب کا قیاس درست نہیں ہے۔

(۲) فاضل مفتی صاحب نے تراویح میں قرآن سنانے کو عام نمازوں کی امامت کے مشابہ قرار دینے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے اور ساتھ میں حضرات فقہاء اور اکابر اہل فتاوی کی رائے پر بڑے زوردار الفاظ سے رد فرمایا ہے کہ تلاوت مجردہ اور ایصال ثواب پر تراویح کا قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اس میں فاضل مفتی صاحب کو سخت مسامحت ہوئی

ہے، انہوں نے استدلال کرتے وقت محض تراویح کا لفظ استعمال کیا ہے، تراویح میں ختم قرآن کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے؛ لیکن سیاق وسباق اور مفتی صاحب کا مقصد اس عبارت سے یہی ہے کہ تراویح میں قرآن سنانے کو تلاوت مجردہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، فاضل مفتی صاحب کو اس تردید میں مسامحت اس لئے ہوئی ہے کہ انہوں نے نماز تراویح اور ختم قرآن کو ایک ہی کردیا ہے اور دونوں چیزوں کو ایک دوسرے سے لاینفک بنا دیا ہے، جیسا کہ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ تراویح پڑھنے کی بنیاد قرآن سنانا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر غیر حافظ عالم دین تراویح کی نماز میں امامت کرے گا، تو کیا تراویح کی نماز صحیح نہیں ہوگی؟ میرے خیال میں تو فاضل مفتی صاحب ضرور جواب دیں گے کہ تراویح کی نماز صحیح ہوجائے گی، تو پھر تراویح میں ختم قرآن لازم کہاں سے آیا؟ بلکہ بعض دفعہ لوگوں پر شاق گذرنے کی صورت میں بغیر ختم کے مختصر سورتوں سے قرآن پڑھنا زیادہ افضل ہے، جیسا کہ فقہاء کی حسب ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

وقيل: من سورة الفيل إلى الآخر مرتين، وهو الأحسن عند أكثر المشايخ، وفي أكثر المعتبرات الأفضل في زماننا أن يقرأ بما لا يؤدي إلى تنفير القوم عن الجماعة؛ لأن تكثير الجماعة أفضل من تطويل القراءة، وبه يفتى. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، مصري قديم ١/ ١٣٧، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٢٠٤)

درحقیقت صحیح بات یہی ہے کہ دو سنتیں الگ الگ ہیں، جیسا کہ موصوف نے بھی اپنی تحریر کے اخیر میں اس کا اقرار کیا ہے۔

(۱) نفس تراویح کی نماز جو مختصر سے مختصر سورتوں کے ذریعہ بھی پوری ہوجاتی ہے، جیسا کہ جن مساجد میں ختم قرآن نہیں ہوتا ہے، ان میں سے اکثر مساجد میں الم ترکیف سے تراویح کی نماز ہوتی ہے، اس سے بھی تراویح کی سنت مکمل طریقے سے ادا ہوجاتی ہے، جیسا کہ فقہاء کی عبارات ذیل سے یہ بات صاف واضح ہوجاتی ہے:

لو قرأ ثلاثا قصارا، أو آية طويلة في الفرض فقد أحسن، ولم يسئي، فما ظنک بالتراويح، وفي فضائل رمضان للزاهدي: أفتى أبوالفضل الكرماني والوبري أنه إذا قرأ في التراويح الفاتحة وآية أو آيتين لا يكره، ومن لم يكن عالما بأهل زمانه فهو جاهل. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، کراچی ٢/ ٤٧، زکریا ٢/ ٤٩٨، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، الصلاة، التراويح، دارالكتاب ديوبند جديد، ص: ٤١٥)

والمتأخرون كانوا يفتون في زماننا بثلاث آيات قصار، أو آية طويلة حتى لا يمل القوم ولا يلزم تعطيلها. (شامي، الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، کراچی ٢/ ٤٧، زکریا ٢/ ٤٩٨)

وفي التجنيس: واختار بعضهم سورة الإخلاص في كل ركعة، وبعضهم سورة الفيل، أي البداء ة منها ثم يعيدها، وهذا أحسن لئلا يشتغل قلبه بعدد الركعات، قال في الحلية: وعلى هذا استقر عمل أئمة أكثر المساجد في ديارنا. (شامي، کراچی ٢/ ٤٧، زکریا ٢/ ٤٩٨، الفتاوى التاتارخانية، الصلاة، الفصل الثالث عشر التراويح، زكريا ٢/ ٣٢٥، رقم:٢٥٥٧)

أي البدائة منها إلى آخره أي إلى آخر القرآن في عشر ركعات، ثم يعيد من سورة الفيل إلى الآخر في العشر الثاني. (تقريرات رافعي/١٢٨، مع الشامي، کراچی ٢/ ٤٧، زکریا ٢/ ٤٩٨)

(۲) تراویح میں سہولت سے ہو سکے تو قرآن کریم ختم کیا جائے، اس میں بھی تفصیل یہ ہے کہ اگر آسانی سے ہو سکے تو تین ختم کرے، یہ نہ ہو سکے تو دو ختم کرے، یہ بھی نہ ہو سکے تو ایک ختم کرے۔ اور اگر ایک ختم بھی لوگوں پر شاق گذرے تو پھر ختم قرآن نہ کرے؛ بلکہ مختصر سورتوں کے ساتھ تراویح کی نماز پڑھ لی جائے، جیسا کہ حسب ذیل فقہی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

والختم مرة سنة، ومرتين فضيلة، وثلاثا أفضل، ولا يترك الختم لكسل القوم لكن في الاختيار الأفضل في زماننا قدر ما يثقل عليهم.
(الدرالمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، مبحث في صلاة التراويح، كراچی ۲/ ۴۷، زكريا ۲/ ۴۹۷)

اب ان عبارات سے صاف واضح ہوگیا کہ تراویح اور ختم قرآن دونوں الگ الگ دو چیزیں ہیں، تراویح کی سنیت عمومی سنت مؤکدہ ہے، عالم حافظ عامۃ المسلمین سب کے لئے نفس تراویح جو "مایجوز بہ الصلاۃ" قراءت کے ذریعہ سے پوری ہوسکتی ہے، سنت مؤکدہ ہے، جیسا کہ دنیا کی لاکھوں مساجد میں مختصر قراءت اورالم ترکیف سے تراویح کی نماز ہورہی ہے اور وہ لوگ اسی سے تراویح کی سنت کا ثواب حاصل کررہے ہیں اور تراویح میں قرآن ختم کرنے کی سنت بالکل الگ دوسری چیز ہے۔ اور یہ سنت عمومی اور آفاقی نہیں ہے؛ بلکہ خصوصی اور جزوی ہے اور وہ بھی بشرط گنجائش اور بشرط سہولت ہے، اس سنت کو حاصل کرنے کے لئے ناجائز اور حرام طریقہ یعنی اجرت دے کر قرآن سننا اور اجرت لے کر قرآن سنانا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ جو کہ نہ تراویح کا جزو حقیقی ہے اور نہ ہی تراویح کے لئے لازم ہے، جیسا کہ فقہاء کی اس قسم کی عبارت سے واضح ہوتا ہے:

ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان، فالحاصل: أن ماشاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز؛ لأن فيه الأمر بالقراءة، وإعطاء الثواب للآخر، والقراءة لأجل المال، فإذا لم يكن للقارئ ثواب لعدم النية الصحيحة فأين يصل الثواب إلى المستأجر ولو لا الأجرة ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان، بل جعلوا القرآن العظيم مكسبا ووسيلة إلى جمع الدنيا إنا لله وإنا إليه راجعون. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ۶/ ۵۶)

(۳) فاضل مفتی صاحب نے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک غیر مفتی بہ اور کمزور قول کو نقل کرکے دعویٰ کیا ہے کہ تراویح ختم قرآن ہی کے لئے ہے، یعنی تراویح کا مقصد ہی قرآن ختم

کرنا ہے، نفس نماز تراویح مقصد نہیں ہے؛ لہٰذا اگر پانچ دن میں، دس دن میں قرآن ختم ہوجائے تو آئندہ دوسرے اور تیسرے عشرہ میں اگر تراویح نہ پڑھے تو کوئی حرج نہیں ہے، یہ فقہاء کے اقوال میں نہایت کمزور اور ناقابل اعتبار قول ہے، مفتی کے لئے معتبر اور مفتی بہ قول کی موجودگی میں غیر مفتی بہ اور کمزور وضعیف قول پر فتویٰ جاری کرنا ممنوع ہے، اس مسئلہ میں مفتی بہ اور معتبر قول یہی ہے کہ تراویح صرف ختم ہی کے لئے نہیں ہے؛ بلکہ یہ مستقل سنت ہے جو ماہ رمضان کے شروع سے آخر تک مسلسل جاری رہتی ہے؛ لہٰذا جن مساجد میں ختم قرآن کا سلسلہ ہے اور دس یا پندرہ دن میں قرآن ختم ہوجاتا ہے، تو بقیہ ایام میں اخیر مہینہ تک مختصر سورتوں کے ساتھ تراویح کا سلسلہ جاری رکھنا مسنون اور افضل ہے، اسی طرح جن مساجد میں ختم قرآن نہیں ہوتا اور مختصر قراءت سے نماز تراویح پڑھی جاتی ہے، ان میں بھی پورے رمضان بغیر ختم قرآن کے نماز تراویح پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، اسی پر فقہاء کا فتویٰ ہے، جیسا کہ حسب ذیل عبارات فقہیہ سے واضح ہوتا ہے:

لو حصل الختم ليلة التاسع عشر، أو الحادي والعشرين لا تترک التراويح في بقية الشهر؛ لأنها سنة، كذا في الجوهرة النيرة، الأصل أنه يكره له الترک، كذا في السراج الوهاج. (هندية، الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ۱/ ۱۱۸، جديد ۱/ ۱۷۷)

ولو ختم في التراويح في ليلة، ثم لم يصل التراويح جاز بلا كراهة؛ لأنه ما شرعت التراويح إلا للقراءة، وقيل: الأفضل أن يقرأ فيها مقدار ما يقرأ في المغرب، وقيل: آيتين متوسطتين، وقيل: آية طويلة، أو ثلاث آيات قصار، وهذا أحسن، وبهذا أفتى المتأخرون. (مجمع الأنهر الجديد، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۰۴)

وقيل: من سورة الفيل إلى الآخر مرتين، وهو الأحسن عند أكثر المشايخ، وفي أكثر المعتبرات الأفضل في زماننا أن يقرأ بما لا يؤدي إلى

تنفير القوم عن الجماعة؛ لأن تكثير الجماعة أفضل من تطويل القراء ة، وبه يفتى. (مجمع الأنهر، الصلاة، فصل في التراويح، دارالكتب العلمية، بيروت جديد ۱/ ۲۰٤)

وأما الذي هو سنن الصحابة فصلاة التراويح في ليالي رمضان (إلى قوله) أما صفتها فهي سنة، كذا روى الحسن عن أبي حنيفة أنه قال: القيام في شهر رمضان سنة لا ينبغي تركها. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في سنن التراويح، كراچی ۱/ ۲۸۸، زکریا ۱/ ٦٤٤)

(۴) مذکورہ فتویٰ میں ختم قرآن پر اجرت کے جواز کے لئے فاضل مفتی صاحب نے بار بار اس طرح کی عبارتیں لکھیں ہیں کہ جب عام نمازوں کی امامت پر اجرت دینا درست ہے، تو رمضان شریف میں نماز تراویح کی امامت دوسری نمازوں کی امامت سے الگ کوئی نماز نہیں ہے۔ اور کہیں لکھا ہے کہ تراویح کی نماز دوسری نماز کی طرح ہے، رکوع، سجدہ وارکان کے اعتبار سے اس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی، تو عجیب حیرت کی بات یہ ہے کہ دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے اور جب دلیل اور قیاس ومقیس علیہ اور مشبہ مشبہ بہ پیش کرتے ہیں تو اس میں نماز تراویح کو پیش کرتے ہیں، ختم قرآن کا ذکر نہیں کرتے؛ حالانکہ موضوع بحث ختم قرآن پر اجرت کا جواز اور عدم جواز ہے، نفس تراویح پر اجرت کا جواز اور عدم جواز نہیں ہے، اگر کسی جگہ الم ترکیف سے تراویح کی نماز ہوتی ہے اور امام اس پر اجرت لیتا ہے تو میری معلومات میں فقہائے متأخرین اور اکابر اہل فتاویٰ میں سے کسی نے بھی اس کے عدم جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے، یہ عجیب خلط مبحث ہے؛ حالانکہ اخیر میں موصوف نے تراویح اور ختم قرآن کو الگ الگ دو سنتیں جداگانہ تسلیم بھی کیا ہے، حضرات فقہاء اور اکابر اہل فتاویٰ ختم قرآن کی سنیت کے بھی قائل ہیں اور اس پر اجرت لینے کی حرمت کے بھی قائل ہیں، موضوع بحث ختم قرآن والی سنت ہے نہ کہ نماز تراویح والی سنت، نیز تلاوت قرآن پر اجرت لینے کی ممانعت نص قطعی سے ثابت ہے۔ اور اذان واقامت پر اجرت لینا نص قطعی سے ثابت نہیں ہے؛ اس لئے دونوں ایک نہیں ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے لئے مقیس

علیہ بن سکتے ہیں، اسی لئے فقہاء نے صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کردی ہے کہ ضرورت کی بنا پر تعلیم قرآن، فقہ، حدیث، تفسیر، اذان، امامت، قضاء اور افتاء پر اجرت کی گنجائش قرار دے کر صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ ان کے ماعدا پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، پھر مزید قراءت قرآن کو خاص طور پر متعین کر کے ذکر کیا ہے کہ اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، جیسا کہ فقہاء کی حسب ذیل عبارات سے واضح ہوتا ہے:

وقد اتفقت كلمتهم جميعا على التصريح بأصل المذهب من عدم الجواز، ثم استثنوا بعده ما علمته، فهذا دليل قاطع وبرهان ساطع على أن المفتى به ليس هو جواز الاستئجار على كل طاعة، بل على ما ذكروه فقط مما فيه ضرورة ظاهرة تبيح الخروج عن أصل المذهب من طرو المنع، فإن مفاهيم الكتب حجة، ولو مفهوم لقب على ما صرح به الأصوليون، بل هو منطوق، فإن الاستثناء من أدوات العموم كما صرحوا به أيضا. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٦)

يظهر لک أن العلة في جواز الاستئجار على تعليم القراء ة، والفقه، والأذان، والإمامة هي الضرورة، واحتياج الناس إلى ذلک، وإن هذا مقصور على هذه الأشياء دون ما عداها مما لا ضرورة إلى الاستئجار عليه.

(رسائل ابن عابدين، ثاقب بكڈپو ١/ ١٦١)

ثم استثنوا تعليم القرآن من الطاعات، وبعضهم استثنى أيضا تعليم الفقه والإمامة، والأذان، والإقامة، كما علمت ذلک مما نقلناه عن المتون وغيرها، وهذا من أقوى الأدلة على ما قلنا من أن ما أفتوا به ليس عاما في كل طاعة، بل هو خاص بما نصوا عليه مما وجد فيه علة الضرورة والاحتياج. (رسائل ابن عابدين، ثاقب بكڈپو ديوبند ١/ ١٦٣)

أن ما أجازه المتأخرون إنما أجازوه للضرورة، ولا ضرورة في الاستئجار على التلاوة، فلا يجوز. (رسائل ابن عابدين، ثاقب بكڈپو ١/ ١٦٨)

اوپر جو یہ بات لکھی گئی کہ الم ترکیف وغیرہ سے نفس تراویح پر اجرت کے عدم جواز کا کوئی قائل نہیں ہے، یہ صرف اسی وقت ہے جب کہ صرف امامت تراویح ہی مقصود ہو، ختم قرآن مقصود نہ ہو، اگر ختم قرآن کو مقصود بنا کر تراویح کے لئے الگ سے امام رکھنے کا حیلہ کیا جائے گا، تو یہ حیلہ مفید حلت نہیں ہوگا، چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ: ''یہ جواز کا فتویٰ اس وقت ہے جب امامت ہی مقصود ہو؛ حالانکہ یہاں مقصود ختم تراویح ہے اور یہ محض حیلہ ہے دیانات میں جو کہ معاملہ فی ما بین العبد وبین اللہ ہے، حیل مفید جواز واقعی نہیں ہوتے؛ لہٰذا یہ ناجائز ہوگا''۔ (امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۹۵)

اس لئے یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہونی چاہئے کہ جب نفس تراویح میں امامت پر اجرت کی حلت ہوگئی تو ختم قرآن پر بھی حلت آجائے گی، ختم قرآن پر اجرت بہر حال حرام رہے گی۔

(۵) موصوف نے اس بات پر بھی بہت زور لگایا ہے کہ سنت کو سنت پر قیاس کیا جائے کہ اذان بھی سنت، امامت بھی اور ختم قرآن بھی سنت ہے، جب اذان وامامت کی سنت کی بقا کے لئے اجرت لینا دینا درست ہے، تو ختم قرآن کی سنت کی بقا کے لئے بھی اجرت لینا درست ہونا چاہئے، موصوف کا اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے یہی مرکز استدلال ہے، اس میں موصوف نے یہ خیال نہیں کیا ہے کہ جماعت اور اذان کی سنت اپنی اپنی جگہ مستقل بالذات ہے، مگر تراویح میں ختم قرآن کی سنت مستقل بالذات نہیں ہے؛ بلکہ ایسی ضمنی اور اضافی سنت ہے کہ اس سنت کے بغیر نفس نماز تراویح میں کوئی کمی نہیں آتی؛ بلکہ اس کی سنیت بدستور باقی ہے، جب کہ اذان اور امامت ایسی مستقل بالذات سنت ہے کہ اگر مؤذن نہ ہوتو اذان کا وجود نہیں ہوسکتا، اسی طرح اگر امام نہ ہوتو جماعت کا وجود نہیں ہوسکتا اور اذان وجماعت کا وجود ضروریات دین اور شعائر اسلام میں سے ہے۔ اور ان کی اجرت کی ممانعت قرآن کریم کی نص قطعی سے ثابت نہیں ہے؛ اس لئے فقہائے متأخرین نے ضرورت کی وجہ سے ان کی اجرت کے جواز پر فتویٰ دیا ہے، مگر نماز تراویح میں قرآن کریم کا ختم کرنا ایسی

مستقل بالذات سنت نہیں ہے کہ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے نفس نماز تراویح اور نماز تراویح کی امامت کا وجود ختم ہوجاتا ہو؛ بلکہ نفس نماز تراویح اور اس کی امامت بدستور باقی رہ جاتی ہے، نیز ختم قرآن کی تلاوت اور تلاوت مجردہ دونوں بالکل یکساں ہیں اور تلاوت مجردہ پر اجرت کی حرمت قرآن کریم کی نص قطعی سے ثابت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول: ”لَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا“ [سورة المائدة: آیت: ٤٤] تو پھر ایسی صورت میں ختم قرآن کی سنت اذان وامامت کی سنت کے برابر کیسے ہوسکتی ہے؟ اور ختم قرآن کی سنت کو اذان واقامت کی سنت کے برابر قرار دے کر اس پر اجرت کو جائز کہنا قطعاً غلط اور بے عقلی کی بات ہوگی، اسی وجہ سے حضرات فقہاء نے ضرورت کی وجہ سے جن امور میں اجرت لینے کی گنجائش دی ہے، ان کو نامزد بھی کردیا ہے، اوران کے ماعدا میں اجرت کو ناجائز کہا ہے۔ اور ختم قرآن کی اجرت بھی ماعدا میں شامل ہے، جیسا کہ حسب ذیل عبارات فقہیہ سے واضح ہوتا ہے:

إن ما أجازه المتأخرون إنما أجازوه للضرورة، ولا ضرورة في الاستئجار على التلاوة، فلا يجوز. (رسائل ابن عابدین، ثاقب بکڈپو ۱/ ۱٦٨)

يظهر لک أن العلة في جواز الاستئجار على تعليم القراءة، والفقه، والأذان، والإمامة هي الضرورة واحتياج الناس إلى ذلک، وإن هذا مقصور على هذا الأشياء دون ماعداها مما لا ضرورة إلى الاستئجار عليه.

(رسائل ابن عابدین، ثاقب بکڈپو ۱/ ۱٦۱)

(٦) موصوف نے جواز کے لئے ایک علت یہ بھی بیان کی ہے کہ اگر حافظ کو اجرت دے کر اس کا قرآن نہ سنا جائے تو حافظ صاحب قرآن بھول جائیں گے؛ اس لئے ”الضرورات تبیح المحضورات“ کے تحت ضروریات دین کی خاطر وقتیہ نماز کی طرح حافظ صاحب کو بھی اجرت دینی چاہئے، تو اب سوال یہ ہے کہ حافظ صاحب کے قرآن یاد رکھنے کے ذمہ دار یہی مقتدی حضرات ہیں یا خود حافظ صاحب اس کے مکلّف ہیں؟ کیا حافظ صاحب اگر قرآن بھول جائیں گے، تو اللہ کے یہاں قرآن بھولنے کی جو سزا ہے اس میں عوام الناس بھی شامل

ہوں گے یا صرف حافظ صاحب پر ہوگی؟ شاید مفتی صاحب کو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑے گا کہ قرآن بھولنے کی سزا صرف حافظ صاحب کو ملے گی، عوام اور مقتدیوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن أنس بن مالک رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: عرضت علي أجور أمتي حتى القذاة يخرجها الرجل من المسجد، وعرضت علي ذنوب أمتي، فلم أر ذنبا أعظم من سورة من القرآن، أو آية أوتيها رجل، ثم نسيها. (سنن الترمذي، أبواب فضائل القرآن، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۱۱۹، دارالسلام، رقم: ۲۹۱٦، سنن أبي داؤد، الصلاة، باب في كنس المسجد، النسخة الهندية ۱/ ٦٦، دارالسلام، رقم: ٤٦۱، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ۱/ ٦۳۹، رقم: ۱۲۹۸، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ۱۲/ ۳۳۹، رقم: ٦۲۱۹)

نیز کیا حافظ قرآن کے لئے یاد کرنے اور پڑھنے کا سال بھر میں یہی ایک مہینہ ہے یا بارہ مہینے اور ہمیشہ قرآن پڑھنے اور یاد رکھنے کا مکلّف ہے؟ اس میں بھی شاید مفتی صاحب یہی جواب دیں گے کہ ہمیشہ قرآن پڑھنے اور یاد رکھنے کا مکلّف ہے، ہاں البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ رمضان میں پڑھنے کا شوق زیادہ بڑھ جاتا ہے؛ اس لئے حافظ صاحب کے قرآن بھولنے کے خطرے کو عمومی سطح پر ضروریات دین میں شامل کرنا کہاں تک درست ہے؟ نیز جو حفاظ اجرت کے بغیر قرآن نہیں پڑھتے، ان کے قرآن بھول جانے سے دین اور قرآن پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اللہ نے خود فرمایا ہے کہ: **"انا له لحافظون"** [سورة الحجر: ۹] اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے خود ہی لے لیا ہے، نیز خود ہمارے شہر مرادآباد میں تقریباً چھ سو مسجدیں ہیں، رمضان آنے سے کئی مہینہ پہلے سے ایک ایک مسجد میں کئی کئی حافظ بغیر اجرت کے قرآن سنانے کے لئے ذمہ داران مسجد کی خوشامد کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح قرآن سنانے کا موقع مل جائے، پھر مفتی صاحب کا یہ گمان کرنا کہاں تک درست ہے کہ دنیا کے تمام حفاظ کا حال یہی ہے کہ اجرت کے بغیر پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

اکابر اہل فتاویٰ اور مشائخ عظام کا متفقہ فتویٰ

اب اخیر میں حضرات اکابر علماء اور اولوالعزم اہل فتاویٰ جن میں سے ایک ایک فرد کے فتوے کو سند کے درجہ میں مانا جاتا ہے، ان میں سے گیارہ مستند اکابر کا متفقہ فتویٰ الگ الگ طور پر مختصر انداز سے نقل کر دیتے ہیں، تا کہ امت میں اس سلسلہ میں بیداری پیدا ہو اور صحیح مسئلہ پر عمل کر سکے اور ہر کسی کے الٹے سیدھے اور غلط فتوے سے گریز کر سکے۔

(۱) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرماتے ہیں: تراویح میں جو کلام اللہ پڑھے یا سنے اس کی اجرت دینا حرام ہے۔ (فتاوی رشیدیہ قدیم/۳۹۲، جدید زکریا/۳۷۰)

(۲) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ فرماتے ہیں: اجرت دے کر قرآن سننا جائز نہیں، لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہیں۔ اور اگر بغیر تعیین اجرت سنایا جائے اور ختم قرآن کے بعد بطور تبرع دیا جائے تو اصح قول کی بنا پر یہ صورت بھی ناجائز ہے۔ (فتاوی مظاہر علوم المعروف بفتاویٰ خلیلیہ ۱/ ۴۸)

(۳) حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: حاصل جواب یہ ہوا کہ رواج مذکور فی السوال محض باطل اور مخالف شرع ہے اور ایسا ختم ہرگز موجب ثواب نہیں؛ بلکہ موجب معصیت ہے۔ (امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۸۱)

(۴) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قرآن مجید تراویح میں سنانے کی اجرت لینا دینا جائز نہیں ہے۔ (کفایت المفتی ۳/ ۳۶۳، جدید زکریا ۳/ ۴۰۹، زکریا مطول: ۱۱/ ۵۳۶)

(۵) حضرت مفتی اعظم مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ فرماتے ہیں: اجرت پر قرآن شریف پڑھنا درست نہیں ہے اور اس میں ثواب نہیں ہے اور بحکم ''المعروف کالمشروط'' جن کی نیت لینے دینے کی ہے، وہ بھی اجرت کے حکم میں ہے اور ناجائز ہے، اس حالت میں صرف تراویح پڑھنا اور اجرت کا قرآن شریف نہ سننا بہتر ہے اور صرف تراویح ادا کر لینے سے قیام

رمضان کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ (فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۴٦)

(٦) حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: چھوٹی سورتوں سے نماز تراویح ادا کریں اجرت دے کر قرآن نہ سنیں؛ کیوں کہ قرآن سنانے پر اجرت لینا اور دینا حرام ہے۔ (جواہر الفقہ ۱/۳۸۲، جدید زکریا ۳/۵۲۲)

اور ''امداد المفتیین'' میں فرماتے ہیں: اجرت لے کر قرآن پڑھنا اور پڑھوانا گناہ ہے؛ اس لئے تراویح میں چند مختصر سورتوں سے بیس رکعات پڑھ لینا بلاشبہ اس سے بہتر ہے کہ اجرت دے کر پورا قرآن پڑھوائیں۔ (امداد المفتیین / ۳٦۵)

(۷) حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں: محض تراویح میں قرآن شریف سنانے پر اجرت لینا اور دینا جائز نہیں، دینے والے اور لینے والے دونوں گنہگار ہوں گے اور ثواب سے محروم رہیں گے، اگر بلا اجرت سنانے والا نہ ملے تو الم ترکیف سے تراویح پڑھیں۔ (فتاوی محمودیہ قدیم ۷/ ۱۷۱، جدید ڈابھیل ۷/۱/ ٦٦)

(۸) حضرت مفتی رشید احمد صاحب فرماتے ہیں: خدمت کے نام سے نقد یا کپڑے وغیرہ دینا بھی معاوضہ ہی ہے۔ اور اجرت طے کرنے کی بہ نسبت زیادہ قبیح ہے؛ اس لئے کہ اس میں دو گناہ ہیں: ایک قرآن سنانے پر اجرت کا گناہ اور دوسرا جہالت اجرت کا گناہ۔ (احسن الفتاوی ۳/۵۱۴)

(۹) تراویح میں ختم قرآن پر اجرت مقرر کرنا خواہ صراحتاً ہو جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں یا بطور عرف وعادت ہو، جیسا کہ عموماً آج کل رائج ہے، دونوں صورتوں میں جائز نہیں۔ (فتاوی احیاء العلوم ۱/ ۱۹۸)

(۱۰) حضرت مفتی عبدالرحیم صاحبؒ فرماتے ہیں: بے شک تراویح میں اجرت لینا دینا ناجائز ہے، لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہوتے ہیں، اس سے اچھا یہ ہے کہ الم ترکیف سے تراویح پڑھی جائے۔ (فتاوی رحیمیہ ۱/ ۳۴۹، جدید زکریا ٦/ ۲۳۴)

(۱۱) بریلوی مکتب فکر کا فتویٰ: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بریلوی مکتب فکر کے بھی مشہور

معروف عالم جناب مولانا مفتی امجد علی صاحب قادری اعظمی کا ایک معتبر فتویٰ بعینہٖ یہاں لکھ دیا جائے، تاکہ بریلوی مکتبِ فکر کے لوگ بھی اس مسئلہ سے متنبہ ہوجائیں اور حرام میں مبتلا ہونے سے محفوظ ہوجائیں، ملاحظہ ہو:

''آج کل اکثر رواج ہوگیا ہے کہ حافظ کو اجرت دے کر تراویح پڑھواتے ہیں، یہ ناجائز ہے، دینے والا اور لینے والا دونوں گنہگار ہیں، اجرت صرف یہی نہیں کہ پیشتر مقرر کرلیں کہ یہ لیں گے، یہ دیں گے؛ بلکہ اگر معلوم ہے کہ یہاں کچھ ملتا ہے اگرچہ اس سے طے نہ ہوا یہ بھی ناجائز ہے ''**المعروف کالمشروط**'' ہاں اگر کہہ دیں کہ کچھ نہیں دوں گا یا نہیں لوں گا، پھر پڑھے اور حافظ کی خدمت کریں تو اس میں حرج نہیں ہے کہ الصریح یفوق الدلالۃ''۔ (بہار شریعت ۴/ ۳۵، قادری بکڈپو)

اب اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ تمام فقہاء متقدمین اور متأخرین اور تمام مستند اکابر اہل فتاویٰ کا اجماع اور اتفاق اس بات پر ہے کہ تراویح میں قرآن ختم کرکے اجرت لینا اور دینا دونوں حرام اور گناہ عظیم ہیں؛ اس لئے مسلمانوں کو اس کے خلاف فتوے سے متنبہ ہوجانا اور دوری اختیار کرنا لازم اور ضروری ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۳/ ۱۴۲۵ھ

اجرت علی التراویح کے حیلہ کی مختلف شکلوں کا حکم

سوال [۳۲۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) تراویح کے ختم پر غیر حافظ کے نذرانے کا حکم کیا ہے؟

(۲) تراویح کے ختم پر حافظ مستقل امام کے نذرانے کا حکم علاوہ تنخواہ کے کیا ہے؟

(۳) تراویح کے ختم پر حافظ غیر مستقل امام کے نذرانے کا مسئلہ کیا ہے؟

(۴) تراویح کے ختم پر نذرانہ لینے کی اگر کوئی ممانعت کی صورت ہو پھر بھی اس صورت میں وہ نذرانہ لے کر بلانیت ثواب صرف کرے، تو کیا حکم ہے؟

(۵) ختم تراویح کے موقع پر شیرینی تقسیم کرنے کا مسئلہ کیا ہے؟

(۶) ختم تراویح پر مصافحہ ومعانقہ کا حکم کیا ہے؟

المستفتی: جاوید انور، رہلتا سی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) تراویح کے ختم پر غیر حافظ کو جو رقم بطور نذرانہ دی جاتی ہے؛ چونکہ یہ پورے رمضان کی امامت کر رہا ہے، تو یہ بشکل نذرانہ مہینہ بھر کی تنخواہ ہے، جو لینا جائز ہے، نیز اس لئے جائز ہے کہ اس نے قرآن ختم نہیں کیا؛ بلکہ صرف نماز پڑھائی ہے، ممانعت ختم قرآن کی صورت میں ہے:

ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة. (درمختار مع الشامي، كتاب الإجارة، باب إجارة الفاسدة كراچی ۶/ ۵۵، زكريا ۹/ ۷۶)

(۲) جو امام پہلے سے مستقل امامت کرتا چلا آرہا ہے، اس کو نذرانہ کے طور پر کچھ دینا اور اس کے لئے لینا جائز ہے؛ اس لئے کہ وہ شخص اس محلّہ کا مستقل امام ہے، رمضان اور غیر رمضان ہر حال میں اس کے لئے تحفہ اور نذرانہ لینا جائز ہے اور مقتدیوں کے لئے دینا بھی جائز ہے، کبھی کم کبھی زیادہ جس طرح چاہیں، اس کو نذرانہ دے سکتے ہیں۔ اور نذرانہ دینے والے کے اختیار میں ہے، لینے والے کو مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے امام صاحب کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں ہونا چاہئے، نیز امام صاحب تراویح پڑھاتے وقت ہرگز یہ نیت نہ کریں کہ میں اپنی امامت کی ذمہ داری سے کوئی الگ کام انجام دے رہا ہوں؛ بلکہ اسے بھی ایک ذمہ داری سمجھیں۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۷/ ۲۹۶، جدید زکریا ۶/ ۲۶۵)

(۳) تراویح کے ختم پر جو نذرانہ دیا جاتا ہے، یہ درحقیقت قرآن سنانے کی اجرت ہی ہے؛ اس لئے اس طرح حیلہ سے اجرت بشکل نذرانہ لینا دینا قطعاً جائز نہیں ہے؛ بلکہ یہ شکل: **لاتشتروا بآياتي ثمنا قليلا"** [البقرة: ۴۱] کی وعید میں داخل ہے۔

(۴) حافظ صاحب کو زحمت کی کوئی ضرورت نہیں، لینا تو بہر حال ناجائز ہے، پھر بلا نیت ثواب صرف کرنے کا حافظ صاحب کو حق نہیں ہے؛ بلکہ جنہوں نے دیا ہے ان کو واپس کرنا ضروری ہے۔

من اکتسب مالا بغير حق ...... كالاستئجار على المعاصي والطاعات، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه، ويجب عليه أن يرده على مالكه. (بذل المجهود، الطهارة، باب فرض الوضوء، میرٹھ ۱/ ۳۷، بيروت دارالبشائر الإسلامية ۱/ ۳۵۹، مطبوعه لكهنؤ ۱/ ۱۴۷)

(۵) تراویح کے بعد شیرینی مسجد کی رقم یا چندہ کی رقم سے تقسیم کرنا درست نہیں؛ البتہ اگر کوئی شخص بخوشی اپنی جیب خاص سے تقسیم کرتا ہو، تو اس کی گنجائش ہے؛ لیکن مسجد کا احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۴/ ۴۲۷، جدید زکریا ۶/ ۲۴۳)

(۶) ختم تراویح کے موقع پر مصافحہ معانقہ کرنا بدعت مکروہ ہے، شریعت میں مصافحہ ومعانقہ کا موقع صرف اول ملاقات ہے، نیز اس رسم کا قرون مشہود لہا بالخیر میں کوئی ثبوت نہیں ہے؛ لہٰذا اس رسم سے احتراز لازم ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۱/ ۳۵۴)

تكره المصافحة بعد أداء الصلاة، بكل حال؛ لأن الصحابة رضي الله عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلاة، ولأنها من سنن الروافض، وقال ابن الحاج من المالكية في المدخل: إنها من البدع وموضع المصافحة في الشرع إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا في إدبار الصلوات. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵۴۷، كراچی ۶/ ۳۸۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۶۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۶ھ

امیر شریعت کے جواز اجرت تراویح کی دلیل کا جائزہ

سوال [۳۲۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) حضرت امیر شریعتؒ نے نذرانۂ تراویح کو امامت وتعلیم قرآن پر قیاس کرتے ہوئے جائز قرار دیا ہے، جب کہ نذرانۂ تراویح اور امامت وتعلیم قرآن کے درمیان فرق ہے؟

الف: تراویح عبادت محضہ ہے، تعلیم قرآن عبادت محضہ نہیں۔

ب: تراویح میں مکمل قرآن سنانا ضروریات دین میں داخل نہیں، جب کہ تعلیم قرآن ضروریات دین میں داخل ہے۔

ج: تعلیم قرآن میں جس وقت کی وجہ سے کسب معاش کا موقع نہیں ملتا، بخلاف تراویح کے کہ وہ کسب معاش میں حارج نہیں۔

د: حفظ قرآن کے بعد حفظ کا باقی رکھنا حافظ کے ذمہ فرض ہے، بخلاف امامت کے کہ علی الانفراد واجب نہیں۔

ہ: کیا یہ امر واقعی اور مشاہد ہے کہ نذرانۂ تراویح کے عدم جواز پر درجہ حفظ میں طلبہ کی تعداد گھٹنے لگے گی؟

و: کیا امیر شریعت کی رائے ان کے امیر شریعت ہونے کی وجہ سے خصوصاً اہل بہار واڑیسہ کے لئے قابل عمل ہے، یا عمل کی گنجائش ہے؟

(۲) بغیر نذرانہ کے تراویح پڑھانے والے کے نہ ملنے پر نائب امام یا ایک دو وقت کی امامت سپرد کر کے تنخواہ متعین کرنے کی اجازت بعض اکابر مفتیان کرام نے دی ہے۔

الف: حیلہ کی شرعی حیثیت اور اس کے اختیار کرنے کا محل وموقع؟

ب: تراویح میں ختم قرآن جو ایک سنت ہے، اس کے لئے حیلہ اختیار کرنا کیسا ہے؟ کیا یہ حیلہ بنی اسرائیل کے حیلہ اصطیاد سمک کی طرح مذموم وقابل لعنت تو نہیں؟ کیوں کہ حضرت تھانویؒ نے حیلہ امامت کو ناجائز لکھا ہے۔

ج: مسجد کی آمدنی میں سے حافظ تراویح جیسے نائب امام محض نذرانۂ تراویح کے جواز کی خاطر مقرر کیا گیا ہے، اس کو دینے پر سکریٹری مسجد قابل ضمان تو نہیں ہوگا؟

المستفتی: محمد الیاس، تنظیم علماء چمپا نگر، بھاگلپور، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جناب امیر شریعت کا نذرانۂ تراویح کو امامت وتعلیم قرآن پر قیاس کر کے جائز قرار دینا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ مقیس ومقیس علیہ میں کسی طرح بھی مطابقت نہیں ہے، جس کو ہر ذی علم سمجھ سکتا ہے؛ کیوں کہ تعلیم قرآن اور چیز ہے اور تلاوت قرآن دوسری چیز ہے، اور انہوں نے تلاوت قرآن کو تعلیم قرآن پر قیاس کیا ہے جو صحیح نہیں ہے، ان کو اس سلسلہ میں مغالطہ ہوا ہے۔

إن المفتى به ليس هو جواز الاستئجار على كل طاعة، بل على ماذكروه فقط مما فيه ضرورة ظاهرة. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٦)

الآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٧)

(ہ) یہ واقعہ نفس الامر کے خلاف ہے کہ نذرانۂ تراویح کے عدم جواز سے درجہ حفظ کے طلبہ کی تعداد کم ہوجائے گی؛ کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ جب سے مغربی یوپی میں لین دین کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا ہے، حفاظ کی کثرت ہے، جہاں صرف ایک درجہ حفظ تھا وہاں آج آٹھ نو درجات ہو گئے ہیں، اور جگہ کی قلت کی وجہ سے طلبہ کو واپس کرنا پڑتا ہے، کوئی چاہے تو مغربی یوپی کا مشاہدہ کرے، نذرانۂ تراویح کے عدم جواز سے کوئی ضرر نہیں ہے۔

فإنه لو مضى الدهر ولم يستأجر أحد على ذلك لم يحصل به ضرر، بل الضرر في الاستئجار عليه (إلى قوله) يمنع استحقاق الثواب. (عقود رسم المفتي، ص: ٣٨)

(و) کسی شخص کی ذات بذاتہ حجت نہیں ہے، الا یہ کہ اس کا قول اصول شرع یعنی کتاب وسنت اجماع وقیاس کے موافق ہو، مذکورہ مسئلہ میں امیر شریعت کو قیاس کرنے میں مغالطہ ہوا ہے جو اجماع کے معارض ہے، اس لئے ان کی رائے قطعاً حجت نہیں؛ بلکہ واجب الترک ہے۔حیلہ کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ خفی مباح طریقہ اپنانے میں غیر کا حق باطل نہ ہو اور نہ کسی باطل کا اثبات ہو، اگر ایسا ہے تو یہ حرام اور ممنوع ہے؛ لہٰذا تلاوت قرآن پر اجرت کا یہ حیلہ کسی بھی ضرورت کے تحت نہیں آتا؛ اس لئے یہ حیلہ شرعاً جائز نہیں؛ کیوں کہ ایک سنت پر عمل کرنے کے لئے حرام کا اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔اور جن اکابر نے اس طرح کے حیلہ کی اجازت دی ہے، اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔

فإن توصل بها بطريق مباح إلى إبطال حق، أو إثبات باطل، فهي حرام. (فتح الباري، كتاب الحيل، قبيل باب في ترك الحيل، بيروت ١٢/ ٣٤٢، اشرفيه ١٧/ ٤٠٤، ١٢/ ٣٢٦، مبسوط، كتاب الحيل، دارالكتب العلمية ٣/ ٢١٠)

اور بہت ممکن ہے کہ یہ حیلہ بنی اسرائیل کے حیلہ اصطیاد سمک کے مرادف ہو؛ اس لئے ایسا حیلہ کرنا جائز نہیں ہے۔

(ج) مسجد کی آمدنی سے حافظ تراویح کو دینے کی اجازت نہیں، اگر مسجد سکریٹری نے حافظ تراویح پر مسجد کی آمدنی سے کچھ صرف کیا تو اس کو اپنی جیب سے تاوان دینا لازم ہوگا؛ اس لئے کہ اس صورت میں یہ خائن ہوگا، ایسے سکریٹری کو عہدہ سے معزول کردینا چاہئے۔

إن عزل القاضي للخائن واجب عليه، ومقتضاه الإثم بتركه، والإثم بتولية الخائن. (مجمع الأنهر، كتاب الوقف، دارالكتب العلمية، بيروت جديد ٢/ ٦٠٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۴۵)

تراویح کی اجرت کے جواز سے متعلق مونگیر کے فتوی کی شرعی حیثیت

مکرم مفتی محمد سلمان صاحب/مفتی شبیر صاحب   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال [۳۲۴۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعد سلام مسنون دریافت طلب امر یہ ہے کہ رمضان ۱۴۰۶ھ میں دار الافتاء مونگیر سے ایک فتوی شائع ہوا تھا (جواس استفتاء سے منسلک ہے) اس میں تراویح میں جو ختم قرآن پر لین دین ہوتا ہے، اس کو اجرت کے بجائے نذرانہ کا نام دے کر نیز بہت سی عقلی علتیں اور خدشات کا امکان ظاہر کر کے اور دوسری فقہی جزئیات پر قیاس کر کے جائز قرار دیا ہے، کیا یہ قواعد فقہیہ کے موافق درست ہے؟ کیا اس میں مذکورہ علتیں قابل اعتبار ہیں؟ اور مذکورہ خدشات کی بنا پر جواز کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے؟ براہ کرم وضاحت فرمائیں، نیز جواز کا جو بھی حیلہ درست ہو تحریر فرمائیں، نیز اس مسئلہ میں حضرت تھانویؒ کی جو رائے ہے اسے تشدد پر محمول کیا جائے گا کہ حضرت بڑے متشدد تھے، مفتی کا کام تو امت کے لئے گنجائش نکالنا ہوتا ہے، نہ کہ معاملہ تنگ کرنا وغیرہ۔ فقط

المستفتی: آپ کا ممنون احقر عبد العظیم صدیقی رحمت پوری، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دار الافتاء مونگیر کا جواب دیکھا گیا ہے، اس جواب میں جو تاویلات اور قیاس آرائیاں کی گئی ہیں وہ سب تاویلات فاسدہ ہیں، اس فتوے کو پیش نظر رکھ کر تراویح میں قرآن سنا کر اجرت لینے کو جائز سمجھنا غلط ہے؛ اس لئے اس فتوے پر اعتماد کر کے حرام کو حلال نہ سمجھیں، اللہ نے قرآن مقدس میں ”**لاتشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا**“ نص قطعی کے ذریعہ سے اس کی حرمت کو واضح فرما دیا ہے؛ اس لئے یہاں پر صرف طاعت پر اجرت کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے۔ اور حضرت تھانویؒ کے جو

جوابات ہیں وہ سب شریعت کے مطابق ہیں اور حضرت کے فتاویٰ کو تشدد پر محمول بتلانا شریعت سے ناواقفیت پرمبنی ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍شوال ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر:۴۰/ ۱۱۲۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹؍۱۰؍۱۴۳۴ھ

تفسیر،امامت وغیرہ کرنے والے کے لئے نذرانۂ تراویح کا حکم

سوال [۳۲۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اگرکوئی حافظ عالم بھی ہواور رمضان میں تراویح کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن بیان کرے اورلوگوں سے تفسیر کے پیسے وصول کرے، جب کہ لوگ بھی اسے تفسیر قرآن کے نام پر پیسہ دیتے ہیں، نیز اگر حافظ عالم نہ ہو،تو ایسی صورت میں دوسرا کوئی عالم تفسیر کر کے پیسے لیتا ہے،تو کیا حافظ قرآن کے لئے تفسیر کی اجرت لینا ازروئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اگرکوئی حافظ رمضان میں تراویح کے ساتھ ساتھ پنجوقتہ نماز کی امامت کرے،تو اس ایک مہینہ کی امامت کی تنخواہ لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۳) اگر رمضان میں کوئی حافظ تراویح پڑھائے جو بارہ مہینے امامت کرتا ہو،تو اسے رمضان میں تنخواہ سے بڑھا کر کچھ رقم بطور انعام دینا کیسا ہے؟

(۴) اگرکوئی شخص رمضان میں الم ترکیف سے تراویح پڑھائے تو وہ اجرت لے سکتا ہے یا نہیں؟ مفصل ومدلل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد ایوب اشاعتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) حافظ صاحب عالم ہوں اور تفسیر قرآن کی اجرت میں پیسہ لیتے ہوں،تو جائز ہے اور اگر حافظ صاحب عالم نہ ہوں تو ایسی صورت میں دوسرا کوئی عالم

تفسیر کرتا ہو اور وہی عالم اپنی تفسیر کا پیسہ لیتا ہو تو جائز ہے، مگر تراویح میں تلاوت قرآن اور ختم قرآن پر اجرت لینا جائز نہیں؛ اس لئے کہ تفسیر قرآن اور نماز میں تلاوت قرآن دونوں کا حکم الگ الگ ہے۔

ویفتی الیوم بصحتها لتعلیم القرآن، والفقه، والإمامة، والأذان.

(درمختار مع الشامي، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٦)

فالحاصل أن ماشاع في زماننا من قراء ة الأجزاء بالأجرة لا يجوز.

(شامي، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٧)

(۲) پنجوقتہ امامت کی تنخواہ لینا جائز ہے؛ لیکن یہ جواز کا فتویٰ اس وقت ہے کہ جب کہ امامت ہی مقصود ہو؛ حالانکہ اس صورت میں مقصود تراویح میں ختم قرآن ہے، امامت مقصود نہیں، اس کی دلیل یہی ہے کہ نماز کی امامت پورے سال ہوا کرتی ہے، صرف رمضان ہی میں نہیں اور مسلمانوں پر صرف رمضان ہی میں نماز فرض نہیں ہے؛ بلکہ پورے سال نماز فرض ہے؛ لہٰذا صرف ماہ رمضان میں امامت کی اجرت مقرر کرنا دراصل ختم قرآن کی اجرت ہے، جس کو حافظ صاحب بھی جانتے ہیں اور دینے والے بھی جانتے ہیں: لہٰذا اجرت کی یہ صورت بھی ناجائز ہوگی۔ (مستفاد: امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۸۵، فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۷۳)

بل الضرر صار في الاستئجار عليه حيث صار القرآن مكسبا وحرفة يتجر بها، وصار القارئ منهم لا يقرأ شيئا لوجه الله خالصا، بل لا يقرأ إلا للأجرة. (شرح عقود رسم المفتي/ ٣٨)

(۳) مسجد کا مستقل امام جو پورے سال نماز پڑھاتا ہو اگر وہ رمضان میں تراویح بھی پڑھائے تو اس کو اس کی مقررہ تنخواہ سے زائد دینا جائز ہوگا۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۶، فتاوی محمودیہ ۷/ ۱۷۰)

ثم استثنوا تعليم القرآن من الطاعات، وبعضهم استثنى أيضا تعليم الفقه،

والإمامة، والأذان، والإقامة. (مجموعه رسائل ابن عابدين ثاقب بكڈپو ١/ ١٦٣)

(۴) صرف ''الم ترکیف'' سے تراویح کی نماز پڑھانے والے کو امامت کی اجرت دینا صحیح اسی وقت ہے، جب کہ امامت تراویح ہی مقصود ہو، ختم قرآن مقصود نہ ہو، اگر ختم قرآن کو مقصود بناکر تراویح کے لئے الگ سے امام رکھنے کا حیلہ کیا جائے گا تو یہ حیلہ مفید حلت نہ ہوگا۔ (انوار رحمت/۴۹۰)

يظهر لک أن العلة في جواز الاستئجار على تعليم القرآن، والفقه، والأذان، والإمامة هي الضرورة واحتياج الناس إلى ذلک. (مجموعه رسائل ابن عابدين ثاقب بكڈپو ١/ ١٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۶۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱/۲۸ھ

اجرت تراویح کے لئے امامت کے حیلہ کی حقیقت

سوال [۳۲۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لوگوں کا آپس میں چندہ کرکے یا بلا چندہ ماہ رمضان المبارک میں قرآن شریف پورا ہونے پر حافظ صاحب کو بطور ہدیہ ونذرانہ کے روپئے دینا درست ہے یا نہیں؟ نیز حافظ صاحب کا ان روپیوں کو قبول کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

(۲) اگر حافظ صاحب ان روپیوں کو لینے کے لئے ماہ رمضان میں امامت کا حیلہ کریں یا تفسیر کا تو شرعاً یہ حیلہ درست ہے یا نہیں؟ نیز اس حیلہ سے وہ روپئے لینے درست ہوں گے یا نہیں؟

(۳) اگر مذکورہ بالا حیلہ درست نہیں تو کیا حافظ صاحب کو ان روپیوں کے قبول کرنے کی شریعت میں کوئی صورت ہے یا نہیں؟

(۴) اگران روپیوں کے جواز کی صورت حافظ صاحب کے عدم شرط اور اخلاص پر مبنی ہوتو پھر فقہی قاعدہ "**المعروف کالمشروط**" کا کیا مطلب اور جواب ہے؟ جب کہ فی زمانناس کا رواج شائع ذائع ہے۔
(۵) بعض علماء طالب علموں کے واسطے مطلقاً ان روپیوں کے جواز کے قائل ہیں، ان علماء کا یہ قول شریعت میں کہاں تک درست ہے؟ آج کل کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب عنایت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حافظ صاحب کو تراویح میں قرآن کریم سنانے پر چندہ یا بلا چندہ بطور ہدیہ یا نذرانہ کے دینا اور حافظ صاحب کو لینا دونوں ناجائز ہے؛ اس لئے کہ یہ نام کا نذرانہ ہے، درحقیقت اجرت ہے؛ اس لئے کہ حافظ صاحب کے دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ آخر میں مجھے کچھ پیش کیا جائے گا اور ذمہ داروں کے دل میں بھی یہ بات ہوتی ہے کہ آخر میں ہم حافظ صاحب کو کچھ پیش کریں گے اور اس زمانہ میں ایسا دستور بہت چل رہا ہے؛ لہٰذا یہ نام کا نذرانہ ہے، حقیقت میں دستور اور عرف کے اعتبار سے اجرت ہے؛ لہٰذا "**المعروف کالمشروط**" (الأشباہ والنظائر، قدیم ۱/ ۱۳۱) کے تحت یہ بھی ناجائز اور حرام ہوگا۔

(۲) حافظ صاحب کو تراویح کے لئے مقرر کیا جاتا ہے، امامت کے لئے نہیں رکھا جاتا؛ لہٰذا امامت اور تفسیر وغیرہ کو حیلہ بنا کر کسی بھی صورت میں جائز نہ ہوگا، ہاں البتہ اگر تراویح کوئی اور پڑھاتا ہے اور یہ حافظ صاحب مستقل تفسیر اور امامت کرتے ہیں اور اتفاقی طور پر کسی دن تراویح پڑھانے والا نہ رہے اور یہ حافظ صاحب پڑھا دیتے ہیں، تو کوئی حرج نہیں۔ (مستفاد: امدادالفتاوی، زکریا ۱/ ۴۷۹)

(۳) حافظ کو لینے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

(۴) اس جواب کو سمجھنا عرف کے سمجھنے پر موقوف ہے، عرف دو طرح کے ہوتے ہیں: (۱)

عرف عام (۲) عرف خاص۔ عرف عام جیسا کہ فی زمانناتراویح میں قرآن کریم سنا کر پیسہ لینا۔ اور خاص کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص علاقہ میں رائج ہو گیا ہو، مذکورہ دونوں قسموں کے عرف اس وقت مؤثر ہوتے ہیں، جب کہ ان کی وجہ سے ترک نص لازم نہ آتا ہو۔ اور اگر سوال میں مذکورہ عرف کا اعتبار کیا جائے تو اس وقت نص قرآنی: ''وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلاً'' کا ترک لازم آتا ہے؛ لہٰذا یہ قاعدہ یہاں پر جاری نہ ہوگا۔

إذا خالف العرف الدليل الشرعي، فإن خالفه من كل وجه بأن لزم منه ترك النص فلا شك في رده لتعارف الناس كثيرا من المحرمات من الربوا وشرب الخمر. (نشر العرف ملحق برسائل ابن عابدين، ثاقب بكڈپو ۲/ ۱۱۶)

(۵) ہم کو ان علماء کا قول معلوم نہیں ہے جو جواز کا فتوی دیتے ہیں، انہیں سے حکم شرعی معلوم کرلیا جائے، ورنہ شریعت میں تو کسی کے لئے بھی خواہ وہ طالب علم ہو یا غریب کسی بھی صورت میں تراویح میں قرآن کریم سنانے کی اجرت لینا جائز نہیں، نیز علم دین حلال پیسہ سے حاصل کرنا چاہئے اور تراویح میں قرآن کریم سنا کر جو پیسہ حاصل ہوتا ہے، وہ حرام و ناجائز ہے، تو حرام پیسہ سے علم دین کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ اس کو حلال کہنا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۷؍ ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۲۴)	۱۷/۴/ ۱۴۱۹ھ

حافظ صاحب کے نذرانہ سے متعلق کس فتوی پر عمل کیا جائے؟

سوال [۳۲۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ضروری گزارش یہ ہے کہ ماہ شعبان ۲۵ھ کے مؤقر ماہنامہ ''ندائے شاہی'' میں ص: ۱۱ پر ختم قرآن پر اجرت کے لین دین کا شرعی حکم اور بنگلہ دیش کے مفتی صاحب کے فتویٰ پر

حضرت مفتی شبیر صاحب کی جرح وقدح وفقہی تبصرہ نظرنواز ہوا، تو غازی آباد کے پتہ سے ندائے شاہی کے اس مضمون کے جواب میں جعفرآباد دہلی کے ائمہ کرام کی طرف سے دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ دہلی کا مشترکہ فتویٰ شائع کیا گیا۔ ماہ رمضان المبارک سے قبل ہر مسجد میں بڑے اہتمام کے ساتھ اس کو آویزاں کیا گیا اور سنایا گیا ہے، نیز اس سال ۲۷ھ کے ماہ رمضان کی آمد سے قبل بھی ندائے شاہی کے شائع شدہ فتوے کی تردید کرنے کا مستقل اہتمام کیا جارہا ہے۔ بعض علماء جناب کے فتوے کی تائید کررہے ہیں، تو بعض دوسرے علماء اس اشتہار میں شائع شدہ فتویٰ کی تائید کررہے ہیں، علی الاعلان یہ کہہ رہے ہیں کہ مفتی شبیر صاحب کا یہ تبصرہ اور متقدمین اکابر کے فتوے سب غلط ہیں اور اس شائع شدہ اشتہار کا فتویٰ ومضمون صحیح ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ”ندائے شاہی“ میں شائع شدہ فتویٰ صحیح ہے؟ کہ اس اشتہار میں شائع شدہ فتوی درست ہے؟ ایک کو صحیح تسلیم کرنے میں دوسرے کی خود بخود تردید ہوجاتی ہے، امید ہے کہ اس مخمصہ واضطراب سے ہم مسلمانان جعفرآباد کو خصوصاً وباشندگان دہلی کو عموماً نجات دلائیں گے، ہم مسلمانان جعفرآباد کس فتوے کو صحیح تسلیم کریں؟ اس استفتاء سے صرف رفع ودفع فتنہ مقصود ہے، اس سے اپنی ناموری وشہرت وغیرہ قطعاً مقصود نہیں ہے۔

نیز یہ بتلائیں کہ کیا واقعتاً اس اشتہار کا فتوی صحیح ہے یا کہ اس میں تدلیس وتلبیس کی گئی ہے؟ یعنی اس اشتہار کے صحت وسقم کو واضح کیا جائے اور ماہنامہ ندائے شاہی کے فتوے سے اس کے تعارض کو دور کیا جائے، امید ہے کہ سنجیدگی سے اس استفتاء اور مرسلہ اشتہار پر غور فرما کر جلد از جلد جواب دینے کی کوشش فرمائیں گے۔ فقط والسلام

المستفتی: ڈاکٹر ذاکر جمال صاحب وغیرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: محترم ذمہ داران چاند مسجد جعفرآباد وذمہ داران مدینہ

مسجد وذمہ داران مسجد عثمان غنی وذمہ داران زینت مسجد جعفر آباد! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔
آپ حضرات کا مرسلہ اشتہار نظر نواز ہوا۔اور سوال نامہ بھی پڑھا گیا اور مدرسہ شاہی سے یکم ربیع الاول ۱۴۲۵ھ کا جاری کردہ جواب بھی دوبارہ پڑھا گیا اور یہ جواب ندائے شاہی میں بھی شائع ہوا اور انوار رحمت میں بھی مستقل عنوان کی شکل میں شائع ہوا، اس فتوی پر دارالعلوم دیوبند کے ان مفتیان کرام کے دستخط ہیں، جن کا فتویٰ مرسلہ اشتہار میں موجود ہے، نیز شاہی کے فتوی پر حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کے بھی وضاحتی دستخط ہیں۔''انوار رحمت'' میں ملاحظہ فرمایئے جو دہلی فرید بکڈ پو سے بھی حاصل ہوسکتی ہے، بار بار غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ دہلی کے فتوے اور مدرسہ شاہی کے جواب کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے؛ اس لئے کہ مدرسہ شاہی کے فتوے کا مدار اس حافظ قرآن کی اجرت پر ہے جس کو صرف رمضان میں اجرت کے ساتھ قرآن سنانے پر متعین کیا گیا ہو، مستقل امام مدرسہ شاہی کے فتوے میں موضوع بحث نہیں ہے۔اور جس اشتہار میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ کا فتوی مذکور ہے اس میں مستقل امام موضوع بحث ہے کہ مستقل امام کو رمضان میں ختم تراویح کے موقع پر اسی طرح نماز عیدین کے موقع پر کچھ دینے کا تذکرہ ہے، جو مستقل امام کے لئے سالانہ آمدنی کا جزو بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور مستقل امام کے بارے میں مدرسہ شاہی سے بھی تقریباً اسی طرح فتوی جاری ہوتا رہتا ہے، جس طرح دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ کا فتوی اشتہار میں موجود ہے، اس لئے عوام الناس کے درمیان دونوں طرف کے مسائل کو مخلوط کرکے شکوک وشبہات نہ پھیلائے جائیں، اگر شبہ ہو تو اشتہار اور مدرسہ شاہی کے فتوے کو کسی سمجھ دار عالم یا ذمہ دار مفتی کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کریں۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۱۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۱۷ھ

تراویح میں حافظ صاحب کو اجرت دینے سے متعلق سوالات کے جوابات

الحمد لله رب العالمين نحمده ونصلي على رسوله الكريم، وعلى آله وأصحابه وأوليائه أجمعين، وسلم تسليما كثيرا، أما بعد!

محترم مفتیان عظام دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد!

سوال [۳۲۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اس تعلق سے میں نے تقریباً ۱۰/رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ کو آپ کے یہاں ایک سوال نامہ (تیز رفتا والی ڈاک سے) ارسال کیا تھا؛ لیکن اس کا جواب آج تک نہیں ملا، خیر دوبارہ بھیج رہا ہوں اجرت تراویح کے عدم جواز کے متعلق ایک جامع اور مفصل فتویٰ شائع ہوا تھا، جس کی کاپی ساتھ ہے، تحقیق کرنے پر لینے والے یعنی ائمہ مسجد اور دینے والے یعنی مقتدیان مساجد سے درج ذیل وجوہات حاصل ہوئی ہیں:

(۱) یہ اجرت نہیں بلکہ نذرانہ ہے۔

(۲) یہ امام کی تراویح کی خدمات کو دیکھتے ہوئے تحفہ ہے۔

(۳) یہ تمام دلائل غیر مقامی حفاظ وائمہ کرام کے لئے ہیں۔ دس، بارہ سال سے جو مقامی امام مستقل امامت کررہا ہوا سے یہ لینا جائز ہے۔

(۴) بغیر تعین کے مقتدیان مساجد اگر اپنی خوشی سے امام کو انفرادی طور پر کچھ رقم وغیرہ دیتے ہیں تو یہ درست ہے۔

(۵) اگر یہ تحفہ یا نذرانہ بند کردیا جائے تو امام کی ضروریات واخراجات کا کیا ہوگا؟

ان تمام وجوہات میں ائمہ مساجد کی مصلحت اور ضروریات واخراجات کا پہلو غالب ہے، یعنی تمام مقتدیان اور امام مسجد بھی یہی چاہتے ہیں اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ کسی قسم کا اختلاف امام ومقتدیان کے درمیان یا ہمارے اور امام کے درمیان پیدا نہ ہوجائے، جب کہ مندرجہ بالا وجوہات میں درج ذیل خامیاں ہیں:

(۱) یہ نذرانہ ہے یا تحفہ ہے تو ختم قرآن پر ہی کیوں؟ نذرانہ یا تحفہ تو پورے سال میں کبھی بھی دے سکتے ہیں۔

(۲) یہ تمام دلائل غیر مقامی حفاظ وائمہ کرام کے لئے ہیں، جب کہ ایسا کچھ بھی نہیں، ہے، مقامی وغیر مقامی کا اس میں کہیں ذکر نہیں ہے، یہ تو غیر مقامی حفاظ وائمہ کرام کے ساتھ مقامی حفاظ وائمہ کرام کے تعصب کی وجہ بن سکتی ہے۔

(۳) اگر انفرادی طور پر کچھ رقم وغیرہ دیتے ہیں، تو امام کو ہر شخص سے اس کی حیثیت کے مطابق امیدیں ہوجائیں گی اور اگر اس میں کمی وبیشی ہوئی تو پھر دل میں اس شخص کے متعلق بدگمانی کا اندیشہ ہوگا۔

(۴) رہا سوال امام کی ضروریات واخراجات کا تو سال کے گیارہ مہینے بھی تو ضروریات واخراجات ہیں، اسی لئے تو ماہانہ تنخواہ کا نظام رائج ہے اور صرف امام کے لئے (ضروریات واخراجات کے پیش نظر) تمام مقتدیوں سے یہ فعل حرام کروانا کس طرح جائز ہوگا؟ ان تمام خامیوں کے پیش نظر ہماری حکمت عملی یہ ہے کہ:

الف: اگر تمام ائمہ مساجد وذمہ داران مساجد ایک متفقہ فیصلہ مشورے سے اس طرح کرلیں کہ امام کی ماہانہ تنخواہ میں بحیثیت وسعت اضافہ کرلیا جاوے، مثال کے طور پر اگر امام کی ماہانہ تنخواہ میں ایک ہزار روپے اضافہ ہو تو سال بھر میں بارہ ہزار روپئے کا امام کی تنخواہ میں اضافہ ہوگا، اس میں ائمہ مساجد کے دو فائدے ہیں: ایک تو ماہانہ تنخواہ میں ایک ہزار کا اضافہ اور دوسرا جہاں انہیں رمضان المبارک میں ختم قرآن پر صرف ایک مہینہ میں پانچ سے چھ ہزار روپئے ملتے تھے وہیں پورے سال بھر میں ماہانہ تنخواہ کی صورت میں براہ راست بارہ ہزار روپیوں کا اضافہ ہوجاوے گا اور ائمہ مساجد اور مقتدیان مساجد بھی اس فعل حرام سے بچ جائیں گے، نیز دیگر اختلافات اور فسادات کے دروازے بھی بند ہوجائیں گے اور کسی قسم کے احکامات کی خلاف ورزی بھی نہ ہوگی، واضح ہو کہ اس میں بھی ہم نے امام کی سہولت کا پہلو غالب رکھا ہے۔

ب: اگر رمضان المبارک میں نقد روپیہ وغیرہ جمع کرکے براہ راست امام کو نہ دیتے ہوئے اس جمع شدہ رقم کے بارہ حصے کرکے سال بھر کے بارہ مہینوں کی تنخواہ میں تقسیم کردیا جائے، تو ختم قرآن پر جو نقد امام کو دینے کا مقصد ہے وہ بھی فوت ہوجائے گا اور امام کی تنخواہ میں خودبخود اضافہ بھی ہوجائے گا۔ (مگر رمضان میں نقد وغیرہ کا جمع کرنا کراہت کا سبب ہوسکتا ہے کہ نقد تو رمضان ہی میں جمع ہورہا ہے) واضح ہو کہ اس میں بھی ہم نے امام کی سہولت کا پہلو غالب رکھا ہے۔

یہ تو ہمارے ذہن میں چند اقدامات تھے (جس میں ہمارے حساب سے الف زیادہ احوط اور راجح ثابت ہوسکتا ہے) مگر اس مسئلہ کے متعلق آپ حضرات کیا فرماتے ہیں، اپنی رائے (کوئی خاکہ یا حکم نامہ جس میں اس کا اور زیادہ مفید اور آسان حل ہو) اور مفید مشوروں وحوالوں اور تفصیلی رہنمائی سے نوازیں، انشاء اللہ بہت فائدہ ہوگا۔

مندرجہ بالا سعی کرنے کے بعد بھی امام اگر اپنے مطلب پر قائم ودائم رہے تو صرف الم ترکیف سے تراویح سن کر یا پڑھوا کر نقد وغیرہ دینا درست ہوگا یا نیا امام رکھ کر الف پر عمل کرنا زیادہ صحیح ہوگا؟ واضح ہو کہ جواب لکھنے سے پہلے ساتھ دیئے ہوئے اہم کاغذات پر نظر ثانی کرلیں، وہ اس لئے کہ ہم آپ سے زبردستی عدم جواز نہیں لکھوانا چاہتے، ہم تو چاہتے ہیں کہ مسئلہ کی صحیح حقیقت اور اس کا صحیح حل تحقیق کرکے معلوم ہوجائے، نیز کسی عالمی فقہی کانفرنس وغیرہ میں اس مسئلہ پر بحث وفیصلہ وغیرہ لئے گئے ہوں تو تفصیل مطلوب ہے۔ فقط

المستفتی: سید میر نوید علی بن بشارت علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) رمضان کے مہینہ میں مستقل امام کو تنخواہ سے زائد جو رقم ملتی ہے وہ اس کی سالانہ آمدنی اور تنخواہوں کا حصہ ہے، بعض مواقع میں اس کی صراحت کردی جاتی ہے کہ ماہانہ تنخواہ اتنی ہوگی اور رمضان میں اس پر اتنا اضافہ ملے گا۔ اور بعض

جگہوں پر زبانی صراحت نہیں ہوتی؛ بلکہ صرف جانبین میں یہ بات ملحوظ ہوتی ہے اور اس اضافہ کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے؛ کیوں کہ عموماً امام کی تنخواہ مناسب مقدار میں نہیں ہوتی، جس پر وہ مطمئن ہوسکے، مگر سال کے اخیر میں رمضان کے موقع پر جو معتد بہ اضافی رقم ملتی ہے، اسی خطیر رقم پر اعتماد کرکے امام پورے سال امامت کے فرائض انجام دیتا ہے، بہر دوصورت مستقل امام کو رمضان میں ختم قرآن پر جو اضافی رقم ملے گی، اسے قرآن سنانے کی اجرت نہیں کہا جائے گا؛ بلکہ اسے امام کی سالانہ آمدنی کا جزو قرار دیا جائے گا، یہی وجہ ہے کہ اگر تراویح میں کوئی دوسرا حافظ قرآن سنائے تب بھی مستقل امام کو الگ سے زائد رقم ملتی ہے؛ لہٰذا اس زائد رقم کا لینا مستقل امام کے لئے جائز اور درست ہے؛ البتہ جو مقامی اور غیر مقامی حفاظ کرام مستقل امام نہیں ہوتے ہیں؛ بلکہ صرف رمضان کے موقع پر قرآن ختم کرتے ہیں، انہیں ختم قرآن پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔

لا تصح الإجارة لأجل الطاعات ...... ويفتى اليوم بصحتها للإمامة.

(شامي، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، كراچی ٦/ ٥٥، زكريا ٩/ ٧٦)

أما شرائط الصحة فمنها رضا المتعاقدين. (هندية، مطلب أنواع الإجارة، وحكمها وكيفية انعقادها وصفتها، زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤٠)

قد يثبت من الحكم تبعا مالا يثبت مقصودا. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في وقف المنقول تبعا للعقار، كراچی ٤/ ٣٦١، زكريا ٦/ ٥٥٢)

(۲) سائل نے سوال نامہ میں جو حکمت عملی پیش کی ہے اور ساتھ میں اس کے تفصیلی اجزاء بھی پیش کئے ہیں وہ ایک مناسب اقدام ہے، اگر اس پر عمل ہوجائے تو زیادہ بہتر ہوگا اور ساتھ میں منسلک کئے گئے وہ کاغذات جس میں تفصیلی جواب موجود ہے، وہ احقر کا لکھا ہوا جواب ہے، جو کئی سال پہلے ندائے شاہی میں بھی شائع ہوا تھا۔ اور احقر کی کتاب ''انوار رحمت'' میں صفحہ: ۴۷۷-۴۹۶ پر بھی وہ تفصیلی فتوی موجود ہے، جس میں دارالعلوم

دیوبند کے مفتیان کرام اور مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کے بھی تائیدی دستخط موجود ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱/۲۵ھ

اجرت لے کر تراویح پڑھانے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال [۳۲۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسجد کے پیش امام رمضان کے مہینہ میں اپنی جگہ دوسرے حافظ کو کھڑا کرکے خود دوسری جگہ یعنی مدرسہ میں دس دن میں تراویح پڑھاتے ہیں، جس کی وجہ سے مسجد کی رونق ختم ہوجاتی ہے، پھر نویں اور دسویں تراویح میں شہر کے ہی ایک مولوی کو بلاکر ان سے تھوڑی تقریر کرواکر مقتدیوں سے چندہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ مولوی اللہ رسول کی دوچار حدیثیں سناکر اور دنیاداری اور امام صاحب کی چند پریشانیوں کو بتاکر مقتدیوں سے جوش اور ان کے دلوں میں رحم پیدا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے متقدی حضرات زیادہ سے زیادہ چندہ دیتے ہیں، جو لوگ نویں تاریخ میں چندہ نہیں دے پاتے ان کو خاص طور سے بتادیا جاتا ہے کہ وہ لوگ کل کو ضرور اور دھیان سے لے آئیں، مفتیان کرام ذرا اس بات پر خاص توجہ دیں کہ جو چندہ کیا جاتا ہے، وہ اس امام کی (جو تراویح سنا رہا ہے) موجودگی میں ہی کیا جاتا ہے، یعنی وہ امام اپنے مصلے پر بیٹھا رہتا ہے اور وہ مولوی جس نے تقریر کی ہوتی ہے وہیں کھڑا ہوکر چندہ جمع کراتا ہے اور بولتا رہتا ہے کہ فلاں شخص نے اتنے پیسہ دئے اور فلاں نے اتنے دئے، علماء دین سے درخواست ہے کہ یہ بتانے کی مہربانی کریں کہ اس چندہ کے پیسے اس امام کے لئے جائز ہیں یا نہیں؟ اور چندہ دینے والے لوگوں کو کچھ اجر وثواب ملے گا یا نہیں؟ کیوں کہ ان کے نام کا بھی تو اعلان کیا جاتا ہے کہ فلاں نے اتنے پیسے دئے مفصل ومکمل جواب تحریر فرمائیں۔

(۲) اگر وہ چندہ کا پیسہ اس امام کے لئے ناجائز ہے، تو کیا اس امام کے پیچھے نمازیں جائز ہوں گی یا نہیں؟ کیوں کہ چار پانچ سال سے وہ امام اس پیسے کو اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا آرہا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد طارق انور، ٹھاکردوارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ میں دس دن میں تراویح پڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ اگر اس کا مطلب یہی ہے کہ دس دن میں قرآن کریم سنایا جاتا ہے اور پھر ختم قرآن پر اجرت لینے کے لئے چندہ کیا جاتا ہے اور قرآن سنانے والا اسی کا پیسہ لیتا ہے، تو شرعاً قرآن سنا کر اس طرح پیسہ لینا ناجائز اور حرام ہے۔ اور نہ ہی دینے والوں کو ثواب ملے گا۔ اور سوال کے آخر میں یہ جو پوچھا گیا ہے، اس کے پیچھے نمازیں جائز ہوں گی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں قرآن سنا کر پیسہ لینے والے کو مسئلہ بتا دیا جائے، بہت ممکن ہے کہ مسئلہ کی تفصیلات ان کو معلوم نہ ہو، اگر مسئلہ بتانے کے بعد آئندہ کے لئے اس عمل سے باز رہتے ہیں، تو ان پر کوئی الزام نہیں۔ اور اگر مسئلہ بتانے کے باوجود پھر سے یہ سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور قرآن سنا کر اجرت لیتے ہیں اور اس کے لئے چندہ کرتے ہیں، تو لوگوں کو اس امام کے پیچھے تراویح کی نماز نہیں پڑھنی چاہئے، اس سے بہتر یہی ہے کہ ''الم تر کیف'' سے تراویح پڑھ لی جائے۔ (فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۴۶، کفایت المفتی ۳/ ۳۶۶، جدید زکریا ۳/ ۴۰۹، جدید مطول ۱۱/ ۵۳۶، امداد المفتیین / ۳۶۵، فتاوی رحمیہ قدیم ۱/ ۳۴۹، جدید زکریا ۶/ ۲۳۴، فتاوی محمودیہ جدید ۱/ ۶۶)

ثم استثنوا تعليم القرآن من الطاعات، وبعضهم استثنى أيضا تعليم الفقه والإمامة، والأذان، والإقامة، كما علمت ذلك مما نقلناه عن المتون وغيرها، وهذا من أقوى الأدلة على ما قلنا من أن ما أفتوا به ليس عاما في كل طاعة، بل هو خاص بما نصوا عليه مما وجد فيه علة الضرورة والاحتياج. (رسائل ابن عابدين، ثاقب بکڈپو دیوبند ۱/ ۱۶۳)

والحاصل أن ما شاع في زماننا من قراء ة الأجزاء بالأجرة لايجوز إلى قوله: بل جعلوا القرآن، مكسبا، ووسيلة إلى جمع الدنيا إنا لله وإنا إليه راجعون إلى قوله: المفتى به جواز الأخذ استحسانا على تعليم القرآن لا على القراء ة المجردة. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسد، مطلب في الاستئجار على الطاعات، کراچی ٦/ ٥٦، زکریا ٩/ ٧٦-٧٧)

ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، کراچی ٦/ ٥٥، زکریا ٩/ ٧٧)

وقد نص الحنفية على أنه لا يجوز قراء ة القرآن بأجر، وأنه لا يترتب على ذلک ثواب، والآخذ والمعطي آثمان. (الموسوعة الفقهية الكويتية ١/ ٢٩١، مستفاد: إمداد الفتاوى ١/ ٤٨١-٤٨٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۷/ رجب ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۱۴)	۱۴۲۸/۸/۲ھ

قرآن سننے اور سنانے کی اجرت کا شرعی حکم

سوال [۳۲۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) تراویح میں قرآن پاک کے سننے سنانے پر اجرت کا لینا اور دینا کیسا ہے؟

(۲) اگر ماہ رمضان میں کسی کو پورے ماہ کا امام بنا دیں یا اس کے ذمہ ایک یا دو وقت کی نماز پڑھانی کر دیں اور تراویح میں قرآن بھی وہی سنائے تو اس پر اجرت کا لینا دینا کیسا ہے؟

(۳) مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ: اگر رمضان شریف کے مہینہ کے لئے حافظ کو تنخواہ پر رکھ لیا جائے اور ایک یا دو نماز پڑھانے کا اس کو امام بنا دیا جائے تو حضرت مفتی صاحب نے جواز کا فتویٰ دیا، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں: یہ

صورت جواز کی ہے؛ کیوں کہ امامت کی اجرت (تنخواہ) کی فقہاء کرام نے اجازت دی ہے، تو کیا یہ مفتی صاحب کا قول صحیح ہے؟

(۴) خالد جو کہ ایک مسجد کا مستقل امام ہے اور رمضان شریف میں قرآن بھی وہی یعنی امام ہی سناتا ہے، جس روز قرآن پورا ہوتا ہے تو مقتدی حضرات اپنے امام کو روپئے دیتے ہیں، ہزار ہوں یا دو ہزار، کتنے ہی ہوں، تو مقتدیوں کا اپنے امام کو دینا اور امام کا لینا کیسا ہے اور یہ قرآن کی اجرت میں ہے یا اس کی مستقل امامت کی اجرت میں؟

(۵) یا دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ جس مسجد میں خالد مستقل امام ہے، اسی مسجد میں خالد کے علاوہ کسی دوسرے حافظ صاحب نے قرآن سنایا تو مقتدی حضرات اپنے امام کو بھی دیتے ہیں اور سنانے والے کو بھی تو اس صورت میں دونوں کو دینا صحیح ہے یا دونوں کو دینا غلط ہے یا دونوں میں سے ایک کو دے دیں، امام کو دے دیں سنانے والے کو نہ دیں، اگر اس صورت میں امام کو دے دیں، تو یہ دینا اس کی مستقل امامت میں داخل ہوگا یا اجرت قرآن میں؟

(۶) ہمارے اکثر میرٹھ وغازی آباد کے علاقہ میں گاؤں ہوں یا شہر تقریباً سبھی جگہ جہاں جہاں مساجد ہیں، مستقل امام حضرات ہوتے ہیں، جس روز قرآن پورا ہوتا ہے تو مقتدی حضرات اپنے اپنے اماموں کو کافی تعداد میں رقم دیتے ہیں، چاہے امام قرآن سنائے یا نہ سنائے، مثلاً امام کے علاوہ کوئی اور سنا دے، جب بھی امام کو ضرور دیتے ہیں۔ اور اگر کسی مسجد میں مستقل امام نہیں ہوتا ہے، تو لوگ دوسری جگہ سے صرف حافظ کو رمضان میں قرآن سنانے کے لئے بلاتے ہیں تو اس سنانے والے کو اتنے روپئے نہیں دیتے جتنے وہ اس امام کو دیتے ہیں جو مستقل امامت کر رہا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اس نے پورے سال محنت نہیں کی ہے اور جو مستقل امام ہوتا ہے اس کو یہ کہتے ہیں کہ یہ اس کی مستقل محنت کے ہیں، آیا یہ دینا لینا ٹھیک ہے؟ یا یہ بھی اجرت قرآن میں داخل ہے؟ یا اجرت امامت میں؟

(۷) زید ایک مسجد کا مستقل امام ہے اور لوگوں نے کچھ تنخواہ بھی طے نہیں کی؛ بلکہ لوگ اپنے امام کو فصل گندم میں گندم دیتے ہیں اور فصل مکئی میں مکئی اور فصل گڑ میں گڑ اور کچھ رقم عید پر

دے دیتے ہیں اور کچھ رقم اس روز دیتے ہیں جس روز قرآن پورا ہوتا ہے، آیا یہ دینا اور امام کا لینا صحیح ہے، یا ناجائز ہے؟ کیوں کہ ایک مولانا صاحب سے جب یہ مسئلہ زبانی معلوم کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ جس مسجد میں مستقل امام ہے، اس کو دینا اور لینا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ اس کی مستقل امامت کی اجرت میں داخل ہے۔ اور امامت کی اجرت لینا جائز ہے، آیا یہ مولانا صاحب کا قول صحیح ہے؟

المستفتی: انتظار احمد، مدرسہ فیض العلوم موضع بدرکھہ، ضلع غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) تراویح میں قرآن کریم سنا کر اجرت دینا اور لینا دونوں ناجائز اور حرام ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۷/۱۷۱، جدید ڈابھیل ۷/۱۶۶)

(۲) اس کو بھی حضرت تھانویؒ نے حرام اور ناجائز لکھا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی، قدیم ۱/۳۲۲، جدید زکریا ۱/ ۴۸۵، ایضاح المسائل/ ۲۸)

(۳) حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے صاف الفاظ میں اس کو جائز لکھا ہو بندہ کو معلوم نہیں۔

(۴) امام کو رکھتے وقت یہ طے ہوا ہے کہ ہر ماہ اتنی تنخواہ رہے گی اور سال کے آخر میں ماہ رمضان میں اتنا ملے گا تو ایسی صورت میں رمضان میں جو زیادہ مل رہا ہے، وہ ہمیشہ کی تنخواہ میں شامل ہوگا، یہ نہیں ہے کہ جو مل رہا ہے وہ صرف قرآن سنانے کی وجہ سے مل رہا ہے، تو یہ شکل جواز کے دائرہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

المسلمون علی شروطهم. (سنن ترمذي، كتاب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس؟ النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

(۵) امام کو دینا اور امام کے لئے لینا جائز اور درست ہے۔ اور دوسرا آدمی جس نے قرآن سنایا ہے، اس کے لئے لینا جائز نہیں ہے۔

(۶) اس صورت میں جو دیا جاتا ہے، وہ ہمیشہ کی تنخواہ میں شامل ہے؛ اس لئے وہ بلا کراہت جائز ہے،جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

(۷) جی ہاں مولانا صاحب کا مذکورہ قول صحیح اور درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۰۶۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۳/۱۳ھ

تراویح کا نذرانہ

محترم المقام حضرت مفتی صاحب جعلکم اللہ قدوۃ للدین والشرع

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کی عافیت کا خواہاں ہوں، اللہ گردش ایام اور تمام حوادث وفتن سے بال بال آپ کی حفاظت فرمائے۔(آمین)

سوال [۳۲۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مقصد تحریر تراویح پڑھانے والے حافظ کو دی جانے والی رقم کی مندرجہ ذیل صورتوں میں شرعی حیثیات معلوم کرنا ہے کہ آیا یہ تمام صورتیں یکساں ہیں یا جدا گانہ؟ اور معاوضہ وہدیہ ہر دو میں فرق ہے یا نہیں؟ صورتیں یہ ہیں:

(۱) رمضان المبارک سے پہلے ہی ٹرسٹیان مسجد حافظ قرآن کے ساتھ معاوضہ متعین کرلیں، مثلاً ۱۰۰۰۰؍روپے، تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر عدم جواز ہے، تو جواز کی صورت یا حیلہ کی شکل کیا ہے؟

(۲) معاوضہ کی پیشگی تعیین تو نہیں کی؛ لیکن ٹرسٹی حضرات محلّہ کے چند مال داروں کو اس بات کا مکلّف کریں کہ ان میں سے ہر ایک شخص حافظ کے لئے کسی بھی طرح پانچ پانچ سو روپئے کا انتظام کرے، اس صورت کا کیا حکم ہے؟

(۳) ختم قرآن کے بعد دیر یا سویر لوگ انفرادی طور پر حافظ سے مصافحہ کرکے ان کے ہاتھ کچھ رقم تھما دیتے ہیں، حافظ کے لئے یہ رقم طیب ہے یا حرام؟ نیز عوام الناس کا اس طرح (ہی سہی) اہل علم کی عزت افزائی ممدوح ہے یا ممنوع؟

(۴) مسجد کے ٹرسٹیان مصلین سے محض درخواست کرکے اکیسویں، تیئیسویں، پچیسویں، ستائیسویں یا کسی اور شب کو مسجد میں رومال پھرا کر حافظ کے لئے روپئے بٹوریں، تو یہ صورت کیسی ہے؟ اس صورت مسئولہ کو مندرجہ ذیل شرائط اور چند مشکلات کی بنا پر اختیار کرنا حرام ہے، یا شرع متین اس کی گنجائش رکھتی ہے؟

شرط ا: کسی فرد واحد پر کسی بھی طرح کا جبر واکراہ نہیں؛ بلکہ جو بصد رضا ورغبت حافظ کو ہدیۃً لوجہ اللہ دینا چاہے وہی دے۔ اور نیز جتنی رقم دینا چاہے اتنی دے، خواہ چار آنے ہی کیوں نہ ہوں۔

شرط ۲: زکوۃ، فطرات اور صدقات کی رقم ہرگز ہرگز اس رومال میں نہ ڈالی جائیں۔

مجبوریاں یہ ہیں:

(۱) انفرادی طور پر لوگوں کو رقم پہنچانی ہو تو اس میں وہ حضرات حرج میں مبتلا ہوتے ہیں جو دس بیس روپئے دینے کے خواہاں ہوتے ہیں، بایں طور کہ وہ لوگ گرچہ بلند جذبہ رکھتے ہیں؛ لیکن اپنی رقم کو حقیر گردانتے ہوئے وہ حافظ کو دیتے وقت عار محسوس کرتے ہیں، جب کہ ایسے لوگ بڑے مخلص ہوتے ہیں اور اللہ ان کے اخلاص کی قدر دانی فرماتے ہیں، نیز یہ قضیہ بھی مسلم ہے کہ بوند بوند گھڑا ابھرتا ہے، ہم نے بہت سے علماء کے حالات میں پڑھا ہے اور آج بھی مدارس دینیہ میں بہت سے طلبہ ایسے ہوتے ہیں جو رمضان کے ایسے ہی ہدایا سے اپنے سال بھر کے اخراجات کی تکمیل کرتے ہیں۔ بہر حال رومال پھرانے میں جانبین کی رعایت ہوجاتی ہے، یعنی جہاں مخلصین اپنے پاکیزہ جذبات کا اظہار کرلیتے ہیں وہیں بہت سے اہل علم کی کفالت بھی ہوجاتی ہے، نیز یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ عالمی سطح پر اسی فی صد سے بھی

زائد مسلمان (مال و دولت کے اعتبار سے) درمیانی یا آخری سطح پر گذر بسر کرتے ہیں تو رومال گردانی میں اسی فی صد مسلمانوں کی رعایت ہو جاتی ہے۔

(۲) جہاں مسجد میں طویل قطار لگ جاتی ہے، وہیں شور وغوغا اور دھکا مکی بھی ہو جاتی ہے۔

نوٹ: اس صورت مسئولہ میں حافظ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاہدہ یا معاملہ نہیں، وہ تو صرف اس جذبہ سے تراویح پڑھا رہا ہے کہ اس کا حفظ قرآن تازہ اور محفوظ ہو جائے (ہم نے بھی حفاظ سے سن رکھا ہے کہ وہ رمضان المبارک میں تراویح سنا دیتے ہیں، تو پورے سال انہیں بھول جانے کا اندیشہ نہیں رہتا) اسے اس بات سے چنداں سروکار نہیں کہ کوئی اسے پھوٹی کوڑی بھی نہ دے۔

(۵) حافظ کے لئے تراویح کے بعد ملنے والی رقم کا لینا علی الاطلاق حرام ہے، یا حرمت مخصوص صورتوں کی ہے؟ اگر مطلقاً حرام ہے تو پھر جواز کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

لگے ہاتھوں مندرجہ ذیل دو مسئلوں کے حکم بھی لکھ دیں تو نوازش ہوگی:

(الف): مسجد کے امام کے لئے نماز عید میں رومال گردانی کا کیا حکم ہے؟ آیا مکروہ ہے، مباح ہے یا حرام؟

(ب): زید کہتا ہے کہ ''جتنے بھی حفاظ ہوتے ہیں ان کے دل میں یہ لالچ ہوتا ہی ہے کہ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا'' گویا یہ حفاظ کرام حریص ہوتے ہیں، تو کیا زید کا اس طرح حفاظ کرام کی نیتوں پر ہاتھ صاف کرنا بجا ہے؟ کیا شرع شریف اسے اس بات کی گنجائش دیتی ہے؟

افتو فتوجروا.

المستفتی: محمد ایاز خان، خواجہ پیلس، نزد مسجد اقصیٰ، کوسہ ممبرا، ضلع تھانہ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حافظ قرآن کے لئے رمضان میں تراویح میں قرآن سنا کر اجرت لینا قطعاً جائز نہیں ہے، نصوص قطعیہ سے اس کی حرمت ثابت ہے۔

وَلاَ تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا. [سورة البقرة: ٤١]

ٹرسٹیان مسجد حافظ قرآن کے ساتھ معاوضہ متعین کرلیں یہ قطعاً جائز نہیں ہے، دینے والے اور لینے والے دونوں گنہگار ہوں گے۔

والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٥، زكريا ٩/ ٧٧)

(۲) معاوضہ کی پیشگی تعیین نہ ہومگر منتظمین سرمایہ داروں کو پانچ پانچ سو یا کم زیادہ حافظ کے لئے انتظام کا پابند کردیں یہ بھی قطعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ بھی صراحتاً اجرت کی ادائے گی کا انتظام ہے، ختم قرآن کے بعد دیر یا سویر انفرادی طور پر مصافحہ میں دینے کا اس مسجد میں پہلے سے رواج نہیں ہے اور اتفاقی طور پر کوئی شخص کچھ دیتا ہے، تو وہ اجرت میں شامل نہیں ہے۔ اور اگر اس مسجد میں پہلے سے ختم قرآن کے موقع پر بوقت مصافحہ دینے کا رواج ہے، تو یہ ''**المعروف كالمشروط**'' کی بناپر اجرت تراویح کے دائرہ میں داخل ہوکر ممنوع ہے۔ حضرت تھانویؒ نے اس طرح لینے دینے کو ناجائز اور ممنوع لکھا ہے۔ (امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۸۱)

(۴) رومال پھرا کر حافظ صاحب کے لئے روپیہ جمع کرنا یہ بھی دوسری صورت کی طرح قرآن سننے سنانے کی صریح اجرت ہے؛ اس لئے اس طرح بھی دینا لینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

شرط ۱ جو شخص بلا جبر واکراہ حافظ صاحب کو لوجہ اللہ ہدیہ دینا چاہتا ہے، تو وہ حافظ صاحب کے گھر کیوں نہیں دیتا۔ اور اگر حافظ صاحب کے گھر جانا دشوار ہو تو حافظ صاحب کے گھر خفیہ طور پر منی آڈر کردے جس کا تعلق قرآن سنانے سے نہ ہو، تو وہ ہدیہ بن سکتا ہے چاہے جتنی رقم حافظ صاحب کے گھر خفیہ طور پر منی آڈر کردے اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن ختم قرآن کے موقع پر دینے کا کیا مطلب ہے؟ یہ سوال نمبر ۳ کی طرح اگر وہاں مصافحہ یا انفرادی طور پر لینے دینے کا پہلے سے رواج نہیں ہے اور کوئی شخص خفیہ طور پر حافظ کو کچھ دے دے جس کا خیال حافظ صاحب کے ذہن میں پہلے سے نہ ہو تو ایسی صورت میں گنجائش ہے، رومال گھوما کر حافظ صاحب کے لئے روپیہ جمع کرنا اور اکٹھے کرکے دینا اس کے لئے سائل نے بہت

سے راستے بیان فرمائے ہیں، مگران راستوں میں سے کوئی بھی راستہ جواز کے لئے نہیں بنتا ہے، اگر حافظ صاحب اور اہل علم کی کفالت کا ارادہ ہے، تو ان کے گھر درمیان سال میں کیوں نہیں بھیجتے؟ ختم قرآن کے موقع پر لینے دینے کا کیا مطلب ہے؟ یہ محض اجرت ہی ہے اور یہ کہنا کہ حافظ صاحب کا قرآن یاد رہے گا تو حافظ صاحب کے قرآن یاد رکھنے کے مکلّف آپ نہیں ہیں؛ بلکہ حافظ صاحب خود یاد رکھنے کے مکلّف ہیں؛ اس لئے دوسرے لوگ اللہ کے یہاں مسئول نہیں ہوں گے، اب کوئی یہ پوچھے کہ قرآن کی حفاظت کیسے ہو تو اس کی ذمہ داری اللہ نے خود لے رکھی ہے۔ ''**انا له لحافظون**''.

اب رہی یہ بات کہ اگر حافظ قرآن سنا کر پیسہ نہ لے تو اس کا گزر بسر کیسے ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حافظ صاحب کے پاس کوئی کاروبار نہیں ہے، تو وہ کسی دینی مدرسہ میں قرآن کی تعلیم دینے کے لئے استاذ بن جائے پھر اپنی ماہانہ تنخواہ سے گزر بسر کیا کرے، قرآن کریم کا درس دینا بچوں کو پڑھانا الگ چیز ہے اور رمضان میں تراویح میں قرآن ختم کرنا دوسری چیز ہے، دونوں کو مخلوط کر کے یکساں سمجھنا دینی مسائل کے سمجھنے میں کمی ہے۔

(۱) رمضان میں قرآن سنا کر اجرت لینے کے جواز کی کوئی شکل یا حیلہ ہم کو معلوم نہیں، ان سب کے دلائل ماہنامہ ''ندائے شاہی'' شمارہ ستمبر ص: ۷ار پر موجود ہیں۔

(۲) مسجد کے امام کے لئے عیدگاہ میں رومال گردانی یا مصافحہ میں دے دے، یا عید کے موقع پر سالانہ رقم دے دے، ہر طرح سے جائز ہے، یہ رقم قرآن سنانے کی نہیں ہے؛ بلکہ امام کی امامت کی سالانہ آمدنی ہے، جس میں ختم قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے، زید کا یہ کہنا کہ تمام حفاظ حریص ہوتے ہیں، درست نہیں ہے، قرآن کریم میں ایسی بدگمانی سے منع کیا گیا ہے۔

اِجۡتَنِبُوۡا كَثِيۡرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ. [سورۃ الحجرات، آیت: ۱۲]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۱۷ر ذیقعدہ ۱۴۲۵ھ
۱۴۲۵/۱۱/۱۹ھ	(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۱۳)

تراویح میں قرآن پاک سنانے کی اجرت ایک متفقہ اور شرعی فیصلہ

سوال [۳۲۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں قرآن پاک بغیر تعین اجرت کے سنانا اور سننا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: فقیہ العصر حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: محض تراویح میں قرآن شریف سنانے پر اجرت لینا درست نہیں ہے، اس میں کوئی حیلہ بھی مفید نہیں۔
(واللہ اعلم بالصواب)

آمد ورفت کا کرایہ لینا اور مہمانی کرنا جائز ہے۔ اور آمد ورفت کا کرایہ دے کر باہر سے حافظ کو بلانا اور اس کا قرآن مجید بلا معاوضہ سننا جائز ہے اور موجب ثواب بھی ہے، اور جب کہ باہر سے آیا ہوا ہو تو بلایا ہوا مہمان ہے؛ لہٰذا اس کو عمدہ کھانا کھلانا بھی جائز ہے اور ثواب بھی ہے۔
(فتاوی دارالعلوم جدید ۴/ ۲۹۰)

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: کہ اجرت دے کر قرآن مجید پڑھنا اور پڑھوانا دونوں گناہ ہے؛ اس لئے تراویح میں چند مختصر سورتوں سے پڑھ لینا بلا شبہ اس سے بہتر ہے کہ اجرت دے کر پورا قرآن مجید پڑھوائے؛ کیوں کہ پورا قرآن مجید تراویح میں پڑھنا مستحب ہے۔ اور اجرت دے کر قرآن مجید پڑھنا پڑھوانا گناہ ہے۔ اور گناہ سے بچنا یہ سنت مستحب پر عمل کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔ اور اگر کسی نے پڑھ لی تو نماز کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، نماز ہوگئی اگرچہ مکروہ ہوئی۔ (فتاوی دارالعلوم قدیم ۲/ ۲۴۷)

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اجرت دے کر قرآن شریف تراویح میں پڑھوانا درست نہیں ہے، اگر بے اجرت لئے ہوئے پڑھنے والا حافظ نہ ملے تو چھوٹی سورتوں سے تراویح پڑھنا بہتر ہے، قرآن مجید تراویح میں سنانے کی اجرت لینا اور دینا جائز نہیں۔
(کفایت المفتی ۳/ ۳۶۲، جدید زکریا ۳/ ۴۰۹، جدید مطول ۱۱/ ۵۳۶)

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: اگر مسجد میں دینے کا رواج ہے تو قاعدہ فقہ

ہے: ''المعروف کالمشروط'' لہٰذا یہ صورت بھی ناجائز ہے اور استیجار علی قراءۃ القرآن میں داخل ہے۔ (فتاوی دارالعلوم قدیم/۱۱۰)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: ختم تراویح کے دن جو حافظ کو چندہ اکٹھا کر کے دیا جاتا ہے یہ جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ روپیہ کی طمع سے قرآن مجید پڑھتا ہے، اس لئے اس کو پڑھنے کا ثواب تو کیا ہوتا یہی غنیمت ہے کہ اس پر مؤاخذہ نہ ہو اور حافظ صاحب کا محض روپیہ کے واسطے پڑھنا ظاہر ہے؛ کیوں کہ حافظ صاحب کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں کچھ نہ ملے گا تو حافظ صاحب ہرگز نہ پڑھائیں گے اور بہانہ بازی کر کے روانہ ہو جائیں گے۔ اور اگر بالفرض پورا قرآن ختم بھی کر دیا تو مایوس ہو کر جائیں گے اور دوبارہ کبھی اس مسجد کا رخ نہ کریں گے، آخر خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اس حافظ نے روپئے کے لالچ میں قرآن پڑھا ہے، یا دین کا کام سمجھ کر خالص رضائے الٰہی کے واسطے پڑھا ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب بغیر اس کے کوئی حافظ نہیں ملتا تو میں یہ کہوں گا کہ ایسے حافظ سے قرآن شریف سننے سے تو بہتر ہے یہ کہ ''الم ترکیف'' (چھوٹی سورتوں سے) تراویح پڑھ لی جائے، یہ اول تو دین فروشی ہے اور دوسرے لوگوں پر دباؤ ڈال کر چندہ لیا جاتا ہے اور چندہ کی فہرست مجمع کو پیش کی جاتی ہے جس سے دوسروں کی دیکھا دیکھی کچھ لکھانا ہی پڑتا ہے، بعض کو غیرت دلائی جاتی ہے کہ میاں یہ تو تمہاری حیثیت کے خلاف ہے کم از کم دو چند تو کر دیجئے طوعاً و کرہاً جب چاروں طرف سے زور ڈالا جاتا ہے، تو بیچارے کو مجبور ہونا ہی پڑتا ہے، یہ رقم قطعاً حرام ہوتی ہے؛ کیوں کہ حلت عطایا میں طیب خاطر شرط ہے، اول تو یہ موقع تھا کہ بخوشی دیا جاتا، تب بھی لینا جائز نہ ہوتا اور اس پر ایک امر موجب حرمت مزید ہو گیا۔

فقیہ الامت حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ: جو حافظ اجرت پر سناتے ہیں، خواہ وہ طے شدہ ہو یا غیر طے شدہ ہو، وہ سنانا عبادت نہیں ہے، پس اس کو سننا بھی نہیں چاہئے۔ (فتاوی رشیدیہ، ص: ۲۱۸)

فتویٰ ۲: جو حافظ روپیہ کی خاطر قرآن سناتا ہے تو اس کا قرآن نہیں سننا چاہئے، تراویح میں

قرآن مجید سنانے کی اجرت لینا اس لئے درست نہیں ہے کہ قرآن شریف پڑھنا عبادت ہے۔اورعبادت پراجرت لینا حرام ہے۔

قال في ردالمحتار: الآخذ والمعطي آثمان.

(ردالمحتار میں ہے کہ: قرآن مجید پراجرت لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار رہیں) حافظوں کواجرت پرقرآن سنانا حرام ہے؛اس لئے کہ رمضان المبارک میں جوقرآن مجید تراویح ونفل میں سنایا جاتا ہے(خواہ شبینہ ہی کی شکل کیوں نہ ہو) سب پر اجرت (یعنی روپیہ وغیرہ) لینا اور دینا دونوں حرام ہےاور یہ خرچہ مسجد کی آمدنی میں سے ہوتو اور بھی برا ہے؛ بلکہ متولی پراس کا ضمان آوے گا،یعنی جس قدراس کام میں مسجد کا مال خرچ کیا ہےاس کے ذمہ ہے کہ پھراپنے پاس سے وہ روپیہ مسجد میں دے۔(فتاوی رشیدیہ/۳۹۲،جدیدزکریا/۳۷۰)

سوال: اگرکوئی حافظ کوایک مہینے کے لئے امام مقررکرکے کچھ دےتو اس صورت میں عند الشرع اجرت حلال ہوگی یانہیں؟ جب کہ اس کا مقصد تراویح میں قرآن سنانا ہےاورامامت کی صورت میں تو حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے؛ کیوں کہ علماءمتأخرین نے امامت کی اجرت کے جواز کافتویٰ دیا ہے،آپ کی کیارائے ہے؟

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: یہ جواز کافتویٰ اس وقت ہے جب امامت ہی مقصود ہو(الأمور بمقاصدہا) حالانکہ یہاں مقصود ختم تراویح ہےاور یہ محض ایک حیلہ ہے، دیانات میں جوکہ معاملہ فی مابین العبدوبین اللہ ہے حیلے مفید جواز واقعی کومفیدنہیں ہوتے؛ لہٰذا یہ جائز نہ ہوگا۔(امدادالفتاوی،زکریا۱/۴۸۵)

سوال: سامع کواجرت دیناجائز ہے یانہیں؟ بعض لوگ اس کو جائز کہتے ہیں،جیسا کہ’’امداد الفتاوی‘‘میں موجود ہے۔

حضرت مفتی سعیداحمد صاحب پالن پوری فرماتے ہیں: سامع کواجرت دینا بھی جائزنہیں۔ (فتاوی دارالعلوم جدید۴/ ۲۹۵) میں عدم جواز کی صراحت موجود ہے۔اور’’امداد الفتاوی ۱/ ۴۹۶‘‘مطبوعہ دیوبند میں جو جواز کا فتویٰ ہے،اس سے حضرت اقدس تھانوی قدس سرہ

نے ''التذکیر'' حصہ سوم ''التہذیب ۳/ ۸۳'' میں رجوع فرمالیا ہے جو ''امداد الفتاوی'' میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ اور میرے تحشیہ کے وقت وہ رجوع میرے سامنے نہیں تھا؛ اس لئے حاشیہ میں نہ آسکا، بعد میں یہ رجوع میرے سامنے آیا ہے، جس کی تائید ''فتاوی دارالعلوم'' سے ہوتی ہے۔

تصدیق حضرت مفتی شبیر احمد صاحب مدظلہ العالی

یہ سب مسائل صحیح و درست ہیں۔

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۰۱)

ایک مہینے کے لئے حافظ قرآن کو امامت کے لئے مقرر کر کے روپیہ دینا

سوال [۳۲۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں میں یہ طے ہوا ہے کہ ایک مہینہ کے لئے حافظ قرآن کو امامت کے لئے مقرر کیا جائے گا اور ختم تراویح کے بعد پیسہ دیا جائے گا، تو کیا یہ پیسہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ مدلل تحریر فرمائیں عین نوازش ہوگی۔ والسلام

المستفتی: ابوالحسن چین پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یہاں اصل مقصد نماز پنجگانہ کی امامت نہیں ہے؛ بلکہ قرآن سنانا ہے؛ اس لئے حضرت تھانوی قدس سرہ نے ''امداد الفتاوی'' میں اس کو بھی ناجائز لکھا ہے۔ (امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۸۵)

الأمور بمقاصدها. (الأشباه، القاعدة الثانية، قديم ١ / ٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۸۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۹/۳ھ

حیلہ بنا کر تراویح کی اجرت لینا

سوال [۳۲۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح کی اجرت کے بارے میں بعض عوام اور حافظ وقت کو حیلہ بناتے ہیں، عوام کہتے ہیں کہ گھر سے آکر وہ ہمارے یہاں مستقل وقت دیتا ہے، اس وقت کی اجرت دیتے ہیں۔ اور حافظ صاحب کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر بار کو چھوڑ کر دوسرے کے یہاں مستقل وقت دیتا ہوں اس کی اجرت لیتا ہوں، اس طرح عوام اور حافظ صاحب کے حیلہ کا کیا جواب ہے؟

المستفتی: محمد اسرار الحق، محمد پور، اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: "المعروف کالمشروط" کے قاعدہ کے مطابق حافظ قرآن کو تراویح میں اجرت لینا اور دینا کسی بھی صورت میں کسی بھی حیلہ کے ساتھ جائز نہیں، ایسی صورت میں کسی کو بھی قرآن کریم سننے اور سنانے کا ثواب نہیں ملے گا؛ بلکہ تمام لوگ گنہگار رہوں گے، اگر بلا اجرت کے کوئی امام نہ ملے تو ایسی صورت میں ''الم ترکیف'' سے تراویح کی نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۱۴/ ۳۲، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۶۴، ایضاح المسائل/ ۲۶)

وإن القراء ة لشيء من الدنيا لا تجوز، وإن الآخذ والمعطي آثمان.

(شامي، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل، زكريا ۲/ ۵۳٤، كراچی ۲/ ۷۳، ٦/ ٥٦، البحر الرائق، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۸/ ۳٥، كوئٹه ۸/ ۱۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الاولی ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۲۲۷)

قرآن سنانے کی اجرت کسی بھی حال میں جائز نہیں

سوال [۳۲۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید حافظ قرآن ہے اور اس کی والدہ مقروض ہیں، اس کے والد اس کی والدہ کا قرض ادا نہیں کرتے، تو کیا قرض ادا کرنے کے لئے زید کو روپیہ لینا جائز ہوگا، تراویح سنانے والے کو قرآن پورا ہونے کے دن مسجد والے دیتے ہیں، زید ابھی کچھ کام بھی نہیں کرسکتا؛ اس لئے کہ وہ ابھی پڑھ رہا ہے۔ اور اگر لینا جائز ہے تو کیا پہلے طے بھی کرسکتا ہے یا نہیں؟ قرض ادا کرنے کے لئے۔ بحوالہ جواب تحریر فرما کر شکریہ کا موقع دیں، اگر ''کفایت المفتی'' کی کسی جلد میں ہو تو وہ بھی تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد راغب سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں زید کا روپیہ لینا ناجائز ہے، لینے اور دینے والے دونوں گنہگار رہیں، اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں، اگرچہ پہلے سے کچھ متعین نہ کیا جائے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۶/ ۳۷۷، جدید ڈابھیل ۱۷/۲/۷)

لأن المعروف كالمشروط، والقرآن بالأجرة لا يستحق الثواب، والآخذ والمعطي آثمان. (درمختار مع الشامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٦-٧٧)

اور پہلے سے اجرت متعین کرنا بھی حرام ہے۔ **لقوله تعالىٰ: وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا.** [سورة البقرة، آیت: ٤١] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۱۹ھ

حافظ کے ذمہ تراویح کے ساتھ ایک دو وقت کی نماز کر کے نذرانہ دینا

سوال [۳۲۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ میں حافظ بلا اجرت تراویح پڑھانے کے لئے نہیں ملتا اور اجرت لینا دینا جائز نہیں، تو پھر کیا رمضان المبارک کے مہینہ میں حافظ کو تنخواہ پر رکھ لیں اور اس کے ذمہ تراویح کے علاوہ عشاء وغیرہ ایک دو وقت کی نماز لازم کر دی جائے اور بقیہ نمازوں میں اگر زیادہ دشواری نہ ہو تو حاضری ضروری قرار دی جائے اور چندہ کر کے یا پھر مسجد سے اس کی تنخواہ پوری کر دی جائے، جیسا کہ اساطین ملت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ اور مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ نے مذکورہ حیلہ کی گنجائش بتلائی ہے، جب کہ دیگر مفتیان کی تحقیقات اس کے برخلاف ہیں اور وہ لوگ "**المعروف کالمشروط**" کے تحت اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

المستفتی: شکیل احمد لکھیم پوری، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو لوگ سوال نامہ میں درج کردہ حیلہ بتلاتے ہیں وہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، بہرحال اس طرح حیلہ کرنا بھی جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا؛ اس لئے کہ آئندہ اس حیلہ کے بغیر حافظ صاحب کو رکھا جائے اور کچھ نہ دیا جائے، تو وہ ہرگز نہیں آئے گا؛ اس لئے اس طرح اجرت لینے والے حافظ کے پیچھے قرآن سننے سے بہتر یہی ہے کہ "الم ترکیف" سے تراویح پڑھی جائے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/۲۶۳، ایضاح المسائل، ص:۲۷، کفایت المفتی قدیم ۳/۳۶۳، جدید زکریا ۳/۴۰۹، جدید زکریا مطول ۱۱/۵۳۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۲۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/ ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ

چندنمازوں کی امامت کے ساتھ تراویح پڑھانے والے کا نذرانہ قبول کرنا

سوال [۳۲۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حافظ رمضان المبارک کے اندر تراویح سناتا ہے اور ساتھ ہی دوتین نمازیں پڑھاتا ہے، تو اس صورت میں تراویح کی اجرت لینا درست ہے یا نہیں؟ یا اجرت کے بغیر صرف کپڑے یا کچھ چیزیں تحفۃً لیتا ہے، تو کیا اس طرح کا لینا جائز ہے؟

المستفتی: سید حبیب، آندھرا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حافظ صاحب خواہ صرف تراویح پڑھاکر اجرت لیں یا تراویح کے ساتھ چندنمازوں کی امامت کرکے اجرت لیں، دونوں صورتوں میں اجرت لینا دینا ناجائز ہے؛ اس لئے کہ تراویح کے ساتھ جو چند نمازیں رمضان میں پڑھا رہا ہے، وہ صرف اس نیت سے پڑھا رہا ہے کہ تراویح کی اجرت حلال ہوجائے، صرف چند نمازیں پڑھانے کی وجہ سے حافظ کو مذکورہ اجرت نہیں دیں گے، تو پتہ چلا کہ جو اجرت دی جارہی ہے وہ تراویح میں ختم قرآن ہی کی اجرت ہے۔ اور دونوں وقت کھانا اور سحری کا انتظام یا کوئی کپڑا دینا لینا یہ اجرت میں شمار نہیں ہوتے، اتنا تو رمضان میں ویسے بھی امام ومؤذن کو دے دیا جاتا ہے۔ (مستفاد: انواررحمت/۴۹۰)

ویمنع القارئ للدنیا، والآخذ والمعطي آثمان، فالحاصل أن ما شاع في زماننا قراء ة الأجزاء بالأجرة لا یجوز. (شامي، کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، کراچی ۶/ ۵۶، زکریا ۹/ ۷۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/صفر ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۱۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۲/۸ھ

ختم قرآن کے موقع پر حفاظ کو کسی بھی حیلہ سے ہدیہ کرنا جائز نہیں

سوال [۳۲۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے شہر میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں تقریباً یہ رواج ہے کہ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے والے حفاظ کرام وائمہ کرام کو ۲۷ر رمضان المبارک کی شب یعنی شب قدر میں بعد ختم قرآن کے مسجد کی انتظامیہ کمیٹی والے اپنے اپنے محلّہ کا چندہ اکٹھا کرکے عوام کی رضاوخوشی سے بلاکسی شرط وشرائط کے نذرانہ وہدیہ کے طور پر اجتماعی حیثیت سے کچھ رقم جو بلاتعیین جمع ہوجاتی ہے، حافظ وامام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور ساتھ میں اپنے اخلاق کریمانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ کپڑے وغیرہ بھی نذر کرتے ہیں، یہ سارا کام بلاتعیین اور بلاجبر واکراہ کے عوام کی رضا وخوشی سے ہوتا ہے، تو کیا شریعت کے اعتبار سے جائز ہے؟ جب کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: ’’**تهادوا تحابوا**‘‘ اور بعض احادیث سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہدیہ اور نذرانہ لینا ثابت ہے۔ اور اسی بات کو مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بھی اپنے فتاویٰ ’’کفایت المفتی‘‘ جلد۳ر میں بلاتعیین جائز قرار دیا ہے۔ اور دارالعلوم کے سابق فتاوی میں بھی اس کو جائز قرار دیا ہے؛ لیکن ہمارے یہاں کے کچھ نیم ملا حضرات نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور ثبوت میں حال کا دارالعلوم کا فتویٰ پیش کیا ہے، اسی طرح مظفرنگر کے مفتی افتخار الحسن صاحب کی جانب سے بھی حرام کا فتویٰ جاری ہوا ہے؛ لہٰذا ہمارے شہر میں بڑا انتشار ہے کہ کس کو مانیں اور کس کو نہ مانیں؛ اس لئے حضرت سے گزارش ہے کہ اس کا تفصیل سے جواب تحریر فرمائیں، تاکہ انتشار دور ہو اور صحیح صورت سامنے آئے۔

المستفتی: انجمن اتحاد المعلمین کھرگون، ایم پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز میں قرآن کریم سنانے کی بنیاد پر حافظ صاحب کو ختم

قرآن کے موقع پر تعیین یا بلا تعیین کسی بھی طریقہ سے کچھ دینا وہ نماز میں قرآن کی تلاوت کی اجرت ہے۔ اور تعیین کر کے دینے کی صورت میں ناجائز ہونا واضح ہے اور بغیر تعیین کے دینا ”**المعروف کالمشروط**“ کے اصول کے تحت یہ بھی ایک طرح کی اجرت ہے؛ اس لئے کہ حافظ صاحب کے دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ مقتدیوں کی طرف سے کچھ ملے گا اور مقتدیوں کے دلوں میں بھی یہ بات ہوتی ہے کہ ہمیں کچھ دینا ہے، چنانچہ سوال نامہ میں اسی کا اظہار بھی ہے کہ حافظ صاحب کو دینے کے لئے چندہ بھی کیا جاتا ہے، یہ صرف اور صرف قرآن پڑھنے کی اجرت ہے، اس کو ہدیہ یا نذرانہ کا نام دینے سے ہدیہ یا نذرانہ نہیں بنے گا، اگر ہدیہ دینا تھا تو اس کے بغیر امام صاحب کے گھر غیر رمضان میں کبھی اتنی بڑی رقم پہنچائی گئی، آج ختم کے موقع پر کیوں دیا جارہا ہے، ہر ایک اپنے اپنے جی میں سوچ کر دیکھ لے یہ قرآن سنانے ہی کی وجہ سے دیا جارہا ہے، اور جو سوال نامہ میں یہ کہا گیا ہے کہ حدیث شریف میں ”**تہادوا تحابوا**“ فرمایا گیا ہے، آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دو، تاکہ محبت بڑھے، کیا اس ہدیہ دینے کا موقع صرف ختم قرآن ہی ہے؟ لاکھوں حدیثوں کے ذخائر سے کوئی حدیث شریف دکھا دی جائے جس میں ختم قرآن کے موقع پر قرآن پڑھنے والے کو ہدیہ پیش کیا گیا ہو، سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام نے خوب ہدیہ قبول فرمایا ہے، اس کا کوئی انکار نہیں کرتا؛ لیکن کیا قرآن سنانے کی بنا پر کسی نے آپ کو ہدیہ پیش کیا تھا؟ اور آپ نے اسی موقع پر اس کو قبول فرمایا تھا؟ یہ کس حدیث شریف میں ہے، اس کو واضح کیا جائے؟ ورنہ یہ محض دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اور جن علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے، انہوں نے صحیح مسئلہ بتلایا ہے، ان کو نیم ملا کہنا بھی علمائے حق کی توہین ہے۔ حضرت مفتی افتخار الحسن صاحب دامت برکاتہم کی جانب سے جو حرام کا فتویٰ جاری ہوا ہے وہ بھی صحیح ہے، اور حضرت تھانویؒ نے ”امداد الفتاوی“ میں حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے ”احسن الفتاوی“ میں حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحبؒ نے ”فتاوی محمودیہ“ میں، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند نے ”فتاوی دارالعلوم“ میں، حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ نے ”فتاوی رحیمیہ“ میں

اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی ''امداد المفتیین'' میں بنام ہدیہ دینے کو بھی ''المعروف کالمشروط'' کےاصول کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجرت قرار دیا ہے۔ اوراس کو ناجائز اور حرام کہا ہے۔ اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی رائے سے کسی بھی اہل فتاوی کو اتفاق نہیں ہے۔ (امداد الفتاوی زکریا ۱/۴۸۴، احسن الفتاوی ۳/۵۱۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۳۷، ۱۴/ ۳۲، ۷/ ۱۷۱، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۳۶، ۶۴، ۶۶، فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۶۳، ۷/ ۲۹۶، امداد المفتیین / ۳۶۳، عزیز الفتاوی/ ۶۶۳، ایضاح المسائل/ ۲۵-۲۶)

وَلا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا. [سورة البقرة: ٤١]

وإن القراءة لشيء من الدنيا لا تجوز، وإن الآخذ والمعطي آثمان، اقرء وا القرآن ولا تأكلوا به. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ٩/ ٧٦، ٩/ ٧٧، كراچى ٥/ ٥٦، رساله ابن عابدين، شفاء العليل، وبل الغليل في حكم الوصية بالختمات والتهاليل، ثاقب بك ڈپو ديوبند ١/ ١٥٧، ١/ ١٥٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۹ھ

تراویح کی اجرت کی چند صورتیں

سوال [۳۲۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک حافظ صاحب کی نیت صاف ہے اور وہ تراویح کا روپیہ لینے سے انکار کرتے ہیں؛ لیکن لوگ لینے پر مجبور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہدیہ ہے، ہم اپنی خوشی سے دے رہے ہیں، ایسی صورت میں یہ روپیہ لینا کیسا ہے؟

(۲) ایک حافظ صاحب عرصۂ دراز سے ایک مسجد میں امامت کرتے ہیں، رمضان میں

تراویح بھی پڑھاتے ہیں، ان کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ روپیہ ملے، تو ایسی صورت میں روپیہ لینا کیسا ہے؟

(۳) ایک حافظ صاحب غریب ہیں اور کسی مدرسہ میں زیر تعلیم ہیں، پڑھنے لکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، تو کیا ان کو تعلیم کی غرض سے روپیہ لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ مدلل ومفصل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: مظہر الاسلام قاسمی، تخصص فی معہد الدعوۃ بجامعۃ القرآن الکریم چاند پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حافظ صاحب کے دل میں لینے کا خیال نہ ہو اور نہ ہی اشراف نفس ہو، تو بھی اس طرح لینے سے غلط رسم اور ناجائز معاملہ کی تائید ہوتی ہے؛ اس لئے درست نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۵۱٦، امداد الفتاوی، زکریا ۱/۴۸۰، ۴۸۵)

(۲) تراویح پڑھا کر پیسہ لینا ناجائز ہے؛ اس لئے کہ قرآن کے عوض میں کوئی چیز وصول کرنا جائز نہیں ہے؛ لہٰذا امام صاحب کے لئے روپیہ لینا درست نہیں ہے، ہاں البتہ رمضان المبارک کی مخصوص مقدار سالانہ تنخواہ میں ضم کردی جائے تو گنجائش ہوسکتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۴/ ۴۲۷، جدید زکریا ٦/۲۴۳، امداد الفتاوی، زکریا ۱/۴۹۳، احسن الفتاوی ۳/۵۱۵)

ولا تصح الإجارة لأجل الطاعات (درمختار) ...... وفی الشامية: إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ. (الدرمختار مع الشامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ديوبند ٩/ ٧٧، ٧٦)

(۳) غریب حافظ جو زیر تعلیم ہو اس کے لئے بھی تراویح میں قرآن سنا کر روپیہ لینا جائز نہیں ہے، اس کو تو بلا کسی کام لئے دینا چاہئے۔ (مستفاد: مجموعۃ الفتاوی ۲/۳٦۳)

التلاوة المجردة عن التعليم من أعظم الطاعات التي يطلب بها الثواب، فلا يصح الاستئجار عليها. (تنقيح الفتاوى الحامدية بحواله مجموعة الفتاوى ٢/ ٢٤٢)

كل طاعة يختص بها المسلم لا يجوز الاستئجار عليها عندنا.
(شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٦، زکریا ٩/ ٧٦)
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۲۶۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۴/۲۹ھ

تراویح کی اجرت سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۳۲۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) تراویح میں قرآن شریف سنا کر حفاظ کرام کا روپیہ لینا اور محلّہ والوں کا حفاظ صاحبان کو روپئے دینا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) ایک حافظ صاحب تراویح میں قرآن کریم سناتے ہیں، روپیہ لینے کی ان کی نیت نہیں ہوتی؛ لیکن بطور ہدیہ اور نذرانہ کے دو چار ہزار روپیہ لوگ دے دیتے ہیں، تو اس صورت میں حافظ صاحب کا لینا اور لوگوں کا دینا جائز ہوگا یا نہیں؟

(۳) ایک حافظ صاحب مدرسہ میں زیر تعلیم ہیں، وہ تراویح میں ملے ہوئے روپئے سے صرف کتابیں خریدتے ہیں، تو ان کے لئے روپئے لینا جائز ہوگا یا نہیں؟

(۴) ایک حافظ صاحب نہایت غریب ہیں، مدرسہ میں زیر تعلیم ہیں، لکھنے پڑھنے کے لئے کوئی ظاہری اسباب نہیں، تو ان کے لئے روپئے لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ نیز مذکورہ چاروں صورتوں میں ان کے پیچھے تراویح کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: مظہر الحق قاسمی، جامعہ اسلامیہ مظاہر علوم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حفاظ صاحبان کو تراویح میں قرآن پاک سنا کر روپیہ

پیسہ بطور ہدیہ قبول کرنا، اسی طرح محلّہ والوں کا حافظ صاحب کو کچھ دینا جائز نہیں ہے۔
(مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۵۱۴، امداد المفتیین ۲/۳۶۳، فتاوی رشیدیہ، قدیم ۳۹۱، جدید زکریا ۳۷۰)

قال في رد المحتار: الآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ٦/ ٥٦)

(۲) اگر چہ حافظ صاحب کی اجرت کے نام سے لینے کی نیت نہیں ہوتی ہے، مگر بطور تحفہ اور نذرانہ لینے کی نیت ہوتی ہے؛ کیونکہ حافظ صاحب کو معلوم ہے کہ لوگ مجھے قرآن سنانے کی بنا پر جاتے وقت کچھ دیں گے اور لوگوں کے دلوں میں بھی یہی ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کو جاتے وقت کچھ دینا ہے؛ لہٰذا یہ بھی ”**المعروف كالمشروط**“ کے تحت داخل ہوکر نام کا نذرانہ ہے، درحقیقت یہ اجرت ہی ہے؛ اس لئے بطور نذرانہ بھی لینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۲۷، امداد الفتاوی ۱/ ٦ ۴۷، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۵)

(۳-۴) طالب علم کے لئے بھی قرآن سنا کر اجرت لینا جائز نہیں ہے، جس طرح غیر حافظ غریب طلباء اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں، اسی طرح غریب حافظ طلباء بھی اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں، قرآن سنا کر اجرت لینے کی اجازت دینا کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا؛ بلکہ یہ تو اجرت لینے کے لئے شروع ہی سے عادی بنانا ہے؛ اس لئے جواز کے دائرے میں نہیں آسکتا، نیز مذکورہ چار صورتوں میں اگر حافظ قرآن نے سنا کر روپیہ پیسہ لیا ہے، تو ایسے قاری کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن نماز مکروہ تحریمی ہوگی؛ لہٰذا اگر بغیر اجرت کے قرآن سنانے والا نہ ملے تو ”الم ترکیف“ سے تراویح پڑھ لینا زیادہ بہتر ہے۔
(مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۵، کفایت المفتی، قدیم ۳/ ۳۸۳، جدید زکریا دیوبند ۳/ ۴۰۹، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۵۳٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۹/۵/۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱ ۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۵/۱۴ھ

ماہِ رمضان میں حفاظ کو نذرانہ دینے کی چند شکلیں

سوال [۳۲۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ماہ رمضان المبارک میں حفاظ حضرات تراویح میں قرآن سناتے ہیں اور موٹی رقم حاصل کرتے ہیں، اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ:

(۱) کبھی تو حافظ صاحب مصلی حضرات سے سنانے کی اجرت طے کر لیتے ہیں، تو کیا اس طرح اجرت لینے دینے میں شریعت مطہرہ میں کوئی گنجائش ہے؟

(۲) کبھی اجرت طے نہیں کرتے، مگر بطور تحفہ ونذرانہ حافظ صاحب کو دیا جاتا ہے، آیا اس طرح نذرانہ دینا اور حافظ صاحب کو قبول کرنا درست ہے؟

(۳) کبھی حافظ صاحب کے ذمہ ایک دو وقت کی نماز سونپ دیتے ہیں اور امامت کے نام پر اجرت دیتے ہیں، جب کہ دوسرے مہینوں میں امام صاحب کی تنخواہ اتنی نہیں ہوتی جتنی حافظ صاحب کو ملتی ہے، کیا اس طرح اجرت دینا اور لینا شریعت مطہرہ میں جائز ہے؟

نوٹ: واضح رہے کہ مذکورہ بالا ہر صورت میں فریقین کے ذہن میں دینے لینے کی بات ملحوظ ہوتی ہے؛ اس لئے کہ حافظ صاحب کو معلوم ہے کہ لوگ مجھے قرآن سنانے کی بنا پر کچھ دیں گے اور لوگوں کے دل میں بھی یہی ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کو جاتے وقت کچھ دینا ہے۔ براہ کرم مذکورہ بالا مسائل کے باحوالہ مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد اظہر امین، لچھمن پور، پوسٹ بوجگاؤں، پورنیہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تراویح کی نماز میں قرآن کریم پڑھنے کی اجرت خواہ پہلے سے طے کر لیں یا بعد میں بطور تحفہ ونذرانہ حافظ قرآن کو دیں، دونوں صورت میں لینا دینا دونوں ناجائز ہے اور ایک دو وقت کی نماز کے لئے امام مقرر کر لیا جائے تب بھی ناجائز ہوگا؛

کیوں کہ اصل مقصد امامت نہیں ہے؛ بلکہ اصل مقصد قرآن کریم کو نماز میں پڑھنے کی اجرت ہے،تو یہ حیلہ ہوا اور دیانات میں حیلہ جائز نہیں ۔(مستفاد: انوار رحمت، باب: ۱۵، امداد الفتاوی ،زکریا ۱/ ۴۸۵ -۴۸۱، فتاوی رشیدیہ، قدیم/۳۹۲، جدید زکریا ۳۷۰، فتاوی خلیلیہ ۱/ ۴۸، کفایت المفتی ۳/ ۳۶۵، جواب: ۴۲۵ ، جدید زکریا ۳/ ۴۱۰، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۵۳۶، فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۴۶، جواہر الفقہ ۱/ ۳۸۲، جدید زکریا ۳/۵۲۲، امداد المفتیین / ۳۶۵، فتاوی محمودیہ ۷/ ۱۷، قدیم ، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۶۶، فتاوی احیاء العلوم ۱/ ۱۹۸، احسن الفتاوی ۳/۵۱۴، بہار شریعت مطبوعہ قادری بک ڈپو ۴/ ۳۵)

قـال الشـامي: إن مـا أجـازه الـمتأخرون إنما أجازوه للضرورة، ولا ضرورة في الاستئجار على التلاوة، فلا يجوز. (رسائل ابن عابدين، شفاء العليل، وبل الغليل في حكم الوصية بالختمات والتهاليل، ثاقب بك ڈپو ديوبند ۱/ ۱۶۸)

وقـال: ويـظهر لک أن العلة فی جواز الاستئجار على تعليم القراء ة والـفـقـه، والأذان، والإقـامة هي الضرورة، واحتياج الناس إلى ذلک، وإن هـذا مـقصور على هذه الأشياء دون ما عداها مما لا ضرورة إلى الاستئجار عليه. (رسائل ابن عابدين ۱/ ۱۶۱)

ومـن ذلک مسئلة الاستئجار على تلاوة القرآن المجردة ...... وقد أطبـقـت الـمتـون والشـروح والـفتـاوی على نقلهم بطلان الاستئجار على الـطـاعـات، إلا فيـمـا ذكـر، وعـلـلوا ذلک بالضرورة، وهي خوف ضياع الـديـن، وصـرحـوا بـذلک التـعـليـل، فـكيف يـصـح أن يقـال: إن مذهب الـمتـأخـريـن صـحة الاستـئـجـار عـلى التلاوة المجردة مع عدم الضرورة الـمذكورة، فـإنـه لـو مـضـى الـدهـر ولـم يستأجر أحد أحدا على ذلک لم يـحـصـل بـه ضـرر، بل الضرر صار في الاستئجار عليه، حيث صار القرآن مـكسبـا وحـرفة يتـجـر بها، وصار القارئ منهم لا يقرأ شيئا لوجه الله تعالیٰ خـالـصا، بل لا يقرأ إلا للأجرة، وهو الرياء المحض. (شرح عقود رسم المفتي،

دارالکتاب دیوبند ۹ ۵-۶۱، سهارنپور ۳۶-۳۸، هكذا في الشامية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ۶/ ۵۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ر رجب ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۸۰)

اجرت تراویح سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۳۲۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کیا حافظ صاحب تراویح میں اجرت طے کر کے پہلے یا بعد میں لے سکتے ہیں یانہیں؟

(۲) حافظ صاحب کو بنا مانگے جو کچھ نقدی کپڑے جوتے وغیرہ لوگ دیتے ہیں، انہیں لے سکتے ہیں یانہیں؟

(۳) اگر کسی گاؤں والوں نے پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے غلہ دیا تو لے سکتے ہیں یانہیں؟

(۴) تراویح میں قرآن پاک حدر سے پڑھنا سنت ہے یا تدویر سے؟

(۵) اگر حافظ صاحب نادار ہیں، غریب اور طالب علم ہیں اور ناداری کی وجہ سے گھر سے خرچ نہیں ملتا تو وہ تراویح کی اجرت لے کر اپنی کتابیں وغیرہ اور اپنا خرچ اس میں سے چلا سکتے ہیں یانہیں؟

(۶) ایک ہوتا ہے ماں باپ کا حکم اور دوسرا ماں باپ کی خواہش، تو کیا ماں باپ کی خواہش پر عمل کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ان کے حکم پر عمل کرنا ضروری ہے؟

(۷) حدیث میں سب سے پاک کمائی وہ بیان کی گئی ہے جو اپنے ہاتھ سے کمائی گئی ہو، تو کیا مدرس بن کر یا مؤذن وامام بن کر جو کمائی کی گئی ہو وہ ہاتھ کی کمائی کے برابر ہی ہے یا فرق ہے؟

المستفتی: محمد عثمان، سیتا پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱،۲،۳) تراویح میں قرآن سنا کر طے کر کے یا بغیر طے کئے نقدی یا غلہ کی شکل میں جو اجرت لی جاتی ہے وہ: **"لا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا"** [البقرۃ: ٤١] کی وعید میں داخل ہوکر ناجائز اور حرام ہے۔

(۴) قرآن کریم تراویح میں حدر سے پڑھنا بھی جائز ہے اور تدویر سے بھی؛ لیکن حدر کے مقابلہ میں تدویر سے پڑھنے میں زیادہ اطمینان وسکون ہوتا ہے اور سامعین کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے حدر کے مقابلے میں تدویر سے پڑھنا زیادہ افضل ہے۔

ثم القراءة على ثلاثة أوجه –إلى– وفي التراويح يقرأ بقراءة الأئمة بين التؤدة والسرعة. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني، القراءة، زكريا ٢/ ٦٧، رقم: ١٧٦٢)

(۵) ایسے نادار طالب علم کا تعاون کرنا مسلمانوں کے لئے باعث سعادت اور بڑی فضیلت ہے، مگر قرآن کریم سنانے کی اجرت کے طور پر نہیں؛ بلکہ از سر نو اس کا تعاون کرتے رہنا چاہئے۔

عن سالم عن أبيه، أن رسول الله –صلى الله عليه وسلم– قال: المسلم أخو المسلم، من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته، ومن فرج عن مسلم كربة، فرج الله عنه بها كربة من كرب يوم القيامة. (مسلم شريف، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الظلم، النسخة الهندية ٢/ ٣٣٠، بيت الأفكار، رقم: ٢٥٨٠، صحيح البخاري، كتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم، ولا يسلمه، النسخة الهندية ١/ ٣٣٠، رقم: ٢٣٧٨، ف: ٢٤٤٢)

عن أبي سعيد –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أيما مسلم كسا مسلما ثوبا على عري كساه الله من خضر الجنة، وأيما مسلم أطعم مسلما على جوع أطعمه الله من ثمار الجنة، وأيما مسلم سقى

مسلما على ظماء سقاه الله عز وجل من الرحيق المختوم. (سنن أبي داؤد، كتاب الزكوة، باب في فضل سقى الماء، النسخة الهندية ١/ ٢٣٦، رقم: ١٦٨٢)

(٦) ہاں البتہ اگر یہی مطلب ہے کہ ماں باپ کبھی حکم کرتے ہیں اور کسی موقع پر کسی دوسری بات کی خواہش ظاہر کرتے ہیں، تو ماں باپ کے حکم پر عمل کرنا واجب اور لازم ہے اور ماں باپ کی خواہش اور مرضی پر چلنا جب کہ شرعی طور پر جواز کے دائرہ میں ہو وہ بھی ضروری اور اولاد کے لئے خوش قسمتی ہے۔

عن معاذ رضي الله تعالىٰ عنه قال: أوصاني رسول الله صلى الله عليه وسلم بعشر كلمات، قال: لا تشرك بالله شيئا، وإن قتلت أو حرقت، ولا تعقن والديک، وإن آمراک أن تخرج من أهلک ومالک. (مسند الإمام أحمد بن حنبل ٥/ ٢٣٩، رقم: ٢٢٤٢٥)

عن عبدالله بن عمرو عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: رضا الرب في رضا الوالد، وسخط الرب في سخط الوالد. (ترمذی شریف، أبواب البر والصلة، باب الفضل في رضا الوالدين، النسخة الهندية، رقم: ١٨٩٩)

عن علي –رضى الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم (إلى قوله) قال: لا طاعة في معصية الله إنما الطاعة في المعروف. (مسلم، الامارة، باب وجوب طاعة الأمراء...... النسخة الهندية ٢/ ١٢٥، بيت الأفكار، رقم: ١٨٤٠)

(٧) مؤذن بن کر یا امام بن کر ماہانہ یا سالانہ جو اجرت ملتی ہے وہ ہاتھ کی کمائی کے حکم میں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۶/۲۴ھ

تراویح سنانے والے کو بلاشرط ہدیہ دینا

سوال [۳۲۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنے گھر میں تراویح پڑھواتا ہے اور یہ اس کا معمول نہیں ہے؛ بلکہ اسے کوئی مل جائے تو خوشی سے اپنے یہاں پڑھواتا ہے، اب جب کہ کچھ نہ ہوا اور نہ حافظ صاحب کو کچھ لالچ ہے تو قرآن شریف مکمل ہونے کے بعد وہ شخص حافظ کو جوڑا اور کچھ رقم دیتا ہے، اب حافظ صاحب اسے قبول کریں یا نہ کریں؟ یہ جوڑا اور رقم صرف ایک شخص کا عطیہ ہے۔ براہ کرام بہت جلد جواب سے نوازیں، مہربانی ہوگی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ بھی ناجائز ہے۔(مستفاد: امداد الفتاوی، قدیم ۱/ ۳۲۲، جدید زکریا ۱/ ۴۸۵)

المعروف عرفا، كالمشروط شرطا. (البناية، أشرفيه ديوبند: ۱۰/ ۲۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ رمضان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۴۷)

تراویح میں بخوشی روپے اور کپڑے دینے کا حکم

سوال [۳۲۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ماہ رمضان المبارک میں تراویح میں ختم قرآن کریم کے پیش نظر بلا تعیین اجرت اگر اہل محلّہ مسجد کے فنڈ یا اپنی طرف سے بخوشی کچھ رقم یا کپڑے وغیرہ دے دیں، تو شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ درصورت نفی شرعاً کوئی حیلہ فی زمانناہو تو تحریر فرمائیں؛ کیوں کہ ہمارے اطراف میں

بلا کچھ دئے قرآن کریم سننے پر لوگ ناراض ہوتے ہیں اور کچھ نہ دینے پر حافظ قرآن کی دستیابی بھی مشکل دہ مسئلہ ہے، بایں وجہ ساری جگہ اختلاف اور ختم قرآن جو سنت ہے اس کے ترک کا خدشہ ہے، امید ہے کہ مفصل جواب دے کر ممنون فرمائیں گے۔

المستفتی: امداد الحق غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں قرآن کریم سنانے والے حافظ صاحب کو اجرت دینا اور حافظ صاحب کا اجرت لینا دونوں ناجائز اور حرام ہیں اور قرآن کریم سننے سنانے کا ثواب کسی کو بھی نہ ملے گا؛ بلکہ سب گنہگار رہوں گے۔

وإن القراء ة لشيء من الدنيا لا يجوز، وأن الآخذ والمعطي آثمان؛ لأن ذلک يشبه الاستئجار على القراء ة، ونفس الاستئجار عليها لا يجوز.

(شامي، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالتهاليل، کراچی ۲/ ۷۳، زکریا ۲/ ۵۳٤)

اور حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم کو حصول رضائے خداوندی کا ذریعہ بناؤ، کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔

اقرؤا القرآن وابتغوا به. الحديث (رواه أحمد ۳/ ۳۵۷، رقم: ۱٤۹۱٦)

تعلموا القرآن، فإذا علمتوه فلا تغلو فيه، ولا تجفوا عنه، ولا تأكلوا به، ولا تستكثروا به. (رواه أحمد ۳/ ٤٤٤، رقم: ۱۵۷۵۱)

اور حدیث شریف میں ایسے لوگوں پر وعید آئی ہے، جو قرآن کریم کو اجرت وکمائی کا ذریعہ بناتے ہیں۔

اقرؤا القرآن وسلوا الله تبارک وتعالىٰ به من قبل أن يجيئ قوم يسئلون الناس به. (رواه أحمد ٤/ ٤٤۵، رقم: ۲۰۲۳۹)

اور اگر اجرت طے نہ کرے؛ بلکہ بطور نذرانہ وتحفہ حافظ صاحب کو دیا جائے اور حافظ صاحب اس کو بطور نذرانہ قبول کریں، تو یہ بھی ناجائز ہوگا، چونکہ یہ تو شرعی طور پر ”المعروف

کالمشروط" (شامي، کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، کراچی ٦/ ٥٥، زکریا ٩/ ٧٦) کے تحت داخل ہوکر نام کا نذرانہ ہے؛ لیکن درحقیقت یہ بھی اجرت ہی ہے؛ اس لئے کہ حافظ صاحب کو معلوم ہے کہ لوگ مجھے قرآن سنانے پر کچھ دیں گے اور لوگوں کے دل میں بھی یہی ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کو جاتے وقت کچھ دینا ہے اور اس طرح لینا دینا عادت اور معروف بھی ہے؛ لہٰذا یہ بھی ناجائز ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۲/ ۲۶۳، ۲/ ۲۹۴)

اور سوال نامہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ کے یہاں لئے دئے بغیر کچھ ہوتا نہیں ہے اور یہ خود لین دین تعیین کے لئے کافی ہے؛ اس لئے کسی بھی طریقہ سے حافظ صاحب کو قرآن سنانے کے بعد کچھ دینا جائز نہیں ہوگا، نیز اگر تراویح میں اجرت دے کر قرآن کریم نہ سنا جائے تو حفظ قرآن کا سلسلہ ختم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے؛ لہٰذا جہاں بلا اجرت حافظ قرآن نہ ملے، تو ایسی جگہ ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھنی چاہئے، تاکہ کم از کم سنت (تراویح) ادا ہوتی رہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/ ۳۶)

کیوں کہ تراویح کی ادائے گی ختم قرآن کریم پر موقوف نہیں، 'الم ترکیف' سے بھی تراویح پڑھی جاسکتی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ر شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸ر شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ

تراویح میں ختم قرآن پر حافظ صاحب کو جوڑا دینا

سوال [۳۲۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احقر رمضان المبارک کے دوسرے عشرہ میں اپنی پھوپھی کے پاس ملنے کے لئے گیا تھا، پھوپھی صاحبہ بھی حافظہ ہیں، انہوں نے گھر پر تراویح میں قرآن پاک سنانے کے لئے کہا، چنانچہ تراویح کا سلسلہ شروع ہوگیا، نیچے جو مالک مکان تھے وہ بھی تراویح میں شریک ہونے

لگے، اس طرح پھوپھا اور چار مرد حضرات شریک ہوتے تھے، آخری دن ختم کلام پاک کے وقت ایک نئی شال انہوں نے مجھ کو اڑھائی اور مجھ سے گلے مل کر رخصت ہوئے، پہلے سے مجھ کو کچھ خیال بھی نہ تھا، گھر واپس آنے کے بعد دادا جان اور ابو نے مجھ سے کہا کہ تمہیں اسی وقت منع اور انکار کرنا چاہئے تھا، تم نے کیوں لی اور ناراضگی کا اظہار کیا، اس کے بعد سے اب تک وہ شال میرے ہی پاس ہے؛ البتہ میں نے استعمال نہیں کی ہے، آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس کا استعمال کرنا میرے لئے حرام یا خلاف اولیٰ تو نہیں ہے، اگر ایسا ہے تو پھر اس کا مصرف کیا ہے؟ کیا کسی مسکین طالب علم کو دینے سے میں بری الذمہ ہو جاؤں گا؟ جو حکم شرعی ہو اس سے میری رہبری فرمادیں۔

المستفتی: ناکارہ سعید الرحمٰن، گلبرگوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت میں پھوپھی نے جو شال دی ہے، اور اس طرح کپڑا وغیرہ پہلے سے بھی دینے کا اگر دستور رہا ہے، تو یہ قرآن سنانے کے عوض میں نہیں ہے، نیز اس طرح کا ایک آدھ جوڑا حافظ قرآن کو دینا قرآن سنانے کی اجرت کے طور پر دینا سمجھ میں نہیں آتا ہے؛ بلکہ اس طرح کے جوڑے ایسے موقع پر آنے والے معزز لوگوں کو بھی بعض دفعہ دئے جاتے ہیں؛ اس لئے اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں اور یہ: **وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا.** [سورة البقرة: ٤١] کی وعید میں داخل نہیں ہے؛ لیکن چونکہ آپ کو بھی تردد ہے؛ اس لئے تقویٰ کی بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ کسی غریب کو اسے صدقہ کردیں، تاکہ آئندہ بھی قرآن سنانے کے بدلے اور نتیجہ میں کوئی چیز لینے کے بارے میں طبیعت میں وہم وگمان بھی نہ رہے، یہ آپ کے لئے افضلیت کی بات ہے، لازم نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۲۹ھ

حافظ تراویح کو عطر، شہد اور مٹھائی ہدیہ میں دینا

سوال [۳۲۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ختم تراویح کے موقع پر یا حافظ صاحب کو رخصت کرتے وقت مصلیان تراویح عمومی چندے سے یا کوئی صاحب خیر شخص اپنے ذاتی مال سے کچھ عمدہ قسم کی مٹھائیاں یا دیگر اشیاء مثلاً خوشبو، شہد وغیرہ بطور ہدیہ ونذرانہ حافظ صاحب کی خدمت میں پیش کریں تو ان کا دینا اور حافظ صاحب کو اس کو لینا کیسا ہے؟ جب کہ حافظ صاحب تراویح سے قبل یا بعد میں نہ تو کسی بھی قسم کی رقم کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ ہی رقم کے لینے پر آمادہ ہوتے ہیں؛ بلکہ موجودہ وقت میں حفاظ کرام کو نذرانہ کی شکل میں جو رقم دی جاتی ہے، اس کے شدید مخالف بھی ہیں؛ اس لئے برائے کرم مذکور فی السوال کے تمام اجزاء کو مدلل مع حوالہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: رئیس احمد چمپارنی، متعلم خادم الاسلام ہاپوڑ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حافظ صاحب کو ختم تراویح کے موقع پر یا رخصتی کے وقت کسی قسم کی نقدی پیسے ظاہری یا خفیہ کسی طرح دینا درست نہیں۔ اور نہ حافظ صاحب کے لئے لینا جائز ہے، ہاں البتہ اگر خوشبو، عطر وغیرہ پیش کیا جائے تو اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں؛ اس لئے کہ یہ اجرت میں داخل نہیں ہے؛ البتہ شہد اور مٹھائیاں لینے میں حافظ صاحب خود ہی اس سلسلہ میں تجربہ کرکے دیکھیں کہ یہ کیوں دیا جارہا ہے، اگر اس کے دینے میں یہ محسوس ہوجائے کہ قرآن سنانے کی وجہ سے ہے، تو لینا درست نہیں اور اس کے بغیر بھی لینے کی بات سمجھ میں آتی ہے، تو لے سکتا ہے ورنہ نہیں۔

إن الآخذ والمعطي آثمان؛ لأن ذلک یشبه الاستئجار علی القراءة

ونفس الاستئجار عليها لايجوز. (شامي، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالتهاليل، زكريا ٢/ ٥٣٤، كراچى ٢/ ٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۰۹۱/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۱۱ھ

حصول علم کی خاطر نادار طالب علم کا تراویح کی اجرت لینا

سوال [۳۲۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک لڑکا حافظ قرآن ہے اور وہ غریب ہے اور مولوی یا مفتی بننے کی اس کی بہت خواہش ہے؛ لیکن وہ اپنی غریبی کی وجہ سے مولویت یا مفتی کا کورس پورا نہیں کرسکتا، تو ایسی صورت میں وہ رمضان میں قرآن شریف سنا کر اس سے جو معاوضہ ملے اس سے وہ ہر سال اپنے پڑھنے اور دوسری ضروریات میں خرچ کرلے، کیا وہ ایسا کرسکتا ہے یا نہیں؟ کیا وہ معاوضہ اس پر کسی طرح حلال ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر نہیں ہوسکتا تو اسے اپنی پڑھائی چھوڑ دینی چاہئے؟

المستفتی: انیس الرحمٰن، مطیع الرحمٰن، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) ایسی صورت میں بھی قرآن سنا کر اجرت لینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ صحیح معنی میں جو محنت کر کے مولوی یا مفتی بننے والے ہیں، ان کے قیام وطعام، پیراہن وغیرہ کی ذمہ داری منجانب مدرسہ ہوا کرتی ہے، اس لئے اس کمزور علت کی وجہ سے حرام کو اختیار کرنے کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

ويمنع القارئ للدنيا والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ٩/ ٧٧، كراچى ٦/ ٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۴/۵/۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴۵۲/۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۵/۳ھ

نادار طالب علم کے لئے تراویح پر اجرت لینا

سوال [۳۲۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس طالب علم کے گھر سے تنگی کی بنا پر پیسے نہیں آتے، اس کو تراویح میں قرآن شریف سنا کر پیسے لینا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد اکرم بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں قرآن شریف سنا کر اس پر اجرت لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں اور قرآن کریم سننے اور سنانے کا ثواب کسی کو بھی نہ ملے گا۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/۲۶، احسن الفتاوی ۱/ ۵۱۵، فتاوی رشیدیہ، قدیم ۳۹۲، جدید زکریا ۳۷۰)

فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراء ة الأجزاء بالأجرة لا يجوز.

(شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، کراچی ۶/ ۵۶) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ شعبان ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۹۸۳)

حافظ طالب علم کو تراویح کی اجرت دینا

سوال [۳۲۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) رمضان المبارک میں جو حافظ صاحب تراویح سنائیں وہ طالب علم ہوں اور بغیر متعین کئے لوگ باخوشی نقد روپئے وغیرہ دیں تو اسے لے کر اپنی تعلیم میں خرچ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ باحوالہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد بشیر الدین متعلم مدرسہ شاہی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر طالب علم ہونے کی وجہ سے بخوشی نقد روپیہ دیتے ہیں، تو قرآن سنانے کے بعد کیوں دیتے ہیں؟ بغیر قرآن سنائے دیا کریں، معلوم ہوا کہ طالب علم ہونے کی وجہ سے نہیں دیتے ہیں؛ بلکہ قرآن کریم سنانے کی وجہ سے دیتے ہیں؛ اس لئے لینا اور دینا دونوں ناجائز اور قابل ترک ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ۲۸، امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۸۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/ ۱۲/ ۱۴۱۲ھ

تراویح میں قراءت قرآن اور سماعت قرآن پر اجرت لینا

سوال [۳۲۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) رمضان المبارک سے کچھ دن قبل ایک حافظ کی دیگر حافظ سے بات چیت ہوئی، آپ آج سے میرے سامع بن جائیں اور آپس میں کچھ رقم بھی متعین ہوئی؛ لہٰذا سامع صاحب حافظ صاحب کے گھر دن میں جا کر سیپارہ سنتے رہے اور رمضان المبارک آنے پر حافظ صاحب کے پیچھے سامع بنے رہے اور جب حافظ صاحب کی آخری تراویح ہوئی، تو حافظ صاحب سامع صاحب سے کہنے لگے کہ میرے اور آپ کے درمیان جو رقم طے ہوئی تھی وہ لایجوز، تو کیا ایسی صورت میں سامع طے شدہ رقم لے سکتا ہے یا نہیں؟ وضاحت کریں۔

(۲) قرآن وحدیث پڑھا کر اجرت لینے کا جو جواز ہے، اس کی کیا صورت ہے؟ مدلل بیان کریں۔

المستفتی: محمد واعظ الحق روزنامہ گرج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حافظ صاحب کا یہ کہنا کہ سماعت قرآن پر جو رقم طے

ہوئی ہے وہ ''لا یجوز'' اور ناجائز ہے، بالکل صحیح ودرست ہے۔اور سماعت پر جو اجارہ کیا گیا ہے وہ ناجائز اور باطل ہے، شرعاً طےشدہ رقم لازم نہ ہوگی۔ (مستفاد: احسن الفتاوی۳/۵۱۴، ۳/۵۱۶)

(۲) قرآن وحدیث پڑھانا اور تراویح میں قرآن کریم پڑھنا وسننا دونوں یکساں نہیں ہیں کیونکہ قرآن وحدیث کی تعلیم اگر جاری نہ رہے اور علماء اور حفاظ پیدا نہ ہوں، تو اسلام اور شعائر اسلام کی بقامشکل اور دشوار ہے؛ اس لئے متأخرین فقہاء نے دین اسلام اور شعائر اسلام کی حفاظت اور قرآن وحدیث کی تعلیم کو مسلمانوں کے درمیان بدستور باقی رکھنے کی ضرورت شدیدہ کی بناپر تعلیم قرآن اور تعلیم فقہ وحدیث پر اجرت کی اجازت دے دی ہے۔ اور تراویح میں اگر قرآن ختم نہ کیا جائے اور ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھی جائے تو اسلام اور شعائر اسلام میں کوئی نقص اور کمی نہیں آتی اور نہ ہی یہ خطرہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اغیار کا غلبہ مذہب اسلام پر ہوکر مذہب اسلام مسخ ہوکر رہ جائے گا؛ اس لئے اس پر اجرت لینا ودینا دونوں ناجائز اور حرام ہے۔اور تراویح پڑھنے والے قاری وسامع اور مقتدی کسی کو ختم قرآن اور تراویح کا ثواب نہیں ملے گا اور ساتھ ساتھ گنہگار بھی ہوں گے۔

ولا تصح الإجارة (إلی قوله) ويفتي اليوم بصحتها لتعليم القرآن، والفقه، والإمامة، والأذان. وتحته في الشامي: وبعض مشايخنا رحمهم الله تعالیٰ استحسنوا الاستئجار علی تعليم القرآن اليوم لظهور التوانی في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن، وعليه الفتوی.

(الدرالمختار، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ٩/ ٧٧، كراچی ٦/ ٥٥)

إن القراءة بالأجرة لا يستحق الثواب (إلی قوله) ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٧)

نیز تعلیم قرآن اور سماعت قرآن دونوں یکساں نہیں ہیں، تعلیم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان پڑھ جاہل کو سکھایا جائے اور سماعت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قاری جوان پڑھ جاہل نہیں ہے، اس کے پڑھنے کے درمیان اگر کوئی رکاوٹ ہوجائے تو سامع مقتدی اپنے امام کو لقمہ دیا کرے جو

تعلیم قرآن کے تحت ہرگز داخل نہیں ہے؛ بلکہ نماز میں اپنے امام کو یاددہانی کے طور پر لقمہ دینا ہوتا ہے جو مقتدی کا فریضہ ہے؛ اس لئے اس پر اجرت ہرگز جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۳۷۶)

حافظ وسامع کو روپیہ یا جوڑا دینے کے لئے چندہ کرنا

سوال [۳۲۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ حافظ صاحب جو کہ تراویح میں قرآن پاک پڑھ رہے ہیں اور جو حافظ صاحب قرآن پاک سن رہے ہیں، ان کو کچھ روپیہ پیسہ یا جوڑا وغیرہ دینے کے لئے چندہ کرنا کیسا ہے۔

المستفتی: اہل محلّہ بستی قاضی باغ، کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح سنا کر اجرت لینا اور دینا قطعاً ناجائز اور حرام ہے؛ لہٰذا حافظ صاحب اور سامع کو روپیہ یا جوڑا وغیرہ دینے کے لئے چندہ کرنا بھی جائز نہیں، اس طرح لینے اور دینے والے دونوں گنہگار رہوں گے اور قرآن سنانے کا ثواب بھی کسی کو نہیں ملے گا؛ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھی جائے جو بغیر کسی لالچ کے محض رضاء الٰہی کے خاطر قرآن سنائے، اگر ایسا حافظ نہ ملے تو ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھی جائے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۳۲، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۶۴، فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۶۳، امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۸۴، کفایت المفتی ۳/ ۶۳ ۳، جدید زکریا ۳/ ۴۰۹، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۵۳۶، ایضاح المسائل/ ۲۶-۲۵)

وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا. [سورة البقرة: ٤١]

إن القراءة لشيء من الدنيا لا تجوز، وأن الآخذ والمعطي آثمان. اقرؤا القرآن ولا تأكلوا به. (شامي، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل، زكريا ٢/ ٥٣٤، كراچی ٢/ ٧٣، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٥-٥٦، شامي زكريا ٩/ ٧٧-٧٦، رساله ابن عابدين، شفاء العليل وبل الغليل في حكم الوصية بالختمات والتهاليل، ثاقب بك ڈپو ١/ ١٥٧، ١/ ١٥٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٤٢٢/١١/٧ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٦/ ٧٣٨٨)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٢/١١/٧ھ

ناجائز کمائی کی رقم ہدیہ کے نام سے تراویح سنانے والے کو دینا

سوال [٣٢٦٤]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حافظ قرآن نے قرآن پاک سنایا، وہاں کے لوگوں نے ہدیہ کے طور پر کچھ امداد کی؛ لیکن ان لوگوں کا کاروبار نمبر دو کا ہے، تو کیا وہ پیسہ حافظ صاحب کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مزاز بڑی مسجد مامن کلاں ہمراوی، بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قرآن سنانے کے بعد کسی بھی طرح کا پیسہ لینا دینا قطعاً جائز نہیں؛ اس لئے حافظ قرآن کو اس پیسہ کا استعمال درست نہیں ہے۔

إنما أفتى المتأخرون بجواز الاستئجار على تعليم القرآن، لا على التلاوة. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٥، زكريا ٩/ ٧٦)

الآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالتهاليل، كراچی ۲/ ۷۳، زكريا ۲/ ۵۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۵۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۱۱/۱۴۲۱ھ

تراویح کے نذرانہ کا شرعی حکم

سوال [۳۲۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان شریف سے بیشتر ہی حفاظ ممبئی، بنگلور، کرناٹک وغیرہ قرآن سنانے جاتے ہیں، باقاعدہ لوگ اجرت پر حفاظ سے تراویح میں قرآن سنتے ہیں، دس پندرہ ہزار روپئے تک مل جاتے ہیں، مفصل حکم قرآن وحدیث کی روشنی میں تحریر فرمادیں، تاکہ اس کی فوٹو کاپی ہر جگہ تقسیم کردی جائے، شاید کسی کی اصلاح ہوجائے۔

المستفتی: (مولانا) محمد شفیع غفرلہ، جامعۃ الصالحات رامپور، یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: تراویح میں قرآن کریم سنانے والے حافظ کو اجرت دینا اور حافظ صاحب کا اجرت لینا دونوں ناجائز اور حرام ہے۔ اور قرآن کریم سننے اور سنانے کا ثواب کسی کو بھی نہ ملے گا؛ بلکہ سب گنہگار رہوں گے۔

وإن القراءة لشيء من الدنيا لا تجوز، وأن الآخذ والمعطي آثمان؛ لأن ذلك يشبه الاستئجار على القراءة ونفس الاستئجار عليها لايجوز.

(شامي، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل، كراچی ۲/ ۷۳، زكريا ۲/ ۵۳۴)

اور حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کو حصول رضا خداوندی کا ذریعہ بناؤ، کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔

اقرؤا القرآن وابتغوا به فضل الله. الحديث (رواه أحمد ۳/ ۳۵۷، رقم: ۱٤۹۱٦)

تعلموا القرآن، فإذا علمتموه فلا تغلوا فيه، ولا تجفوا عنه، ولا تأكلوا به، ولا تستكثروا به. (رواه أحمد ۳/ ٤٤٤، رقم: ۱۵۷۵۱)

اوراگر اجرت طے نہ کرے؛ بلکہ بطور تحفہ ونذرانہ حافظ کو دیا جائے اور حافظ صاحب بطور نذرانہ اس کو قبول کرلیں تو یہ بھی جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ تو شرعی طور پر **"المعروف كالمشروط"** (كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٦) کے تحت داخل ہوکر نام کا نذرانہ ہے؛ لیکن درحقیقت اجرت ہے؛ اس لئے کہ حافظ صاحب کو معلوم ہے کہ لوگ مجھے قرآن سنانے کی بنا پر کچھ دیں گے اور لوگوں کے دل میں بھی یہی ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کو جاتے وقت کچھ دینا ہے اور اس طرح لینا دینا عادت اور معروف بھی ہے؛ لہٰذا یہ بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۶۳، ۲۹۴)

اس لئے جہاں بلا اجرت حافظ قرآن نہ ملیں تو ایسی جگہوں میں ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھنی چاہئے، تاکہ کم از کم ایک سنت تراویح ادا ہوتی رہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/ ۳٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦/ رجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ٦۲۴۴)

ختم قرآن کے موقع پر حافظ یا امام کو ہدیہ دینا

سوال [۳۲٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرض یہ ہے کہ رمضان المبارک کے موقع پر تراویح کے متعلق ہمارے یہاں چار عمل ہوتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تراویح میں قرآن مجید سننے کے لئے حافظ کو دوسرے گاؤں یا شہر سے بلایا جاتا ہے، جس کے قیام وطعام کا نظم بھی داعیان کی جانب سے کیا جاتا ہے۔

(۲) حافظ مقامی ہوتا ہے، لوگوں کی خواہش پر وہ تراویح میں قرآن مجید سناتا ہے، گویا کہ اس سے ایک ماہ کا وقت لیا گیا ہے۔

(۳) امام حافظ ہوتا ہے اور وہی قرآن سناتا ہے۔

(۴) ایک شخص حافظ نہیں ہوتا ہے؛ لیکن قرآن اچھا پڑھتا ہے، لوگوں کی خواہش پر وہ تراویح پڑھاتا ہے، گویا کہ اس سے بھی ایک ماہ کا وقت لیا گیا ہے، ان چاروں صورتوں میں عشرۂ اخیرہ کی کسی طاق رات میں حافظ امام اور مؤذن کے لئے کپڑے سلائے جاتے ہیں، پھر حافظ اور غیر حافظ کو اجتماعی وانفرادی طور پر رقم یا اشیاء کی شکل میں ہدیہ پیش کیا جاتا ہے، یہ محض اس بنا پر ہوتا ہے کہ حافظ نے ہماری چاہت پر اپنے مصروف وقت کو فارغ کیا، ہمارا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس کی ضروریات زندگی کا لحاظ رکھیں اور اس نے ہماری خواہش پر قرآن سنایا اور ہماری تشنگی بجھائی، اس حسن عمل پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، نہ حافظ کی طرف سے کچھ مطالبہ ہوتا ہے نہ مصلیوں کی طرف سے کچھ متعین اور اس دینے لینے کو عرف میں نہ اجرت سے تعبیر کیا جاتا ہے، نہ اس کا کوئی تصور ہے، تو کیا مذکورہ چار طریقہ اور ہدیہ دینا اور لینا شریعت کے مطابق ہے؟

المستفتی: محمد شمس الحق قاسمی، مدرسہ قاسم العلوم، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ ہدیہ ہے یا اجرت اس کا تجربہ کرنے کے لئے آپ دو سال تک ان مذکورہ حضرات کو نہ کپڑا دیں اور نہ رقم، اگر اس کے باوجود بھی تیسرے سال بخوشی آ کر قرآن کریم سنائیں گے، تو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ اجرت نہیں ہے اور حفاظ کو اس کا خیال نہیں ہے، ورنہ یہ بھی اجرت ہی ہے کہ نہ دینے پر آئندہ سال بخوشی آ کر سنانے پر آمادہ نہیں ہیں، ہاں البتہ جو غیر حافظ محض چند سورتوں سے تراویح پڑھاتا ہے، اس کو دینا جائز ہے؛ کیوں کہ اس کے لئے اجرت لینا بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ قرآن کی اجرت نہیں

ہے؛ بلکہ نماز پڑھانے کی اجرت ہے، جو کہ جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ۲۷) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رمحرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۱۵۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱/۱۴۱۸ھ

قرآن کریم کے سننے سنانے پر اجرت لینا

سوال [۳۲۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) آج کل رمضان المبارک میں حفاظ کرام قرآن پاک سناتے ہیں، ان کو ہدیہ کے نام پر رقم ملتی ہے، نیز جوڑا بھی دیا جاتا ہے، بعض حفاظ تو سنانے کی اجرت طے کر لیتے ہیں، بعض طے تو نہیں کرتے؛ لیکن کمیٹی والے فی نفر چندہ رکھ دیتے ہیں، بعض کمیٹی والے اعلان کرتے ہیں کہ اپنی خوشی سے جتنا دینا چاہو جمع کر دو، پھر وہ رقم اکٹھی کر کے قرآن پورا ہونے پر حافظ صاحب کو ہدیہ دیا جاتا ہے، بعض جگہ ختم قرآن کے دن مصلیان اپنی خوشی سے حافظ صاحب کی جیب میں ڈال دیتے ہیں، کیا یہ تمام صورتیں ناجائز ہیں، یا جائز یا بعض جائز، بعض ناجائز، اگر جواب نفی میں ہے، تو اس رسم کو ختم کرنے کی کیا صورت ہے؟ نیز سامع کی اجرت کا بھی حکم تحریر کیجئے۔

(۲) بعض جگہ جو رقم حافظ صاحب کے نام پر جمع ہوتی ہے، اس میں سے مسجد کے امام ومدرس کو ہدیہ کے نام پر رقم دینا اور جوڑے بنوانا کیسا ہے؟ کیا لینے اور دینے والے کا حکم ایک ہی ہے، یا الگ؟

المستفتی: مولانا منیر احمد، امام بڑھیوں والا تھانہ جسپور، اودھم سنگھ نگر، اترانچل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: رمضان المبارک میں حفاظ کرام کو قرآن سنانے پر ہدیہ اور تحفہ کے نام سے جو رقم دی جاتی ہے وہ ”**المعروف کالمشروط**“ (شامی کراچی ۶/ ۵۵)

کے اصول کے تحت داخل ہوکر ایسے ہی ناجائز اور حرام ہے، جیسا کہ اجرت طے کرنے کی صورت میں ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح جو رقم انفرادی طور پر حافظ صاحب کوملتی ہے یا اجتماعی چندہ کے بعد دی جاتی ہے، وہ سب حافظ صاحب کے لئے ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح سامع کی اجرت بھی ناجائز ہے، دینے والے بھی گنہگار ہوں گے اور لینے والے بھی۔

(مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۵۱۴، فتاوی محمودیہ، قدیم ۷/ ۱۷۱، جدید ڈابھیل ۱۷/ ٦٦، رشیدیہ، قدیم ۳۹۲، جدید زکریا ۴۷۰، جواہر الفقہ، قدیم ۱/۳۸۲، جدید زکریا ۲/۵۲۲، فتاوی دارالعلوم جدید ۴/ ۲۹۵)

فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز؛ لأن فيه الأمر بالقراءة وإعطاء الثواب للآمر والقراءة لأجل المال، فإذا لم يكن للقارئ ثواب لعدم النية الصحيحة، فأين يصل الثواب إلى المستأجر ولو لا الأجرة ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان بل جعلوا القرآن العظيم مكسبا، ووسيلة إلى جمع الدنيا. الآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ٦/ ٥٦)

(۲) جن جگہوں پر قرآن سنانے والے حافظ صاحب کے نام پر رقم جمع ہوتی ہے، پھر وہ رقم مسجد کے امام اور مدرس اور خود حافظ صاحب کو بطور ہدیہ تقسیم کردی جاتی ہے اور اس میں سے جوڑا بھی دیا جاتا ہے، تو قرآن سنانے والے حافظ صاحب کے لئے ان میں سے کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے۔ اور اگر دینے والوں کو پہلے سے معلوم ہے کہ جو چندہ حافظ صاحب کے نام پر جمع ہورہا ہے اس میں سے امام ومدرس کو بھی دیا جائے گا، تو امام ومدرس کے لئے لینا جائز ہے اور دینے والوں کے لئے دینا بھی جائز ہے۔ اور اگر صرف دینے والے حافظ صاحب ہی کے لئے دیتے ہیں، پھر وصول کرنے والے امام اور مدرس کو دیتے ہیں، تو امام ومدرس کے لئے نہ لینا جائز ہے، اور نہ دینے والوں کے لئے دینا جائز ہے؛ اس لئے کہ یہاں دھوکہ اور خیانت ہوتی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٦٦/ ۷٦۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۱٦ھ

تراویح پڑھانے والے کو نذرانہ دینا

سوال [۳۲۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: الحمدللہ ہمارے گاؤں میں پانچ مسجدیں ہیں، اور پانچوں مسجدوں میں بڑی تراویح ہوتی ہے اور کسی بھی مسجد میں کسی بھی حافظ کے لئے اجرت یا نذرانہ کے متعلق کوئی بات پہلے سے طے نہیں ہوتی ہے؛ لیکن صورت حال کافی زمانہ سے یوں چلی آرہی ہے کہ رمضان میں تراویح کے نام پر گاؤں میں وصولی ہوتی ہے اور جو چندہ ہوتا ہے، اس کو اکٹھا کرکے حافظ صاحب کو شب قدر کے بعد دے دیا جاتا ہے، کسی سال ۱۷۰۰ر کسی سال ۲۰۰۰ر، کسی سال ۲۵۰۰ر لیکن اب تک کسی بھی حافظ نے نذرانہ سے متعلق یہ نہیں کہا کہ کم ہے یا زیادہ؛ بلکہ جو کچھ ہوتا ہے اسے بخوشی قبول فرمالیتے ہیں، تو کیا اس طرح چندہ کرکے اور رقم کو اکٹھا کرکے حافظ کو دینا اور حافظ کا اس رقم کو لینا درست ہے یا نہیں؟ جب کہ حافظ بغیر لالچ کے بڑی تراویح پڑھاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ”**المعروف کالمشروط**“ یا ”**الأمور بمقاصدها**“ کے تحت داخل ہوکر ناجائز ہوجائے، مستفتی نے مسائل تراویح، ایضاح المسائل، کفایت المفتی، فتاوی دارالعلوم کا مطالعہ کرلیا ہے؛ لیکن یہاں کی صورت حال میں کون سا حکم لگے گا یہ فیصلہ نہیں کر پارہا ہے، اور اس مسئلہ کو لے کر کافی انتشار واختلاف ہے اور یہ مسئلہ ہمارے یہاں کے لحاظ سے مختلف فیہ بن گیا ہے؛ اس لئے اس مسئلہ کی ایسی وضاحت فرمائیں کہ خواص کی سمجھ میں بات آجائے اور یہ مسئلہ مختلف فیہ سے نکل کر متفق علیہ بن جائے۔

المستفتی: عبدالرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رمضان المبارک میں ختم قرآن کے موقع پر لوگوں سے تراویح کے نام پر روپیہ اکٹھا کرکے حافظ قرآن کو دینا جائز نہیں ہے اور نذرانہ کے کم وبیش

ہونے پر حافظ قرآن کا بخوشی قبول کرنا اور کسی قسم کی ناراضگی نہ جتلانا اس کے جواز کی دلیل نہیں؛ کیوں کہ اس کو یہ معلوم ہے کہ بستی کے لوگ حسب معمول نذرانہ ضرور دیں گے؛ اس لئے یہ ”**المعروف کالمشروط**“ (شامي، کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زکریا ۹/ ۷۷) کے تحت داخل ہوکر ناجائز اور حرام ہے، لینے والے اور دینے والے دونوں گنہگار رہوں گے اور ”امداد الفتاوی“ اور ”ایضاح المسائل“ کا مسئلہ جس کا آپ مطالعہ کر چکے ہیں وہ صحیح اور درست ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۴، فتاوی رشیدیہ، قدیم ۳۹۲، جدید زکریا /۳۷۰، ایضاح المسائل/ ۲۶)

فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراء ة الأجزاء بالأجرة لایجوز؛ لأن فیه الأمر بالقراء ة، وإعطاء الثواب للآمر والقراء ة لأجل المال، فإذا لم یکن للقارئ ثواب لعدم النیة الصحیحة، فأین یصل الثواب إلی المستأجر ولو لا الأجرة ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان، بل جعلوا القرآن العظیم مکسبا، ووسیلة إلی جمع الدنیا إنا للّٰه وإنا إلیه راجعون. (شامي، زکریا ۹/ ۷۷، کراچی ۶/ ۵۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ صفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۱۷ھ

تراویح کے نذرانہ کی شرعی حیثیت

سوال [۳۲۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے امام صاحب مستقل امام ہیں اور حافظ بھی ہیں، دوسری مسجد کے امام صاحب عالم تو ہیں مگر حافظ نہیں ہیں، تیسری مسجد کے امام صاحب میاں صاحب ہیں جو ”الم ترکیف“ سے تراویح ادا کرتے ہیں، دوسری مسجد کے امام صاحب باہر سے رمضانی حافظ بلاتے ہیں، اب ان تینوں اماموں کے لئے چندہ ہوتا ہے۔ اور ۲۷/ رمضان کو نذرانہ پیش کیا جاتا ہے، مستقل حافظ

امام کے لئے مفتی دارالعلوم دیوبند نے رمضان کی تنخواہ کہہ کر دینے کو جائز قرار دیا ہے اور دوسرے رمضانی حافظ کے لئے مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نائب امام بنا کر جائز قرار دیا ہے، عام طور سے اماموں کی تنخواہیں پندرہ سو دو ہزار تک ہیں، رمضان کی تنخواہ چالیس تیس ہزار۔ اور نائب امام کی پانچ ہزار یہ کہاں کا اصول ہے؟ جب کہ اشتہار دارالعلوم و یوکرن کی روداد میں ناجائز وحرام لکھا ہے، نیز سامع کے لئے بھی نذرانہ لینا دینا کیسا ہے؟ مکمل مع دلائل کے واضح فرمائیں اور فی الحال جو تنخواہ اماموں کو مل رہی ہے وہ گذر بسر کے لئے ناکافی ہے، سارے پہلو پر غور وفکر کر کے ہی جواب دیں اور جدید فقہی مسائل/۱۹۴ بھی پڑھ لیں۔

المستفتی: عظیم اللہ بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر امام یا سامع کو جو نذرانہ دینا معروف ومشہور ہے وہ اجرت کے درجہ میں آتا ہے؛ اس لئے ناجائز وحرام ہے اور جدید فقہی مسائل ص: ۱۹۴ / پر مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا بیان کردہ جو حیلہ ذکر کیا گیا ہے وہ ناکافی ہے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ ومفتی عزیز الرحمٰنؒ کی رائے ناجائز ہونے ہی کی ہے؛ البتہ مستقل امام کو دینے کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ مستقل امام کو جو دیا جاتا ہے وہ سال بھر کی تنخواہ کے اندر سالانہ آمدنی شمار ہوتی ہے، قرآن سننے یا سنانے کے متعلق نہیں ہوتی۔ اور بہتر یہ ہے کہ تیس چالیس ہزار کی جو بات کہی جارہی ہے یہ پیسہ جمع کر کے امام صاحب کی پورے سال کی تنخواہ میں ضم کر دیا جائے، تاکہ ختم قرآن کی اجرت کا شبہ باقی نہ رہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۸۵، دارالعلوم ۴/ ۳۷۳)

ویمنع القارئ للدنیا، والآخذ والمعطي آثمان، فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا یجوز. (شامي، کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، کراچی ٦/ ٥٦، زکریا ٩/ ٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۲/۱۱/۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/ ۷۳۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/٦ھ

اجرت تراویح کے لئے چندہ کرنا

سوال [۳۲۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں رمضان شریف میں نماز تراویح میں قرآن پاک مکمل سنانے کے بعد حافظ صاحب کے لئے نذرانہ کے نام سے چندہ ہوتا ہے، جب کہ حافظ صاحب کی طرف سے نذرانہ کی رقم متعین نہیں ہوتی ہے؛ لیکن حافظ صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ موٹی رقم ملے گی، یہی وجہ ہے کہ اکثر حفاظ کو اچھی جگہ کی تلاش ہوتی ہے۔(۱) تراویح کے نام پر چندہ مانگنا اور دینا درست ہے یا نہیں؟

(۲) تراویح کے نذرانہ کے جائز ہونے کی صورت ہے یا نہیں؟

(۳) کسی مقام پر بغیر نذرانہ کے قرآن سنانے والے نہ ملیں تو کیا کریں؟

(۴) اس بیماری میں اکثر دین سے واقف طبقہ (علماء وحفاظ) ملوث ہیں۔

امید ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں تشفی بخش جواب دے کر مطمئن فرمائیں گے۔

المستفتی: حافظ عطاء خطیب دسٹرک جبل دھنباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حافظ صاحب کو تراویح میں قرآن کریم سنانے کے عوض میں نذرانہ کے نام سے کچھ رقم دینا اور لینا دونوں ناجائز ہیں؛ کیوں کہ درحقیقت یہ نذرانہ نہیں؛ بلکہ دستور اور عرف کے لحاظ سے اجرت ہے؛ لہٰذا ''**المعروف کالمشروط**'' کے تحت دونوں ناجائز اور حرام ہیں۔ اور اس کے لئے چندہ وصول کرنا اور چندہ دینا ناجائز اور گناہ ہے، جہاں بلا اجرت حافظ نہ مل سکے وہاں ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھنا زیادہ بہتر ہے؛ کیوں کہ اجرت دے کر قرآن کریم سننے سے ثواب نہیں ملتا ہے۔ اور جہاں تک فتنہ کے اندیشہ کا سوال ہے، تو اس سلسلے میں لوگوں کو نرمی اور حکمت کے ساتھ مسئلہ بتایا جائے، ان شاء اللہ سارے لوگ شرعی فیصلہ کے سامنے سر جھکائیں گے، کوئی فتنہ نہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۷۹، امداد المفتیین / ۳۶۵، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۴)

وقال العيني في شرح الهداية: ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٧، بناية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفيه ديوبند ١٢/ ٢٣٧، الدرر الأحكام ٢/ ٢٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍رجب ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹؍۷؍۱۴۱۹ھ

چندہ کر کے قاری وسامع کی خدمت کرنا اور ختم پر شیرینی تقسیم کرنا

سوال [۳۲۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) رمضان شریف میں ختم شریف کے موقع پر محلوں سے جو مسجد سے متعلق ہیں بخوشی چندہ کر کے قاری اور سامع کی خدمت کی جاتی ہے، سامع مسجد میں مستقل امام ہے، مگر قاری امام نہیں ہے، امام صاحب کی جو رمضان میں خدمت کی جاتی ہے وہ طے شدہ تنخواہ کے علاوہ ہوتی ہے، کیا یہ درست ہے؟ اسی چندہ میں سے ان حضرات کے دودھ لینے کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟

(۲) رمضان شریف میں ختم شریف کے موقع پر اجتماعی چندہ کر کے یا انفرادی طور پر شیرینی تقسیم کرنا درست ہے کہ نہیں؟

المستفتی: عبدالحمید راعینی سانپور، ضلع بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) رمضان شریف میں ختم شریف کے موقع پر محلوں سے چندہ کر کے قاری اور سامع کو اجرت لینا ناجائز ہے۔ اور اگر اجرت طے نہ کرے؛ بلکہ بطور تنخواہ اور نذرانہ حافظ اور سامع کو دیا جائے تو یہ شرعی طور پر ’’**المعروف کالمشروط**‘‘

کے تحت داخل ہوکر نام کا نذرانہ ہے، ورنہ درحقیقت یہ اجرت ہے؛ لہٰذا یہ بھی جائز نہیں۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/۲۶۳)

كذا في الشامية: وأن القراءة لشيء من الدنيا لا تجوز، وأن الآخذ والمعطي آثمان؛ لأن ذلك يشبه الاستئجار على القراءة، ونفس الاستئجار عليها لا يجوز. (شامي، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل، زكريا ٢/ ٥٣٤، كراچی ٢/ ٧٣)

وأيضا اقرؤا القرآن ولا تأكلوا به. الحديث (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٥، زكريا ٩/ ٧٦)

لیکن اسی چندہ سے حافظ صاحب اور سامع کے لئے دودھ وغیرہ کا بندوبست کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ شرعی طور پر اجرت میں داخل نہیں؛ بلکہ یہ مہمان نوازی ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/۲۹۴)

(۲) رمضان شریف میں چندہ کرکے مٹھائی یا شیرینی تقسیم کرنا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ چندہ دینے والے کی طرف سے طیب خاطر کا یقین نہیں؛ بلکہ وہ چندہ دینے پر مجبور ہوتے ہیں؛ اس لئے ان سے کچھ لینا ہرگز جائز نہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۵)

ہاں البتہ کوئی شخص اپنے طور پر بطیب خاطر اپنی جیب خاص سے مٹھائی تقسیم کرتا ہے، تو اس شرط کے ساتھ گنجائش ہے کہ حرمت مسجد کا لحاظ رکھا جائے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۴/ ۳۸۹، جدید زکریا ۶/ ۲۴۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ صفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۱۲ھ

تراویح میں حافظ وسامع کو اجرت دینا

سوال [۳۲۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: (۱) اجرت لے کر یا دے کر تراویح پڑھنا یا پڑھوانا کیسا ہے؟ جب کہ یہ سلسلہ ہر مسجد میں ہر سال تراویح میں ہوتا ہے، کوئی سننے یا سنانے کی اجرت کا نام لے کر نہیں لیتا؛ بلکہ کوئی ہدیہ کہہ کر لیتا ہے، تو کوئی امداد کہہ کر لیتا ہے، جب کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا کہنا ہے کہ ہدیہ ہو یا امداد نیت لینے اور دینے والے کی ایک ہی ہوتی ہے؛ لہٰذا ایسا کرنا ہر حال میں حرام ہے، کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں سامع حضرات پیسے نہ لیتے ہوں، کئی جگہ تو امام صاحب جو تراویح سناتے ہیں، وہ بھی پیسے لیتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟

(۲) جہاں امام صاحب یا سامع حضرات کی نیت پیسے لینے کی ہو اور منتظمہ کمیٹی کی نیت دینے کی ہو تو ایسی جگہ تراویح پڑھنا کیسا ہے؟ اگر کسی جگہ مسجد میں پیسے لینے دینے کا ماحول ہو اور اسی مسجد میں کوئی باشرع شخص جو کہ حافظ نہ ہو؛ بلکہ ناظرہ خواں ہو اور تجوید وقواعد اچھی طرح جانتا ہو، تو کیا وہ شخص مصلی سے علیحدہ مسجد کے کسی دوسرے حصہ میں بغیر کسی اجرت کے الم ترکیف سے تراویح پڑھا سکتا ہے اور تراویح پڑھنے و پڑھانے والوں کو تراویح کا ثواب حاصل ہوسکتا ہے؟

المستفتی: احقر محمد شاہد الراعی، باڑہ ہندوراؤ، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوال نامہ میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے جو مسئلہ لکھا گیا ہے وہی صحیح اور درست ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۴۸۱)

(۲) کسی کی نیت کی بات اللہ کو معلوم ہوتی ہے اور انسان کو اسی وقت معلوم ہوتی ہے کہ جب اس نیت کے مطابق عمل ظاہر ہو جائے، دینے لینے کا معمول پہلے سے جاری ہو تو حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ''امداد المفتیین'' میں تراویح میں اجرت دے کر قرآن سننے اور اجرت لے کر قرآن پڑھنے کو گناہ کا کام لکھا ہے۔ اور لکھا ہے کہ نماز مکروہ ہوجاتی ہے اور یہی بات حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے ''احسن الفتاوی'' میں لکھی ہے، ملاحظہ فرمائیے: (امداد المفتیین، ص: ۳۶۵، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۵)

(۳) اگراجرت دیئے لئے بغیر تراویح میں قرآن پڑھنے والے نہ مل سکیں تو ”الم ترکیف“ جیسی مختصر سورتوں کے ساتھ تراویح کی نماز پڑھ لینا زیادہ بہتر ہے؛ لیکن اس کے لئے مسجد والوں کے ساتھ اس طرح معارضہ کرنا کہ مسجد میں باجماعت قرآن ہورہا ہو اور ”الم ترکیف“ کے ساتھ اسی مسجد کے دوسرے کنارہ پر دوسری جماعت شروع کردی جائے یہ ایک معارضہ اور جھگڑے کی بات ہے۔ اور معارضہ اور جھگڑے سے بچنا بھی ہر مسلمان پر لازم ہے؛ اس لئے مسجد میں فرض پڑھنے کے بعد الگ سے کسی دوسری جگہ جاکر کے پڑھنا مناسب ہے۔

ولو صلى التراويح في مسجد واحد مرتين في ليلة واحدة يكره.

(فتاوى النوازل، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، دار الايمان، ص: ۹۵)

ولو صلى التراويح مرتين في مسجد واحد يكره. (خانيه على الهندية، كتاب الصلاة، باب التراويح زكريا ۱/ ۲۳٤، زكريا جديد ۱/ ۱٤٥، هنديه، البـاب التاسع فى النوافل، فصل في التراويح، زكريا قديم ۱/ ۱۱٦، جديد ۱/ ۱۷٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۷/ربیع الاول ۱۴۳۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۳۶)	۱۴۳۳/۳/۷ھ

قاری اورسامع کواجرت دینا

سوال [۳۲۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں قرآن پاک کے قاری اور سامع کو مسجد کی آمدنی سے کچھ نذرانہ پیش کیا جاتا ہے، نیز ختم والے دن شیرینی بھی مسجد ہی کی آمدنی سے تقسیم کی جاتی ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ والسلام

المستفتی: وقار احمد نواب رامپور، کوچہ لالہ میاں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قاری اور سامع کو مسجد کی آمدنی سے اجرت دینا ہرگز جائز نہیں، اسی طرح ختم قرآن کے موقع پر مسجد کی آمدنی سے شیرینی تقسیم کرنا جائز نہیں ہے، متولی اور ذمہ داران مسجد اگر ایسا کریں، تو ان پر لازم ہے کہ اتنا پیسہ اپنی جیب سے مسجد کو ادا کردیں۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ، قدیم/ ۵۱۹، جدید زکریا/ ۴۹۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۷۵)

تراویح میں قرآن سننے والے کا اجرت لینا

سوال [۳۲۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں قرآن سننے والا حافظ اجرت یا انعام لے سکتا ہے؟ اور کیا طے بھی کرسکتا ہے؟ جواب باصواب سے نوازیں۔ والسلام

المستفتی: حافظ زاہد حسین، مدرس مدرسہ چچیلا کلاں ناصر العلوم تحصیل دھنورہ منڈی، ضلع مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں جس طرح قرآن سنانے والے کے لئے اجرت یا بنام انعام رقم لینا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح سامع کے لئے بھی ناجائز ہے۔ اور کسی زمانہ میں حضرت تھانویؒ نے سامع کی اجرت کو جائز لکھا تھا، پھر بعد میں اس سے رجوع کرکے ناجائز لکھا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ۲۷، فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۹۹، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/۹/ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۸۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۹/ ۱۴۱۹ھ

تراویح کی اجرت

سوال [٣٢٧٥]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان المبارک میں تراویح پڑھا کر اس پر اجرت لینا کیسا ہے؟ جیسے بعض حضرات رمضان میں مدرسہ کا سفر کرتے ہیں اور قرآن تراویح میں پڑھ کر اجرت لیتے ہیں، کیا اس طرح لینا درست ہے؟ اگر ایسے آدمی کو امام بنایا جائے تو اس کے پیچھے نماز ادا کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: مسعود الحسن رشیدی سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: رمضان المبارک میں تراویح پڑھا کر اجرت لینا دینا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ قرآن کے عوض میں کوئی چیز وصول کرنا ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ١/٢٥٥، جدید ڈابھیل ٧/١٧٤، فتاویٰ رحیمیہ قدیم ٤/٤٢٧، جدید زکریا ٦/٢٤٣)

ولا تصح الإجارة لأجل الطاعات. (الدرالمختار، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٥، زكريا ديوبند ٩/ ٧٢)

اور جب تک وہ توبہ نہ کرلے اس کی امامت مکروہ ہے۔

كون الكراهة في الفاسق تحريمية. (طحطاوي، كتاب الصلاة، فصل في بيان الأحق بالإمامة، قديم ١٦٥، دارالكتاب ديوبند: ٣٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الثانیہ ١٤١٨ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٥٣١٥/٣٣)

اجرت لے کر قرآن سنانے والے کے پیچھے تراویح پڑھنا

سوال [٣٢٧٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

رمضان المبارک میں تراویح سنانے والے حافظ کو برا بھلا کہنا اور طعنہ دینا کیسا ہے؟ اور ایسا حافظ جو روپیہ کے لالچ میں تراویح سناتا ہے، تو ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد اشتیاق پلاموی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں قرآن کریم سنانے کی اجرت چاہے، چندہ کرکے دیں یا کوئی شخص اپنی جیب سے دیدے، دونوں صورتوں میں اجرت دینا اور لینا ناجائز اور حرام ہے۔ اور اس میں قرآن کریم سننے اور سنانے کا ثواب بھی نہیں ملے گا، بغیر اجرت کا حافظ نہ ملے تو ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھنی چاہئے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ، قدیم/ ۳۹۲، جدید زکریا ۳۷۷، ایضاح المسائل/ ۲۶، شامی، کتاب الإجارۃ، باب الإجارۃ الفاسدۃ، زکریا ۹/ ۷۷، کراچی ۶/ ۵۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۲۸)

اجرت علی التراویح کی شرعی حیثیت

سوال [۳۲۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک گاؤں چھ سات سو مکان کا ہے اور ایک جامع مسجد ہے، ماہ رمضان میں نماز تراویح میں چالیس پچاس آدمی شامل ہوتے ہیں، پندرھویں رمضان سے لے کر بعد نماز عید تک تاکیداً ہر ایک مکان سے مسجد کمیٹی لسٹ لے کر کے روپیہ وصول کرتے ہیں اور حافظ جی کو دیتے ہیں، ایسے حافظ کے پیچھے نماز تراویح کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ اور ایسی حالت میں کس طرح سے نماز پڑھیں؟ اور ''فتاوی دار العلوم'' اور اس کے مسئلے صحیح ہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبد الغفار قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں قرآن کریم سنانے والے حافظ کو اجرت دینا اور حافظ صاحب کا اجرت لینا دونوں ناجائز اور حرام ہے۔ اور قرآن کریم سننے سنانے کا ثواب کسی کو بھی نہ ملے گا؛ بلکہ سب گنہگار رہوں گے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۱/۳۹۲، جدید زکریا ۳۷۰، احسن الفتاوی ۱/۵۱۵، فتاوی محمودیہ قدیم ۷/۱۷۱، جدید ڈابھیل ۷/۲۶۱، ایضاح المسائل ۲۸)

قال تاج الشریعة في شرح الهداية: إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب...... ويمنع القارئ للدنيا والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ۶/ ۵۶)

اجرت لینے والے حافظ کے پیچھے تراویح کی نماز پڑھنے کے بجائے ’’الم ترکیف‘‘ سے تراویح پڑھنا بہتر ہے۔ فتاوی دار العلوم کے مسائل صحیح ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۷۸)

تراویح پڑھانے والے حافظ صاحب کو نذرانہ دینا

سوال [۳۲۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ماہ رمضان میں قیام لیل میں ہدیہ یا نذرانہ لینا دینا کیسا ہے؟ جب کہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری کا فتوی جواز کا ہے، موصوف نے علی الاطلاق جامع مسجد نجیب آباد میں دوران تقریر تین مرتبہ یہ الفاظ کہے تھے کہ: ’’میں کہتا ہوں جائز ہے، جس کو اعتراض ہو وہ مجھ سے بات کرے‘‘۔ نیز صوبہ کرناٹک میں مطلقاً جواز کا فتوی ہے۔ اور ’’فتاوی دار العلوم‘‘ میں جائز لکھا ہے، ص: ۲۹۸-۲۹۹۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ حفاظ کرام کا نذرانہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے تو مفتی

صاحب کی تقریر کا کیا حاصل؟ اور کرناٹک میں جو جائز ہے اس کا کیا جواب؟ فتاوی دار العلوم میں جو لکھا، اس کا کیا مطلب؟ شریعت کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں جائز ہے یا ناجائز؟ اگر نہیں تو ان سب کا مدلل جواب تحریر کریں۔

اخبار کی فوٹو کاپی روانہ کررہا ہوں، بغور اس کا مطالع کرنے کے بعد اس کا بھی جواب لکھیں، جس میں امامت، اذان، تعلیم القرآن فقہ کی طرح اس کو جائز لکھا گیا ہے، جواب صاف صاف مفصل مدلل پشت پر تحریر فرمادیں، تاکہ فوٹو اسٹیٹ کرالی جاسکے۔

المستفتی: سلیم احمد خطیب جامع مسجد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رمضان المبارک میں قرآن کریم تراویح میں سنانے والے حافظ اور سامع دونوں کو اجرت دینا اور ان کا لینا جائز نہیں ہے، نیز اس زمانہ میں نذرانہ کے نام سے جو دیا جاتا ہے وہ بھی رواج پا گیا ہے؛ اس لئے وہ بھی ناجائز ہے۔ فتاوی دار العلوم ص: ۲۹۹ رمیں اسی طرح لکھا گیا ہے اور اس میں جو اخیر میں لکھا ہے کہ حافظ کو لینے کا خیال نہیں اور ذمہ داروں کو دینے کا خیال نہیں، اتفاق سے ہدیہ کے طور پر حافظ صاحب کو جاتے وقت کچھ دے دیا جائے تو گنجائش کی بات ہے، اولاً ایسا کہاں ہوتا ہے؟ نیز ایسی شکل کے لئے بحث مباحثہ کی نوبت کیسے پیش آئی ، بحث مباحثہ کی نوبت سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ سب کے ذہن میں لینے اور دینے کی بات رواج کی مطابق ہوتی ہے، جس کو فتاوی دار العلوم کے مذکورہ حوالہ میں ناجائز اور باطل لکھا ہے۔ اور جن مفتی صاحب کا استفتاء میں ذکر کیا گیا ہے تو کسی مفتی کا منصب یہ نہیں کہ وہ کسی دوسرے مفتی عالم پر نقد کرے؛ اس لئے ہم ان سے متعلق کوئی بات نہیں لکھ سکتے؛ البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ حضرت تھانوی قدس سرہ موجودہ زمانہ کے تمام مفتیان کرام اور تمام علماء کرام سے بڑھ کر عالم ومفتی اور محقق تھے، انہوں نے ہدیہ ونذرانہ کو اس موقع پر ناجائز لکھا ہے، نیز حضرت تھانویؒ نے شروع میں تعلیم قرآن پر قیاس کرکے سامع کی اجرت کو جائز لکھا تھا، جو ''امداد الفتاوی''میں شائع ہوچکا

ہے، مگر بعد میں حضرت تھانویؒ نے سامع کی اجرت کے مسئلہ سے رجوع کرکے عدم جواز کا فتاوی دیا ہے، جو ''التذکیر والتہذیب ۳/۸۳'' میں شائع ہو چکا ہے اور ''النقیب'' میں ہر سال اسی طرح شائع کرتے رہے اور اس میں لکھے ہوئے دلائل سب مخدوش ہیں جو تمام فقہاء اور تمام اکابر اہل فتاوی کے خلاف ہیں؛ اس لئے اس سے تعارض کی ضرورت نہیں۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ رمضان ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۱۶)

ختم تراویح پر نذرانہ اور مٹھائی تقسیم کرنا

سوال [۳۲۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح سنانے والے طالب علم کے لئے پیسہ لینا جائز ہے کہ نہیں؟ اور اگر سننے والے خوشی سے دے رہے ہیں تو لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور تراویح ختم میں جب مٹھائی بانٹی جاتی ہے، تو اگر وہ چندہ کے پیسہ سے بانٹی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: احقر محمد عثمان پینتے پور، ضلع سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح سنانے والا طالب علم ہو یا غیر طالب علم کسی کے لئے بھی تراویح کا نذرانہ لینا جائز نہیں، اگرچہ دینے والے غیر متعین طور پر خوشی ہی سے کیوں نہ دیں۔

لأن المعروف كالمشروط؛ لأن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب، والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٧)

تراویح کے ختم پر مسجد کی رقم سے یا چندہ کرکے مٹھائی تقسیم کرنا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر کوئی

شخص اپنی جیب خاص سے بخوشی تقسیم کراتا ہو تو گنجائش ہے؛ لیکن مسجد کا احترام لازم اور ضروری ہے۔ (مستفاد: رحیمیہ قدیم ۴/ ۴۲۷، جدید زکریا ۶/ ۲۴۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۴۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۲۷ھ

تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا

سوال [۳۲۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) لفظ اجرت کی کیا تعریف ہے؟ (۲) جو حافظ قرآن بلا تعین اجرت تراویح میں قرآن سناتا ہے اور عوام چندہ اکٹھا کر کے نذرانہ یا ہدیہ کے نام سے دیتی ہے، تو کیا حافظ قرآن کے لئے ان روپیوں کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور ''ردالمحتار'' میں ''**والآخذ والمعطي آثمان**'' ہے، لینے اور دینے والے اس کے ذیل میں آئیں گے یا نہیں؟ اور یہ صورت استیجار علی قراءۃ القرآن میں داخل ہے یا نہیں؟

(۳) جو حافظ قرآن حیلہ امامت کر کے اجرت لیتا ہے، وہ ''**الأمور بمقاصدها**'' کے تحت ناجائز ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے حیلۂ امامت کو جائز قرار دیا ہے، کیا وہ فتویٰ مفتیان کرام وفقہاء عظام کی نظر میں معتبر ہے، جب کہ ''**الأمور بمقاصدها**'' اس کی اجازت نہیں دیتا ہے، چند علماء کرام اس کی روشنی میں بحث وحجت کر رہے ہیں؛ لہٰذا تحقیقی جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: امیر اللہ قاسمی مدرس شعبہ عربی وفارسی مدرسہ قاسم العلوم کولا چھاپر مدراپالی، دیوریا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اجرت حق الخدمت کو کہا جاتا ہے اور اس کی مقدار متعین نہیں ہے، حسب موقع کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

(۲) چندہ کرکے بنام نذرانہ اور ہدیہ دینا محض ایک حیلہ ہے اور عبادات میں حیلہ جائز نہیں ہے؛ بلکہ ”**المعروف کالمشروط**“ کے تحت ہوکرنا جائز اور ممنوع ہوگا اور ”**والآخذ والمعطي آثمان**“ کے ذیل میں داخل ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی، قدیم ۱/ ۳۲۲، جدید زکریا ا/ ۴۸۵، ایضاح المسائل، ص: ۲۸)

(۳) جو حافظ حیلۂ امامت کے ذریعہ اجرت لیتا ہے شرعاً ”**الأمور بمقاصدها**“ کے تحت داخل ہوکر ناجائز ہوگا؛ اس لئے کہ مقصد امامت نہیں ہے؛ بلکہ تراویح میں قرآن سنانا ہی اصل مقصد ہے، یہ اجرت بھی اسی وجہ سے دی جاتی ہے۔ اور یہ ایک حیلہ ہے اور عبادات میں حیلہ جائز نہیں ہے؛ اس لئے یہ بھی جائز نہیں ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی قدیم ۳۲۲، جدید زکریا ا/ ۴۸۵)

الأصل أن كل طاعة يختص بها المسلم لا يجوز الاستئجار عليها عندنا؛ لقوله عليه الصلاة والسلام: اقرؤا القرآن ولا تأكلوا به. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ۷٦، كراچی ٦/ ٥٥)

اور ”کفایت المفتی“ میں حیلہ امامت والا مسئلہ جو واقعتاً صریح دلیل بن سکتا ہے؟ نظر سے نہیں گذرا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ ۱۱/ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۸۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۱۱/ ۱۴۱۲ھ

تراویح پڑھانے والے حافظ کو ہدیہ دینا

سوال [۳۲۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حافظ مدرسہ یا ٹیوشن کے ذریعہ قرآن کا درس دیتا ہے، اس کے علاوہ اس کا کوئی اور ذریعہ معاش بھی نہیں ہے، اس کے باوجود جب رمضان کا مہینہ آتا ہے، تو وہ سب کچھ چھوڑ کر

پورا دن قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور رات کو تراویح میں قرآن پڑھتا ہے، اس کے بعد اگر تراویح پڑھنے والے ایسے حافظ کو اپنی طرف سے کچھ ہدیہ دیں تو آیا جائز ہے کہ نہیں؟

المستفتی: تسلیم احمد اکبر پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اس طرح بطور ہدیہ اور نذرانہ کے نام سے دینا اور لینا متعارف ہے۔ اور جو چیز متعارف ہوتی ہے وہ بمنزلہ شرط کے ہوتی ہے؛ اس لئے حضرت تھانویؒ نے اس کو بھی ناجائز لکھا ہے۔

المعروف كالمشروط. (مستفاد: إمداد الفتاوى، قديم ١/ ٣٢٢، جديد زكريا ١/ ٤٨٥، إيضاح المسائل ٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۱۲/۵ھ

تراویح میں قرآن سنا کر اجرت لینا

سوال [۳۲۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان شریف میں تراویح کے بعد لینا دینا کیسا ہے؟ مفتی ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم کا ایک فتویٰ جواز کا ہے، تحریر دوسرے کے پاس ہے اور وہ باہر ہیں؛ اس لئے حوالہ نمبر نہیں لکھ سکا، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری کا فتویٰ جواز کا ہے، ''فتاوی دارالعلوم'' میں ابتغاءً للہ جائز ہے، جلد: ۴، ص: ۲۹۸ مسائل تراویح، صوبہ کرناٹک میں عام طور سے کافی رقم لی دی جاتی ہے اور خود حضرات اساتذۂ دارالعلوم کو وہاں پایا گیا، بنگلور سے مفتیوں کی ایک جماعت آئی تھی صرف مفتی حضرات تھے، ان سے جب معلوم کیا گیا تو بتلایا کہ صوبہ کرناٹک میں لینا دینا جائز ہے؛ اس لئے کہ مسئلہ عرف ورواج پر چلتا ہے اور وہاں عرف ہے؛ اس لئے جائز ہے، مفتی صاحبان نے فرمایا کہ اس چیز کا عرف سہارنپور میں نہیں ہے؛ اس لئے مفتی صاحبان ناجائز لکھتے ہیں، کیا عرف پر مسئلہ کا چلنا صرف کرناٹک کی خصوصیت ہے یا سب

کے لئے ہے؟ اگر سب کے لئے ہے تو ضلع بجنور میں پرانے زمانے سے یہ عرف ہے کہ تراویح کے بعد لیا دیا جاتا ہے، کیا یہاں عرف کا اعتبار نہیں ہوگا؟ اگر نہیں ہوگا تو کیوں؟ کرناٹک میں مفتیان کرام کا جواز کا فتوی ہے اور یہ بات کہ: **المعروف کالمشروط** میں جو داخل ہو وہ ناجائز ہے، تو علمائے کرام وعظ تقریر کے بعد جو ہدایا وغیرہ لیتے ہیں وہ داخل ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جب کہ اس کو ہر آدمی جانتا ہے۔

المستفتی: مصلیان مسجد بنجاران ساہن پور نجیب آباد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن کریم سنا کر اجرت لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں۔ اور ''فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۹۸'' جو فتویٰ ہم نے دیکھا ہے، اس میں موجودہ زمانہ میں لینے دینے کا رواج ہونے کی وجہ سے ناجائز لکھا ہے۔ اور اساتذۂ دارالعلوم کے قرآن پر اجرت لینے کا علم احقر کو نہیں ہے، اگر آپ کو معلوم ہے تو آپ ان سے براہ راست گفتگو کریں، نیز کسی کا عمل جو شرعی حکم کے خلاف ہے وہ حجت شرعی نہیں ہوسکتا۔ اور جن مفتیوں کی جماعت سے آپ کی گفتگو ہوئی ہے، شاید ان کی بات آپ کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہوگا؛ اس لئے کہ فتاوی دارالعلوم کے جس فتوے کا حوالہ آپ نے پیش کیا ہے خود اس میں عرف ورواج جہاں ہے وہاں لینا دینا ناجائز اور حرام لکھا ہے۔ اور قرآن کے ثواب سے محروم ہونے کو ثابت کیا گیا ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۹۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۹/۴/۱۴۱۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۵۱)	۱۹/۴/۱۴۱۳ھ

حافظ صاحب کا اجرت لے کر قرآن سنانا اور مقتدیوں کا سننا کیسا ہے؟

سوال [۳۲۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صوبہ راجستھان ضلع جھن جھنوں میں ''جاکھل'' نامی گاؤں کی مسجد میں شہر مرادآباد یوپی

کے مشہور مدرسہ جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد سے فارغ التحصیل سند یافتہ عالم، قاری، امام مقرر ہے، اس امام کے پیچھے سنت تراویح پڑھنے کے بجائے روپیہ کا نذرانہ دے کر تراویح میں ایک قرآن ختم سننے کے لئے حافظ لانا چاہتے ہیں، شریعت مطہرہ کے حساب سے کیا بہتر ہے؟ نیز مذکورہ مسجد میں جو بھی امام مقرر ہوتا ہے اس کے ذمہ مسلمانوں کے سبھی دینی امور کی مسجد سے متعلق ہوں یا گاؤں سے متعلق ہوں ذمہ داری ہوتی ہے اور عید کے دن تراویح کے بہانے سے اور بقرعید میں قربانی کے بہانے سے تنخواہ کے علاوہ کچھ رقم نذرانہ کے طور پر دیتے ہیں اور دوسرے موقعوں پر بھی دیتے ہیں، امام مقرر کرتے وقت یہ بتا دیتے ہیں کہ مذکورہ موقعوں پر نذرانہ دیا جائے گا، تو کیا اس قسم کا نذرانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ مدلل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: مصلیان مسجد ضلع جھن جھنوں راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حافظ کو اجرت لے کر سنانا اور مقتدیوں کو اجرت دے کر سننا جائز نہیں؛ اس لئے ایسا حافظ تلاش کرنا چاہئے جو بلا اجرت سناتا ہو۔ اور اگر بلا اجرت سنانے والا نہ ملے تو اسی امام کے پیچھے سورۂ تراویح پڑھ لینا چاہئے۔

إن القراءة لشيء من الدنيا لا تجوز، وأن الآخذ والمعطي آثمان؛ لأن ذلک يشبه الاستئجار على القراءة، ونفس الاستئجار عليها لايجوز، فكذا ما أشبهه. (شامي، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل، كراچی ۲/ ۷۳، زكريا ۲/ ۵۳٤)

البتہ جو شخص مستقل امامت کے فرائض انجام دے رہا ہے ختم کے موقع پر اسے نذرانہ پیش کرنے میں کوئی خرابی نہیں؛ اس لئے کہ اس کا قرآن سنانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۴/ ۴۲۷، جدید زکریا ۶/ ۲۴۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۴۲۰/۸/۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۰۰)	۱۴۲۰/۸/۸ھ

اجرت لے کر تراویح پڑھانے والے کے پیچھے نماز تراویح

سوال [۳۲۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک عالم ہے، وہ کہتا ہے کہ جس حافظ کو تراویح میں اجرت دی جاتی ہے، اس کے پیچھے تراویح پڑھنا درست نہیں؛ بلکہ اس سے بہتر سورۂ تراویح پڑھنا ہے؛ لیکن زید تو ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھتا ہے کسی نے اس سے پوچھا کہ آپ تو ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنے سے سورہ تراویح پڑھنے کو افضل بتلاتے ہیں، پھر آپ کیوں پڑھتے ہیں؟ تو انہوں نے دو وجہ بتلائی۔ پہلی وجہ یہ بتلائی کہ مجھے قرآن سننے کا بے حد شوق ہے اور میں صرف سن لوں گا کسی قسم کا عوض یا اجرت اس حافظ کو بذات خود نہیں دوں گا، دوسری وجہ یہ بتلائی کہ ہم کو سورۂ تراویح پڑھنے سے دل کو اطمینان اور سکون اور سرور نہیں ہوتا ہے، تو کیا ان صورتوں میں زید کو ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنا درست ہے؟

المستفتی: اسرار الحق، کیراف نور الدین بیکری والے محمد پور، اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں زید کو جب یہ بات معلوم ہے کہ سنانے والے کو اجرت دی جاتی ہے، تو اس کے پیچھے قرآن کریم سننے سے بہتر یہ ہے کہ سورہ تراویح پڑھ لے۔ (مستفاد: کفایت المفتی، قدیم ۳/۳۶۳، جدید زکریا ۳/۴۰۹، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۵۳۶، امداد الاحکام ۲/ ۲۶۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲۴ھ

تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا

سوال [۳۲۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک شخص حافظ قرآن ہے، اس کا ذریعہ معاش ایسا کاروبار ہے کہ وہ ہر ماہ اپنے بچوں کا خرچ پورا کرلیتا ہے، اب رمضان المبارک آنے پر وہ شخص مسجد میں قرآن سناتا ہے اور رمضان میں قرآن سنانے کے بعد اس کو جو پیسے ملتے ہیں اس کے ذریعہ ہی وہ اپنے بچوں کا خرچ پورا کرتا ہے، اب اگر وہ عدم جواز کی صورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیسے نہ لے تو اس صورت میں اس کے بچوں کا خرچ پورا نہ ہوگا، اسی عدم جواز کی وجہ سے بعض حفاظ نے رمضان میں قرآن کو سنانا ترک کردیا، مذکورہ صورت مسئلہ پر نظر رکھتے ہوئے اگر وہ پیسے لے لے تو اس صورت میں یہ جائز ہوگا یا نہیں؟، نیز طلبہ کے لئے یہ پیسے لینا جائز ہے یا نہیں؟

رمضان المبارک میں تراویح کے نام سے جو چندہ جمع کرتے ہیں، جب کہ بعض لوگ بددلی سے دیتے ہیں اور بعض خوش دلی سے، کیا اس کو مسجد کے مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس تراویح کے چندہ سے دودھ کے پیسے دئے جاتے ہیں، آیا حافظ صاحب کا دودھ پینا اور اپنی زبان سے دودھ طلب کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مذکورہ بالا تمام صورتوں کا جواب مدلل دیں۔

المستفتی: محمد شعیب بجنوری، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مسئولہ صورت میں ایسے شخص کو تراویح کا پیسہ لینا جائز نہیں ہے، لینے اور دینے والے دونوں گنہگار رہیں، اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے، اگرچہ پہلے سے کچھ متعین نہ کیا جائے بچوں کا خرچ پورا کرنے کے لئے کوئی دوسرا کام کریں، نیز طلبہ کے لئے بھی اس کے پیسے لینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۶/ ۳۷۷، جدید ڈابھیل ۷/۱۷۱، ایضاح المسائل، ص:۲۶)

والمعروف کالمشروط. (ردالمحتار، زکریا ۹/ ۷۶)

إن القرآن بالأجرة لا یستحق الثواب، والآخذ والمعطي آثمان.

(شامي، کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، کراچی ۶/ ۵۶، زکریا ۹/ ۷۷)

(۲) تراویح کے نام سے چندہ کرنا مشروع نہیں ہے؛ اس لئے کہ تراویح میں ختم قرآن کے نام سے کوئی اجرت ہی نہیں ہے، اگر مسجد کے مصرف کے لئے چندہ کی ضرورت ہے، تو اسی

کے نام سے چندہ کریں اور حافظ صاحب کو دودھ پلانا، کھانا کھلانا اور اس کی افطاری کا انتظام کرنا جب کہ وہ اس محلّہ کا نہ ہو یہ سب مہمانداری ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، یہ تراویح سنانے کی اجرت نہیں ہے اور یہ مہمانداری مسجد والوں پر فرض ہے، مانگنے اور مطالبہ کا موقع نہیں دینا چاہئے؛ بلکہ مسجد والوں کو رغبت سے یہ کام کرنا چاہئے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۹۵، ایضاح المسائل/ ۲۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ علم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۹ھ

حافظوں کے لئے تراویح کا پیسہ لینا کیسا ہے؟

سوال [۳۲۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل رمضان شریف میں حافظوں کو پیسے دینے کا دستور ہے، تو کیا یہ صحیح ہے، بعض جگہ خوشی سے دیتے ہیں اور عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ حافظوں کے لئے چندہ کرنے میں زبردستی کی جاتی ہے، پھر وہ پیسہ حافظوں کو ہدیہ میں پیش کرتے ہیں، یہ لینا صحیح ہے یا نہیں؟ اور کس صورت میں جائز ہے اور کس صورت میں نہیں؟

المستفتی: قاری اصغر علی جوٹھیا رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دستور اور رواج کے مطابق حافظ کو جو دیا جاتا ہے وہ بھی شرعی طور پر جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ حافظ صاحب کو معلوم ہے کہ مجھے کچھ پیش کریں گے اور مقتدیوں کے دلوں میں بھی یہ بات رہتی ہے کہ جاتے وقت حافظ کو کچھ دینا ہے؛ لہٰذا یہ بھی ”**المعروف کالمشروط**“ کے تحت داخل ہو کر نام کا نذرانہ ہے، درحقیقت اجرت ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔ اور اس طرح حافظ صاحب کو دینے کے لئے چندہ کرنا نیز اس میں زور دباؤ سے کام لینا جائز نہیں ہے، بہر حال خوشی سے دیتے ہوں یا دباؤ سے ہر حال میں ناجائز

ہے۔(مستفاد: ایضاح المسائل/ ۲۷، شامی کتاب الإجارۃ، باب الإجارۃ الفاسدۃ، زکریا۹/ ۷۶، کراچی ۶/ ۵۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍شوال ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱۸۰/۳۱)

سامع کی اجرت

سوال [۳۲۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں رقم سامع کے لئے لینا جائز ہے یا نہیں؟ مسجد والوں کے اطمینان کے لئے سامع ضروری ہے، سامع کے بغیر مصلیان کو تسلی نہیں ہوتی اور بغیر رقم دیئے ہوئے کوئی سامع نہیں ملتا، ایسی مجبوری میں سامع کو رقم دے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: فرخ منہاج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس طرح تراویح میں قرآن سنانے والے کو اجرت دینا اور لینا دونوں جائز نہیں، اسی طرح لقمہ دینے والے سامع کو اجرت لینا اور دینا بھی ناجائز اور حرام ہے، حضرت تھانویؒ نے تعلیم قرآن پر قیاس کرتے ہوئے کسی زمانہ میں اس کے جواز کا فتویٰ دیا تھا، پھر حضرت تھانویؒ نے اس فتویٰ سے رجوع فرمالیا تھا، جو ''التذکیر والتھذیب ص: ۸۳'' میں مذکور ہے؛ اس لئے پہلے فتویٰ سے رجوع کر کے عدم جواز کا فیصلہ دیا ہے۔
(مستفاد: ایضاح المسائل/ ۲۶، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۶، فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۹۵)

ویمنع القارئ للدنیا، والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، کتاب الإجارۃ، باب الإجارۃ الفاسدۃ، زکریا ۹/ ۷۷، کراچی ۶/ ۵۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۰۹۰/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۵ھ

سامع وقاری کی اجرت کا حکم

سوال [۳۲۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید تراویح میں قرآن کریم سنتا یا پڑھتا ہے، اس کو تراویح میں ختم والے دن روپیہ ملتا ہے، تو کیا یہ روپیہ لینا جائز ہے؟

(۲) کیا قرآن کریم سننے اور سنانے والے حافظ کو روپیہ دینا جائز ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں قرآن ختم کرنے والے حافظ اور سننے والے سامع حافظ دونوں کے لئے روپیہ لینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۳۹۲، جدید زکریا ۳۷۰، جواہر الفقہ ۱/۳۸۲، جدید زکریا ۳/۵۲۲، فتاوی دار العلوم ۴/۵۶۵، ایضاح المسائل/۲۶)

نیز روپیہ دینے والوں کے لئے دینا بھی جائز نہیں ہے۔

والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة، الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ۶/ ۵۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۰۸)

قاری وسامع کی اجرت کے لئے چندہ کرنا

سوال [۳۲۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے بعض علاقہ میں یہ دستور ہے کہ مسجد کے متولیان حضرات مسجد کے نمازیوں سے چندہ وصول کرتے ہیں اور یہ چندہ سامع اور قاری کے درمیان تقسیم کردیتے ہیں، تو کیا سامع کو اس کا لینا درست ہے؟

المستفتی: جمیل احمد، بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قاری وسامع کو اجرت دینے کے لئے متولیان مسجد کا نمازیوں سے چندہ وصول کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، اور نہ ہی وصول کرکے قاری وسامع کے درمیان تقسیم کرنا جائز ہے۔ اور نہ قاری وسامع کے لئے اس کا لینا درست ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/۵۱۴، فتاوی دارالعلوم دیوبند ۴/۲۹۵)

والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة، الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ٦/ ٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۴۱۸)

سامع کا آمد ورفت کا کرایہ وصول کرنا

سوال [۳۲۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا سامع کو آمد ورفت کے لئے کرایہ کا لینا جائز ہے، خصوصاً جب کہ سامع (تراویح میں قرآن سننے والا) طے شدہ شہر یا قصبہ میں پہلے سے موجود ہے، تو کیا گھر جانے کے لئے کرایہ لینا درست ہے جب کہ سامع کو کرایہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے؟

المستفتی: جمیل احمد بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت تھانویؒ نے ’’امداد الفتاوی‘‘ میں سامع کے لقمہ دینے کو تعلیم قرآن کے مشابہ قرار دے کر سامع کے لئے اجرت وکرایہ وغیرہ کو جائز قرار دیا ہے۔ (امداد الفتاوی، قدیم ۱/ ۳۲۹، جدید زکریا ۱/ ۴۹۶)

اور ''احسن الفتاوی'' کے اندر فرمایا ہے کہ یہ تعلیم نہیں ہے؛ بلکہ تذکیر ہے، جس پر اجرت ناجائز ہے؛ اس لئے سامع کو قاری کی طرح اجرت وکرایہ وغیرہ لینا دینا حرام اور ناجائز ہے۔ (احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۴، ۳/ ۵۱۶)

احقر کے نزدیک اس مسئلہ میں ''احسن الفتاوی'' کی دلیل زیادہ مضبوط ہے؛ اس لئے مذکورہ صورت میں سامع کے لئے کرایہ کے نام سے مذکورہ اجرت کا لینا شرعاً ناجائز ہے؛ کیوں کہ سامع کو باہر سے بلایا نہیں گیا اور باہر سے بلانے کی ضرورت میں آمد ورفت کا کرایہ جائز ہوتا ہے، ورنہ نہیں۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم دیوبند ۴/ ۴۹۴) فقط اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ر رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۴۱۸)

سامع کا اجرت طے کرنا

سوال [۳۲۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعد آداب گزارش یہ ہے کہ رمضان شریف میں سامع قرآن سننے کا معاوضہ طے کر کے لے سکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ وہ دوپہر کو حافظ کے گھر جاکر روزانہ قرآن سنتا ہے، مہربانی فرما کر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس طرح قاری کے لئے تلاوت قرآن کی اجرت حرام اور ناجائز ہے، اسی طرح سامع کے لئے بھی ناجائز اور ممنوع ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ۲۷، التذکیر والتہذیب ۳/ ۸۳)

البتہ اگر دوپہر کو حافظ کے گھر جاکر حافظ کو قرآن کریم یاد کراتا ہے، تو مناسب معتدل اجرت

اس وقت کی لینے کی گنجائش ہوسکتی ہے جیسا کہ ٹیوشن پڑھانے کی اجرت لی جاتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ ر رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۱۴/ ۳۶۱۴)

سامع کی اجرت کا شرعی حکم

سوال [۳۲۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید رمضان شریف میں ہر سال تراویح کے اندر قرآن کریم سناتا ہے اور وہ اپنے سامع کو برابر سننے کی اجرت دیتا ہے، ہمارے یہاں سامع کی اجرت سنانے والے کے ذمہ ہوتی ہے، اہل محلّہ کے تعاون کے بغیر آج تک اس اجرت کے عدم جواز کے بارے میں کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی؛ چونکہ حضرت تھانویؒ کا فتویٰ بھی جواز کا ہے، مگر کچھ دنوں سے اس کے خلاف سننے میں آرہا ہے، جب کہ اس کے اندر کتنے علماء کرام اور حفاظ صاحبان ملوث ہیں کسی کے ذہن میں بھی یہ نہیں کہ یہ اجرت ناجائز ہے، اب سوال طلب امر یہ ہے کہ اس کا صحیح مسئلہ کیا ہے، اگر عدم جواز کا ہے تو کیا بہر صورت حرام ہے؟ یا کوئی خاص شکل مستثنیٰ ہے، جیسے اگر طے نہ کریں تو کیسا ہے؟ اگر اجرت کی ممانعت ہوتی ہے تو سامعین بالکل نہیں مل پائیں گے، جس کے باعث انتہائی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا، یا تو قرآن کریم تراویح کے اندر ہونا بند ہوجائے گا یا اگر ہوگا تو حفاظ صرف اپنے حافظہ سے پڑھتے رہیں گے، کتنی غلطیوں کا احساس تک نہ ہوگا، سامع کو بھی لینے پر مجبور کرتے ہیں، ورنہ اس کا احسان سمجھ کر اس کو اپنے اوپر لینا نہیں چاہتے، پھر بھی جوڑا وغیرہ دے ہی دیتے ہیں، دونوں مسئلوں میں حتی المقدور گنجائش نکال کر ممنون فرمائیں۔

(۲) حفاظ کرام دور دراز قرآن پڑھنے جاتے ہیں، کنسیشن لے کر اگر کوئی اجرت نہ لے

صرف کرایہ خرچ لے تو کیا پورا کرایہ وصول کرسکتا ہے یا کنسیشن کے حساب سے لے گا، جب کہ کبھی کنسیشن نہیں بھی ملتا ہے؟

المستفتی: ابن داؤد مسجد کہنہ ٹانڈہ بادلی، ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت تھانوی قدس سرہ نے سامع کے لقمہ دینے کو تعلیم سمجھ کر سامع کے لئے اجرت کے جواز کا فتوی ضرور صادر فرمایا ہے، جو ''امداد الفتاوی'' میں شائع ہو چکا ہے؛ لیکن بعد میں حضرت تھانوی قدس سرہ نے اپنے اس فتوی سے رجوع بھی کر لیا ہے اور رجوع کا فتویٰ اتفاق سے ''امداد الفتاوی'' میں نہیں آسکا اور حضرت تھانویؒ کی کتاب ''التذکیر والتھذیب، ۸۳/۳'' میں رجوع کا فتوی موجود ہے؛ اس لئے کہ لقمہ دینا در حقیقت تعلیم نہیں ہے؛ بلکہ تذکیر ہے۔ اور ''امداد الفتاوی'' زیادہ متداول ہونے کی وجہ سے جواز کا فتویٰ مشہور ہو گیا ہے۔ اور ''التذکیر والتھذیب'' متداول نہ ہونے کی وجہ سے رجوع کا فتویٰ پردۂ خفا میں رہ گیا ہے؛ لہٰذا قاری کی طرح سامع کے لئے بھی اجرت جائز نہ ہوگی، نیز عدم جواز کا فتویٰ (فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۹۵، احسن الفتاوی ۳/ ۵۱۶ پر موجود ہے) اور بغیر اجرت سامع نہ ملنے کا جو اشکال پیش کیا جارہا ہے، اس سے اہم اشکال قاری نہ ملنے کا بھی کیا جاتا رہا ہے، اور اسی طرح سماعت قرآن پر اجرت لینے میں علماء وحفاظ کے ملوث ہونے کا جو اشکال پیش کیا جارہا ہے، اس سے اہم اشکال تراویح میں قرآن کریم پڑھنے پر اجرت لینے میں بھی علماء وحفاظ کے ملوث ہونے کا کیا جاتا رہا ہے اور ان اشکالات کی طرف شریعت نے کوئی توجہ نہیں دی ہے؛ بلکہ بغیر اجرت قاری وسامع کے نہ ملنے کی صورت میں ''الم ترکیف'' سے تراویح ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/ ۳۶)

(۲) کنسیشن نہیں ملتا ہے، تو پورا کرایہ، ورنہ کنسیشن کا کرایہ وصول کرسکتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ شعبان ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۲۶۹)

حافظ قرآن کو مسجد کے فنڈ سے آمد ورفت کا کرایہ دینا

سوال [۳۲۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسجد کی اعانت وامداد کے مخصوص فنڈ سے حافظ تراویح کے آمد ورفت کے کرایہ عمدہ کھانے سحر وافطار کا نظم کرنا کیسا ہے؟

(۲) یا پھر مذکورہ امور کے لئے مسجد کے عام مصلیوں سے چندہ کرنے کا کیا حکم ہے؟ نیز اگر نمازیوں میں سے تنہا کوئی شخص حافظ صاحب کے مذکورہ اخراجات کی ذمہ داری قبول کرلے تو اس سلسلہ میں کیا مسئلہ ہے؟

المستفتی: رئیس احمد چمپارنی، متعلم خادم الاسلام ہاپوڑ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۲) حافظ قرآن کو آمد ورفت کا کرایہ دینا اور مہمان داری کرنا قرآن سنانے کی اجرت میں داخل نہیں ہے؛ لیکن یہ خرچ مسجد کے فنڈ سے نہ دیا جائے؛ بلکہ کوئی سرمایہ دار اپنے طور پر خرچ کرے یا محلّہ کے دوچار افراد آپس میں بخوشی ورضا اس پیسے کا انتظام کریں، کسی پر اسکی وصولی کے لئے دباؤ ڈالنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۴/۴۲۲، جدید زکریا ۶/ ۲۵۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/۵/۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۰۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۵/۱۴۲۴ھ

”الم ترکیف“ سے تراویح پر اجرت لینا

سوال [۳۲۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی ختم قرآن تراویح پر اجرت لے تو یہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور سورۂ تراویح پر

اجرت لےتو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور ہدایا اور تحائف لینا کیسا ہے؟ فقط والسلام

المستفتی: فخر الاسلام آسامی، متعلم مدرسہ ہذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سورۂ تراویح یعنی ''الم ترکیف'' سے تراویح کی امامت پر اجرت کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ اس صورت میں قرآن سنانا مقصد نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ صرف نفس نماز تراویح مقصد ہوتا ہے اور نماز تراویح اصل ہے اور تراویح کے ضمن میں مختصر سورتیں نماز کے تابع ہیں؛ اس لئے اصل مقصد نماز تراویح ہے اور نماز کی امامت میں اجرت جس وقت کی لینا شرعاً جائز ہے اور ختم قرآن کی صورت میں تراویح کے ساتھ ختم قرآن اہم مقصد ہوتا ہے۔ اور قرآن کریم سنا کر اجرت لینا اور دینا دونوں حرام ہے؛ اس لئے جائز نہیں ہے۔

والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ٦/ ٥٦)

اور ہدایا وتحائف کے نام سے بھی ناجائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی، قدیم ۱/۳۲۲، جدید زکریا ۱/ ۴۸۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶/۷/۱۴۱۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۲۷۵۳)	۶/۷/۱۴۱۲ھ

سورۂ فیل سے تراویح پڑھانے پر اجرت لینے کا حکم

سوال [۳۲۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض لوگ ''الم ترکیف'' کے بعد دس سورت کو لے کر تراویح پڑھاتے ہیں اور اس تراویح پڑھانے کی اجرت لیتے ہیں، کیا یہ اجرت لینا جائز ہے؟

المستفتی: ابوالخیر، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں چونکہ مقصود ختم قرآن پر اجرت نہیں ہے؛ بلکہ محض امامت تراویح پر اجرت لینا ہے؛ لہٰذا ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھانے کی صورت میں اجرت لینا درست ہوگا؛ اس لئے کہ یہ امامت کی اجرت ہے تلاوت کی اجرت نہیں ہے۔

یفتی الیوم بصحتها لتعلیم القرآن، والفقه، والإمامة، والأذان.

(درمختار مع الشامي، کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زکریا دیوبند ۹/ ۷٦، کراچی ٦/ ٥٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/۶/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۶/۱۴۱۵ھ

تراویح میں ملی ہوئی رقم کو کیا کریں؟

سوال [۳۲۹٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید رمضان المبارک میں ختم قرآن کے بعد ہدیہ یا نذرانہ لیتا تھا لاعلمی کی بنا پر، مگر اب اس کی حرمت کا علم ہوا تو زید نے سختی کے ساتھ لین دین کو کئی سالوں سے بند کر دیا ہے اور توبہ بھی کر لی ہے، گذشتہ سالوں کا لاعلمی کا لین دین جو ہوا ہے کیا زید کے ذمہ یہ حقوق العباد رہا جب کہ زید پہلے سے ہی اس لین دین سے خوش نہ تھا اور نہ کسی سے کچھ طلب کرتا تھا، اگر ذمہ میں حقوق العباد ہے، تو اس کی معافی کی کیا شکل ہوگی؟ مقتدی کوئی طلب گار بھی نہیں ہے؟

المستفتی: محمد اسلام پریس والے، شیرکوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں: (۱) حقوق العباد، اس کا

مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کی ملکیت کواس کی اجازت اور مرضی کے بغیر قبضہ کرنا اور تصرف میں لانا یہ ہرگز جائز نہیں ہے، مالک سے معاف کروانا لازم ہے۔ اور اگرکوئی اپنی ملکیت کو بخوشی کسی کی ملکیت میں دے دیتا ہے،تو معطی لہ اس کا مالک ہوجاتا ہے۔ اوراس ناجائز عمل اورفسادعقد کاتعلق درحقیقت حقوق اللہ سے ہے، دوسری چیز حقوق اللہ ہے، اس میں اگرخرابی آجائے توانشاءاللہ تعالیٰ توبہ سے بری ہوجائے گا، اورعقد فاسد کے ذریعہ سے اگر مالک کی رضامندی سے کوئی چیزکسی کی ملکیت میں آجائے توجب تک وہ چیز موجود ہوواپس کرنالازم ہوتا ہے، تاکہ فسادعقد کی بناپرحقوق اللہ میں جوخرابی آئی ہے وہ دور ہوجائے۔ اوراگروہ چیز موجودنہیں ہے؛ بلکہ ختم ہوچکی ہےتو حدوداللہ سے تجاوز کرنے کی وجہ سے جو گناہ ہوا ہے، وہ اس پر باقی ہے انشاءاللہ تعالیٰ توبہ سے اس کی تلافی ہوجائے گی؛ لہٰذا گذشتہ سالوں میں جو پیسہ قرآن سنا کر ملا ہے اورختم ہوچکا ہے،تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلی جائے اور آئندہ نہ لیا جائے۔ اوراگروہ رقم موجودہےاورسب لوگوں کو پہنچانا دشوار ہےتوعام اعلان کردیا جائے کہ وہ رقم موجودہے، اگرآپ سب لوگ اجازت دےدیں تواس رقم کوآپ لوگوں کی طرف سے صدقہ وغیرہ یا فلاں کارخیر میں خرچ کردیتا ہوں، بری ہونے کا یہ ایک آسان راستہ ہے۔

(مستفاد: بذل المجہود، الطہارۃ، باب فرض الوضوء، دارالبشائرالاسلامیہ بیروت ۱/ ۳۵۹، میرٹھ ۱/ ۳۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱رمحرم ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۹۲)

تراویح میں موصول اجرت کامصرف

سوال [۳۲۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ''استئجار علی الطاعات'' کی حرمت کے ضمن میں ''استئجار علی

تلاوت القرآن‘‘ کی حرمت پر متقدمین اور متأخرین کا اتفاق ہے، اور بنابریں وجہ اجرت تراویح کے عدم جواز کا فتویٰ ہے؛ لیکن اگر کسی شخص نے اجرت تراویح کو کسی حیلہ سے یا بغیر حیلہ کے قبول کرلیا یا بغیر اس کی رضامندی کے اسے اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، تو اب سوال طلب امر یہ ہے کہ آیا وہ شخص حاصل شدہ رقم کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اسے کسی رفاہی کام میں لگا سکتا ہے؟ مثلاً وہ اس رقم سے کچھ کتابیں خرید کر ایک رفاہی لائبریری قائم کرے اور کسی طرح کے تعصب کے بغیر عام لوگوں کے استفادہ کے لئے اس میں کتابیں جمع کرے، تو بروئے شریعت اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: غلام محمد غفرلہ مقام موڈاسا، ضلع سابرکانٹھا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر تراویح میں قرآن سنانے کی وجہ سے اس کی اجرت بطلب یا بجبور یا امامت کا نام دے کر حیلہ کیا گیا ہو اور مقصود ختم قرآن ہو تو ان تمام صورتوں میں اجرت ناجائز اور حرام ہوگی ۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۳۲۲، جدید زکریا ۱/ ۴۸۵)

لہٰذا ان تمام صورتوں میں اگر واپس کرنا ممکن نہ ہو تو صدقہ کر دینا واجب ہے ۔ اور بعض لوگوں نے رفاہ عام میں خرچ کرنے کی گنجائش قرار دی ہے؛ لیکن صدقہ کر دینا ہی اصل ہے ۔

من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة، والاستئجار على المعاصي والطاعات (إلى قوله) ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه (إلى قوله) يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/ ٣٥٩، ميرٹھ ١/ ٣٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ رشعبان ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۳۲۱)

تراویح میں لی ہوئی اجرت کس طرح واپس کی جائے؟

سوال [۳۲۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے رمضان شریف میں مصلیان مسجد سے تراویح پر اجرت طے کی اور کلام پاک سنایا، ختم تراویح پر مسجد کی انتظامیہ نے طے شدہ اجرت سے کچھ زیادہ رقم زید کو دی اور کہا کہ یہ ہدیہ ہے اور فرداً فرداً مقتدیوں نے بھی ہدایا کے نام سے پیسے کپڑے دیئے، دیگر سالوں میں اسی مسجد میں زید نے کلام پاک سنایا اور طے کچھ نہیں کیا، مسجد والے خود ہی ایک رقم مسجد سے بخوشی دیتے رہے اور مقتدی بھی ہدایا دیتے رہے، تو اس رقم کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو واجب الاعادہ ہے یا نہیں؟ جب کہ زید کو اب معلوم نہیں ہے کہ کس سال کتنی رقم ملی اور کن لوگوں نے ہدایا دیئے، اس صورت میں زید کیا کرے؟ شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عبدالقادر بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رمضان المبارک میں قرآن کریم تراویح میں سنا کر طے شدہ اجرت لینا اور بنام ہدیہ لینا دونوں ناجائز اور حرام ہیں، دینے والے اور لینے والے دونوں گنہگار ہوں گے۔

إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت، ولا للقارئ ...... ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان، فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ٦/ ٥٦)

جو کچھ واپس کر سکتے ہیں، اس مسجد کو واپس کر دیں، مقدار معلوم نہ ہو تو تخمینہ لگا کر دے سکتے

ہیں، نیز لوگوں کو اگر فرداً فرداً پہنچا نہ سکیں تو اس مسجد ہی کو واپس کردیں، نیز توبہ بھی کرلیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/صفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۶۲۹)

تراویح میں ملے ہوئے روپیوں کو مسجد میں دینا

سوال [۳۲۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے تراویح کی نماز پڑھائی اور اس کو لوگوں نے اجرت دینی چاہی، مگر زید نے لینے سے انکار کردیا، پھر بھی لوگوں نے اصرار کیا، تو اس نے وہ روپئے لے لئے، اب وہ چاہتا ہے کہ ان روپیوں کو مسجد کی ضرورت میں لگادے گا، تو مسجد میں دینا یا کسی مزدور کو دینا کیسا ہے؟

المستفتی: فروغ احمد، متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غریب ناداروں کو دے دینا زیادہ بہتر اور افضل رہے گا۔

ویجب علیہ أن یردہ علی مالکہ إن وجد المالک، وإلا ففي جمیع الصور یجب علیہ أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء.

(بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، دارالبشائر الإسلامیة بیروت ۱/ ۳۵۹، میرٹھ ۱/ ۳۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۵/۱۲/۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۲/۲ھ

کوئی حافظ بلا اجرت تراویح پڑھانے کے لئے تیار نہ ہو تو کیا کرے؟

سوال [۳۳۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک مسجد ہے، جس میں تقریباً چار سال سے ختم تراویح کی نماز نہیں ہو رہی ہے، صرف روپیوں کی بنا پر اس وجہ سے کہ کوئی بھی حافظ روپیوں کے بغیر نماز تراویح پڑھانے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے، اب ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اگر تراویح کی نماز پڑھی جاتی ہے، تو ایک گناہ کا ارتکاب کرنا لازم آرہا ہے۔ اور اگر تراویح کی نماز نہیں پڑھی جارہی ہے، تو اب ایسی صورت میں ایک سنت کو ترک کرنا لازم آرہا ہے، تو اب ان دونوں صورتوں میں کون سی شکل اختیار کی جائے آیا اب روپیہ دے کر تراویح کی نماز پڑھی جائے یا سنت تراویح پر ہی اکتفا کیا جائے؛ لہٰذا حضور والا سے درخواست ہے مسئلہ کو قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں۔

المستفتی: امیر الدین پورنوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اجرت پر ختم تراویح سنانا اور سننا "المعروف کالمشروط" کے تحت قطعاً ناجائز اور حرام ہے، ایسی صورت میں سننے اور سنانے والے دونوں گنہگار ہوں گے؛ لہٰذا ایسے حافظ سے ختم تراویح سنی جائے جو بلا کسی اجرت اور معاوضہ کے محض رضائے الٰہی کے خاطر قرآن سنائے، اگر ایسے حافظ نہ ملیں تو پھر "الم ترکیف" سے سورۂ تراویح ہی پڑھی جائے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۴۸۴، احسن الفتاوی ۳/۵۱۴، فتاوی محمودیہ ۱۲/۷/۳۷، ۱۴/۳۲۲، ۷/۱۷۱، فتاوی احیاء العلوم/۱۹۹، فتاوی دار العلوم ۴/۲۶۳، امداد المفتیین/۳۶۳، عزیز الفتاوی/۲۶۳، فتاوی رحیمیہ ۴/۴۲۲، ۷/۲۹۶، ایضاح المسائل/۲۵-۲۶)

ولا تشتروا بآياتي ثمنا قليلا. [سورة البقرة: ٤١]

وان القراءة لشيء من الدنيا لاتجوز، وأن الآخذ والمعطي آثمان ...... اقرؤا القرآن ولا تأكلوا به. (فتاوى شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، زكريا ٩/ ٧٦، ٩/ ٧٧، شامي كراچى

۲/ ۷۳، ٦/ ٥٦، رسالہ ابن عابدين، الرسالة السابعة، بشفاء العليل، و بل الغليل في حكم الوصية بالختمات والتهاليل ١/ ١٥٧، ١/ ١٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/۶/۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/۷۶۹٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ جمادی الثانی ۱۴۲۳ھ

کوئی حافظ بلا اجرت تراویح پڑھانے کے لئے تیار نہیں

سوال [۱۰۳۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ’’ندائے شاہی‘‘ میں تراویح میں ختم قرآن پر اجرت کا لین دین جائز نہیں ہے، اکابر اہل فتویٰ، مشائخ عظام کا متفقہ فتویٰ ص: ۲۵/ پر ستمبر ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے، جس سے سیدھی سی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ختم قرآن پر اجرت کا لین دین قطعاً حرام ہے؛ لیکن موجودہ دور میں ایک معمولی حافظ سے لے کر اچھے پڑھے لکھے قرآن سنانے والے تک بغیر اجرت کوئی بھی قرآن سنانے کے لئے تیار نہیں ہے؛ بلکہ سماعت کرنے والے بھی ایک ہزار سے کم اجرت لینے پر تیار نہیں، اس کا ذمہ دار کون ہوگا، عوام یا خواص؟ اور اگر مجھ جیسے کم فہم آدمی کو بلا اجرت قرآن سنانے والا نہیں ملتا تو اجرت پر قرآن سننا کیسا ہے؟ مسجدوں میں امامت کرنے والے سب سے پہلے سوال کرتے ہیں کہ یہاں پر کیا آمدنی ہے، تو گاؤں والے بتاتے ہیں کہ اتنا اناج ملتا ہے اور اتنی رمضانی ملتی ہے، اب اگر امام کو معاوضہ نہیں ملتا تو امام صاحب ایسی جگہ پر امامت کے لئے تیار نہیں ہوتے ایسے حالات میں امام کو اجرت دینا یا اس کو ضروریات زندگی کا خرچ اور بار اٹھانے کی سوچ رکھتے ہوئے رمضان میں ان کو دینا کیسا ہے؟ جس میں قرآن کی اجرت کے بجائے امام کی خدمت کا خیال ہو تو کیسا ہے؟

المستفتی: محبوب بھائی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر رمضان میں بلا اجرت ختم قرآن کے لئے حافظ نہ

ملے تو بارہ مہینے جو امام نماز پڑھاتے ہوں، ان کے ذریعہ سے ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھ لینی چاہئے؛ اس لئے کہ ختم قرآن سنت ہے اور اس پر اجرت لینا دینا حرام ہے۔ اور ایک سنت کی ادائے گی کے لئے حرام کا ارتکاب ہرگز جائز نہیں ہے، اس کی پوری تفصیل اس فتویٰ میں موجود ہے، جس کا سوال نامہ میں حوالہ ہے اور حافظ قرآن کی ضروریات زندگی اور خرچ کا بار اس کی مستقل آمدنی کا ذریعہ ہوگا، اگر ملازم ہے تو ملازمت سے، کاروباری ہے، تو کاروبار سے۔ اور اگر امامت سے اس کا خرچ پورا نہیں ہوتا، تو اس کی تنخواہ بڑھادی جائے جس سے اس کی تمام ضروریات پوری ہوسکیں، یہی اس کے لئے لحاظ ہے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ، قدیم ۱/۳۸۲، جدید زکریا ۳/۵۲۲، امداد المفتیین /۳۶۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۹۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۱۱/۱۴۲۵ھ

جس مسجد میں نذرانہ لینے دینے کا معاملہ نہ ہو اس میں انفرادی طور پر کچھ دینا

سوال [۳۳۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں رمضان المبارک میں ختم قرآن کے موقع پر قاری اور سامع کو بطور نذرانہ مسجد کی طرف سے کچھ پیسے اور کپڑے دئے جاتے تھے، جب علم ہوا کہ ختم قرآن پر لینا دینا درست نہیں ہے، تو مسجد میں اعلان کردیا گیا کہ ختم قرآن پر نذرانہ لینا دینا درست نہیں ہے، مسجد والوں نے شرعی حکم سن کر سننے سنانے والوں کو دینا بند کردیا، اب سننے سنانے والوں کو بھی یہ علم ہے کہ یہاں مسجد میں لین دین بند ہے؛ لیکن کسی سال ایسا ہوجاتا ہے کہ مقتدیوں میں سے کوئی سنانے والے یا سننے والے کو یا دونوں کو اپنی جیب سے کچھ انعام دے دیتا ہے، حالانکہ مسجد کے فنڈ سے یا چندہ سے لین دین بالکل بند ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر مسجد میں لینا دینا بالکل بند ہو، پھر اتفاقی طور پر کوئی مقتدی سننے سنانے والے کو کچھ دے دے تو کیا یہ بھی

اجرت علی الطاعات میں آ کرنا جائز ہے؟ کیا یہاں ''**المعروف کالمشروط**'' کا قاعدہ چلے گا جب کہ عرفاً لین دین بند ہے؟ تفصیلی جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مسجد میں لینے دینے کا سلسلہ ختم کر دیا بہت اچھا ہوا اور کسی کا انفرادی طور پر دینے کی جو بات کہی گئی تو سوال یہ ہے کہ مسجد میں کیوں دیا جاتا ہے؟ اگر کسی کو حافظ یا سامع سے خصوصی تعلق ہے اور وہ اسی بنیاد پر دیتا ہے، تو حافظ صاحب یا سامع کے گھر یا رہائش گاہ میں جا کر کیوں نہیں دیتا؟ اگر خصوصی تعلق کی بنا پر کچھ دینا ہے، تو رہائش گاہ میں جا کر دینا چاہئے، اگر مسجد میں اس طرح دینے کا سلسلہ شروع ہوگا، تو پھر ایک آدھ سال کے بعد وہی بات سامنے آنے لگے گی کہ ''**المعروف کالمشروط**'' (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ٦/ ٥٥) کے ضابطہ میں داخل ہو کر نا جائز ہو جائے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ رذی قعدہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/ ۱۱/ ۱۴۲۵ھ

حافظ صاحب کو رکشہ کرایہ دینا کیسا ہے؟

سوال [۳۳۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حافظ صاحب تراویح پڑھانے کے لئے ایک کلومیٹر دور سے تشریف بر کشہ لاتے ہیں، تو کیا ان کو رکشہ کا کرایہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شمیم محلّہ جولاہان، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حافظ صاحب کے لئے لینا جائز اور دینے والوں کے لئے موجب ثواب ہے ۔(مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۹۵)فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ محرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۷۰)

ختم قرآن کے موقع پر مستقل امام کو روپیہ پارچہ دینا

سوال [۳۳۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مستقل امام ہے، رمضان شریف میں قرآن کریم سناتا ہے، مقتدی حضرات چندہ کرکے ختم والے دن روپیہ اور پارچہ وغیرہ دیتے ہیں، کیا مستقل امام کے لئے یہ لینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: صبغت اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مستقل امام کو چندہ کرکے دینے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) تقرر کے وقت یہ طے کرکے رکھا ہے کہ ماہانہ تنخواہ اتنی ہوگی اور رمضان المبارک میں ہر سال اتنا اضافہ ملتا رہے گا۔ اور امام کو رمضان میں اضافہ کے ساتھ دینے کے لئے چندہ کیا جاتا ہے اور ختم کے موقع پر وہی اضافی رقم امام کو دی جاتی ہے، تو یہ قرآن سنانے کی اجرت نہیں ہے؛ بلکہ سالانہ واجبی تنخواہ ہے، اس کے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور ذمہ داران پر اس کا دینا واجب ہے۔

(۲) تقرر کے وقت طے نہیں ہوا، مگر مقتدیوں کا معمول ہے کہ تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے رمضان میں امام کو تعاون کرنے کے لئے چندہ کیا جاتا ہے اور ان لوگوں سے چندہ لیا جاتا ہے جو بخوشی دیتے ہیں، تو یہ بھی درست ہے؛ لیکن اگر صرف قرآن سنانے کی وجہ سے ہی چندہ

کر کے اس امام کو دیا جاتا ہے، تو پھر یہ ختم قرآن کی اجرت ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔
(مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۴/ ۴۲۷، جدید زکریا ۶/ ۲۴۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر محرم ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۴۴)

مستقل امام کو رمضان میں زائد ملنے والی تنخواہ تراویح کی اجرت نہیں

سوال [۳۳۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) نماز پنج گانہ کے مستقل ائمہ کرام جو علماء اور حفاظ بھی ہوں یا صرف حافظ قرآن ہوں، رمضان المبارک میں مکمل قرآن کریم تراویح میں سنانے پر دیگر حفاظ کرام کی طرح انہیں بھی مصلیان کرام سے چندہ لے کر کپڑے اور نقد رقم بطور نذرانہ دی جاتی ہے، تو کیا ان مستقل ائمہ اور حفاظ کرام کے لئے وہ نذرانہ لینا جائز ہے یا عارضی حفاظ تراویح کے نذرانہ کی طرح ناجائز ہے؟ ان دونوں نذرانوں میں کوئی فرق ہے جواز اور عدم جواز کے بارے میں یا دونوں کا حکم یکساں ہے؟ یعنی ناجائز۔

(۲) اگر ایسا کیا جائے کہ ان مستقل حفاظ ائمہ کو وہی نذرانہ بجائے سب کے سامنے اعلان کر کے دینے کے کمیٹی کے کچھ افراد اور معززین محلہ بعد ختم قرآن پاک (۱) رات میں گھر پر لے جا کر دیں (۲) یا ۲۷/ ۲۸/ ۲۹ ویں روزہ کو مسجد میں یا گھر میں لے جا کر دیں (۳) ۲۴/ ۲۶/۲۵ ویں روزہ کو گھر پر لے جا کر دیں، تو کیا یہ جائز ہوگا یا ناجائز ہی رہے گا؟

(۳) خلعت ونذرانہ کے بجائے تمام خادمین مسجد کو بشمول امام صاحب جنہوں نے مکمل قرآن کریم سنایا ہے نائب امام صاحب مؤذن صاحب وغیرہ کو ان حضرات کی ضروریات واخراجات کا لحاظ کرتے ہوئے بطور خدمت جن کی جو تنخواہ ہے، ہر ایک کو ایک تنخواہ زائد دی جائے یہ شرعاً کیسا ہے؟

(۴) مستقل ائمہ کرام کوقرآن پاک سنانے کے بعد ہدیہ لینے اور دینے کی کوئی شکل جو بلا کراہت باتفاق مفتیان کرام جائز ہو واضح فرمائیں، تاکہ اس کے مطابق عمل کیا جاسکے؟

المستفتی: وقایت اللہ خالد قاسمی، دارالعلوم کریلا، محلّہ جاہ، ناندیڑ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مستقل امام کو رمضان میں جو زائد ملتا ہے وہ سالانہ آمدنی اور تنخواہوں کا جزو ہوتا ہے۔ اور امام کے تقرر کے وقت جانبین میں اس کا لحاظ ملحوظ رہتا ہے۔ اور ان کی ماہانہ تنخواہ اتنی نہیں ہوتی ہے جتنے پر وہ مطمئن ہوں؛ لیکن سال کے آخر میں رمضان کے موقع پر معتد بہ رقم ملتی ہے، اسی پر اعتماد کرکے کم تنخواہ پر امام رکا رہتا ہے۔ اور بعض جگہوں پر تقرر کے وقت اس کی صراحت ہوتی ہے کہ ماہانہ اتنا ملے گا اور رمضان میں اتنا ملے گا۔ اور بعض جگہ جانبین میں ملحوظ رہتا ہے صراحت نہیں رہتی۔ اور دیہات میں دو فصلوں میں غلہ دینے کا ذکر ہوتا ہے، پھر رمضان میں ایک موٹی رقم دینے کا عرف ودستور ہوتا ہے، ان سب صورتوں میں رمضان کی اضافہ شدہ رقم امام کی سالانہ آمدنی اور تنخواہ میں شامل ہوتی ہے، اسی وجہ سے اگر رمضان میں کوئی دوسرا حافظ تراویح میں قرآن سناتا ہو تب بھی مستقل امام کو رمضان میں الگ سے اضافی رقم ملتی ہے، اس لئے اگر مستقل امام تراویح میں قرآن سنائے اس کے بعد زائد رقم اس کو مل جائے تو قرآن سنانے کی اجرت شمار نہیں ہوگی؛ بلکہ سالانہ آمدنی میں شامل ہوجائے گی، اس تفصیل سے سوال نامہ کے ہر گوشہ کا جواب واضح ہوچکا ہے۔

لا تصح الإجارة لأجل الطاعات ...... مثل الإمامة، ويفتى اليوم بصحتها ...... للإمامة. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، كراچی ٦/٥٦، زكريا ٩/٧٦)

أما شرائط الصحة، فمنها: رضا المتعاقدين. (هندية، مطلب أنواع

الإجارة وحكمها وكيفية انعقادها وصفتها، زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤٠)
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/رجب ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۷/۱۴۳۱ھ

تراویح میں امام صاحب کا قرآن پڑھا کر پیسہ لینا

سوال [٦٣٣٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تراویح میں امام صاحب کا قرآن پڑھا کر پیسہ لینا اوراحباب کمیٹی کا چندہ کر کے پیسہ دینا کیسا ہے؟ اورنہ دینے والے یا کم دینے والے احباب کمیٹی پر امام صاحب کا اعتراض کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں مسجد میں اس قدر زیادہ دیتے ہیں، آپ اتنے کم دیتے ہیں، ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ جب کہ دوسرے حفاظ بغیر پیسہ کے بخوشی پڑھانے کے لئے تیار ہیں؟ گزارش ہے کہ ہر ایک سوال کا تفصیل سے جواب لکھیں۔

المستفتی: عبدالرشید خان، نرمل عادل آباد، آندھراپردیش
09059212786

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: تراویح میں ختم قرآن پر پیسہ لینا ناجائز اورحرام ہے، نیز ختم قرآن پر حافظ صاحب کا مانگ کر لینا بھی ناجائز ہے۔ اور یہ کہنا بھی ناجائز ہے کہ دوسری مسجد میں زیادہ مل رہا ہے، اگر وہ قرآن سنانے کی بنیاد پر مل رہا ہے، تو وہ بھی ناجائز ہے۔
(مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۱۵/۲۸۱-۲۸۲)

وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا. [سورة البقرة: ٤١]

قال عليه السلام: اقرؤا القرآن ولا تأكلوا به، ولا تستكثروا به، ولا

تجفوا عنه، ولا تغلوا فيه. (مصنف ابن أبي شيبة، الصلاة، في الرجل يقوم بالناس في رمضان، فيعطى، موسسة علوم القرآن، جديد ٥/ ٢٤٠، رقم: ٧٨٢٥)

من قرأ القرآن يتأكل به الناس جاء يوم القيامة ووجهه عظم ليس عليه لحم.

(شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٣٣، رقم: ٢٦٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۲/۲۷ھ

مستقل امام صاحب کو ختم تراویح کے موقع پر ہدیہ دینا

سوال [۳۳۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ختم قرآن کریم پر اگر سامع کو بغیر کسی معاوضہ کے کچھ ہدیہ یا تحفہ دے دیا جائے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

(۲) اگر مستقل امام کسی حافظ قرآن کا قرآن سن رہا ہے اور بروز ختم قرآن بروقت بغیر کسی معاوضہ کے کچھ ہدیہ اس مستقل امام سامع کو دے دیا جائے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

(۳) نیز یہ مسئلہ بھی زیر غور ہے کہ اگر کوئی مستقل امام ہے اور ہر رمضان کو قرآن کریم سنا رہا ہے، تو اس کو اگر کچھ دے دیا جائے تو کوئی حرج تو نہیں ہے، یہ مسئلہ کہاں تک درست ہے؟ کیا ایسے امام کے لئے بحالت قراءت یا بحالت سماع بغیر کسی معاوضہ کے لینا درست ہے؟

المستفتی: عبدالجلیل خادم جامعہ عربیہ سراج العلوم ٹنڈی کلاں کھرولیا، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) تراویح میں ختم قرآن پر امام یا سامع کو ہدیہ یا تحفہ کے نام سے جو نذرانہ دینا معروف اور مشہور ہے، وہ اجرت کے درجہ میں ہو جاتا ہے؛ اس لئے ناجائز ہے۔

(۲-۳)اور جو مستقل ہمیشہ کے لئے امام ہے،اس کو دینے کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ مستقل امام کو جو دیا جاتا ہے، وہ سال بھر کی تنخواہ کے اندر سالانہ آمدنی شمار ہوتی ہے، قرآن سننے یا سنانے کے متعلق نہیں ہوتی۔ (مستفاد: محمودیہ، قدیم ۷/ ۱۷۱، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۵۷، فتاوی دارالعلوم ۴/ ۲۹۵)

ويمنع القارئ للدنيا والآخذ والمعطي آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٥٦، زكريا ٩/ ٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ شوال ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۰/۲۹ھ

مسجد کے مستقل امام کو تراویح میں نذرانہ دینا

سوال [۳۳۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جو حافظ صاحب تراویح میں قرآن پاک سنا رہے ہیں، وہ مستقل امام بھی ہیں اور تنخواہ بھی لیتے ہیں، کیا ان کو نذرانہ کے طور پر روپیہ یا جوڑا وغیرہ دینا مسجد کے فنڈ سے صحیح ہے یا نہیں؟ اگر مسجد کے فنڈ سے نذرانہ دیا گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ مدلل اور مفصل بیان کیجئے۔

المستفتی: اہل محلہ مسجد قاضی باغ کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر حافظ مسجد کا مستقل اور سال بھر کا پرانا امام ہے اور وہ سلسلۂ امامت کے ساتھ ختم تراویح بھی سناتا ہے، تو رمضان میں ختم تراویح کے موقع پر جو کچھ بھی دیا جائے وہ اس کی سالانہ آمدنی اور تنخواہ میں سمجھا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ امامت بھی کرتا ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں ایسے مستقل امام کو روپیہ یا جوڑا وغیرہ دینا جائز اور درست ہے؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ ختم قرآن کے موقع پر نہ دیا جائے؛

بلکہ اس سے پہلے یا بعد میں دیا جائے؟ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ، قدیم ۱۲/۱۸۰، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۸۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/۷ھ

امام صاحب کا رمضان میں تنخواہ سے زائد اجرت لینا

سوال [۳۳۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو حفاظ کرام مساجد کے مستقل امام ہوتے ہیں اور رمضان المبارک میں قرآن پاک سناتے ہیں، کیا ان کو مسجد کے فنڈ یا عوامی چندہ سے تنخواہ سے زائد روپیہ یا جوڑا وغیرہ دینا ختم قرآن کے موقع پر جائز ہے یا نہیں؟

(۲) تلاوت قرآن کے ختم پر جو قراء حضرات ''صدق اللہ العظیم'' پڑھتے ہیں، کیا اس کا ثبوت کسی حدیث یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد رحمت اللہ در بھنگوی، متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر حافظ مسجد کا مستقل اور سال بھر کا پرانا امام ہے اور وہ سلسلۂ امامت کے ساتھ ختم تراویح بھی سناتا ہے، تو رمضان میں ختم تراویح کے موقع پر جو کچھ بھی دیا جائے وہ اس کی سالانہ آمدنی اور تنخواہ میں سمجھا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ امامت بھی کرتا ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں ایسے مستقل امام کو روپیہ یا جوڑا وغیرہ دینا جائز اور درست ہے؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ ختم قرآن کے موقع پر نہ دیا جائے؛ بلکہ اس سے پہلے یا بعد میں کسی اور موقع پر دیا جائے؟ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ، قدیم ۷/ ۱۷۰، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۶۷)

(۲) تلاوت قرآن سے فراغت پر ''صدق اللہ العظیم'' پڑھنا کسی حدیث سے ثابت نہیں

ہے؛ البتہ امام غزالی نے اپنی کتاب ''احیاء العلوم'' میں تلاوت قرآن سے فراغت کے وقت اس کو پڑھنا آداب تلاوت میں شمار فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

ولیقل عند فراغه من کل سورة ''صدق الله تعالیٰ، وبلغ رسول الله صلی الله علیه وسلم. (إحیاء العلوم ۱/ ۱۵۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ رجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۷/ ۱۴۲۵ھ

رمضان میں امام صاحب کو مقتدی حضرات کا تحفہ تحائف دینا

سوال [۳۳۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آپ کا فتویٰ حافظ قرآن کا تراویح میں اجرت لینے کے بارے میں ''ندائے شاہی'' ستمبر ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں پڑھا، بحمد اللہ بہت ہی تفصیلی اور معلوماتی فتویٰ ہے، اللہ رب العزت آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے- آمین- مگر حافظ امام معین کے بارے میں کچھ باتیں وضاحت طلب ہیں، تاکہ اس پہلو کی تشنگی بھی باقی نہ رہے، جیسا کہ یہ عام ہے مساجد کے ائمہ کے لئے رمضان المبارک میں تعاون کیا جاتا ہے، امام چاہے قرآن سنائے یا نہ سنائے، بہر صورت رمضان المبارک کی ستائیس کو اور کبھی بعد میں مقتدی حضرات خاموش طریقہ سے چندہ کرکے ہدیہ کے نام سے دیتے ہیں۔ اور کبھی عیدی کہہ کر دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ امام کا حق ہے؛ لہٰذا بتائیں کہ حافظ امام معین کا تعاون اس طرح کریں، تو اجرت کے دائرہ میں آتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: ولی محمد عفی عنہ، امام جامعہ ابوبکر صدیق فتح پور، محلّہ بیوپاریان، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حافظ صاحب جو مسجد کے مستقل امام ہیں اور سلسلۂ

امامت کے ساتھ ختم تراویح بھی سناتے ہیں، تو رمضان میں ختم تراویح کے موقع پر جو کچھ بھی دیا جائے وہ ان کی سالانہ آمدنی اور تنخواہ میں سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ امامت بھی کرتے ہیں؛ لہٰذا ایسی صورت میں ایسے مستقل امام کو روپیہ یا جوڑ او غیرہ دینا جائز اور درست ہے۔ یہ اجرت کے دائرہ میں داخل نہیں ہوگا؛ لیکن بہتر صورت یہ ہے کہ ختم قرآن کے موقع پر نہ دیا جائے؛ بلکہ اس سے پہلے یا بعد میں دیا جائے، تاکہ شکوک وشبہات باقی نہ رہیں۔

(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۲/۱۸۰، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۵۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۵/۸/۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۵۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۸/۵ھ

ختم تراویح کے موقع پر حافظ صاحب کے علاوہ امام ومؤذن کو تنخواہ بڑھا کر دینا

سوال [۳۳۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) رمضان شریف میں ختم قرآن کے موقع پر حفاظ کو جو ہدیہ مسجد کی کمیٹی کی جانب سے یا مخصوص افراد سے چندہ کر کے دیا جاتا ہے، اس کا لینا کیسا ہے؟ کیا اس کے جواز کا کوئی حیلہ ہے؟

(۲) رمضان میں ختم قرآن ہی کے موقع پر تراویح سنانے والے حافظ صاحب کے علاوہ مسجد کے امام مؤذن صاحبان اور خادم مسجد کو بھی مقررہ تنخواہ کے علاوہ ہدیہ پیش کیا جاتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر مذکورہ پیسہ لینا کسی طرح جواز کے درجہ میں نہیں آتا تو جو حافظ اس سے قبل چند سالوں سے یہ رقم لیتا رہا ہو، اب وہ اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے، تو اس کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ جب کہ یہ معلوم بھی نہ ہو کہ گذشتہ کئی سالوں سے کس شخص نے کتنا پیسہ دیا تھا، براہ کرم بالتفصیل اس مسئلہ کو جس میں ابتلاء عام ہے واضح فرمائیں۔

المستفتی: مقبول ایاز خان، منڈولی شاہ پور حسن پور، ضلع سلطانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر مسجد کمیٹی کی طرف سے جو رقم دی جاتی ہے، اس کا نہ لینا جائز نہ دینا جائز؛ بلکہ لینے والے اور دینے والے دونوں گنہگار ہوں گے اگرچہ پہلے سے کچھ متعین نہ کیا جائے؛ اس لئے کہ نفس اجرت پہلے سے فریقین کے ذہن میں مرکوز ہوتی ہے؛ لہٰذا ''**المعروف کالمشروط**'' کی وجہ سے یہ بھی جائز نہیں۔

وإن القراءة لشيء من الدنيا لا تجوز، وأن الآخذ والمعطي آثمان؛ لأن ذلک یشبه الاستئجار علی القراءة، ونفس الاستئجار علیها لایجوز، فکذا ما أشبه. (شامي، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصیة بالختمات والتهالیل، کراچی ۲/ ۷۳، زکریا ۲/ ۵۳٤)

(۲) جو شخص پنج گانہ امام ہے اور اس نے پورے سال امامت کا فریضہ ادا کیا ہے، اسی طرح مؤذن و دیگر خدام مسجد کے لئے اگر چندہ کیا جائے اور مصلی بخوشی چندہ دیتے ہوں، تو یہ جائز ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں؛ اس لئے کہ ان حضرات کا قرآن سنانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۴/ ۴۲۷، جدید زکریا ۶/ ۲۵۸، فتاوی محمودیہ، قدیم ۱۰/ ۲۵۵، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۴۷)

(۳) ظاہر بات ہے کہ وہ رقم حافظ صاحب کو مسجد کے کسی ذمہ دار کے ہاتھ سے ملی ہوگی، بس حافظ صاحب وہ رقم مسجد کے ذمہ دار کے حوالہ کردیں، اس سے حافظ کے ذمہ سے اس کا وبال ساقط ہوجائے گا، باقی مصلیوں کو واپس کرنا اس ذمہ دار کی ذمہ داری ہے۔

ویجب رده لو قائما ورد مثله، أو قیمته لو مستهلکا. (شامي، کتاب البیوع، باب الربو، کراچی ۵/ ۱۶۹، زکریا ۷/ ۳۹۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ر رجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۷/ ۱۴۲۰ھ

رمضان میں تراویح سنانے والے مستقل امام کو تنخواہ بڑھا کر دینا

سوال [۳۳۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک شخص مسجد کا امام ہے اور رمضان شریف میں اس نے تراویح میں قرآن شریف بھی سنایا ہے اور اس کی ایک ہزار ماہانہ تنخواہ تھی، اب اس کو جب تنخواہ دی تو بڑھا کر ڈھائی ہزار روپئے دے دی، تو کیا اس صورت میں اس کے لئے یہ روپئے لینا جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) عام طور سے رمضان المبارک کے آخری جمعہ کے اندر الوداع الوداع ضروری سمجھ کر پڑھتے ہیں، تو کیا اس کا پڑھنا قرآن وحدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

المستفتی: نظام الدین متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر غیر حافظ امام کو بھی اسی طرح رمضان المبارک اور عیدین کے موقع پر اضافہ کرکے دیا جاتا ہے، تو اس حافظ کو بھی جو مستقل امام ہے، تنخواہ پر اضافہ کرکے دینا جائز ہے؛ لیکن اگر غیر حافظ مستقل امام کو اضافہ کرکے نہیں دیا جاتا ہے، تو حافظ امام کو بھی دینا جائز نہ ہوگا۔

(۲) رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں خطبہ الوداعی پڑھنا دورِ نبوت، دورِ صحابہ اور ائمہ مجتہدین اور فقہ کسی سے بھی ثابت نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی، زکریا ۱/ ۶۸۵، فتاوی دارالعلوم ۵/ ۵۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۸/ ۴/ ۱۴۱۹ھ

مستقل امام کو ختم تراویح کے موقع پر ڈبل تنخواہ دینا

سوال [۳۳۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: مساجد کے اماموں کو جو رمضان شریف میں تراویح وغیرہ کے ختم پر کچھ لیتے نہ ہوں، اگر یہ امام حضرات رمضان میں اخراجات کے پیش نظر اپنی تنخواہ کا معاملہ دوگنا کرالیں تو کمیٹی اس ماہ میں بڑھا کر دے سکتی ہے یا نہیں؟ اور لینا کیسا ہے؟ اور ”**المعروف کالمشروط**“ کے دائرہ میں آتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد غفران مدرس وخطیب مسجد مدرسہ تعلیم القرآن، شیرکوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مستقل سال بھر کا امام ہے اور وہ رمضان میں تراویح بھی سناتا ہے، پھر عید کے موقع پر اس کی تنخواہ دوگنی کردی جائے یا کم وزیادہ اسے پیسہ دیا جائے، تو وہ سالانہ آمدنی میں شمار ہوگا وہ صرف قرآن سنانے کی بنا پر اجرت شمار نہ ہوگی، نیز جس طرح مدارس کے ملازمین اور اساتذہ کو تعطیل کلاں رمضان میں چھٹی ملتی ہے اور چھٹیوں میں کام کرنے کے نتیجہ میں ڈبل تنخواہ ملتی ہے، اسی طرح مسجد کے اماموں کا بھی حکم ہے؛ لیکن مستقل امام کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو تراویح میں قرآن سنانے کے بعد کم یا زیادہ کچھ رقم دی جائے وہ جائز نہیں، چاہے رمضان میں بعض فرض نماز بھی پڑھا دیتا ہو۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ۲۸، امداد الفتاوی ۱/ ۳۲۲، جدید زکریا ۱/ ۴۸۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۴؍ شعبان ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۰۹)	۱۴۲۹/۸/۱۶ھ

رمضان میں امام کا ڈبل تنخواہ لینا

سوال [۳۳۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی عالم یہ طے کرکے آئے کہ میں رمضان المبارک میں کلام پاک سنوں یا سناؤں گا تو ڈبل تنخواہ لوں گا، اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد ریحان اسرائیلی کالاگڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کوئی عالم یہ طے کرکے آئے کہ رمضان المبارک میں کلام پاک سنوں یا سناؤں گا تو ڈبل تنخواہ لوں گا؟ لفظ ''ڈبل'' تنخواہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے وہاں کا مستقل امام ہے یا مستقل امامت کے لئے شرط لگا رہا ہے۔ اور مستقل امام کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ تعطیل کے زمانہ میں وقت دینے کی بنا پر ڈبل تنخواہ حاصل کرے، جیسا کہ مدارس میں رمضان میں تعطیل کلاں ہوتی ہے اور بغیر کام کئے ماہ رمضان کی تنخواہ ملتی ہے، اب اگر امام اسی طرح ماہ رمضان کی چھٹی میں رہنا چاہتا ہے اور اسے چھٹی کے دنوں کی تنخواہ ملتی ہے، ایسے حالات میں مسجد والے چھٹی کے ایام میں اس کو روکنا چاہیں تو وہ ڈبل تنخواہ کا مطالبہ کرسکتا ہے چاہے وہ قرآن سنائے یا محض پنج گانہ پڑھائے، دونوں صورتوں میں ڈبل تنخواہ کی اجازت ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص مستقل امام نہیں ہے، صرف رمضان میں قرآن سنانے کے لئے آتا ہے، تو اس کے لئے کسی طرح کا کوئی پیسہ لینا قطعاً جائز نہیں ہے۔ اور اگر کسی مسجد میں رمضان کے ایام میں امام کو چھٹی ہی نہیں ملتی ہے، تو اس مسجد میں تقرر کے وقت امام یہ شرط لگا سکتا ہے کہ اگر میں رمضان میں امامت کی غرض سے رکا رہوں گا تو ڈبل تنخواہ لوں گا، چاہے قرآن سنائے یا نہ سنائے، اس طرح کی شرط لگانا جائز ہے، قرآن سنانے یا سننے یا نہ سنانے تینوں صورتوں میں مستقل امام کے لئے شرط لگانا جائز ہے۔

لقوله عليه السلام: والمسلمون على شروطهم. (ترمذي، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية، ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/۱/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۵۰)

مستقل امام کو ملنے والے تراویح کے نذرانہ کی شرعی حیثیت

سوال [۳۳۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: مستقل امام کے بارے میں معلوم کرنا ہے، جو آدمی مستقل کسی مسجد میں امام ہے، سات آٹھ سال سے اور وہ حافظ بھی ہے اور ہر سال سناتا بھی ہے۔ اور ختم پر لوگ اس کو دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ تم تو مستقل امام ہو تم ایک عرصہ سے ہمارے یہاں امامت کررہے ہو اور یہ کہ ہم کچھ دیں یا نہ دیں مستقل امام ہونے کی وجہ سے تم کو تو سنانا ہی ہے، نیز مستقل اماموں کا بھی خیال یہی ہے کہ مستقل امام کے لئے ختم قرآن پر ہدیہ لینا درست ہے، تو اس طرح مستقل امام کا لینا اور مقتدیوں کا دینا درست ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ مستقل امام کے لئے کوئی حیلہ یا گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ محمد عاصم کاظم پوردیوی، بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حافظ مسجد کا مستقل اور قدیم امام ہو اور وہ امامت کے ساتھ ختم تراویح بھی سناتا ہو، تو رمضان میں ختم تراویح کے موقع پر جو کچھ دیا جاتا ہے، اس کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ مستقل امام ختم قرآن کے ذریعہ سے تراویح نہ پڑھائے؛ بلکہ ’’الم ترکیف‘‘ سے پڑھائے تب بھی ختم تراویح کے دن یا اس سے آگے پیچھے امام کو کچھ دیا جاتا ہو اور امام بھی اپنا حق سمجھتا ہو اور مقتدی و ذمہ داران بھی اپنا فرض سمجھتے ہوں، کہ یہ امام کی سالانہ آمدنی ہے، تو ایسی صورت میں اگر اسی امام نے ختم قرآن کے ذریعہ تراویح پڑھائی ہو تو اس کو ختم قرآن کے موقع پر دینا درحقیقت ختم قرآن کی اجرت نہیں ہے؛ بلکہ امام کی سالانہ آمدنی کا جزو ہے، لہٰذا اس کا دینا لینا دونوں جائز ہے؛ لیکن یہ چیزیں ختم قرآن کے دن دینا شکوک وشبہات پیدا کرنے والی ہیں، اس لئے اگر مستقل امام کو دینا ہے، تو ختم قرآن کے دن نہ دیں؛ بلکہ چند دن پہلے یا اس کے بعد دے دیں، نیز ختم قرآن کے موقع پر دینے سے بہت سے لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ ختم ہی کی اجرت ہے۔ اور اگر امام ختم قرآن کے ذریعہ تراویح نہ پڑھائے؛ بلکہ ’’الم ترکیف‘‘ سے پڑھادے اور امام کو اس صورت میں کچھ نہ دیا جاتا ہو اور نہ ہی امام اپنا کچھ حق سمجھتا ہو اور نہ ہی مقتدی و دیگر ذمہ داران اپنا فرض سمجھتے ہوں کہ امام

کو کچھ دینا چاہئے، تو ایسی صورت میں ختم قرآن کے موقع پر مستقل امام کے لئے بھی کچھ لینا جائز نہ ہوگا اور اس کا تجزیہ اپنے اپنے علاقہ کے لوگ خود کرلیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۷/ ۱۷۰، جدید ڈابھیل ۷/۱ ۵ ۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍شعبان ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۵۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۸/۵ھ

تنخواہ میں اضافہ کرکے اجرت علی التراویح کا حیلہ

سوال [۳۳۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عام دستور سے زائد ایک ماہ کی بڑی تنخواہ طے کرکے قرآن سنایا جائے تو کیا اس طرح درست ہوگا، برائے کرم جواب باصواب سے مشکور فرمائیں۔

المستفتی: عبدالرحیم بڑیڈوی عفی عنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تراویح میں قرآن سنانے کی اجرت کا جو حیلہ سوال نامہ میں ذکر کیا گیا ہے، یہ محض نام کا حیلہ ہے، حقیقت میں قرآن سنانے کی اجرت ہے؛ اس لئے شرعاً نہ ایسا حیلہ جائز ہے اور نہ ہی تنخواہ کے نام سے قرآن سنانے کی اجرت دینا جائز ہے؛ بلکہ یہ شکل ”وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا“ [سورة البقرة: ٤١] کی وعید میں داخل ہوکر جائز نہیں ہوگی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۶۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲ھ

۲۶/ باب صلاة المسافر

کسی کی اقتداء میں نماز کے لئے سفر کی ممانعت اور حصولِ علم وحصول فیض کے لئے اجازت

سوال [۳۳۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی بڑی شخصیت کی اقتداء میں نماز پڑھنے کے لئے مسافت سفر طے کرنا جائز ہے یانہیں؟

المستفتي: محمد یعقوب غازی آبادی، متعلم شعبہ افتاء مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نیک اور بڑے لوگوں کی اقتداء میں نماز پڑھنے کے لئے سفر شرعی طے کرنا کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے؛ البتہ صالحین کی زیارت اور ان کی صحبت اختیار کرنے اور ان سے دین سیکھنے اور ان سے حصول علم کے لئے اور ان سے فیض حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا جائز اور حدیث سے ثابت ہے۔

عن البراء –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ الصلاة خلف رجل ورع مقبولة والهدية إلى رجل ورع مقبولة والجلوس مع رجل ورع من العبادة والمذاكرة معه صدقة. (جامع الأحاديث ٦/ ١١٣، رقم: ١٣٧٦٥)

أما قصد غير المساجد من الراحلة في طلب العلم، وزيارة الصالحين، والإخوان، والتجارة، والتنزه ونحو ذلک، فليس داخلا فيه.

(إعلاء السنن، کراچی ٥/ ١٥٠، دارالکتب العلمية بيروت ٥/ ٢٠٥)

عن عائشة –رضي الله عنها– أنها كانت تقول المتقون سادة العلماء، والفقهاء، وقادة أخذ عليهم أداء مواثيق العلم، والجلوس إليهم بركة، والنظر إليهم نور. (كنز العمال ٢/ ٤٢، رقم: ٥٦٥٠)

رحل جابر بن عبدالله مسيرة شهر إلى عبدالله بن أنيس في حديث

واحد. (بخاري شريف، كتاب العلم تحت ترجمة الباب الخروج في طلب العلم ۱/ ۱۷)

عن أبي أمامة قال: قال رسول الله ﷺ: إن لقمان قال لابنه: يا بني! عليک بمجالس العلماء، واستمع كلام الحكماء، فإن الله يحيى القلب الميت بنور الحكمة كما يحي الأرض الميتة بوابل المطر. (المعجم الكبير للطبراني، داراحياء التراث العربي ۸/ ۱۹۹، رقم: ۷۸۱۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۶۱)

دہلی کی جامع مسجد میں جمعۃ الوداع پڑھنے کے لئے سفر کی ممانعت

سوال [۳۳۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رمضان کے آخری جمعہ کو دور دراز سے لوگ دہلی کی جامع مسجد میں الوداعی جمعہ پڑھنے کے لئے جاتے ہیں، کیا بڑے شہروں کی جامع مسجد کے لئے دوسرے اضلاع سے سفر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتي: محمد نعمان ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: رمضان المبارک کے آخری جمعہ پڑھنے یا کوئی اور نماز پڑھنے کے لئے دور دراز کا سفر کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ صرف تین مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لئے دور دراز کا سفر کرنا مشروع ہے: (۱) مسجد حرام (۲) مسجد نبوی (۳) مسجد اقصیٰ، ان کے علاوہ باقی کسی بھی مسجد میں نماز کے لئے مسافت سفر طے کرنا مشروع نہیں ہے۔

عن شهر بن حوشب قال: سمعت أبا سعيد وذكرت عنده الصلاة في الطور، فقال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا ينبغي للمصلي أن يشد

رحاله إلى مسجد تبتغي فيه الصلاة غير المسجد الحرام، والمسجد الأقصى، ومسجدي. (مسند أحمد ۳/ ٦٣، رقم: ١١٦١٥)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد: المسجد الحرام، ومسجد الرسول، ومسجد الأقصى. (بخاري شريف، كتاب فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة ١/ ١٥٨، رقم: ١١٧٦، ف: ١١٨٩، ترمذي شريف، كتاب الصلاة، باب ماجاء في أي المساجد أفضل، النسخة الهندية ١/ ٧٥، دارالسلام، رقم: ٣٢٦)

لا ينبغي للمطي أن تشد رحاله إلى مسجد يبتغي فيه الصلاة ...... فإنه صريح في النهي عن ابتغاء الصلاة، فيما سوى المسجد الحرام وقرينيه، فالمراد بالمسجد موضع الصلاة ...... فإن النهي عن السفر إلى مسجد للصلاة غير الثلاثة. (إعلاء السنن كراچی ٥/ ١٥٠، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٣٠٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۲/۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۵۴/۴۰)

محض ارادہ سے آدمی مسافر نہیں ہوتا

سوال [۳۳۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی کسی جگہ پر اقامت کی نیت سے ٹھہرا ہے؛ لیکن دو تین روز کے بعد ہی اسے گھر واپسی کی ضرورت پیش آگئی، تو اب اگر وہ نیت رجوع کے بعد از خود وہیں پر ظہر کی نماز ادا کرنے لگے، تو کیا اس میں قصر ہوگا؟

المستفتي: محمد راشد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مسافر شرعی اقامت کی نیت سے کسی جگہ ٹھہرا ہوا ہے، پھر دو تین دن کے بعد وہاں سے واپسی کا ارادہ ہے، تو محض ارادہ اور نیت کی وجہ سے مسافر نہیں بنے گا اور نہ ہی قصر کرے گا؛ بلکہ عملی طور پر جب وہاں کی آبادی سے باہر نکل کر سفر شروع کرے گا تب نمازوں کا قصر کرے گا۔

أنس بن مالک یقول: صلیت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم الظهر بالمدينة أربعا، وصليت معه العصر بذى الحليفة ركعتين. (صحیح مسلم، الصلاة، باب صلاة المسافرين وقصرها، النسخة الهندية ١/ ٢٤٢، بيت الأفكار، رقم: ٦٩٠)

والأصل أن النية متى تجردت عن العمل لا تكون مؤثرة، فإذا نوى الإقامة في موضع الإقامة فقد اقترنت النية بعمل الإقامة، فصار مقيما، وإذا نوى السفر فقد تجردت النية عن العمل ما لم يخرج فلا يصير مسافرا.

(المبسوط، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٢٣٩)

قاصدا ...... مسيرة ثلاثة أيام (قال الشامي:) أشار به مع قوله ''خرج'' إلى أنه لو خرج ولم يقصد أو قصد ولم يخرج لا يكون مسافرا. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۲۲، زكريا ۲/ ۶۰۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲/۵/۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۳۶)	۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ

محض نیت سفر کی وجہ سے وطن اقامت باطل ہوگا یا نہیں؟

سوال [۳۳۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وطن اقامت صرف سفر کی نیت کرنے سے باطل ہوگا کہ نہیں، مثلاً ایک آدمی کسی مدرسہ میں پڑھاتا ہے اور وہ سفر کی نیت کرتا ہے کہ میں تین دن کے بعد جاؤں گا، تو کیا اب وہ مدرسہ میں تین دن مسافر شمار ہوگا اور قصر کرے گا یا جب مدرسہ سے نکل جائے گا تب مسافر مانا

جائے گا؟ کتب حدیث کے حوالہ کے ساتھ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتي: عرفان احمد قاسمی گونڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس وقت مدرسہ میں حاضر ہورہا ہے، اگر اس وقت پندرہ روز قیام کا ارادہ کیا ہے اور اس کے بعد بحالت قیام پندرہ روز سے قبل دوبارہ سفر کا ارادہ کرتا ہے، تو محض ارادہ کی وجہ سے قصر نہیں کرے گا؛ بلکہ وہاں کی آبادی سے باہر نکلنے کے بعد ہی قصر لازم ہوگی۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– أنه كان يقصر الصلاة حين يخرج من بيوت المدينة، ويقصر إذا رجع حتى يدخل بيوتها. (مصنف عبدالرزاق، باب المسافر متى يقصر إذا خرج مسافرا، المجلس العلمي ٢/ ٥٣٠، رقم: ٤٣٢٣)

ولا يصير مسافرا بالنية حتى يخرج. (هندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ١٣٩، جديد ١/ ١٩٩)

لا يصير الشخص مسافرا بمجرد نية السفر، بل يشترط معه الخروج. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل ٢٢/ صلاة السفر، زكريا ٢/ ٤٩٣، رقم: ٣٠٩٣)

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه– قال: صليت الظهر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم أربعا، والعصر بذى الحليفة ركعتين. (صحيح البخاري، كتاب تقصير الصلاة، باب يقصر إذا خرج من موضعه، النسخة الهندية ١/ ١٤٨، رقم: ١٠٧٨، ف: ١٠٨٩، صحيح مسلم، الصلاة، باب صلاة المسافرين وقصرها، النسخة الهندية ١/ ٢٤٢، بيت الأفكار، رقم: ٦٩٠)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذیقعدہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۱۱/۱۴۱۱ھ

معصیت کے ارادہ سے سفر کرنا بھی موجب تخفیف ہے

سوال [۳۳۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی کسی گناہ کے کام سے سفر شرعی کا ارادہ کرتا ہے، مثلاً کوئی چور یا ڈاکو ہے اور وہ ڈیڑھ سوکلومیٹر دور چوری کے لئے سفر کرتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ دوران سفر وہ نمازیں مکمل پڑھے گا یا قصر کرے گا؟

المستفتي: ذاکراللہ آندھراپردیش

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سفر کرنا ہر مسافر کے لئے موجب تخفیف ہے؛ لہٰذا گناہ کے ارادہ سے سفر گرچہ شریعت میں ممنوع وناجائز ہے، مگر اس کے باوجود جب سفر شرعی کا تحقق ہوجائے تو ایسی صورت میں اس پر نمازوں کی قصر ہی لازم ہے، اس کے لئے اتمام کرنا جائز نہ ہوگا۔ دلائل ملاحظہ فرمایئے:

ولو كان عاصيا بسفره؛ لأن القبح المجاور لا يعدم المشروعية.

(شامي مع الدر المختار، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٦٠٤، كراچی ٢/ ١٢٤، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، دارالكتاب ديوبند ٤٢٢-٤٢٣)

وصرح الحنفية بأن السفر الذي يكون الغرض منه فعلا هو معصية كسفر البغاة، وقطاع الطريق لا يمنع الرخصة؛ لإطلاق النصوص.

(الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٨/ ٢١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف رجسٹر خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۱)

یکبارگی مسافت سفر کا ارادہ کرنا قصر کے لئے لازم

سوال [۳۳۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنے گھر سے ۲۰؍کلومیٹر کی مسافت پر جانے کے ارادہ سے نکلا اور ظاہر ہے کہ وہاں قصر نہیں کرے گا، اب وہاں ایک رات گزارنے کے بعد پھر مزید ۴۰؍کلومیٹر آگے جانے کا ارادہ ہوا، تو اب وہ کل ملاکر ۶۰؍کلومیٹر کے فاصلہ پر ہوگیا، اب وہاں ایک دن قیام کرکے اس کے ذہن میں آیا مثلاً گڑھ میں ہے، پھر اس کا ہاپوڑ جانے کا ارادہ ہوا اور مرادآباد سے ہاپوڑ سوکلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، جس کے مسافت سفر ہونے پر کسی کا اختلاف نہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ وہ گڑھ سے ہاپوڑ پہنچنے تک قصر کرلے گا یا اتمام کرے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص اپنے گھر سے ۲۰؍کلومیٹر کی مسافت پر نکلے، پھر وہاں رات گزارنے کے بعد مزید ۴۰؍کلومیٹر کی مسافت پر نکلے، پھر وہاں سے مزید ۴۰؍کلو میٹر کی مسافت پر نکلے، تو ایسی صورت میں اگرچہ یہ شخص اپنے وطن سے ۱۰۰؍کلومیٹر کی دوری پر ہے، جو کہ بالاتفاق مسافت شرعی ہے؛ لیکن پھر بھی وہ قصر نہیں کرے گا؛ بلکہ اتمام ہی کرنا اس پر لازم ہے؛ اس لئے کہ قصر کے لئے یکبارگی مسافت سفر طے کرنے کا قصد نہیں کیا؛ اس لئے اس شخص پر اتمام کرنا لازم ہوگا، قصر جائز نہ ہوگی۔

وأما الثاني: فهو أن يقصد مسيرة ثلاثة أيام، فلو طاف الدنيا من غير قصد إلى قطع مسيرة ثلاثة أيام لا يترخص. (البحر الرائق، باب صلاة المسافر، کوئٹه ۲/ ۱۲۸، زکریا مکتبه دارالکتاب ۲/ ۲۲۶)

فإن لم يقصد موضعا وطاف الدنيا من غير قصد إلى قطع مسيرة ثلاثة أيام لا يترخص بالقصر. (الفقه الإسلامي وأدلته، صلاة المسافر الموضوع الأول المسافة التي يجوز فيها القصر، هدی انٹر نیشنل دیوبند ۲/ ۲۸۷)

ولا بد للمسافر من قصد مسافة مقدرة بثلاثة أيام حتى يترخص برخصة المسافرين وإلا لا يترخص أبدا. (تبيين الحقائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، إمداديه ملتان ١/ ٢٠٩، زكريا ١/ ٥٠٧)

فإنه إذا كان يسير مرحلة جميع الدنيا ولا ينوي سفرا لا يصير مسافرا. (الفتاوى التاتارخانية، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ٢/ ٤٩٦، رقم: ٣١٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۱/۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۳۶۸/۴۰)

مسافر ومقیم شرعاً کب ہوتے ہیں؟

سوال [۳۳۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) الف: آدمی اپنے گاؤں اور بستی سے نکلتے ہی مسافر ہو جاتا ہے یا اپنے شہر سے نکلنے کے بعد مسافر ہوتا ہے؟

(۲) ب: اگر شہر گاؤں سے بہت دور ہو تو گاؤں سے نکلتے ہی مسافر ہو گا یا شہر سے نکلنے کے بعد مثلاً گاؤں سے تیس کلومیٹر کی دوری پر شہر واقع ہے، تو مسافر گاؤں سے نکلنے کے بعد مانا جائے گا یا شہر سے نکلنے کے بعد؟

(۳) سفر سے واپسی میں آدمی مقیم کب ہوتا ہے اپنے گاؤں میں گھسنے کے بعد مقیم بن جاتا ہے یا شہر میں داخل ہونے کے بعد؟ بسا اوقات شہر گاؤں سے بہت دور ہوتا ہے، تو اس صورت میں مقیم کہاں بنے گا؟

المستفتي: شمشاد حسین نواب پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) الف، ب (۲) سفر شرعی کی نیت سے اپنے گاؤں

سے باہر نکلتے ہی قصر کا حکم لگ جاتا ہے، شہر سے تجاوز کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس میں شہر کا کوئی تعلق نہیں؛ بلکہ صرف اپنی بستی اور آبادی ہی کا اعتبار ہوتا ہے؛ لہٰذا واپسی میں بھی شہر میں پہنچنے سے قصر کا حکم ختم نہ ہوگا، جب تک کہ اپنی بستی کی آبادی میں داخل نہ ہو جائے۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– أنه كان يقصر الصلاة حين يخرج من بيوت المدينة، ويقصر إذا رجع حتى يدخل بيوتها. (مصنف عبدالرزاق، باب المسافر متى يقصر إذا خرج مسافرا؟ المجلس العلمي ۲/ ۵۳۰، رقم: ۴۳۲۳)

عن أبي حرب بن أبي الأسود الديلمي أن عليا لما خرج إلى البصرة رأى خصا، فقال: لو لا هذا الخص لصلينا ركعتين، فقلت: ما خصا؟ قال: بيت من قصب. (مصنف عبدالرزاق، باب المسافر متى يقصر إذا خرج مسافرا؟ المجلس العلمي ۲/ ۵۲۹، رقم: ۴۳۱۹)

من خرج من عمارة موضع إقامته قاصدا. (تنوير الأبصار، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۲۱، زكريا ۲/ ۵۹۹)

وكذا إذا عاد من سفره إلى مصر لم يتم حتى يدخل العمران. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ۲/ ۲۲۶، کوئٹہ ۲/ ۱۲۸، كبيري صلاة المسافر، أشرفيه ۵۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ رجب ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۹۹)

مسافت شرعی کی مقدار

سوال [۳۳۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سفر شرعی کی مقدار جس پر مسافر کے اوپر قصر کا حکم عائد ہوتا ہے، میلوں کے اعتبار سے تو ۴۸؍

میل ہے، اب میل اور فرلانگ کا حساب تو ختم ہوگیا، کلومیٹر سے مسافت کا حساب لگایا جاتا ہے، تو فرمائیں اب کتنے کلومیٹر شرعی سفر کی مسافت ہے؟ اور میل اور کلومیٹر میں کتنا فرق ہے؟

المستفتي: محمد عباس ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شرعی ۴۸/میل کی مسافت کلومیٹر کے حساب سے ۸۷/ کلومیٹر ۸۲/ ۷/میٹر ۴۰/سینٹی میٹر ہے۔ میل اور کلومیٹر میں ۶۰۹/میٹر ۳۴/سینٹی میٹر ۴/ملی میٹر کا فرق ہے؛ کیوں کہ ایک کلومیٹر ایک ہزار میٹر کا ہوتا ہے، مگر فقہاء نے جو مسافت لکھی ہے اس میں سب سے مختصر مسافت ۴۵/میل شرعی ہے اور اس کی مقدار کلومیٹر کے حساب سے ۸۲/کلومیٹر ۲۹۶/میٹر ہے کہ اس سے کم کی مسافت میں قصر نہیں کرنا چاہئے اور اتنی مسافت سے قصر کا حکم شروع ہوجاتا ہے؛ لہٰذا آج کل کے زمانہ میں کلومیٹر کے حساب سے ۸۲/کلو میٹر ۲۹۶/میٹر پر ہی سفر شرعی کا حکم جاری ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ۶۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/۱/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۵۹۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱/۱۴۲۰ھ

مسافت سفر میں ۴۵ یا ۴۸/میل شرعی کا اعتبار

سوال [۳۳۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسافت سفر کی مقدار کیا ہے؟ حدیث وفقہ کی معتبر کتابوں کے حوالہ سے جواب تحریر فرما دیں، یہاں کچھ لوگ ساڑھے ستتر کلومیٹر کہتے ہیں۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ ۸۲/کلومیٹر سے کم مسافت پر قصر مشروع نہیں، آنجناب واضح فرمادیں، تاکہ اطمینان ہوجائے۔

المستفتي: عبد اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافت سفر کی مقدار سے متعلق مختصر وضاحت یہ ہے کہ حدیث شریف میں تین منزل کو مسافت سفر قرار دیا گیا ہے؛ لیکن تین منزل کی مقدار کو عامۃ المسلمین خود متعین نہیں کر سکتے؛ اس لئے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین کرام اور فقہائے متأخرین نے مسافت سفر کی جو مقدار متعین فرمائی ہے، اس کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

اور مسافت کی مقدار کے بارے میں صحابہ سے لے کر متأخرین فقہاء تک ۴/ اقوال ہمارے سامنے آتے ہیں:

(۱) ۱۵/ فرسخ۔ اور ایک فرسخ میں ۳/ میل شرعی ہوتے ہیں؛ لہٰذا ۱۵/ فرسخ میں ۴۵/ میل شرعی ہوں گے۔

(۲) ۱۶/ فرسخ، جس میں ۴۸/ میل شرعی ہوتے ہیں۔

(۳) ۱۸/ فرسخ، جس میں ۵۴/ میل شرعی ہوتے ہیں۔

(۴) ۲۱/ فرسخ، جس میں ۶۳/ میل شرعی ہوتے ہیں۔

یاد رہے کہ ایک شرعی میل میں ۲۰۰۰/ گز یعنی ایک کلومیٹر ۸۲۸/ میٹر ۸۰/ سینٹی میٹر ہوتے ہیں، اس حساب سے ۴۵/ شرعی میل ۸۲/ کلومیٹر ۲۹۶/ میٹر ہوتے ہیں، یہ مذکورہ چاروں اقوال میں سے سب سے کم مسافت والا قول ہے۔

اور ۴۸/ میل شرعی میں ۸۷/ کلومیٹر ۷۸۲/ میٹر ۴۰/ سینٹی میٹر ہوتے ہیں، یعنی تقریباً پونے ۸۸/ کلومیٹر۔

اور ۵۴/ میل شرعی میں ۹۸/ کلومیٹر ۷۵۵/ میٹر ۲۰/ سینٹی میٹر ہوتے ہیں، یعنی تقریباً پونے ۹۹/ کلومیٹر۔

اور ۶۳/ شرعی میل میں ۱۱۵/ کلومیٹر ۲۱۴/ میٹر ۴۰/ سینٹی میٹر ہوتے ہیں۔

اب اس تفصیل کے بعد اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ شریعت میں شرعی میل کا اعتبار ہوتا ہے، انگریزی میل کا اعتبار نہیں ہے، ہمارے بعض بزرگوں نے ۴۸/ میل انگریزی کا

اعتبار فرمایا ہے، جس میں ۷۷/کلومیٹر ۲۴۸/میٹر ۵۱/سینٹی میٹر ہوتے ہیں، اسلاف سے یہ قول منقول نہیں ہے، حضرات اسلاف اور فقہاء سے جو چار اقوال منقول ہیں، جن کو ہم نے اوپر ذکر کردیا ہے، اس میں سب سے کم مسافت والا قول ۸۲/کلومیٹر ۲۹۶/میٹر والا قول ہے؛ اس لئے اس سے کم مسافت میں نمازوں کا قصر کرنا ہم صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ اور احتیاط اس میں ہے کہ ۴۸/میل شرعی یعنی ۸۷/کلومیٹر ۸۲/۷میٹر ۴۰/سینٹی میٹر سے کم مسافت میں قصر نہ کریں۔ اور یہ مسئلہ بھی سب کو معلوم ہے کہ مسئلہ قصر واتمام میں جب اختلاف ہوجائے تو اتمام کو ترجیح ہوتی ہے؛ اس لئے ۷۷/کلومیٹر والے قول پر ہم عمل کو درست نہیں سمجھتے، اب اس تفصیل کے بعد عربی عبارتوں کے ساتھ مأخذ ملاحظہ فرمایئے:

(۱) **كان ابن عمر وابن عباس يقصران ويفطران في أربعة برد، وهو ستة عشر فرسخا.** (بخاري، أبواب تقصير الصلاة ١/ ١٤٧)

(۲) **عن نافع عن سالم أن ابن عمر –رضي الله عنه– خرج إلى أرض له بذات النصب فقصر، وهي ستة عشر فرسخا.** (المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن ٥/ ٣٥٧، رقم: ٨٢٢٠)

(۳) **عن ابن أبي رباح قال: قلت لابن عباس: أقصر إلى عرفة؟ فقال: لا، قلت: أقصر إلى مز؟ فقال: لا، قلت أقصر إلى الطائف وإلى عسفان؟ قال: نعم، وذلک ثمانية وأربعون ميلا، وعقد بيده.** (المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن ٥/ ٣٥٨، رقم: ٨٢٢٢)

(٤) **لكن جمهور الفقهاء قدروها باعتبار المكان بأربعة برد، وهو ثمانية وأربعون ميلا استنادا إلى بعض الآثار.** (الموسوعة الفقهية الكويتية، ٣٦/ ٣٤٧)

(٥) **وفي النهاية الفتویٰ علی اعتبار ثمانية عشر فرسخا، وفي المجتبی فتوی أكثر أئمة خوارزم علی خمسة عشر فرسخا.** (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، كوئٹه ٢/ ١٢٩، زكريا ٢/ ٢٢٨)

(٦) **ثم اختلفوا فقيل: أحد وعشرون فرسخا، وقيل: ثمانية عشر، وقيل: خمسة عشر، والفتوى على الثاني؛ لأنه الأوسط، وفي المجتبى: فتوى أئمة خوارزم على الثالث.** (شامي، باب صلاة المسافر، كراچی ١/ ١٢٣، زكريا ٢/ ٦٠٢، مجمع الأنهر،باب صلاة المسافر، مكتبه فقيه الأمت ديوبند ١/ ٢٣٩، فتح القدير، باب صلاة المسافر، كوئٹه ٢/ ٤، زكريا و أشرفيه ديوبند ٢/ ٢٩، بدائع الصنائع، باب المسافر، فصل فيما يصير به المقيم مسافرا، قديم ١/ ٩٣، زكريا ١/ ٢٦١)

(٧) **ومنهم من قدره بثلاث مراحل، وقال مالك: أربعة برد، كل برد إثنا عشر ميلا.** (بدائع الصنائع زكريا ١/ ٢٦١، قديم كراچی ١/ ٩٣) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۵)

شرعی مسافت سفر کی تعیین سے متعلق ایک تحقیقی جائزہ

سوال [۳۳۲٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسائل کی کتابوں کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ۴۸؍میل یا ۷۲؍کلو میٹر سفر کرنے کے ارادے سے نکلے، تو اس پر سفر کے احکام جاری ہوں گے؛ لیکن سننے میں آیا کہ آپ کی تحقیق یہ ہے کہ ۸۱؍کلو میٹر سے زیادہ سفر کرنے کے ارادہ سے نکلے تو اس پر احکام سفر جاری ہوں گے، یہ خبر کس حد تک صحیح ہے؟

المستفتي: مطیع اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نصوص اور فقہاء کی عبارات سے یہ بات واضح ہے کہ

شرعی مسافت تین منزل پر ہوتی ہے؛ لیکن تین منزل میں کتنے میل اور کتنے کلومیٹر ہوتے ہیں، اس کا تعین نصوص سے ثابت نہیں؛ بلکہ حضرات فقہاء کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے، بعض فقہاء نے ۲۱ ر فرسخ، بعض نے ۱۸ ر فرسخ اور بعض فقہاء نے ۱۵ ر فرسخ کی مسافت بتلائی ہے۔ اور ایک فرسخ میں تین شرعی میل ہوتے ہیں۔ اور بعض اکابر کی کتابوں میں ۱۶ ر فرسخ کی بات بھی ملتی ہے، تو کل یہ چار اقوال ہو گئے۔

۲۱ فرسخ = ۶۳ میل شرعی = ۱۱۵ کلومیٹر ۲۱۴ میٹر ۴۰ سینٹی میٹر ہوتے ہیں۔
۱۸ فرسخ = ۵۴ میل شرعی = ۹۸ کلومیٹر ۷۵۵ میٹر ۲۰ سینٹی میٹر ہوتے ہیں۔
۱۶ فرسخ = ۴۸ میل شرعی = ۸۷ کلومیٹر ۷۸۲ میٹر ۴۰ سینٹی میٹر ہوتے ہیں۔
۱۵ فرسخ = ۴۵ میل شرعی = ۸۲ کلومیٹر ۲۹۶ میٹر ہوتے ہیں۔

اب ان فقہاء کے چاروں اقوال میں سے قول نمبر: ۲ کو بعض فقہاء نے مفتی بہ بتلایا ہے اور ائمہ خوارزم نے قول نمبر ۴ یعنی ۱۵ ر فرسخ کی بات کو مفتی بہ اور راجح قرار دیا ہے، بہر حال ان چاروں اقوال میں سے سب سے کم مسافت کا قول پندرہ فرسخ کا ہے جو کہ کلومیٹر کے اعتبار سے ۸۲ ر کلومیٹر ۲۹۶، میٹر ہوتے ہیں۔ اور ہم پر ایسے مسائل میں حضرات فقہاء کے استنباط کردہ راجح قول پر عمل کرنا لازم ہے۔ اور ۸۲ ر کلومیٹر ۲۹۶ میٹر سے کم مسافت پر قصر کے بارے میں متقدمین اور متأخرین فقہاء میں سے کسی کا کوئی قول ہم کو نہیں ملتا؛ اس لئے ہمیں مجبوراً یہ لکھنا پڑتا ہے کہ ساڑھے ۸۲ ر کلومیٹر سے کم پر قصر کرنا جائز نہ ہوگا۔ اور ۴۸ ر انگریزی میل جس میں ۲۷ ر ۷۷ ر کلومیٹر ہوتے ہیں اس کی کوئی اصل کتب فقہ میں نہیں ملتی، ہاں البتہ بعض ہمارے اکابر نے ایسا بھی لکھا ہے، مگر اس پر فقہاء کی کوئی تائید نہیں ملتی اور اس کی ایک تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''ایضاح المسائل'' میں لکھی ہے، وہاں سے دیکھ سکتے ہیں۔

الفرسخ ثلاثة أميال، والميل أربعة الآف ذراع (إلى قوله) ثم اختلفوا فقيل: أحد وعشرون، وقيل: ثمانية عشر، وقيل: خمسة عشر، والفتوىٰ على الثاني؛ لأنه الأوسط، وفي المجتبى فتوى أئمة خوارزم على الثالث،

وجه الصحيح أن الفراسخ تختلف باختلاف الطريق في السهل، والجبل، والبر، والبحر. (شامي، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۰۲، كراچی ۲/ ۱۲۳، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر زكريا ۲/ ۲۲۸، كوئٹه ۲/ ۱۲۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۱ھ

۴۸ رمیل کتنا کلومیٹر ہے؟

سوال [۳۳۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کے دور میں ۴۸ رمیل سے کتنا کلومیٹر مراد ہے، شرح مظاہر حق جدید ۳/ ۲۶۵ پر ۴۸ رسے ۸۷ کلومیٹر مراد تحریر ہے، جب کہ مفتی عزیز الرحمٰن فتح پوری صاحب نے جن کا فتویٰ انقلاب اخبار میں شائع ہوتا ہے ۷۲ کلومیٹر فرمایا ہے؛ لہٰذا درست جواب کیا ہے؟

المستفتي: عبداللہ حسن پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافت سفر کے بارے میں حدیث شریف میں تین دن کی مسافت آئی ہے اور کتب فقہ کے متون میں بھی تین منزل کی بات منقول ہے۔ اور یہ ایک تخمینی چیز ہے، اس کے سلسلہ میں فقہاء احناف کے چار اقوال ملتے ہیں:

(۱) پندرہ فرسخ (۲) اٹھارہ فرسخ (۳) اکیس فرسخ اور ایک فرسخ میں تین میل شرعی ہوتے ہیں۔ اور چوتھا قول سولہ فرسخ کا بھی ہے۔ اب ان چاروں اقوال کے مطابق کیا مسافت بنتی ہے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) ۱۵ رفرسخ میں ۴۵ رشرعی میل ہوتے ہیں۔ اور ۴۵ رشرعی میل میں ۸۲ رکلومیٹر ۲۹۶، میٹر ہوتے ہیں۔

(۲) ۴۸؍شرعی میل میں ۸۷؍کلومیٹر ۲۸۲ میٹر ۴۰؍سینٹی میٹر ہوتے ہیں۔
(۳) ۵۴؍شرعی میل میں ۹۸؍کلومیٹر ۵۵۷؍میٹر ۲۰؍سینٹی میٹر ہوتے ہیں۔
(۴) ۶۳؍شرعی میل میں ۱۱۵؍کلومیٹر ۲۱۴؍میٹر ۴۰؍سینٹی میٹر ہوتے ہیں۔
حضرات فقہاء احناف کی طرف سے یہی چار اقوال ملتے ہیں، ان میں سے کم سے کم مسافت ۱۵؍فرسخ ہے، جس میں ۴۵؍شرعی میل ہوتے ہیں اور کلومیٹر کے حساب سے ۸۲؍کلومیٹر ۲۹۶ میٹر ہوتے ہیں۔ اور حضرات فقہاء کے ان چاروں اقوال کے پیش نظر ۸۲؍کلومیٹر ۲۹۶؍میٹر سے کم مسافت میں قصر کرنا درست نہ ہوگا۔ اقوال فقہاء ملاحظہ فرمائیں:

ثم اختلفوا فقيل: أحد وعشرون، وقيل: ثمانية عشر، وقيل: خمسة عشر، والفتوىٰ على الثاني؛ لأنه الأوسط، وفي المجتبى فتوى أئمة خوارزم على الثالث. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۰۲، كراچی ۲/ ۱۲۳، هكذا تاتارخانية، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون صلاة السفر، زكريا ۲/ ۴۹۰، رقم: ۳۰۸۶، كوئٹه ۲/ ۲)

اور سوال نامہ میں جو ۷۲؍کلومیٹر یا ۷۸؍کلومیٹر کا قول نقل کیا گیا ہے شرعی میل کے اعتبار سے وہ درست نہیں ہے۔ ۴۸؍شرعی میل کی مسافت پونے ۸۸؍کلومیٹر سے کم نہیں ہوتی ہے؛ البتہ انگریزی میل کے اعتبار سے ۴۸؍میل میں ۷۷؍کلومیٹر ۲۴۸؍میٹر ۵۱؍سینٹی میٹر ۲؍ملی میٹر ہوتے ہیں، یعنی تقریباً سوا ۷۷؍کلومیٹر۔ سوال نامہ میں ۷۲؍کلومیٹر جو لکھا ہے وہ انگریزی میل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اور شریعت میں شرعی میل کا اعتبار ہوتا ہے، انگریزی میل کا نہیں ہوتا؛ اس لئے انگریزی میل کے اعتبار سے سوا ۷۷؍کلومیٹر کا قول جو بعض اکابر نے نقل کیا ہے، وہ فقہاء کے اقوال اور شرعی میل کے اعتبار سے برابر نہیں بیٹھتا؛ اس لئے اس قول پر عمل کرنا ہماری سمجھ میں نہیں آتا، حضرت تھانویؒ نے بھی انگریزوں کے زمانہ میں ۴۸؍انگریزی میل کی بات کہی ہے، مگر وہ فقہاء کے اقوال کے مطابق شرعی میل کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا؛ اس لئے ہم ساڑھے ۸۲؍کلومیٹر سے کم میں نمازوں میں

قصر کرنا درست نہیں سمجھتے، اس کی ایک تفصیل ''ایضاح المسائل/ ۷۰'' پر دیکھی جاسکتی ہے۔
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۱۸)

مسافت سفر سے متعلق ''ایضاح المسائل'' کے مسئلہ پر اعتراض کا جواب

سوال [۳۳۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صد افسوس سے لکھنا پڑھ رہا ہے کہ آج کل جتنے لوگ اردو مسائل لکھتے ہیں ان کا مبلغ علم صرف اردو کتابیں ہیں، نہ عربی کتابیں سمجھ سکتے ہیں اور نہ پڑھ سکتے، اردو کتابیں دیکھ کر عربی کتابوں کا حوالہ دے دیتے ہیں، نہ ان کتابوں کے مقابلہ کی توفیق ہے اور نہ فرصت۔

(۱) آپ نے ''ایضاح المسائل'' میں سفر شرعی کی مسافت پر سیر حاصل تحقیقی بحث کے تحت لکھا ہے کہ مسافت سفر کے بارے میں شامی وغیرہ معتبر کتب فقہ میں چار اقوال نقل کئے گئے ہیں: ۶۳-۵۴-۴۸-۴۵/میل۔

اور شامی کراچی ۲/ ۱۲۳ کا حوالہ دیا ہے، ہمارے یہاں شامی کے مذکورہ صفحہ میں ۴۸/میل کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، آپ اپنی کتاب سے ۴۸/میل والی روایت کی عربی عبارت نقل کردیں گے تو عین نوازش ہوگی؟

(۲) معتبر کتب فتاوی کون کونسی ہیں؟ کیا اکابر کا فتویٰ بھی معتبر کتب فقہ میں شامل ہے؟

(۳) ۴۸/میل مسافت سفر شرعی حنفیہ کی کون سی معتبر کتاب میں لکھا ہے، عربی عبارت سے واضح کریں؟

(۴) مفتی بہ قول کو چھوڑ کر غیر مفتی بہ قول پر فتویٰ دینے کی آپ کو اجازت ہے؟

(۵) پندرہ فرسخ سے شرعی مسافر ہو جائے گا یہ قول کون سی معتبر کتب فقہ میں لکھا ہے؟

(۶) جن حضرات نے ۴۸؍میل انگریزی مانا ہے، ان کی کیا دلیل ہے؟ کیا جب مسافت سفر شرعی متعین کیا جارہا تھا، اس وقت انگریز بھی موجود تھے؟

(۷) اگر غیر مفتی بہ قول پر فتوی دے کر لوگوں کو عمل کرایا جائے تو گناہ کس پر ہوگا؟

(۸) بلاضرورت شدیدہ مذہب غیر پر فتویٰ دینا کیسا ہے؟ اگر کوئی مفتی فتویٰ دے دے تو مستفتی کو عمل کرنا کیسا ہے؟ جب کہ اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ مذہب غیر ہے اور اس کو ضرورت شدیدہ بھی نہ ہو؟ فقط والسلام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آنجناب کی ناصحانہ تحریر بغیر جوابی لفافہ کے موصول ہوئی، یہاں جوابی لفافہ کے بغیر جو تحریر آتی ہے، اس کا جواب نہیں دیا جاتا ہے؛ لیکن پھر بھی مناسب سمجھا گیا کہ چند سطر لکھ دیں، آنجناب کا علمی تبحر کے ساتھ حکم نامہ موصول ہوا، جس کا یہ خاکسار انتہائی مشکور ہے، آنجناب نے اپنی تحریر میں توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ: ”۴۸؍میل والی روایت کی عربی عبارت نقل کر دیں گے، تو عین نوازش ہوگی“ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ احقر نے ”ایضاح المسائل“ کم پڑھے لکھے مسلمانوں کے لئے لکھی تھی، جس میں انتہائی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اور مسافت شرعی کے بارے میں کتب فقہ میں چار اقوال ملتے ہیں: (۱) ۶۳؍میل (۲) ۵۴؍میل (۳) ۴۸؍میل (۴) ۴۵؍میل۔ اور شامی میں چونکہ ۴۸؍میل کے علاوہ دیگر تمام اقوال موجود ہیں؛ اس لئے شامی کا نام لکھا اور ساتھ میں وغیرہ کا لفظ بڑھا دیا؛ کیوں کہ اس مختصر کتاب میں ساری کتب فقہ کے حوالہ لکھنے میں عوام کے لئے خاص فائدہ نہیں ہے اور اس کتاب کے لکھتے وقت یہ توقع بھی نہیں تھی کہ آپ جیسے صاحب علم بھی اس کتاب کو دیکھیں گے، بہر حال آنجناب نے ۴۸؍میل والے قول کی عربی عبارت نقل کرنے کے لئے حکم فرمایا ہے، تو اس سلسلے میں حدیث کی تین کتابوں کے حوالے اور فقہ کی تین کتابوں کے حوالہ ذیل میں درج کر دئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے: حدیث کی تین کتابوں کے حوالے حسب ذیل ہیں:

(۱) بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا عمل درج ذیل ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وكان ابن عمر وابن عباس يقصران ويفطران في أربعة برد، وهو ستة عشر فرسخا. (بخاري شريف، كتاب تقصير الصلاة، تحت ترجمة الباب في كم يقصر الصلاة؟ ١/ ١٤٧)

اور ایک فرسخ میں ۳؍میل شرعی ہوتے ہیں اور سولہ فرسخ میں ۴۸؍میل شرعی ہوتے ہیں۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کا عمل نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

عن سالم أن ابن عمر خرج إلى أرض له بذات النصب، فقصر وهي ستة عشر فرسخا. (المصنف لابن أبي شيبة ٥/ ٣٥٧، ٣٥٨، رقم: ٨٢٢٠)

(۳) سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اہل مکہ! تم چار برید سے کم مسافت میں قصر مت کیا کرو اور مکہ مکرمہ سے عسفان چار برید کے فاصلے پر ہے۔ اور یہی قول فقہ کی مشہور ترین کتاب ''مبسوط سرخسی''میں بھی نقل کیا گیا ہے کہ اولاً امام مالکؒ کا قول نقل کیا گیا کہ مسافت سفر ۴؍ برید ہے اور ہر ایک برید بارہ میل کا ہوتا ہے اور اس پر امام مجاہد اور امام عطاء کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار برید سے کم مسافت میں قصر کرنے سے منع فرمایا۔ ملاحظہ فرمائیے:

عن ابن عباس -رضي الله عنه- أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: يا أهل مكة! لا تقصروا الصلاة في أدنى من أربعة برد من مكة إلى عسفان. (السنن الكبرى للبيهقي، دار الفكر ٤/ ٣٣١، رقم: ٥٥٠٤)

وأقل ما يقصر فيه الصلاة فى السفر إذا قصد مسيرة ثلاثة أيام، وفسره في الجامع الصغير بمشي الأقدام وسير الإبل، فهو الوسط؛ لأن أعجل السير سير البريد، وأبطأ السير سير العجلة، وخير الأمور أوسطها،

وهـذا مذهب ابن عباسؓ وإحدى الروايتين عن ابن عمر رضى الله عنه، وعنه فـي رواية أخـرى التـقدير بيوم وليلة، وهو قول الزهريؒ، والأوزاعيؒ، وقال مالكؒ: أربعة برد كل بريد اثنا عشر ميلا، واستدل بحديث مجاهد وعطاء أن الـنبي صلى الله عليه وسلم قال: يا أهل مكة! لا تقصروا الصلاة فيما دون مـكة إلى عسفان، وذلك أربعة برد. (المبسوط للسرخسي، باب صلاة المسافر، دارالكتب العلمية، بيروت ۱/ ۲۳۵)

اورکتب فقہ کے حوالہ ذیل میں درج ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

(۱) ''**الـفـقـه على المذاهب الأربعة**'' کی عبارت ہے کہ سولہ فرسخ مسافت سفر ہے۔ اورایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے، عبارت ملاحظہ فرمایئے:

مـنهـا أن يـكون السفر مسافة تبلغ ستة عشر فرسخا فقط، والفرسخ ثـلاثة أميـال، والـميـل ستة آلاف ذراع بذراع اليد، وهذه المسافة تساوي ثمانين كيلو ونصف كيلو ومائة وأربعين مترا. (الفقه على المذاهب الأربعة، مباحث قصر الصلاة الرباعية، شروط صحة القصر، دارالكتب العلمية، ودارالفكر بيروت ۱/ ۴۷۲)

(۲) ''مجمع الانہر'' کی عبارت ہے:

وقيـل: الـفتـوى عـلى اعتبار ثمانية عشر فرسخا، وضعفه في البحر، وهـو ستة عشـر فرسخا. (مـجـمـع الأنهـر، كتـاب الـصلاة، باب المسافر، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۳۸، ۲۳۹)

(۳) ''**الـفـقـه الإسلامي وأدلتـه**'' اس میں بھی مسافت سفر میں سولہ فرسخ کا ذکر موجود ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

ويـقـدر بـالـمسـافة ذهـابا بأربعة برد أو ستة عشر فرسخا، أو ثمانية وأربـعيـن ميلا هاشميا. (الـفـقـه الإسـلامـي وأدلتـه، صلاة المسافر، الموضوع الأول المسافة التي يجوز فيها القصر، مطبع هدى انٹر نيشنل ديوبند ۲/ ۲۸۸)

آنجناب نے لکھا ہے کہ معتبر کتب فتاوی کون کون سی ہیں؟ تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ ہمارے علماء کے محاورے میں معتبر کتب فتاوی، فقہ کی ان کتابوں کو کہا جاتا ہے کہ فتویٰ لکھتے وقت جن کتابوں کا حوالہ عام طور پر دیا جاتا ہے، جیسا کہ شامی، مجمع الانہر، بدائع الصنائع، البحر الرائق، فتاوی ہندیہ، فتاوی تاتارخانیہ وغیرہ۔ آنجناب نے یہ بھی پوچھا ہے کہ اکابر کا فتویٰ بھی معتبر کتب فقہ میں شامل ہے؟ اکابر کے فتاوی، فتاوی ہوتے ہیں، کتب فقہ نہیں اور ان کے معتبر فتاوی سے استفادہ کرنا کوئی گناہ نہیں۔ آنجناب نے تیسرا نمبر قائم کر کے پھر سوال کیا ہے کہ ۴۸ر میل مسافت شرعی حنفیہ کی کون سی معتبر کتاب میں لکھا ہے، عربی عبارت سے واضح کریں، اس کے بارے میں اوپر آنجناب کے سامنے تین کتابوں کے حوالے پیش کر دئے گئے ہیں، ''مجمع الانہر'' بھی حنفیہ کی معتبر کتاب ہے۔ اور ''الفقہ علی المذاہب الاربعۃ'' میں حنفیہ کے مذاہب کو بھی واضح طور پر اجاگر کیا گیا ہے، نیز ''مبسوط سرخسی'' بھی حنفیہ کی معتبر کتب فقہ میں سے ہے، اس میں بھی چار برید کا ذکر موجود ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ آنجناب نے نمبر ۴ر پر لکھا ہے کہ مفتی بہ قول کو چھوڑ کر غیر مفتی بہ قول پر فتوی دینے کی آپ کو اجازت ہے؟ یہ بات آنجناب نے سوالیہ طور پر لکھی ہے، تو آنجناب سے گزارش ہے کہ آپ کے نزدیک معتبر مفتی بہ قول کیا ہے؟ حضرات حنفیہ کا تو راجح قول یہی ہے کہ تین منزل مسافت شرعی ہے اور تین منزل کی مقدار کتنی میل ہے اور کتنے کیلو میٹر ہیں، اگر آنجناب کے ذہن میں ہو تو متعین فرمادیں؛ اس لئے کہ صرف تین منزل کہہ دینا عامۃ المسلمین کے لئے کافی نہیں ہے، ہر ایک مسلمان منزل کی مسافت کو متعین نہیں کر سکتا، نیز شامی کی عبارت کو آنجناب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ **والفتوی علی الثاني ؛ لأنه الأوسط، وفي المجتبی : فتوی أئمة خوارزم علی الثالث .**

(شامي، باب صلاة المسافر، کراچی ۲/ ۱۲۳، زکریا ۲/ ۶۰۳، البحر الرائق، کتاب الصلاة، باب المسافر، کوئٹہ ۲/ ۱۲۹، زکریا ۲/ ۲۲۸) کے الفاظ آنجناب کی نظر سے گذرے ہوں گے۔ مفتی بہ قول اس کو کہا جاتا ہے کہ جس قول کے اوپر اس طرح کے الفاظ

فقہاء نے استعمال کئے ہوں، جس میں ''بہ یفتی''، ''وعلیہ الفتوی'' اور ''والفتوی علی ہذا'' وغیرہ ہیں۔ اور آنجناب نے نمبر۵ میں سوال کیا ہے کہ پندرہ فرسخ سے شرعی مسافر ہوجائے گا، یہ قول کون سی معتبر کتب فقہ میں لکھا ہے؟ تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ ''شامی'' اور ''البحرالرائق'' اور ''فتاوی تاتارخانیہ'' وغیرہ میں پندرہ فرسخ کی صراحت موجود ہے۔ اور پندرہ فرسخ میں ۴۵ رمیل شرعی ہوتے ہیں اور ائمہ خوارزم کا فتوی پندرہ فرسخ پر ہی ہے؛ اس لئے اس قول کو بھی مفتی بہ قول کہا جاسکتا ہے، عربی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

ثم اختلفوا، فقيل: أحد وعشرون، وقيل: ثمانية عشر، وقيل: خسمة عشر، والفتوى على الثاني؛ لأنه الأوسط، وفي المجتبى: فتوى أئمة خوارزم على الثالث. (شامي، زكريا ٢/ ٦٠٢، البحرالرائق جديد ٢/ ٢٢٨)

ولم يعتبر بعض مشايخنا الفراسخ، وفي السغناقي: وهو الصحيح، وعامة مشايخنا قدروها بالفراسخ أيضا، واختلفوا فيما بينهم بعضهم قالوا: أحد وعشرون فرسخا، وبعضهم قالوا: ثمانية عشر، وبعضهم قالوا: خمسة عشر. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ٢/ ٤٩٠، رقم: ٣٠٨٦)

آنجناب نے سوال نمبر۶ قائم کرکے سوال فرمایا ہے کہ ۴۸ رمیل انگریزی جن حضرات نے مانا ہے، ان کی کیا دلیل ہے؟ احقر اس سلسلے میں گزارش کرتا ہے کہ جن حضرات نے انگریزی میل مانا ہے، آنجناب انہی سے دلیل مانگئے، ان کی دلیل پیش کرنے کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں اور نہ ہی ۴۸ رمیل انگریزی کو ہم معتبر مانتے ہیں۔ آنجناب نے سوال نمبر۷ قائم کرکے یہ سوال کیا ہے کہ غیر مفتی بہ قول پر فتوی دے کر لوگوں کو عمل کرایا جائے تو گناہ کس پر ہوگا؟ تو ہم نے اپنی معلومات میں غیر مفتی بہ قول پر فتوی نہیں لکھا ہے؛ اس لئے کہ پندرہ فرسخ والے قول پر ائمہ خوارزم کا فتویٰ آنجناب کے سامنے نقل کردیا گیا ہے، ہمارے لئے مسئلہ لکھنے میں متأخرین کے فتاوی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے؛ اس لئے اس میں کوئی

حرج نہیں۔ آنجناب نے سوال نمبر ۸ میں یہ سوال کیا کہ بلا ضرورت شدیدہ مذہب غیر پر فتویٰ دینا کیسا ہے؟ اگر کوئی مفتی فتوی دے دے تو مستفتی کو عمل کرنا کیسا ہے؟ جب کہ اس کو معلوم ہوجائے کہ یہ مذہب غیر ہے اور اس کو ضرورت شدیدہ بھی نہ ہو، یہ آنجناب کی عبارت ہے، اس سلسلے میں بلاضرورت شدیدہ فتویٰ دینے والے مفتی اور مستفتی سے آپ معلوم فرمالیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۶۸)

مسافت شرعی کی مقدار پر تحقیقی فتویٰ

محترم ومکرم حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب زید مجدکم وفیوضکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال [۳۳۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بفضلہ تعالیٰ خیریت ہے۔ آپ کی محقق تالیف ''ایضاح المسائل'' سے استفادہ کا موقع ملا، آنجناب نے شرعی مسافت کے بارے میں صفحہ نمبر ۶۹/ پر تحریر فرمایا ہے (کہ ۸۲/ کلومیٹر ۲۹۶ میٹر سے کم کی مسافت میں قصر نہیں کرنا چاہئے) اس سلسلہ کی ایک مفید اور محقق کتاب ''شرعی مسائل'' آپ کی خدمت میں ارسال ہے، جس میں صاحب کتاب استاذی حضرت مرشد الامت مفتی مہربان علی شاہ بڑوتوی قدس سرہ نے ''مسافت شرعی'' سے متعلق اپنے زمانے کے اہل افتاء کی تائید کے ساتھ ساتھ جمہور علماء کے مسلک کو واضح کیا ہے، اس تحقیق کے بعد صاحب ''احسن الفتاوی'' نے بھی اپنے اس قول سے رجوع فرمایا تھا جو قول آپ نے تحریر فرمایا ہے، جس کا ذکر ''احسن الفتاوی'' جلد۴، ص: ۹۶/ پر ضمیمہ میں موجود ہے، امید ہے کہ جناب والا اس سلسلہ میں نظر ثانی فرمائیں گے۔

نوٹ: ’’شرعی مسافت‘‘ نامی کتاب دو سال قبل اس عریضہ کے ساتھ بھیجی گئی تھی، اگر وہ کسی وجہ سے نہ مل سکی ہو یا ڈاک کی نظر ہوگئی ہو تو مطلع فرما دیں، تاکہ دوبارہ کتاب ارسال کی جاسکے۔

المستفتي: محمد عابد یسع قاسمی، خادم الافتاء والتدریس جامعہ فلاح دارین اسلامیہ، بلاسپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آنجناب نے دو سال پہلے ’’مسافت شرعی‘‘ سے متعلق مفتی مہربان علی مرحوم کی تحریر کے حوالہ سے جو بات لکھی تھی اور اس میں جمہور علماء کا حوالہ دیا گیا تھا، احقر کو مع رسالہ کے موصول ہوچکی تھی، مگر اس کا جواب لکھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا، نیز حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب سے براہ راست احقر کی ملاقات ہوئی اور اسی وقت مفتی مہربان علی صاحبؒ نے جو تحریر مفتی رشید احمد صاحب کے پاس لکھی تھی وہ بھی احقر کو دکھائی گئی اور مفتی رشید احمد صاحب نے احقر کے سامنے ان کی تحریر پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ حضرت تھانویؒ کے ملفوظ اور بہشتی زیور کا حوالہ دیا گیا ہے، اس لئے حضرت تھانویؒ کی تحریر کی بنا پر اپنی تحریر میں کچھ ترمیم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اور اڑتالیس میل انگریزی جو کلومیٹر کے حساب سے ۷۷؍کلومیٹر ۲۴۸؍میٹر ۱۵؍سینٹی میٹر ۲؍ملی میٹر کی مسافت ہے، اس کے بارے میں جمہور علماء کا کوئی قول احقر کو نہیں ملا، نیز شریعت میں شرعی میل کے اعتبار کو چھوڑ کر انگریزی میل کا اعتبار کرنے والے متقدمین یا متأخرین فقہاء کا کوئی قول یا مسلک احقر کی نظر سے نہیں گذرا، ہاں البتہ حضرت تھانویؒ کا قول بہشتی زیور میں اور حضرت کے بعض ملفوظ میں موجود ہے، اب اس تفصیل کے بعد اصل مسئلہ سے متعلق ان فقہاء متأخرین کے اقوال اور فتاوی کی عبارتیں پیش خدمت ہیں، جن پر خود حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ اعتماد فرمایا کرتے تھے، نیز ایسے محدثین کی آراء بھی پیش کی جارہی ہیں جن کو حجت کے درجہ میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی پیش خدمت ہے، جب انگریزی میل اور شرعی میل کا تعارض ہمارے سامنے آئے گا تو ہم انگریزی میل کا اعتبار نہیں کریں گے؛ بلکہ شرعی میل کا اعتبار کریں گے؛ اس لئے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں برید

اور فرسخ کا اعتبار کیا گیا ہے اور ایک برید چار فرسخ کا ہوتا ہے۔ اور ایک فرسخ تین شرعی میل کا ہوتا ہے۔ اور انگریزی میل کا حدیث اور فقہ کی کتابوں میں کہیں سے کہیں تک بھی ذکر نہیں ہے، چنانچہ فقہ کی کتابوں میں اس سلسلے میں عام طور پر تین اقوال ملتے ہیں: ۲۱/فرسخ، ۱۸/ فرسخ، ۱۵/فرسخ۔ کتب فقہ میں ۱۸/فرسخ پر فتوی نقل کیا ہے، جس کے شرعی میل کے حساب سے ۵۴/میل ہوتے ہیں اور کلومیٹر کے حساب سے ۹۸/کلومیٹر ۵۵۷/میٹر ۲۰/سینٹی میٹر ہوتے ہیں۔ اکثر فقہاء متأخرین نے اسی پر فتوی دیا ہے۔ اور ائمہ خوارزم کا فتویٰ ۱۵/فرسخ پر ہے، جس کے ۴۵/شرعی میل ہوتے ہیں اور کلومیٹر کے حساب سے ۸۲/کلومیٹر ۲۹۶/میٹر مسافت سفر بنتی ہے۔ اور اس سے کم مسافت کا کوئی قول کتب فقہ میں احقر کی نظر سے نہیں گذرا؛ اس لئے ''ایضاح المسائل'' میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ ۴۵/میل شرعی یعنی ۸۲/کلومیٹر ۲۹۶/میٹر سے کم مسافت میں قصر نہیں کرنا چاہئے۔ اور ۱۶/فرسخ کی بات کتب فقہ میں وضاحت سے نہیں ملتی؛ لیکن حدیث کی کتابوں میں ۱۶/فرسخ کی بات صاف الفاظ کے ساتھ موجود ہے، جس کے ۴۸/میل شرعی ہوتے ہیں۔ اور کلومیٹر کے حساب سے ۸۷/کلومیٹر ۸۲۷/میٹر ۴۰/سینٹی میٹر ہوتے ہیں، اس قول کے بارے میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ خود فرماتے ہیں کہ میں اسی پر فتویٰ دیتا ہوں؛ اس لئے کہ حدیث کی کتابوں میں یہی منقول ہے، چنانچہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اسی پر متأخرین کا مذہب نقل کیا ہے۔ اور حدیث کی کتابوں میں اس بات کی وضاحت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ چار برید سے کم مسافت میں قصر نہ کیا کرو، جیسا کہ مکہ مکرمہ اور عسفان کے درمیان کی مسافت ہے۔ اور چار برید میں ۱۶/فرسخ ہوتے ہیں۔ اور ۱۶/فرسخ میں ۴۸/میل شرعی ہوتے ہیں۔ اور حضرات فقہاء ومحدثین کے ان تمام دلائل ونظائر کو چھوڑ کر انگریزی میل کا اعتبار کرنا جس کا ثبوت کہیں سے بھی نہیں ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا، نیز حضرات فقہاء نے لکھا ہے کہ جب قصر واتمام کے مسئلہ میں اختلاف اور تعارض ہوجائے تو اتمام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ اور فقہاء ومحدثین سے فی الجملہ چار اقوال منقول ہیں جو آپ کے سامنے پیش کئے جاچکے ہیں، ان سب کو

چھوڑ کر شرعی مسافت کے لئے انگریزی میل کا اعتبار کیسے کیا جاسکتا ہے، اس لئے ہم نے ''ایضاح المسائل'' میں جو لکھا ہے اس کے اوپر ہم کو الحمدللہ بھرپور اعتماد ہے، اب اس کے بعد فقہ وحدیث کی چند عبارتیں ذیل میں نقل کردیتے ہیں، امید ہے کہ ان پر غور فرمائیں گے:

(۱) شامی اور موسوعہ میں اس سلسلے میں یہ عبارت نقل کی گئی ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

ثم اختلفوا فقيل: واحد وعشرون، وقيل: ثمانية عشر، وقيل: خمسة عشر، والفتوى على الثاني؛ لأنه الأوسط. وفي المجتبى: فتوى أئمة خوارزم على الثالث. (الموسوعة الفقهية ۲۵/ ۳۰، شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۲۳، زكريا ۲/ ۶۰۲)

(۲) اور ''حلبی کبیر'' میں یہ مسئلہ ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

قال المرغيناني: وعامة المشايخ قدروها بالفراسخ، فقيل: أحد وعشرون فرسخا، وقيل: ثمانية عشر فرسخا، قال المرغيناني: وعليه الفتوى، وقال العتابي في جوامع الفقه وهو المختار. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، فصل في صلاة المسافر، أشرفيه ديوبند، ص: ۵۳۵، عمدة القاري، كتاب تقصير الصلاة، باب في كم يقصر الصلاة؟ جديد زكريا ۵/ ۳۸۵، قديم بيروت ۷/ ۱۲۵، بناية، كتاب الصلاة، باب المسافر، أشرفيه ديوبند ۳/ ٤)

(۳) ''فتاوی تاتارخانیہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وعامة مشايخنا قدروها بالفراسخ أيضا، واختلفوا فيما بينهم، بعضهم قالوا: أحد وعشرون فرسخا، وبعضهم قالوا: ثمانية عشر، وبعضهم قالوا: خمسة عشر، والفتوى على ثمانية عشر؛ لأنها أوسط الأعداد. وفي الغياثية: وعامتهم قدروا بالفراسخ، واختاروا ثمانية عشر في التقدير لا خمسة عشر؛ لأنه أضبط وأحوط. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، جديد، زكريا ۲/ ٤۹۰، رقم: ۳۰۸٦، قديم ۲/ ۲)

(۴) ''فیض الباری'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

ومسافة القصر في المذهب مسيرة ثلاثة أيام ولياليها، ثم حولوها إلى التقدير بالمنازل، فاختلفوا فيه على أقوال منها: ستة عشر فرسخا، كل فرسخ ثلاثة أميال، فتلك ثمانية وأربعون ميلا، كما في الحديث، وبه أفتى لكونه مذهب الآخرين. (فيض الباري، أبواب التقصير، باب في كم يقصر الصلاة، كوئٹه ٢/ ٣٩٧)

(۵) اورحدیث کی کتابوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

عن ابن عباس -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا أهل مكة لا تقصروا الصلاة في أدنى من أربعة برد من مكة إلى عسفان. (سنن دارقطني، الصلاة، باب قدر المسافة التي تقصر في مثلها صلاة وقدر المدة ١/ ٣٧٤، رقم: ٤٣٢، بيهقي، الصلاة، باب السفر الذي لا تقصر ٣/ ١٣٧، المعجم الكبير، دار احياء التراث العربي ١١/ ٧٩، رقم: ١١١٦٢، السنن الكبرى، دارالفكر ٤/ ٣٣١، رقم: ٥٥٠٤)

(٦) ''عمدۃ القاری'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے جو بخاری شریف میں بھی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وكان ابن عمر -رضي الله عنه- وابن عباس -رضي الله عنه- يقصران ويفطران في أربعة برد، وهي ستة عشر فرسخا. (عمدة القاري، جديد زكريا ٥/ ٣٨٤، قديم بيروت ٧/ ١٢٥، بخاري شريف، كتاب الصلاة، تحت ترجمة الباب في كم يقصر الصلاة؟ ١/ ١٤٧)

والفراسخ ثلاثة أميال. (عمدة القاري، جديد زكريا ٥/ ٣٨٥، قديم بيروت ٧/ ١٢٥)

(۷) ''البحر الرائق'' میں اس مسئلہ کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے اور ساتھ ہی ۱۸؍فرسخ یعنی ۵۴؍میل شرعی جس کے ۸۷؍کلو میٹر ۵۵۷؍میٹر ۲۰؍سینٹی میٹر ہوتے ہیں، اسی پر جمہور کا

فتویٰ نقل کیا ہے۔ اور ائمہ خوارزم کا فتویٰ ۱۵؍فرسخ جو۴۵؍شرعی میل ہے، جس کی ۸۲؍کلومیٹر اور۲۹۶؍میٹرمسافت ہوتی ہے پر نقل کیا ہے۔عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وفي النهاية: الفتوى على اعتبار ثمانية عشر فرسخا. وفي المجتبى: فتوى أكثر أئمة خوارزم على خمسة عشر فرسخا. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ۲/ ۲۲۸، كراچی ۲/ ۱۲۹)

(۸) اور ''المحيط البرهاني'' میں جمہور کا فتویٰ ۱۸؍فرسخ پر نقل کیا ہے،عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وعامة مشايخنا قدروه بالفراسخ أيضا، واختلفوا فيما بينهم، بعضهم قالوا: أحد وعشرون فرسخا، وبعضهم قالوا: ثمانية عشر فرسخا، أدنى مدة السفر ثمانية عشر فرسخا، وبعضهم قالوا: خمسة عشر، والفتوىٰ على ثمانية عشر؛ لأنها أوسط الأعداد. (المحيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، المجلس العلمي بيروت ۲/ ۳۸۵، رقم: ۲۰۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۹؍شعبان ۱۴۳۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۶۸)	۱۴۳۱/۸/۹ھ

مسافت سفر کی تحقیق

سوال [۳۳۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''احکام مسافر'' کی فوٹو اسٹیٹ حاضر خدمت ہے، اس میں شرعی سفر ساڑھے ۷۷؍کلو میٹر میں ثابت کیا ہے۔ اور ''ایضاح المسائل'' میں ۸۲؍کلومیٹر ۲۹۶؍میٹر اور تقریباً ۸۷؍کلومیٹر لکھا ہے، مسافر کس مقدار پر عمل کرے؟ خیال رہے کہ میل انگریزی اور میل شرعی میں فرق ہے، میل انگریزی کے مقابلہ میں میل شرعی ۲۴۰؍گز بڑا ہوتا ہے، یعنی دو ہزار گز کا ہوتا ہے، اس لحاظ سے ۴۸؍میل، میل شرعی سے ۸۷؍کلومیٹر ۸۲۷؍میٹر ۴۰؍سینٹی میٹر ہوتا ہے، مسافت سفر میں شرعی میل ۸۷؍کلومیٹر مراد نہیں ہے؛ بلکہ انگریزی میل مراد ہے۔

(نوٹ) بعض حضرات نے مسافت شرعی کی تحدید میں ۴۸؍میل کو میل شرعی پر محمول کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلاف کی عبارات میں میل شرعی مراد ہے نہ کہ انگریزی، اس لحاظ سے ۸۷؍ کلومیٹر مسافت یقینی طور پر ہوگی، نہ کہ ۴/۱ ۷۷؍کلومیٹر؛ لیکن یہ قول بندہ کی معلومات کی حد تک سب سے پہلے مفتی پاکستان حضرت مولانا رشید احمد صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم نے اختیار کیا تھا، مگر جب مولانا مہربان علی بڑوتوی نے ان کا تعاقب کیا اور اکابر علمائے دیوبند سے اس کی تصدیق کرائی اور مسافت سفر نامی رسالہ شائع کیا تو حضرت مفتی صاحب نے رجوع کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''بہر کیف ان اکابر کی مراد اور ان کے فتوی کی بناواضح ہوگئی، تو میں اپنی تحریر سابق سے رجوع کرتا ہوں، جب تک کہ اہل تفقہ علماء حالات زمانہ پر از سر نو اجتماعی طور پر غور وفکر کر کے کوئی نیا فیصلہ نہیں کرتے، اس وقت تک مسافت سفر ذیل رہے گی:

مسافت سفر: ۴۸؍میل انگریزی ۲۴۸۵، ۷۷'' (احسن الفتاوی ۴/ ۹۶)

اسی طرح ''ایضاح المسائل'' کے مصنف مفتی شبیر احمد صاحب نے بھی یہی تحقیق پیش فرمائی ہے کہ میل سے مراد میل شرعی ہے۔ اور مسافت سفر ۸۷؍کلومیٹر ہے، نہ کہ ۴/۱ ۷۷کلومیٹر، ممکن ہے موصوف کو حضرت مفتی رشید احمد صاحب کے فتاوی ''احسن الفتاوی'' کے قدیم نسخہ سے دھوکہ ہوا ہو، بہر حال مسافت سفر نامی رسالہ سے ۴/۱ ۷۷کلومیٹر کی تحدید مزید متحقق ہوگئی؛ لہٰذا مسافت شرعی ۴/۱ ۷۷کلومیٹر ہے، جیسا کہ سید مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری نے بھی تحریر فرمایا ہے۔ (فتاوی رحیمیہ ۵/ ۵) فقط والسلام

المستفتي: محمد یونس سنگرور، پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافت سفر کی مقدار نصوص میں منزل وارد ہوئی ہے اور نصوص میں میل اور کیلومٹر کے ذریعہ سے تعیین نہیں کی گئی، بعد میں عامۃ المشائخ نے پندرہ فرسخ، اٹھارہ فرسخ اور اکیس فرسخ، تین اقوال نقل فرمائے ہیں۔ اور بعض نے ۱۶؍فرسخ بھی

نقل فرمایا ہے۔اور ایک فرسخ میں تین شرعی میل ہوتے ہیں اور پندرہ فرسخ سب سے چھوٹی مسافت ہے،اس میں ۴۵/میل شرعی ہوتے ہیں،جس میں ۸۲/کلو میٹر ۲۹۶/میٹر ہوتے ہیں۔اور ہمارے اکابر میں سے بعض نے ۴۵/میل انگریزی کہا ہے۔اور بعض نے ۳۶/میل انگریزی اور بعض نے ۴۸/میل انگریزی کہا ہے۔اور ایک اہم اصول فقہاء نے لکھا ہے کہ جب مسافت سفر اور مسئلہ قصر میں اختلاف واقع ہوجائے تو اتمام کرنا چاہئے،قصر نہیں کرنا چاہئے؛اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ عامۃ المشائخ کے اقوال میں سے کم ازکم آخری قول اختیار کیا جائے،یعنی ۱۵/فرسخ جس میں ۴۵/میل شرعی ہوتے ہیں،جو۸۲/کلومیٹر ۲۹۶/میٹر ہوتے ہیں۔اور ہم لوگ اسی مقدار پر فتویٰ لکھتے ہیں۔اور اگر کوئی ۴۸/میل انگریزی پر عمل کرتا ہے،تو ہم ان پر شدت سے نکیر بھی نہیں کرتے ہیں۔اور''ایضاح المسائل ص:۶۹/میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے،اب رہی''ایضاح المسائل'' لکھتے وقت''احسن الفتاوی'' کے قدیم نسخہ سے دھوکہ ہونا یہ جناب مولانا مفتی انعام الحسن دار العلوم عالی پور مدظلہ کا اپنا خیال ہے،واقعہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ جس وقت مولانا مہربان علی بڑوتوی نے مفتی رشید احمد کی تحریر پر اعتراضات لکھا تھا،اس کی ایک فوٹو کاپی مولانا مہربان علی صاحب نے اس ناکارہ کے پاس بھی بھیجی تھی،سب چیزوں پر نظر ڈالی گئی،اس کے بعد'ایضاح المسائل'،لکھی گئی ہے،نیز اس موضوع کو بڑی تحقیق اور کاوشوں کے ساتھ بڑے بڑے علماء اور مفتیان کرام سے مشورہ کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح:	کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۲۹/محرم ۱۴۱۸ھ
۲۹/۱/۱۴۱۸ھ	(الف فتویٰ نمبر:۵۱۶۲/۳۳)

۷۰/کلو میٹر مسافت سفر نہیں ہے

سوال [۳۳۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کہ میں مرادآباد سے گڑھ کا سفر کرتا ہوں جو مرادآباد سے ستر کلومیٹر ہے؛ لیکن جویا پہنچ کر مجھے امروہہ بھی جانا ہے اور امروہہ جویا سے سات کلومیٹر ہے، جس کی آمد ورفت ۱۴ر کلومیٹر ہوتی ہے، پھر گجرولہ پہنچ کر حسن پور بھی جانا ہے، جو گجرولہ سے ۱۳ر کلومیٹر ہے، جس کی آمد ورفت گجرولہ، حسن پور تک ۲۶ر کلومیٹر ہوتی ہے؛ لیکن اصل ہمارا منتہاء سفر گڑھ ہے، جو مرادآباد سے کل ستر کلومیٹر ہے، اگر بیچ سفر سے ادھر ادھر جانے کی مسافت بھی جوڑی جائے تو کل مسافت ایک سو دس کلومیٹر ہوتی ہے، تو اس صورت میں میں مسافر شرعی ہوں گا یا نہیں؟ نیز جویا سے امروہہ جانے کی صورت میں اور گجرولہ سے حسن پور جانے کی صورت میں آنے جانے کی یعنی دونوں طرف کی مسافت سفر میں شمار ہوگی یا صرف ایک طرف کی یعنی صرف جانے کی یا صرف آنے یا ادھر ادھر جانے آنے کی مسافت بالکل شمار نہیں ہوگی؟

المستفتي: مفتی محمد شاہد عفا اللہ عنہ، عمری کلاں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زیر نظر سوال میں یہ بات واضح ہے کہ منتہائے سفر گڑھ ہے، جو سوال نامہ کے مطابق ۷۰ر کلومیٹر ہے۔ اور یہ مسافت سفر نہیں ہے۔ اور جو درمیان میں جویا سے امروہہ جا کر اسی راستہ سے جویا واپس آنا ہوا، اسی طرح گجرولہ سے حسن پور جا کر اسی راستہ سے گجرولہ واپس آنا ہوا یہ ضمنی سفر ہے اور ضمنی سفر کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، اس لئے امروہہ اور حسن پور کا ضمنی سفر معتبر نہیں ہوگا؛ لہٰذا سوال نامہ میں ذکر کردہ صورت میں یہ شخص مسافر نہیں ہوگا، ہاں البتہ اگر جویا سے امروہہ جا کر واپس جویا نہ آنا ہوتا؛ بلکہ امروہہ سے رجب پور والا راستہ پکڑ کر رجب پور نکل جاتا اور امروہہ سے رجب پور ہوتے ہوئے دلی روڈ پکڑ کر مسافت سفر ۸۵ر کلومیٹر ہو جاتی، تو ایسی صورت میں مسافت سفر شرعی پوری ہو جاتی؛ اس لئے قصر کرنا لازم ہو جاتا، اسی طرح گجرولہ سے حسن پور جس راستہ سے گیا ہے، اسی راستہ سے گجرولہ واپس نہ آکر دوسرا راستہ اختیار کر کے دلی روڈ پکڑ لیتا تو گجرولہ سے حسن پور ہو کر دلی

روڈ پکڑنے تک جو مسافت ہوسکتی ہے وہ بھی معتبر ہوجاتی، پھر مرادآباد سے اس راستہ سے ہوکر کے گڑھ پہنچنے میں ۸۵-۹۰/کلومیٹر ہوجاتے ہیں، تو ایسی صورت میں بھی قصر کرنا لازم ہوجاتا، پھر اگر گڑھ جو منتہائے سفر ہے، وہاں سے مرادآباد واپس ہونے میں دائیں بائیں کہیں کا ارادہ نہ ہوتا، ڈائریکٹ مرادآباد کا ارادہ ہوتا تب بھی مرادآباد پہنچنے تک مسافر ہی رہتا۔ سائل نے سوال نامہ میں جو شکل پوچھی ہے اس سے مسافر نہیں ہوگا اور امروہہ حسن پور کا سفر مسافت میں داخل نہیں ہوگا۔ (مستفاد: امداد الاحکام ۲/۳۳۴، ۳۳۵)

وتعتبر المدة من أي طريق أخذ فيه، كذا في البحر الرائق، فإذا قصد بلدة وإلى مقصده طريقان، أحدهما مسيرة ثلاثة أيام ولياليها، والآخر دونها، فسلك الطريق الأبعد كان مسافرا عندنا، هكذا في فتاوى قاضيخان، وإن سلك الأقصر، يتم كذا في البحر الرائق.

(عالمگيري، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا ۱/ ۱۳۸، جديد زكريا ۱/ ۱۹۹، قاضيخان على الهندية، الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۱/ ۱۶۵، زكريا جديد ۱/ ۱۰۴، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ۲/ ۱۲۹، زكريا ۲/ ۲۲۸، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب المسافر، مصري قديم ۱/ ۱۶۱، دار الكتب العلمية، بيروت جديد ۱/ ۲۳۹، شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۰۳، كراچی ۲/ ۱۲۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۰۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۲۹ھ

وطن اصلی ووطن اقامت کی تعریف

سوال [۳۳۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: اگر میں اپنے گھر سے یا جائے ملازمت سے سفر شرعی پر جاؤں اور بالا بالا مدرسہ آ کر تعلیم وتدریس میں مشغول ہو جاؤں کہ جمعرات یا جمعہ کو گھر چلا جاؤں گا، ابھی درمیان ہفتہ کیا جاؤں تعلیم کا نقصان ہوگا، دراں حالانکہ میں پندرہ روز مسلسل جائے ملازمت پر رہنے کا ارادہ نہ کروں، تو اتنے دنوں تک میں اپنی نمازوں میں قصر کروں یا اتمام؟ نیز وطن اصلی اور وطن اقامت کی شرعی تعریف مع احکام مدلل بیان فرمائی جائے۔ بینوا توجروا

المستفتي: محمد عثمان القاسمی، مرکزی دارالعلوم، محمدیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: قصر کرنا ہوگا۔ (فتاوی دارالعلوم ۴/۴۵۲، کفایت المفتی قدیم ۴/ ۳۳۵، جدید زکریا ۳/ ۳۷۸، جدید زکریا مطول ۵/ ۷۰)

يبطل ...... وطن الإقامة بمثله ...... وبإنشاء السفر الخ. (الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٦١٤، كراچى ٢/ ١٣٢)

نیز وطن اصلی وہ مقام ہے جہاں پیدائش ہوئی ہو یا شادی کی ہو یا مستقل رہنے کا ارادہ ہو۔ اور ان مقامات سے جب تک مع ساز وسامان کے منتقل نہ ہو جائے یہ اپنی جگہ وطن اصلی ہی رہیں گے۔

الوطن الأصلي هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه، أي عزم على القرار فيه، وعدم ارتحال وإن لم يتأهل. (درالمختار، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٦١٤، كراچى ٢/ ١٣١)

اور وطن اقامت وہ مقام ہے جہاں مسافت سفر پر مسافر نصف ماہ یا اس سے زائد قیام کا ارادہ کرے، وہاں سے محض مسافت سفر کے ارادہ سے روانہ ہونے سے وہ وطن باطل ہو جاتا ہے۔

ووطن الإقامة، وهو موضع الذى ينوى المسافر أن يقيم فيه خمسة عشر يوما فصاعدا. (زيلعي، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ١/ ٥١٧، إمداديه ملتان ١/ ٢١٤)

ویبطل وطن الإقامة بمثله، وبإنشاء السفر الخ. (الدرالمختار، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ المسافر، زکریا ۲/ ۶۱٤، کراچی ۲/ ۱۳۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/ ۳/ ۱۴۱۱ھ

وطن اقامت اور وطن اصلی

سوال [۳۳۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مرادآباد میں کسی مدرسہ میں ملازم ہے اور اس کا وطن دیوبند ہے، اس کے ماموں کا گھر سہارنپور ہے اور زید بچپن ہی سے اپنے ماموں کے گھر رہا ہے اور اب بھی وہ مرادآباد سے اپنے ماموں کے گھر ہی جاتا ہے اور وہیں قیام کرتا ہے اور مستقل پوری زندگی وہیں رہنے کا ارادہ بھی ہے۔ اور اپنے گھر یعنی دیوبند میں بطور مہمان کبھی ایک دن کے لئے اور کبھی دو دن کے لئے جاتا ہے، تو کیا ایسی صورت میں زید اپنے ماموں کے گھر مسافر رہے گا یا مقیم رہے گا؟ اسی طرح ایک شخص مسافر ہے اور مدت اقامت سے پہلے اس کا ارادہ دوبارہ سفر کا ہے، تو کیا ایسا شخص اقامت کی نیت کرکے مقیمین حضرات کی امامت کرسکتا ہے؟

المستفتي: انیس عالم جامع مسجد برہم بازار، دیور یاصدر (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جوصورت لکھی گئی ہے، اس میں زید کی پرورش سہارنپور ماموں کے یہاں ہوئی ہے اور ہمیشہ وہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ اور زید عاقل بالغ بھی ہے، تو ایسی صورت میں اس کا وطن اصلی سہارنپور ہی ہے اور دیوبند جو اس کا وطن ولادت ہے، اگر اس کے ذہن میں اس کو باقی رکھنے کا ارادہ ہے، تو دونوں جگہ نمازوں کا اتمام

کرے گا۔اور اگر دیوبند کی وطنیت ختم کرنے کا ارادہ ہے تو دیوبند اس کا وطن اصلی نہیں رہا؛ لہٰذا اگر مرادآباد سے دیوبند ہوکر سہارنپور جانا ہے، تو دیوبند میں مسافر رہے گا اور نمازوں کی قصر کرنی ہوگی۔ اور اگر سہارنپور ہوکر دیوبند جانا ہے، تو سہارنپور پہنچتے ہی مقیم ہوجائے گا اور نمازوں کو مکمل ادا کرے گا۔اور سہارنپور سے دیوبند جائے گا تو اس میں مسافت سفر نہیں ہے؛ اس لئے دیوبند میں نمازوں کا اتمام کرے گا،سوال نامہ میں مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ پوچھا گیا ہے کہ مسافر شخص کا کسی جگہ قیام کرکے آگے سفر کرنے کا ارادہ ہے اور جہاں پر قیام کیا جارہا ہے، وہاں سے مدت اقامت سے پہلے آگے کے سفر کا ارادہ ہے،تو ایسا شخص اس جگہ قیام کے دوران مسافر رہے گا،اور نمازوں کی قصر کرنا لازم ہوگا، چار رکعت پڑھنا اور پڑھانا اس کے لئے جائز نہیں ہوگا، اگر مقیمین کی امامت کرتا ہے،تو دو رکعت پر سلام پھیرنا لازم ہے۔اور مقیمین حضرات اپنی بقیہ نماز بعد میں پوری کریں گے۔

الوطن الأصلي هو موطن ولادته، أو تأهله، أو توطنه، يبطل بمثله لا غير، قال الشامي: ويسمى بالأهلي، ووطن الفطرة والقرار، عن القهستاني قوله (أو تأهله) أى تزوجه، قوله (توطنه) أي عزم على القرار فيه، وعدم ارتحال وإن لم يتأهل، فلو كان له أبوان ببلد غير مولده، وهو بالغ ولم يتأهل به، فليس ذلک وطنا له إلا إذا عزم على القرار فيه، وترک الوطن الذى كان له قبله شرح المنية. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، ووطن الإقامة، کراچی ۲/ ۱۳۱، زکریا ۲/ ٦١٤)

وصح اقتداء المقيم بالمسافر في الوقت وبعده، فإذا قام المقيم إلى الاتمام لا يقرأ فى الأصح. (شامي، زکریا ۲/ ٦١٠-٦١١، کراچی ۲/ ۱۲۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۹۰۰)

وطن اقامت سے اپنے آبائی وطن آئے تو نماز میں قصر واتمام کا کیا حکم ہے؟

سوال [۳۳۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کی پیدائش اپنے آبائی وطن شہر مرادآباد میں ہوئی، اب یہ شخص مع اہل وعیال کے دوسرے شہر میں مقیم ہوگیا اور ان کا سارا کاروبار بھی وہیں ہے، اب یہ شخص اپنے رشتہ دار سے ملنے کی غرض سے اپنے وطن اصلی آتا ہے، تو اس مدت میں پور نماز پڑھے گا یا قصر کرے گا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتي: کمال الدین مفتی ٹولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت میں شخص مذکور جب اپنے آبائی وطن میں رشتہ داروں سے ملنے کی غرض سے آئے گا اور پندرہ روز سے کم مدت میں واپس چلے جانے کا ارادہ ہے، تو اس درمیان آبائی وطن میں اس پر قصر کرنا لازم ہوگا۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۴/ ۷۶)

يبطل الوطن الأصلي بمثله الخ. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ۲/ ۲۳۹، كوئٹه ۲/ ۱۳۶)

ويبطل الوطن الأصلي بالوطن الأصلي إذا انتقل عن الأول بأهله.

(هندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا ۱/ ۱۴۲)

البتہ اگر اس کا ارادہ مرادآباد ہی میں دوبارہ آکر ہمیشہ کی رہائش کا ہے، تو پھر مرادآباد میں قصر کرنا جائز نہ ہوگا، اتمام لازم ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ رجب ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۲۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۷/ ۱۴۱۳ھ

''ایضاح المسائل'' کے ایک مسئلہ کی وضاحت

سوال [۳۳۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ''امداد الاحکام'' میں (۶۰۴/۱۸) میں ہے، ''تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قصر کرنا چاہئے تھا'' ہونا چاہئے کرنا چاہئے، اس میں آپ بھی غور فرمائیں۔

(۲) کتاب ''ایضاح المسائل'' ص: ۶۶/ پر مسئلہ نمبر۲ جب دہلی میں مراد آبادی مستقل کاروبار کرتا رہا ہے، تو اس کے لئے ص: ۶۷ کی شرط نہیں ہونی چاہئے، جیسا کہ دار العلوم دیوبند کے ایک مفتی صاحب نے بندہ سے فرمایا، پھر نمبر۲ پندرہ روز رہنے کی نیت کر چکا ہو ہونا چاہئے پندرہ روز سے زائد قیام کر چکا ہو نہ ہونا چاہئے، ان دوسطروں میں غور فرمائیں اور یہ شرط ''امداد الاحکام'' میں نہیں ہے۔

(۳) ''امداد الاحکام'' (۶۰۹/۱) سطر اول میں خلاصہ یہ ہوا کہ وطن اقامت سے اگر انشاء سفر کا قصد کیا جاوے، تو اس صورت میں تو خروج من العمران کے بعد ہی وطن اقامت باطل ہوجاتا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آیا؛ کیوں کہ اصلی وطن، وطن اقامت دونوں کو چھوڑ کر سفر کرنے سے اور اصلی وطن میں داخل ہونے سے یا اس کے مثل دوسرا بنا لینے سے ختم ہوتے ہیں، محض سفر کر لینے سے ختم نہیں ہوتے، جب کہ حضرت مفتی صاحب اصلی وطن اور وطن اقامت متعدد ہوسکتے ہیں، تو خروج من العمران کے بعد کیسے باطل ہوجائیں گے؟ ایسا ہی (امداد الاحکام ص: ۶۳۱، سوال نمبر ۱۱) کے جواب میں ہے کہ وطن اقامت میں تنہا مرد کا قیام ہو اس کے سفر کرنے سے باطل ہوجائے گا، یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا، اصل میں وطن ختم ہونے کا مدار نیت پر ہے، چھوڑ کر جائے گا تو ختم اور اگر واپسی کی نیت ہے حاجت پوری کرنی ہے، تو باقی رہے گا، اس میں آپ کی رائے شریف کیا ہے؟

المستفتي: حافظ نور محمد جھنجھانوی، محلہ کوڑہ گر، قصبہ جھنجھانہ، مظفر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ”امدادالاحکام“ کی پوری عبارت اس طرح ہے:
”کیوں کہ اگر مطلق تزوج ببلدہ موجب قصر ہوجائے خواہ زوجہ کو وہاں رکھے یا نہ رکھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں قصر کرنا چاہئے تھا؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے مکہ میں نکاح کیا تھا۔ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے باپ کا گھر وہاں موجود تھا، ان کے بھائی وغیرہ بھی وہاں موجود تھے، نیز حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے مکہ ہی میں نکاح کیا تھا اور ان کا خاندان مکہ میں تھا، مگر صحیحین سے ثابت ہے کہ آپ نے مکہ میں قصر کیا ہے۔ اور نماز کے بعد فرماتے تھے: ”**یا أهل مكة! أتموا صلاتكم، فإنا قوم سفر**“ الخ. اب غور فرمایئے ان عبارات میں لفظ ”قصر“ نہ کرنا چاہئے تھا، اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہے، ہاں البتہ اس سے قبل کی عبارت اگر مطلق تزوج ببلدہ موجب قصر ہوجاوے میں کتابت میں الٹا ہوگیا ہے، ہونا چاہئے تھا، موجب اتمام، یہاں موجب اتمام کی جگہ موجب قصر ہوگیا ہے، باقی سب عبارات اپنی جگہ درست ہیں۔
”امدادالاحکام“ (۳۱۰/۲) میں یہ بحث ہے۔

(۲) آنجناب کی بات اس بارے میں بالکل صحیح اور درست ہے کہ ایک دفعہ پندرہ روز قیام کی قید لگانے کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن اس بارے میں احقر نے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی سے گفتگو کی تو انہوں نے فرمایا کہ اس مسئلہ پر کراچی میں علماء پاکستان کا ایک فقہی اجتماع ہوا، اس میں سب نے احتیاطاً اس شرط کی قید لگائی“ احقر نے صرف علماء کے اتفاق واجماع کی بناء پر یہ شرط لگائی ہے، ورنہ اس شرط کی ضرورت نہیں تھی اور پندرہ روز کے بجائے زائد کا لفظ لگا کر بیان کرنا محاورہ میں معروف ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پندرہ روز سے کم نہ ہو۔

(۳) آنجناب سے گزارش ہے کہ فرشتوں کی تحریر اور فرشتوں کی زبان ابن آدم سمجھنے سے قاصر ہے، شاید آنجناب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح انشاء سفر سے وطن اصلی باطل نہیں

ہوتا ہے، اسی طرح انشاء سفر سے وطن اقامت بھی باطل نہ ہونا چاہئے، اگر یہی مراد ہے، تو جواب یہ ہے کہ وطن اصلی اور وطن تاہل یعنی جہاں بیوی کے ساتھ رہائش اختیار کر رکھی ہے، دونوں کا حکم ایک ہے، یعنی انشاء سفر سے باطل نہیں ہوتے ہیں؛ لیکن وطن اقامت جس میں تنہا رہتا ہو واپسی کی نیت ہو تب بھی مسافت سفر کے ارادہ سے انشاء سفر کرے گا تو وطن اقامت باطل ہو جائے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/ ۳/ ۱۴۱۹ھ

وطن اقامت کس طرح کے سفر سے باطل ہوتا ہے؟

سوال [۳۳۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا وطن اقامت محض سفر شرعی سے باطل ہو جاتا ہے، جیسا کہ عام متون وشروح اس پر دال ہیں: "**ويبطل الوطن الأصلي بمثله والسفر، ووطن الإقامة، بمثله والسفر**" یا ایسے سفر سے باطل ہوتا ہے جس کے بعد وطن اقامت کی طرف عود کا ارادہ نہ ہو، جیسا کہ وطن اصلی محض سفر سے باطل نہیں ہوتا ہے، جب تک کہ وطن اصلی کو بالکلیہ ترک نہ کیا ہو اور دوسرا وطن اصلی نہ بنا لیا ہو، اس سلسلہ میں ایک استفتاء ''احسن الفتاوی'' جلد چہارم میں منقول ہے، رسالہ کا نام ہے ''**وطن الارتحال يبقى ببقاء الأثقال**'' اور اس کا جواب خیر المدارس پاکستان کے مفتی عبد الستار نے دیا ہے اور اس کی تصویب حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے کی ہے، جس میں لکھا ہے کہ وطن اقامت محض سفر شرعی سے باطل نہیں ہوگا جب تک اس وطن سے مکمل ارتحال کا قصد نہ ہو، اس سلسلہ میں حضرت مفتی صاحب نے بدائع اور بحر سے دلائل پیش کر کے فتویٰ کو حتمی شکل دی ہے، دلائل کا خلاصہ ذیل میں ہے۔

وطن اقامت کا بطلان سفر شرعی کے ذریعہ فقہی عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے، اور یہی معمول بہ

بھی ہے؛ لیکن سفر شرعی سے مراد مکمل طور پر قصد ارتحال ہو، وطن اصلی کی طرح جس وطن سے بھی ترک توطن کا عزم کرلیا اور وہاں سے نکل پڑا اور دوسری جگہ وطن بنالیا ہو تو وہ وطن باطل ہوجائے گا، خواہ یہ وطن اصلی ہو یا وطن اقامت۔ ''بدائع'' میں ہے:

وينقض بالسفر أيضا؛ لأن توطنه في هذا المقام ليس للقرار، ولكن لحاجة، فإذا سافر منه يستدل به على قضاء حاجته، فصار معرضا عن التوطن به، فصار ناقضا له دلالة. (بدائع الصنائع، زكريا ١/ ٢٨٠)

کسی جگہ سے سفر کرنا اس حال میں کہ سامان اور ضروریات کی تمام چیزیں وہاں رکھ چھوڑی ہیں، تو ایسی جگہ کا وطن ہونا متعین ہے، بقائے ثقل، بقائے توطن کی قطعی دلیل ہے۔ ''البحر الرائق'' کی عبارت اس سلسلہ میں واضح دلیل ہے:

لو كان له أهل بالكوفة وأهل بالبصرة، فمات أهله بالبصرة، وبقي له دور وعقار بالبصرة (لاتبقى وطنا له) وقيل: تبقي وطنا له؛ لأنها كانت وطنا له بالأهل والدار جميعا، فبزوال أحدهما لا يرتفع الوطن كوطن الإقامة تبقى ببقاء الثقل، وإن أقام بموضع آخر. (البحر الرائق، زكريا ٢/ ٢٣٩)

گذشتہ دلائل سے یہ بات متعین ہوگئی کہ وہی سفر مبطل اور ناقض الوطن السابق ہے، جو اعراض پر دلالت کرے۔ ''**وإن أقام بموضع آخر**'' سے بیک وقت دو وطن اقامت کا ہونا بھی ثابت ہورہا ہے، وہ اس لئے کہ پہلا وطن حالت سابقہ پر باقی ہے، معرض کوئی پیش نہیں آئی ہے، یمین کے مسئلہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جب قسم کھائے کہ ''**لا يسكن هذه الدار ...... فخرج وبقى متاعه، وأهله حنث؛ لأنه يعد ساكنا ببقاء أهله ومتاعه عرفا**''. (البحر الرائق، كتاب الأيمان، باب اليمين في الدخول والخروج، زكريا ٥/ ٥٠٤، كوئٹه ٤/ ٣٠٦)

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص چند سال یا چند ماہ کے واسطے ملازمت کی غرض سے مع اہل وعیال کہیں مقیم ہے، اسی طرح مدارس کے معلمین ومتعلمین درس وتدریس کے سلسلہ

میں کہیں رہتے ہیں، جسے وطن اقامت کہا جاتا ہے،تو اب ملازمت کے دوران وطن اقامت سے کبھی کسی ضرورت کے تحت سفرشرعی پر جاتے ہیں اور سفر سے واپسی پر اپنی ملازمت کی جگہ یعنی وطن اقامت میں پندرہ روز سے قبل ہی سفر کا ارادہ رکھتے ہیں، تو مشہور تو یہی ہے کہ سفر شرعی سے وطن اقامت ختم ہوجاتا ہے، اب اتمام کے لئے تجدید نیت یعنی دوبارہ پندرہ روز کی نیت سے قیام کرنا ہوگا، ورنہ قصر پڑھتے رہیں گے، مگر مفتی غلام صاحب کا فتویٰ ہے کہ چونکہ یہ سفر محض ضرورت کے لئے عارضی ووقتی ہے اور اس سفر سے وطن اقامت کے ترک کا قصد نہیں؛ بلکہ عود کا عزم مصمم ہے؛ اس لئے محض انشاء سفر سے مع عزم العود وطن اقامت باطل نہیں ہوا۔ اور سفر سے واپسی پر اتمام کرتے رہیں گے، گوکہ پندرہ روز سے قبل دوبارہ سفر کا ارادہ ہو کہ یہ سفر مبطل وطن اقامت نہیں ہے، جناب والا سے استدعاء ہے کہ اپنی تحقیق سے سرفراز فرمائیں، یہ گوشہ بھی ملحوظ رہے کہ بعض ملازم مع اپنے اہل وعیال وخانگی سامان کے قیام پذیر ہوتے ہیں، جب کہ بعض دوسرے تنہا اور مختصراً استعمال کے کپڑوں کے ساتھ قیام کرتے ہیں، کیا دونوں قسموں کے ملازموں کا حکم یکساں ہے، یا دونوں میں فرق ہے؟ مفتی غلام صاحب نے تو پہلی صنف کے ملازموں کی اقامت پر وطن اصلی ہونے کا بھی حکم لگایا ہے، تفصیلی جواب سے ممنون فرمائیں۔ بینوا بالبرہان اجرکم الرحمان۔

المستفتي: محمد شہباز ندوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ مسئلہ صرف حضرت مولانا عبدالستار صاحب اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب نے نہیں لکھا ہے؛ بلکہ ان کے پہلے حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی زیرنگرانی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ وغیرہ ’’امداد الاحکام‘‘ میں لکھ چکے ہیں۔ (امداد الاحکام ۲/۲۳۲) میں کافی تفصیلی فتویٰ موجود ہے، احقر نے ’’ایضاح المسائل‘‘ میں بھی اس مسئلہ کو لکھا ہے، بس اس میں اتنی قید لگائی جاتی ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ

قیام کرتا ہو؛ کیوں کہ بقائے ثقل کا پورا مفہوم بیوی کے ساتھ ہی پورا ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۱/۴ھ

''شرح وقایہ'' کی عبارت: ''ویبطل الوطن الأصلی'' کی وضاحت

بخدمت حضرات مفتیان کرام اور حاملین شرع متین دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں گے!

ازراہ کرام درج ذیل عبارت کی تسلی بخش تشریح کرکے ممنون فرمائیں:

سوال [۳۳۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''**ویبطل الوطن الأصلي بمثله لا السفر، ووطن الإقامة بمثله، والسفر، والأصلی**''. (شرح وقایة ۱/ ۱۹۷)

کیا وطن اقامت مطلق ہر سفر شرعی سے باطل ہوجاتا ہے یا ساز وسامان کے ساتھ سفر کرنا ضروری ہے، جیسا کہ صاحب احسن الفتاوی اس کی قید لگاتے ہیں اور مستقل رسالہ اس بارے میں انہوں نے تحریر فرمایا:

''**وطن الارتحال یبقی ببقاء الأثقال**''. (أحسن الفتاوی ٤/ ١٠٧)

اگر مطلق سفر شرعی سے وطن اقامت باطل ہوتا ہو تو پھر ''بحر'' کی اس عبارت کا کیا مطلب ہوسکتا ہے:

قال صاحب البحر، وفي المحیط: ولو کان له أهل بالکوفة وأهل بالبصرة ...... کوطن الإقامة تبقی ببقاء الثقل، وإن أقام بموضع آخر.

(۲/ ۲۳۹ مطبع زکریا)

نیز ''بحر'' کی اس عبارت سے لگ رہا ہے کہ ایک سے زائد وطن اقامت ہوسکتے ہیں۔ اور متون کے اطلاق سے معلوم ہورہا ہے کہ حکم اس کے برعکس ہے۔

غرض حاصل سوال کا یہ ہے کہ متون کے اس اطلاق کو عزم علی الترک کے ساتھ مقید کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ صاحب احسن الفتاوی مقید مانتے ہیں، یا وہ عبارتیں اپنے اطلاق پر باقی ہیں، آپ کے پاس جو بات راجح ہو اس سے مطلع فرمائیں، اگر صاحب احسن الفتاوی کی یہ رائے محض تفرد ہو تو ان کے دلائل کا جواب مدلل ارقام فرمائیں- جزاکم اللہ خیرا- اللہ تعالیٰ آپ کی عمر شریف دراز فرمائے اور امت کو خوب استفادہ کا موقع ملے۔ (آمین)

المستفتي: راقم بندہ عبدالرحمٰن مدرسہ مفتاح العلوم میل وشارم مدراس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال کا جواب ایک اصولی گفتگو کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وطن کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وطن اصلی، یہ متعدد ہوسکتے ہیں۔

(۲) وطن تأہل، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی جگہ کا رہنے والا ہے، وہ دوسری جگہ جا کر کے شادی کر لیتا ہے اور بیوی کی رہائش کا انتظام بھی وہیں کر لیتا ہے، یا کسی جگہ کا رہنے والا اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ دوسری جگہ جا کر رہائش اختیار کرتا ہے اور پہلی جگہ کو نہیں چھوڑتا، یا پہلے وطن کے باقی رہتے ہوئے دوسری جگہ ملازمت اختیار کر لیتا ہے اور اپنی بیوی بچوں کو ساتھ لے کر رہنے لگتا ہے، تو یہ بھی وطن تأہل کہلاتا ہے۔ اور وطن تاہل کا حکم وطن اصلی جیسا ہوتا ہے۔

(۳) وطن اقامت، وطن اقامت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوران سفر کسی بھی جگہ پندرہ دن سے زائد قیام کی نیت کر لی جائے اور یہ وطن محض وہاں سے سفر شروع کر دینے کی وجہ سے باطل ہوجاتا ہے۔ اور ''شرح وقایہ'' کی عبارت کا مطلب یہی ہے؛ لیکن اگر کسی جگہ پندرہ دن سے زیادہ قیام کی نیت کر لی ہے اور بیوی بچے ساتھ میں ہیں، پھر بیوی بچوں کو وہاں چھوڑ کر

دوسری جگہ سفر کر کے لوٹ کر آتا ہے، تو ایسی صورت میں اس جگہ پر قصر کرے گا یا اتمام کرے گا؟ جب کہ اس کے بال بچے بھی یہاں موجود رہے ہوں، اور زندگی کے ساز وسامان بھی یہیں رہے ہوں، تو اس سلسلہ میں صاحب بحر وغیرہ نے یہ لکھا ہے کہ جب بال بچہ کی رہائش کا انتظام اس جگہ پر کرلیا گیا ہے، تو وہ وطن تأہل کے درجہ میں ہوگیا۔ اور بعض فقہاء نے اس میں اختلاف بھی کیا ہے؛ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ بال بچہ اور اثاثہ کے ساتھ اس جگہ پر ایک مدت تک رہنے کا ارادہ ہو چکا ہے، تو وہ وطن تأہل کے درجہ میں ہوگیا ہے۔ اور اگر ایک عرصہ تک رہنے کا ارادہ نہیں ہے، تو وطن تأہل کے درجہ میں نہیں ہوگا، اس کی مثال یوں سمجھ لی جائے کہ مسافت سفر سے دوری پر شادی کرلی جائے تو اس کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں:

(۱) شادی کر کے بیوی کی رہائش کا انتظام بھی وہیں کرلیا جائے تو وہ وطن تأہل بن گیا، اب وہ وطن اقامت نہیں رہا۔

(۲) دوسری شکل: مسافت سفر سے دوری پر شادی کرلی جائے اور بیوی کو رخصت کر لے اپنے وطن لے آئے پھر بعد میں ساز وسامان کے ساتھ بیوی کو لے کر سسرال جائے اور پندرہ دن سے زائد سسرال میں قیام کرلے، پھر اس کے بعد بیوی کو سسرال ہی میں چھوڑ کر مسافت سفر پر جاتا آتا ہے، اور اس کا ارادہ یہی ہے کہ محض دو تین مہینے کے لئے سسرال میں رہنا ہے، اس کے بعد اصلی وطن واپس ہوجائیں گے، تو ایسی صورت میں بیوی کے وہاں ہوتے ہوئے پندرہ دن سے کم قیام کے ارادے سے آنے جانے پر صاحب بحر کے قول کے مطابق اتمام کرے گا۔ اور وطن اقامت باطل نہیں ہوگا۔ اور دوسرے فقہاء کے اقوال کے مطابق وطن اقامت باطل ہوجائے گا، اسی طرح مسافت سفر پر بیوی کو اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں چھوڑ کر آتا جاتا ہے، تو یہی حکم اور یہی اختلاف رہے گا؛ لیکن اس کے برخلاف جائے ملازمت میں بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کی صورت میں جائے ملازمت وطن تأہل بن جاتا ہے۔ اور اگر بیوی بچوں کے ساتھ نہیں ہے، تنہاء اور تجرد کی زندگی گزارتا ہے، تو جائے ملازمت وطن تأہل نہیں بنے گا؛ بلکہ وطن اقامت ہی رہے گا، مستفتی نے ’’احسن

الفتاویٰ'' کا حوالہ دیا ہے؛ لیکن یہ مسئلہ مفصل طور پر''امداد الاحکام'' میں موجود ہے، جو حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نگرانی میں مرتب فرمایا ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔ اور ہماری رائے بھی یہی ہے کہ مسافت سفر پر جس جگہ بیوی بچے اور ساز وسامان کے ساتھ رہتا ہے، تو وہ وطن تأہل کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور اگر بغیر بیوی بچے کے رہتا ہے، تو وہ وطن اقامت کے حکم میں ہوتا ہے؛ لہٰذا بیوی بچوں کے رہنے کی حالت میں وہاں سے سفر شرعی کرے گا، تو وہ وطن ختم نہیں ہوگا، جیسا کہ صاحب بحر نے لکھا ہے، اور بغیر بیوی بچوں کے رہنے کی حالت میں سفر کرے گا، تو وہ وطن ختم ہوجائے گا، جیسا کہ''شرح وقایہ'' کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔ مزید تفصیل (امداد الاحکام ۲/ ۳۰۷-۳۱۵) میں دیکھ لی جائے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۱۰/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۵/۲۵ھ

وطن اصلی تبدیل کرنے کی صورت میں نماز کا حکم

سوال [۳۳۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے ایک عزیز پہلے یہاں (مرادآباد) میں مقیم تھے اور اب مستقل مع اہل وعیال دہلی چلے گئے، ایسی صورت میں جب کبھی مرادآباد آئیں تو نماز قصر ادا کریں اور دہلی میں کیا کریں؟

المستفتي: ظہیر عالم محلّہ بھٹی اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر اب مرادآباد رہنے کا ارادہ نہیں ہے اور دہلی ہی کو اپنا وطن بنا لیا ہے، تو مرادآباد بطور مہمانداری آنے پر پندرہ روز سے کم قیام کی صورت میں مرادآباد میں قصر کرنا لازم ہوگا۔ اور دہلی میں چار رکعت پڑھنا لازم ہوگا۔ اور اگر مرادآباد میں

رہائشی سب چیزیں ملکیت میں موجود ہیں اور مرادآباد کو بطور وطن باقی رکھا ہے اور مرادآباد کو بالکلیہ ترک کرنے کا ارادہ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں دونوں جگہ نماز مکمل پڑھا کرے گا۔

عن يحيى بن أبي اسحاق سمعت أنسا –رضي الله عنه– يقول: خرجنا مع النبي صلى الله عليه وسلم من المدينة إلى مكة، فكان يصلي ركعتين ركعتين، حتى رجعنا إلى المدينة، قلت: أقمتم بمكة شيئا؟ قال: أقمنا بها عشرا. (صحيح البخاري، كتاب تقصير الصلاة، باب ماجاء في التقصير، النسخة الهندية ١/ ١٤٧، رقم: ١٠٧٠، ف: ١٠٨١)

إذا انتقل من البلد الذي تأهل به أهله وعياله وتوطن ببلدة أخرى بأهله وعياله لا تبقى البلد المنتقل عنها وطنا له.

لو نقل الرجل أهله وعياله ببلدة وتوطن ثمة، وله في مصره الأول دور وعقار، قال بعض المشايخ: يبقى المصر الأول وطنا له، حتى لو دخل فيه يصير مقيما من غير نية الإقامة. (الفتاوى التاتارخانية، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ٢/ ٥١٠، رقم: ٣١٤٥، ٣١٤٩)

الوطن الأصلي هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه، ويبطل بمثله إذا لم يبق له بالأول أهل، فلو بقي لم يبطل بل يتم. (درمختار، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ٢/ ١٣٢، زكريا ٢/ ٦١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ر صفر المظفر ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۱۸)

وطن اقامت سفر شرعی سے باطل ہوجاتا ہے

سوال [۳۳۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک مسجد میں امامت کرتا ہوں، میرا گھر پندرہ میل دور ہے، میں اتوار کے دن

مسجد ہی سے یہ نیت کر کے گھر گیا کہ پیر کے دن مسجد میں آ کر دو دن رہ کر جمعرات کو بردوان جاؤں گا اور مسجد سے بردوان کا ۵۰/ میل کا راستہ ہے، تو میں گھر سے آ کر مسجد میں نماز قصر کروں یا پوری نماز ادا کروں؟ اور بردوان سے واپس آ کر مسجد میں نماز قصر کروں یا پوری نماز ادا کروں؟ اگر قصر کروں تو کب تک کرنا ہوگا؟ میں بردوان سے گھر نہ جانے تک قصر کروں یا بردوان سے مسجد آ کر پوری نماز ادا کروں؟

المستفتي: محمد حیدر علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت میں چونکہ گھر سے بردوان کی مسافت ۶۵/ میل سفر شرعی کے بقدر ہے؛ اس لئے گھر سے جب بردوان جانے کے ارادے سے نکلے گا تو وہ مسافر بن جائے گا، اسے مسجد میں بھی قصر کرنا ہوگا۔ اور پھر بردوان سے واپس آ کر اگر مسجد میں پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت نہیں تو بھی قصر کرنا واجب ہوگا۔

عن عبدالله بن عمر قال: إذا كنت مسافرا فوطنت نفسك على إقامة خمسة عشر يوما، فأتمم الصلاة، وإن كنت لاتدري فاقصر، قال محمد: وبه نأخذ، وهو قول أبي حنيفة. (كتاب الآثار، للإمام محمد، باب الصلاة في السفر، رحيم اكيڈمی كراچی/ ۲۰۱، رقم: ۱۸۸)

والحاصل: أن إنشاء السفر يبطل وطن الإقامة. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۲، زكريا ۲/ ۶۱۵)

والسفر أي يبطل وطن الإقامة به؛ لأنه ضد الإقامة، فلا يبقى معه حتى لو نوى الإقامة في بلد، ثم سافر، ثم أتى ذلك البلد قصر مالم ينوها.
(مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دارالكتب العلمية، بيروت ۱/ ۲۴۳)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/۴/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۰۵)

مسافت سفر کی ابتداء وانتہاء کا حکم

سوال [۳۳۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہم جب مرادآباد کا سفر کرتے ہیں، تو ہمارے گاؤں سے اور جہاں سے مرادآباد شہر کی حد شروع ہوتی ہے، یعنی ہرتھلا پار کر کے یہاں تک مسافت سفر پوری نہیں ہوتی؛ البتہ ہمیں دارالطلبہ لالباغ جانا ہوتا ہے، وہی ہماری منزل ہے، لالباغ تک مسافت پوری ہوجاتی ہے، معلوم یہ کرنا ہے، کیا ہم مسافر ہونگے یانہیں؟

(۲) شرعاً مسافت سفر کا اعتبار شہر کی ابتدائی حدود تک شمار ہوگا یا شہر کے جس محلّہ اور جس جگہ جارہے ہیں اس جگہ تک مسافت کا اعتبار ہوگا؟

(۳) شہر کے جس محلّہ اور جگہ سے سفر شروع کیا ہے، وہاں سے مسافت کی ابتداء ہوگی یا شہر کی حد جس جگہ ختم ہوتی ہے، اس جگہ سے مسافت سفر شمار ہوگی؟

المستفتي: عبدالرشید سیڑھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) جب آپ کے گاؤں سے مرادآباد کی آبادی کی ابتدا ہرتھلہ تک کے درمیان مسافت سفر پوری نہیں ہوتی ہے، تو آپ کو مرادآباد کے سفر میں قصر کرنا جائز نہ ہوگا؛ بلکہ نمازوں کا اتمام لازم ہے چاہے، مرادآباد کی آبادی کے اندر دارالطلبہ تک پہنچنے میں مسافت سفر پوری ہوجاتی ہو؛ اس لئے کہ قصر واتمام کا مدار جہاں سے سفر شروع کیا جاتا ہے وہاں کی آبادی کی سرحد سے جہاں جانا ہے وہاں کی آبادی کی ابتداء تک کے درمیان کی مسافت پر ہے۔ اور یہاں مسافت سفر پوری نہیں ہے۔

أخرج البخاري تعليقا قال: وخرج علي بن أبي طالب، فقصر وهو يرى البيوت، فلما رجع قيل له: هذه الكوفة قال: لا، حتى ندخلها. (صحيح البخاري، كتاب تقصير الصلاة، باب يقصر إذا خرج من موضعه ۱/ ۱۴۸)

من خرج من عمارة موضع إقامته من جانب خروجه، وإن لم يجاوز

من الجانب الآخر. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۲۰، زكريا ۲/ ۵۹۹)

وفي التاتارخانية: والمعتبر من الخروج أن يجاوز المصر وعمراناته هو المختار، وعليه الفتوى. (تاتارخانية، قديم ۲/ ٤، جديد زكريا ۲/ ٤۹۳، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر)

(۲) اس کا جواب اوپر آچکا ہے۔ (۲) جس جگہ اور محلّہ سے سفر شروع کیا ہے، وہاں سے مسافت کی ابتداء وہاں کی آبادی کی سرحد جہاں پر ختم ہورہی ہے، وہاں سے ہوگی، دلیل اوپر گذر چکی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۴ھ

مسافت سفر کے ارادہ سے سفر شروع کرنے کے بعد درمیان میں قیام اور سفر ملتوی کرنے کا حکم

سوال [۳۳۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کو دلی جانا تھا اور وہ دلی کے لئے روانہ ہوا، پھر امروہہ اترا، مرادآباد سے امروہہ ۳۰؍ کلومیٹر ہے اور امروہہ اترنے کے بعد اس کا ارادہ دلی جانا کینسل ہوگیا اور امروہہ سے نوگاواں ۵-۷؍ کلومیٹر ہے وہاں دو، تین دن رہنے کا ارادہ ہوا، پھر وہاں سے دس بارہ کلو میٹر کے فاصلہ پر سات دن گذارنے کا ارادہ ہے، پھر وہاں سے کانٹھ ۷؍ کلومیٹر ہے، کانٹھ میں دس دن رہنے کا ارادہ ہے، اس کے بعد اس کا مرادآباد لوٹنے کا ارادہ ہے، اب مفتی صاحب سے گزارش یہ ہے کہ تیس کلومیٹر کے فاصلہ پر جاکر دلی جانے کا ارادہ ملتوی ہوگیا، پھر اس علاقہ میں دس پندرہ روز رہنے کا ارادہ ہوا، یہاں تک کہ امروہہ مرادآباد سے مسافت سفر پر نہیں ہے تو کیا امروہہ پہنچ کر دلی کا ارادہ ملتوی کرنے سے اقامت لوٹ آئے گی یا مسافر ہی

رہے گا ؟ جب کہ وہ امروہہ پہنچنے سے پہلے قصر بھی کر چکا ہے، نیز امروہہ سے نوگاواں، عمری، کانٹھ ہوتے ہوئے جب مرادآباد آنے کا ارادہ ہوا تو وہ مقیم بن گیا یا مسافر ہی رہے گا ؟ ایسا ہی واقعہ تبلیغی جماعت کے ساتھ کثرت سے پیش آتا ہے۔

المستفتي: محمد ابراہیم قاسمی غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرادآباد سے دلی مسافت سفر پر ہے؛ اس لئے مرادآباد سے دلی جانے والوں پر مرادآباد کی آبادی ختم ہونے کے بعد سے نمازوں کا قصر کرنا لازم ہوتا ہے، جب یہ شخص دلی ہی کے ارادہ سے مرادآباد سے روانہ ہوا ہے، جب تک اس کا ارادہ باقی رہے گا قصر کرتا رہے گا۔ اور امروہہ صرف ۳۰ رکلومیٹر پر ہے اور اسی طرح نوگاواں، عمری اور کانٹھ وغیرہ قریب قریب کے علاقے ہیں، جب یہ شخص امروہہ یا نوگاواں وغیرہ جانے کے بعد دلی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہے، تو جس وقت ارادہ ملتوی کرے گا اس وقت سے علاقائی مقیم بن جائے گا، اب اس کے لئے نمازوں کو قصر کرنا جائز نہیں ہوگا؛ بلکہ پوری نماز پڑھنا لازم ہوگا، اسی طرح تبلیغی جماعت والے لمبی مسافت کے ارادہ سے نکلے اور بعد میں ابھی لمبی مسافت کا سفر نہیں ہو پایا تھا، ان کا ارادہ بدل جائے کہ اب یہیں سے واپس ہونا ہے، تو جہاں پر ارادہ بدل جائے وہیں سے نمازوں کا اتمام کرنا لازم ہو جائے گا۔

جزئیات ملاحظہ فرمایئے:

إذا عزم المسافر على العود إلى وطنه قبل أن يسير مسافة القصر، فإنه يعتبر مقيما من حين عزم على العود، ويصلي تماما؛ لأن العزم على العودة إلى الوطن قصد ترك السفر بمنزلة نية الإقامة.

(الموسوعة الفقهية ۲۷/ ۲۸۶)

ولا يزال حكم السفر حتى ينوي الإقامة في بلده أو قرية خمسة عشر يوما، أو أكثر كذا في الهداية، هذا إذا سار ثلاثة أيام، أما إذا لم يسر

ثلاثة أيام، فعزم على الرجوع أو نوى الإقامة يصير مقيما وإن كان في المفازة. (الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، جديد ۱/ ۱۹۹، قديم ۱/ ۱۳۹)

ثم اعلم أنا قلنا إنما يصير مقيما بنية الإقامة إذا سار ثلاثة أيام، فأما إذا لم يسر ثلاثة أيام فعزم على الرجوع ونوى الإقامة يصير مقيما وإن كان في المفازة، كذا ذكر فخر الإسلام، وفي المجتبى: لا يبطل السفر إلا بنية الإقامة أو دخول الوطن أو الرجوع إليه قبل الثلاثة. (البناية شرح الهداية، المكتبة الأشرفية ۳/ ۱۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۰۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۶/۵ھ

نماز کا وقت شروع ہونے کے بعد سفر کرنے والا اتمام کرے گا یا قصر؟

سوال [۳۳۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی نماز شروع ہونے کے بعد نماز ادا کئے بغیر سفر شرعی کرے اور پھر دوران سفر اس نماز کو ادا کرے، تو کیا اس میں قصر ہوگا؟

المستفتي: محمد راشد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گھر پر رہتے ہوئے جس نماز کا وقت ہو گیا ہے اور وقت ختم ہونے سے پہلے سفر شروع کر دیا ہے، تو وہ سفر کی نماز ہوگی، حضر کی نہیں؛ لہٰذا سفر میں اس نماز کا قصر کرنا لازم ہے؛ اس لئے کہ سفر شروع کرنے کے بعد بھی وقت باقی تھا۔

والمعتبر في تغيير الفرض آخر الوقت ...... فإن كان المكلف في

آخره مسافرا وجب ركعتان وإلا فأربع؛ لأنه المعتبر في السببية عند عدم الأداء قبله (تحته في الشامية) وجب ركعتان أي وإن كان في أوله مقيما.

(شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۱، زكريا ۲/ ۶۱۳، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب صلاة المسافر، دارالكتاب ديوبند ص: ۴۲۸، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۷/ ۲۸۱)

فإن كان آخر الوقت مسافرا وجب عليه ركعتان، وإن كان مقيما وجب عليه الأربع؛ لأنه المعتبر في السببية عند عدم الأداء في أول الوقت.

(تبيين الحقائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، إمداديه ملتان ۱/ ۲۱۵، زكريا ۱/ ۵۲۰)

إذا كان الرجل مقيما في أول الوقت فلم يصل حتى سافر في آخر الوقت كان عليه صلاة السفر. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون، زكريا ۲/ ۵۰۶، رقم: ۳۱۳۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲/۵/۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۳۶)	۲۲/۵/۱۴۳۴ھ

نیت اقامت میں ایام سفر معتبر نہیں

سوال [۳۳۴۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ممبئی سے یوپی جانے میں تقریباً ۲½ یا تین دن درکار ہوتے ہیں، پس اگر کوئی شخص سفر کرے تو کیا وہ ایام سفر وایام اقامت کو ملا کر ۱۵/ دن سے کم کی نیت کرنے پر مسافر ہوگا یا یہ کہ آنے جانے میں جو پانچ چھ دن درکار ہیں انہیں چھوڑ کر بقیہ اقامت کے دن شمار کرے، یعنی سوال یہ ہے کہ ۱۵/ دن سے کم کی جو نیت کرے گا اس میں ایام سفر کو شامل کرے گا یا صرف یوپی پہنچ کر وہاں سے رہنے کے دن شمار ہوں گے؟

المستفتي: عبداللہ حسن پور، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اقامت میں ایام سفر کا اعتبار نہ ہوگا، یعنی آنے جانے میں جو ایام صرف ہوں گے، وہ اقامت میں شمار نہیں ہوں گے؛ بلکہ ان ایام سفر کے علاوہ جہاں جاکر مقیم ہونا ہے، اگر وہ وطن اصلی نہیں ہے، تو پندرہ دن یا اس سے زیادہ ایک مقام پر قیام کی نیت سے اقامت کا ثبوت ہوجائے گا؛ لہٰذا نمازوں کا اتمام کرے گا۔ اور اگر پندرہ دن سے کم کی نیت ہے، تو قصر کا سلسلہ باقی رہے گا۔

وإن لم يكن وطنا أصليا له، فإنه يقصر الصلاة ما لم ينو الإقامة بها خمسة عشر يوما، ثم نية الإقامة لا تصح إلا في موضع الإقامة ممن يتمكن من الإقامة. (فتاوى قاضيخان على هامش الهندية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ١/ ١٦٥، زكريا جديد ١/ ١٠٤، وهكذا في الهندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ٣٩، جديد ١/ ١٩٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۳۱۸)

شہر کے فناء متصل سے نکلنے کے بعد قصر کرنا

سوال [۳۳۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسافر جب سفر شروع کردے اور اس کا ارادہ مثلاً دو سو کلومیٹر سفر کرنے کا ہو، تو نمازوں کی قصر آبادی سے نکلتے ہی کرے گا یا آبادی کے بعد فنائے شہر سے نکلنے کے بعد شروع کرے گا؟

المستفتي: محبوب اناوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص شرعی سفر کے ارادے سے شہر سے نکلے گا، تو وہ شہر

کی آبادی اور اس کے ملحقات سے نکلنے کے بعد قصر کرے گا، فنائے شہر سے خارج ہونا ضروری نہیں ہے، یہ اس وقت ہے جب فنائے شہر، شہر سے منفصل ہو۔ اور اگر فنائے شہر، شہر کی آبادی سے متصل ہے، تو فنائے متصلہ سے نکلنے کے بعد نمازوں کی قصر شروع کرے گا، شہر سے ایک غلوہ (تقریباً پاؤکلومیٹر کے فاصلہ کے فناء کو بھی فنائے متصل کہا جاتا ہے)۔

وهل يعتبر مجاوزة الفناء؟ إن كان بين المصر وفنائه أقل من قدر غلوة، ولم يكن بينهما مزرعة يعتبر مجاوزة الفناء أيضا. (خانية على الهندية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ١/ ١٦٥، جديد ١/ ١٠٤)

قال محمد رحمه الله تعالیٰ: لا يقصر حتى يخرج من مصره ويخلف دور المصر ...... ومن مشايخنا رحمهم الله من اعتبر مجاوزة فناء المصر إن كان بين المصر وبين فناءه أقل من قدر غلوة، ولم يكن بينهما مزرعة، وإن كان بينهما مزرعة، أو كانت المسافة بين المصر وفنائه، قدر غلوة لا يعتبر مجاوزة الفناء. (محيط البرهاني، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، جديد مجلس علمي ٢/ ٣٨٧-٣٨٨، رقم: ٢٠٢٣، قديم ٢/ ١٢٧)

أما الفناء وهو المكان المُعدّ لمصالح البلد كربض الدواب، ودفن الموتى، وإلقاء التراب، فإن اتصل بالمصر اعتبر مجاوزته، وإن انفصل بغلوة أو مزرعة فلا. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٦٠٠، كراچی ٢/ ١٢١)

إن عليا خرج من البصرة فصلى الظهر أربعا، ثم قال: أما إنا إذا جاوزنا هذا الخص صلينا ركعتين. (مصنف ابن أبي شيبة، موسسة علوم القرآن جديد ٥/ ٣٦٩، رقم: ٨٢٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۶۸)

مسافر شرعی کس مقام سے قصر کرے گا؟

ســــوال [۳۳۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسافر شرعی کس مقام سے قصر کرنی شروع کرے گا؟

المستفتي: مفتی محمد سمیر عثمان آباد، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الـجواب وبالله التوفيق: (۱) مسافر سفر شرعی کی نیت سے اپنی جائے قیام کی آبادی اور اس کے ملحقات سے آگے بڑھتے ہی قصر شروع کردے گا۔ (مستفاد: کتاب المسائل، جدید ۱/۵۵۳)

عـن أنـس –رضـي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى الـظهـر بـالـمدينة أربعا، وصلى العصر بذى الحليفة ركعتين. (صحيح مسلم، الصلاة، باب صلاة المسافرين وقصرها، النسخة الهندية ۱/ ۲۴۲، بيت الأفكار، رقم: ۶۹۰)

عـن أبـي حـرب بن أبي الأسود الديلي، أن عليا لما خرج إلى البصرة رأى خـصـا، فـقال: لو لا هذا الخص لصلينا ركعتين، فقلت: ما خصا؟ قال: بيت من قصب. (مـصـنف عبـدالـرزاق، باب المسافر متى يقصر إذا خرج من موضعه؟ المجلس العلمي ۲/ ۵۲۹، رقم: ۴۳۱۹)

وأشـار إلى أنه يشترط مفارقة ما كان من توابع موضع الإقامة كربض الـمـصـر، وهـو مـاحول المدينة من بيوت ومساكن، فإنه في حكم المصر. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچى ۲/ ۱۲۱، زكريا ۲/ ۵۹۹)

قـال مـحـمـد رحمه الله تعالىٰ: يقصر حين يخرج من مصره ويخلف دور الـمـصـر، كذا في المحيط. وفي الغياثية: هو المختار، وعليه الفتوى. (هـنـدية، البـاب الـخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱۳۹، جديد ۱/ ۱۹۹،

قاضی خان علی هامش الهندية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ١٦٥، جديد ١/ ١٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۵۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۷ھ

قصر کے لئے اپنے مقام سے سفر شرعی کا ارادہ کرنا لازم ہے

سوال [۶۳۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک جماعت تین دن کے لئے اپنے وطن سے بیس کلومیٹر دور گئی اور وہاں وہ جماعت امیر کے تابع ہے، امیر ان تین دنوں میں اپنے مامورین کو اپنے وطن سے مسافت شرعی پر یا جہاں جماعت ہے وہاں سے مسافت شرعی پر یا اس سے کم پر روانہ کرسکتا ہے، ابھی روانہ کیا نہیں ہے، تو مامورین ان تین دنوں میں جماعت جہاں ہے وہاں پر اتمام کریں گے، یا قصر؟ جب کہ وہ امیر کے تابع ہیں۔

المستفتي: مفتی سمیر صاحب عثمان آباد، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب تک امیر جماعت اپنے مامورین کو مسافت شرعی کی دوری پر روانہ نہ کرے یہ جماعت اتمام ہی کرتی رہے گی؛ اس لئے کہ قصر کے لئے اپنے مقام سے سفر شرعی کے قصد وارادہ سے نکلنا شرط ہے اور وہ یہاں نہیں پایا جارہا ہے۔ (مستفاد: کتاب المسائل، جدید ۱/۵۵۴)

ولا بد للمسافرين قصد مسافة مقدرة بثلاثة أيام حتى يترخص برخصة المسافرين، وإلا لا يترخص أبدا، ولو طاف الدنيا جميعها بأن كان طالب آبق أو غريم أو نحو ذلک. (هندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ١٣٩، جديد ١/ ١٩٩)

قاصدا ولو كافرا، ومن طاف الدنيا بلا قصد لم يقصر . وتحته في الشامية: أشار به مع قوله "خرج" إلى أنه لو خرج ولم يقصد أو قصد ولم يخرج لا يكون مسافرا. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۲۲، زكريا ۲/ ۶۰۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۷ھ

قصر کے لئے مسافت سفر کا ہونا لازم ہے

سوال [۳۳۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ساکن ٹانڈہ گاڑی پر رہتا ہے۔ اور ٹانڈہ سے سیدھے کاشی پور جاتا ہے، ٹانڈہ سے کاشی پور ۲۷؍ کلومیٹر ہے۔ اور کاشی پور سے سیدھے ٹانڈہ ہوتے ہوئے مراد آباد جاتا ہے (کاشی پور سے مراد آباد ۵۵؍ کلومیٹر ہے) پھر مراد آباد سے وایہ ٹانڈہ کاشی پور جاتا ہے، اسی طرح سے زید کے صبح سے شام تک کئی چکر ہوجاتے ہیں اور مجموعی سفر تقریباً دوسو کلومیٹر ہوجاتا ہے، مسئلہ دریافت یہ کرنا ہے کہ زید کو نماز قصر پڑھنی چاہئے یا کہ پوری نماز؟ اسی طرح جب گاڑی مراد آباد سے کاشی پور جاتے ہوئے یا آتے ہوئے کچھ دیر کے لئے ٹانڈہ روکتا ہے، تو اس وقت کون سی نماز پڑھنا چاہئے؟

المستفتي: جلیس احمد ٹانڈہ بادلی رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ایسی صورت میں زید مسافر نہیں ہوتا؛ اس لئے اس کے لئے قصر کرنا جائز نہ ہوگا؛ بلکہ ٹانڈہ، کاشی پور، مراد آباد تینوں مقاموں میں نمازوں کا اتمام اس پر لازم ہوگا؛ کیوں کہ اس میں ابتداء سفر سے منتہائے سفر تک کے درمیان کسی بھی مقام سے

مسافت سفر پوری نہیں ہوتی، نیز ابتدائے سفر سے منتہائے سفر تک اگر مسافت بھی ہو، مگر درمیان میں اپنا وطن ہوکر گذرنا پڑے تب بھی قصر جائز نہیں ہوتا، اتمام لازم ہوتا ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی زکریا ۱/ ۵۶۱)

أقل مسافة سفر تتغير به الأحكام مسيرة ثلاثة أيام، كذا في التبيين هو الصحيح. (هندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱۳۸، جديد ۱/ ۱۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ۶/ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/ ۶/ ۱۴۱۶ھ

ساڑھے ۸۲ر کلومیٹر سے کم مسافت میں قصر نہ کرنا چاہئے

سوال [۳۳۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر مسافت سفر میں ۴۸ر میل کا اعتبار ہے، تو اس سے میل شرعی مراد ہے، یا میل انگریزی؟ بعض بزرگوں نے انگریزی میل مراد لیا ہے، اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ جب کہ ۴۸ ر میل انگریزی ۴۵ر میل شرعی سے بھی کم کا ہوتا ہے؟

المستفتي: ساجد میرٹھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافت سفر ۴۸ر میل ہے۔ اور میل سے میل شرعی مراد ہے، نہ کہ میل انگریزی۔ ''فتاوی رشیدیہ''، ''فتاوی دار العلوم'' اور ''احسن الفتاوی'' کے فتاوی سے یہی معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ حضرت گنگوہیؒ اور مفتی عزیز الرحمٰن نے مسافت سفر ۴۸ر میل تحریر فرمانے کے بعد آگے میل کی تعین ۴۰۰۰ر چار ہزار قدم سے کی ہے اور چار ہزار کا میل شرعی ہوتا ہے، نہ کہ میل انگریزی، معلوم ہوا کہ ۴۸ر میل شرعی مسافت سفر ہے۔ اور بعض

بزرگوں سے جو ۴۸ر میل انگریزی منقول ہے اس کا کوئی ماخذ اور دلیل فقہاء متأخرین سے ہم کو نہیں مل سکی۔ اور ۴۸ر میل شرعی میں ۸۷ر کلومیٹر ۸۲ ۷ر میٹر ۴۰ر سینٹی میٹر ہوتا ہے۔ اور ۴۵ر شرعی میل میں ۸۲ر کلومیٹر ۲۹۶ر میٹر ہوتا ہے؛ اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ ۸۲ر کلومیٹر ۲۹۶ر میٹر سے کم کی مسافت میں نمازوں کا قصر نہ کیا جائے۔ (فتاوی رشیدیہ، مکتبہ فقیہ الامت ۲/ ۸۵، رقم: ۶۴۹، زکریا دیوبند ۴۱۲، احسن الفتاوی ۴/ ۹۵، زکریا، فتاوی رشیدیہ جسیم بک ڈپو دیوبند/ ۴۳۷، فتاوی دارالعلوم مکتبہ زکریا دیوبند ۴/ ۴۴۴-۴۴۶)

كـان ابـن عـمـر –رضـي الله عـنـه– وابن عبـاس –رضي الله عنـه– يـقصران ويفطران في أربعة برد، وهو ستة عشر فرسخا. (بخاري شريف، باب في كم تقصر الصلاة؟ ١/ ١٤٧)

عـن ابـن عبـاس –رضـي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقصروا الصلاة في أدنى من أربعة برد من مكة إلى عسفان. (عمدة القاري، أبواب تقصير الصلاة، باب الصلاة بمنى، قديم بيروت ٧/ ١١٩، زكريا ٥/ ٣٧٦)

عـن مالک عن نافع عن سالم بن عبيدالله أن عبدالله بن عمر ركب إلى ذات الـنصب، فقصر الصلاة في مسيرة ذلک، قال يحيى: قال مالک: وبين ذات النصب والمدينة أربعة برد. (أوجز المسالك، ما يجب فيه قصر الصلاة ٣/ ١٨١)

ابـن عـلية عن أيوب عن نافع عن سالم أن ابن عمر خرج إلى أرض له بـذات الـنـصب، فقصر وهي ستة عشر فرسخا. (مـصنف ابن أبي شيبة، موسسة علوم القرآن ٥/ ٣٥٨، رقم: ٨٢٢٠)

عن عطاء بن رباح قال: قلت لابن عباس: أقصر إلى عرفة؟ فقال: لا، قلت: أقصر إلى مر؟ قال: لا، قلت أقصر إلى الطائف وإلى عسفان؟ قـال: نعم، وذلک ثمانية وأربعون ميلا، وعقد بيده. (مصنف ابن أبي شيبة، بيروت ٥/ ٣٥٨، رقم: ٨٢٢٢)

لـكن جمهور الفقهاء قدروها باعتبار المكان بأربعة برد، وهي ثمانية وأربعون ميلا، استنادا إلى بعض الآثار. (الموسوعة الفقهية ٣٦/ ٣٤٧)

عـن نـافع أن ابن عمر –رضي الله عنه– كان يقصر الصلاة في مسيرة أربعة برد. (مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي ٢/ ٥٢٥، رقم: ٤٣٠٠)

اختـلـفـوا فـقيـل: أحد وعشرون، وقيل: ثمانية عشر، وقيل: خمسة عشر، والفتوى على الثاني. وفي المجتبى: فتوى أئمة خوارزم على الثالث. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٦٠٢، كراچی ١/ ١٢٣)

ثـم اختلفوا فقال بعضهم: أحد وعشرون فرسخا، وقال آخرون: ثـمانية عشر، وآخرون خمسة عشر. (فتـح الـقـدير، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، أشرفيه ٢/ ٢٩)

وفـي النهاية: الفتوى على اعتبار ثمانية عشر فرسخا، وفي المجتبى: فتوى أكثر أئمة خوارزم على خمسة عشر فرسخا. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا دارالكتاب ٢/ ٢٢٨، كراچی ٢/ ١٢٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/۱۱/۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۳۲۰/۴۰)

اتمام کے لئے پندرہ دن کا شمار کب سے؟

سوال [۳۳۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) نماز قصر جس دن گھر سے نکلیں اس دن سے پندرہ دن جوڑیں یا منزل پر پہنچ کر قصر لازم ہوتی ہے؟ (۲) اگر قصر میں اکیلا نماز پڑھے تو کتنی رکعت پڑھے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جو شخص مسافت شرعی یعنی تقریباً ۸۲؍ کلومیٹر کے

ارادے سے نکلے اور وہاں پر پندرہ دن قیام کا ارادہ نہیں ہے، تو وہاں پر قصر کرے گا۔ اور اگر پندرہ دن قیام کا رادہ ہے، تو ایسی صورت میں مکمل نماز پڑھے گا، نیز مسافت سفر کا اعتبار نکلنے کے وقت سے ہوگا۔ اور پندرہ دن کا اعتبار پہنچنے کے دن سے ہوگا۔

عن عبدالله بن عمر -رضي الله عنهما- قال: إذا كنت مسافرا فوطنت نفسک على إقامة خمسة عشر يوما، فأتمم الصلاة، وإن كنت لاتدري فاقصر، قال محمد: وبه نأخذ، وهو قول أبي حنيفة. (كتاب الآثار، باب الصلاة في السفر، الرحيم اكيڈمی، كراچی/ ٢٠١، رقم: ١٨٨)

من خرج من عمارة موضع إقامته قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها صلى الفرض الرباعي ركعتين، حتى يدخل موضع مقامه، أو ينوى إقامة نصف شهر. (درمختار على الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٥٩٩، ٦٠٥، كراچی ٢/ ١٢١-١٢٥)

عن عائشة -رضي الله عنها- قالت: فرضت الصلاة ركعتين، ثم هاجر النبي صلى الله عليه وسلم ففرضت أربعا، وتركت صلاة السفر على الأولى. (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، النسخة الهندية ١/ ٥٦٠، رقم: ٣٧٩٥، ف: ٣٩٣٥)

(٢) حالت سفر میں چار رکعت والی نماز تنہا پڑھنے کی صورت میں دو پڑھے گا۔ اور امام کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں امام کی اتباع کرتے ہوئے چار ہی پڑھے۔

عن عمر -رضى الله عنه- قال: صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم بمنى ركعتين، وأبو بكر بعده، وعمر بعد أبي بكر، وعثمان صدرا من خلافته، ثم إن عثمان صلى بعد أربعا، فكان ابن عمر إذا صلى مع الإمام صلى أربعا، وإذا صلاها وحده صلى ركعتين. (صحيح مسلم، الصلاة، فصل إذا صلى المسافر مع الإمام المقيم فليصل أربعا، النسخة الهندية ١/ ٢٤٣، بيت الأفكار، رقم: ٦٩٤)

إن اقتدى مسافر بمقيم أتم أربعا. (هندية، الباب الخامس عشر في صلاة

المسافر، قديم ۱/ ۱۳۳، جديد ۱/ ۲۰۲، هكذا في الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۰، زكريا ۲/ ۶۱۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۳/۳ھ

مسافت سفر کا شمار کہاں سے ہوگا؟

سوال [۳۳۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''احکام مسافر'' مصنفہ مولانا مفتی انعام الحق صاحب نے کتاب کے ص: ۶۷/ پر کفایت المفتی ۳/ ۳۵۳/ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مسافت سفر کا شمار اپنے اس مقام اور مکان سے ہوگا جہاں سے وہ سفر کا آغاز کر رہا ہے، نہ کہ حدود شہر سے نکلنے کے بعد۔ حضرت مفتی اعظمؒ فرماتے ہیں کہ ہیڈ کواٹر جہاں قائم رہتا ہے، وہاں سے مسافت سفر کا اعتبار ہوگا۔ ''احکام مسافر'' میں اگلا مسئلہ لکھا ہے کہ جس شہر میں جا رہا ہے اس کی حدود تک مسافت شرعی مکمل نہیں ہوتی؛ لیکن شہر کے جس حصہ میں پہنچنا ہے، وہاں تک مسافت پوری ہوجاتی ہے، تو اس سے وہ مسافر ہوگا؛ کیوں کہ مسافت کا شمار اس جگہ تک ہوتا ہے، جہاں قیام کرنا ہے، جب کہ آں محترم نے فتوی نمبر: ۹۴۹۷/ میں لکھا ہے کہ قصر واتمام کا دار ومدار آبادی کی سرحد کی ابتداء اور انتہاء سے ہوگا الخ اشارۃً لکھا ہے، پوری تفصیل رجسٹر میں موجود ہوگی، معلوم یہ کرنا ہے، اس سلسلے میں راجح اور مفتی بہ قول کونسا ہے؟

المستفتي: عبد الرشید قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ''احکام مسافر'' مصنفہ مولانا مفتی انعام الحق صاحب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور ''کفایت المفتی'' (۳/ ۳۵۳، زکریا مطول ۱۱/ ۵۳۶)

پرتراویح سے متعلق بحث ہے، مسائل سفراور قصرواتمام سے متعلق کوئی مسئلہ اس صفحہ میں نہیں ہے، ہاں البتہ ''کفایت المفتی ۳/ ۳۳۲، زکریا مطول ۵/ ۷۷'' پرایک مسئلہ سے اس طرف اشارہ ملتا ہے، جیسا کہ آنجناب نے سوال میں لکھا ہے، اب اصل مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے،مسئلہ یہ ہے کہ اگر چھوٹے یا اوسط درجہ کا شہر ہے، جیسا کہ مرادآباد، سہارنپور، مظفرنگر وغیرہ، یا گاؤں اور قصبہ ہے، جہاں سے سفر شروع کیا جارہا ہے، وہ بھی چھوٹا شہر یا اوسط درجہ کا شہر یا قصبہ یا گاؤں ہے۔ اور جہاں پہنچنا ہے، اس کا بھی یہی حال ہے، تو مسئلہ وہی ہے جو فقہاء کی عام عبارات اور جزئیات سے واضح ہوتا ہے، جس کو احقر نے ۴؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ میں لکھا ہے، جس کا نمبر شمار الف ۸/ ۹۴۹۷ رہے؛ لیکن اگر شہر بہت بڑا ہو جس کی ایک جانب اس کے مقابل کی دوسری جانب کے لوگوں کے لئے بالکل اجنبی شمار ہوتی ہو، جیسا کہ دہلی کے ایک کنارے غازی آباد ہے، اس کے مقابل دوسرے کنارہ پر فرید آباد ہے، مگر فرید آباد سے غازی آباد تک تسلسل آبادی ہے، اسی طرح نوئیڈا سے اس کے مقابل دوسری جانب پنجاب روڈ اور گڑ گاؤں ہے، ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبیت ہے، یہی حال شہر بمبئی، کلکتہ، بنگلور، مدراس، کراچی وغیرہ کا ہے، تو اتنے بڑے شہر کا حکم عام شہر اور قصبات سے الگ ہوگا کہ اتنے بڑے شہر سے اگر سفر کا ارادہ ہے، تو اپنے ایریا اور حدود سے تجاوز کرنے پر قصر صلاۃ کا حکم لاگو ہوگا، پورے شہر کے تسلسل آبادی مکمل ختم ہوجانے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ اور آگے جہاں جانا ہے وہ اگر اتنا بڑا شہر نہیں ہے، اوسط درجہ کا یا چھوٹا شہر ہے، اس میں پندرہ روز یا اس سے زائد قیام کا ارادہ ہے، تو اس کی آبادی کی حدود میں داخل ہوتے ہی، قصر کا حکم ختم ہوجائے گا۔ اور اگر جہاں جانا ہے، وہ بمبئی، کلکتہ، مدراس وغیرہ جیسے ہیں، تو صرف حدود میں داخل ہونے سے قصر کا حکم ختم نہیں ہوگا؛ بلکہ جس جگہ قیام کرنا ہے، اس کے ایریا کے حدود میں داخل ہونے کا اعتبار ہوگا، حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ نے بھی ''فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۶۴'' میں تقریباً ایسا ہی جواب لکھا ہے؛ لہٰذا اگر ''کفایت المفتی'' کا مسئلہ اسی طرح ہے، تو وہ بڑے شہر سے متعلق ہوگا۔ اور اس مسئلہ کی پوری تفصیل ہماری کتاب ''انوار رحمت'' ص:

۸۱/اور ''انوار مناسک'' ص:۴۶۴/ پر موجود ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔ اور آنجناب نے ۴/ ربیع الاول کے لکھے ہوئے فتوی کے سوال میں شہر مرادآباد کو پیش کیا ہے۔ اور مرادآباد اتنا بڑا شہر نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۹/۳/۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۲۰ھ

مسافر کہاں سے نمازوں میں قصر شروع کرے گا؟

سوال [۳۳۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسافر شخص کہاں سے کہاں تک جا کر قصر کرے گا؟ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کا مرادآباد سے سہارنپور کے آخری حصہ میں جاکر ۴۸/ میل شرعی حد کے اعتبار سے ہو تو کیا وہ شخص سہارنپور کے اسٹیشن پر جا کر قصر کرے گا یا نہیں یا جہاں پر ۴۸/ میل شرعی اعتبار سے ختم ہو رہا ہے، وہاں جا کر قصر کرے گا، یا اس ۴۸/ میل سے آگے جا کر قصر کرے گا؟

المستفتي: محمد اکرام علی، بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب سفر شرعی یعنی مسافت سفر طے کرنے کے ارادہ سے اپنی آبادی سے باہر ہو جائے گا، تو وہاں سے نماز کا قصر کرنا لازم ہو جاتا ہے، یعنی مرادآباد کی آبادی سے باہر نکلنے کے بعد ہی سے قصر کرنا لازم ہو جائے گا؟

عن أبي حرب بن أبي الأسود الديلي: أن عليا لما خرج إلى البصرة رأي خصا، فقال: لو لا هذا الخص لصلينا ركعتين، فقلت: ما خصا؟ قال: بيت من قصب. (مصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب المسافر، متى يقصر إذا خرج مسافرا؟ المجلس العلمي ۲/ ۵۲۹، برقم: ۴۳۱۹)

ولو جاوز العمران من جهة خروجه، وكان بحذائه محلة من الجانب الآخر يصير مسافرا إذ المعتبر جانب خروجه. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۰۰، كراچى ۲/ ۱۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رشوال ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۸۱)

مسافت سفر سے کم سفر کی صورت میں آدمی مقیم ہے

سوال [۳۳۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جون کے ''ندائے شاہی'' ماہنامہ میں سفر سے متعلق بہت سے شبہات الحمد للہ دور ہوگئے، مگر ایک خلجان باقی ہے، ہمارے ساتھی نہٹور، دھام پور، نگینہ وغیرہ یعنی قریبی قصبات اور دیہات میں مدرسہ اور مسجد میں پڑھاتے ہیں، سنیچر کی صبح کو جاتے ہیں اور جمعرات کی شام کو گھر آجاتے ہیں، اس طرح کے ائمہ اور معلمین جب مدرسہ سے سفر میں جائیں اور واپسی بھی مدرسہ یا مسجد میں کریں، تو یہ اتمام اور قصر کے بارے میں کیا فیصلہ کریں؟ کیا ان کا چھ دن مدرسہ یا مسجد میں رہنا یہ وطن اصلی کے حکم میں ہوگا یا وطن اقامت ہی رہے گا؟ اور ان کا ہر ہفتہ جمعرات کو گھر آنا اور سنیچر کو مدرسہ اور مسجد جانا یہ علی سبیل القرار رہائش میں آئے گا یا نہیں؟

المستفتي: سعید احمد قاسمی، سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: آپ کے جو ساتھی مسافت سفر سے کم مسافت پر واقع دیہات وقصبات میں مدرسے اور مسجدوں میں پڑھاتے ہیں، ان کا اپنے گھر آنے جانے سے قصر واتمام میں کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ ہمیشہ مقیم ہی رہتے ہیں، وہ اپنے گھر سے آکر مدرسہ اور مسجد میں بدستور امامت کرسکتے ہیں؛ کیوں کہ ان کا سفر مسافت سفر کے طور پر نہیں۔

رجل خرج من مصره إلى قرية لحاجة ولم يقصد السفر، ونوى أن

يقيم فيها أقل من خمسة عشر يوما، فإنه يتم فيها؛ لأنه مقيم. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۳، زكريا ۲/ ٦١٤، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۲٤۱، كوئٹه ۲/ ۱۳۷، تبيين الحقائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، إمداديه ملتان ۱/ ۲۱٤، زكريا ۱/ ۵۱۸)

نوٹ: یہ حکم جائے ملازمت سے صرف گھر آنے جانے سے متعلق ہے۔ اور اگر جائے ملازمت سے مسافت سفر پر دوسری جگہ جانا ہے، تو اس کا حکم دوسرا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۶/۱۶ھ

پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں آدمی مقیم نہیں ہوتا

سوال [۳۳۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید علی گڑھ میں پڑھتا ہے اور رامپور میں اس کا گھر ہے، زید اپنے گھر آتا ہے، پھر زید کو دس یا بارہ دن کے لئے کسی کام سے علی گڑھ جانا ہے اور اب ان دس یا بارہ ایام میں زید پر کیا حکم لگے گا، اس مدت میں زید اپنی نمازیں قصر پڑھے گا یا پوری پڑھے گا؟ علی گڑھ اور رامپور کے درمیان تقریباً دوسو کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

المستفتي: خورشید احمد سوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب کہ زید صرف دس بارہ دن کی نیت سے علی گڑھ کا سفر کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں زید وہاں مسافر رہے گا۔ اور اس پر قصر لازم ہوگا۔ اور آدمی ۸۲/ کلومیٹر ۲۹۶/ میٹر میں مسافر ہو جاتا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ۶۸)

عن عبدالله بن عمر –رضي الله تعالىٰ عنهما– قال: إذا كنت مسافرا

فوطنت نفسک علی إقامة خمسة عشر یوما، فأتمم الصلاة، وإن کنت لا تدري فاقصر، قال محمد: وبه نأخذ، وهو قول أبي حنیفة. (کتاب الآثار للإمام محمد، باب الصلاة في السفر، الرحیم اکیڈمی کراچی، ص: ۲۰۱، رقم: ۱۸۸)

قاصدا مسیرة ثلاثة أیام ولیالیها من أقصر أیام السنة بالسیر الوسط مع الاستراحات المعتادة صلی الفرض الرباعي رکعتین وجوبا. (درمختار مع الشامي، کتاب الصلاة، باب الصلاة المسافر، کراچی ۲/ ۱۲۲، زکریا ۲/ ۶۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ ۱۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ (الف فتویٰ نمبر: ۹۲۸۲/۳۸)	الجواب صحیح: احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ ۱۰/۵/۱۴۲۸ھ

کلکتہ سے فجر پڑھ کر بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچا تو فجر کے وقت کے بیس منٹ باقی ہیں

سوال [۳۳۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کلکتہ سے فجر کی نماز اول وقت میں پڑھ کر ہوائی جہاز پر سوار ہوکر دہلی آیا جب دہلی آیا تو اس وقت نماز فجر کے وقت ہونے میں بیس منٹ باقی تھے، کیا اس شخص پر نماز فجر دوبارہ لازم ہوگی؟ اس مسئلہ کو اختلاف علماء مع دلائل واضح تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ فقط والسلام

المستفتي: ابوسعید ۲۴؍ پرگنہ، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: شوافع کے نزدیک مذکورہ شخص پر نماز فجر دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔ اور احناف کے یہاں اقرب الی الفقہ یہی ہے کہ دوبارہ پڑھنا واجب نہیں ہے۔

فلو غربت ثم عادت هل یعود الوقت؟ الظاهر نعم، وهي الوسطی

علی المذهب (وفي الشامية) بحث لصاحب النهر حيث قال: ذكر الشافعية أن الوقت يعود –إلى قوله– قلت: على أن الشيخ إسماعيل ردما بحثه في النهر تبعا للشافعية، بأن صلاة العصر بغيبوبة الشفق تصير قضاء، ورجوعها لا يعيدها أداء، وما في الحديث خصوصية لعلى كما يعطيه –إلى قوله– قلت: ويلزم على الأول بطلان صوم من أفطر قبل ردها، وبطلان صلاته المغرب لو سلمنا عود الوقت بعودها للكل. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، مطبوعه كوئٹه ١/ ٢٦٥، شامي مصري ١/ ٣٣٤، كراچی ١/ ١٦٠– ٣٦١، زكريا ٢/ ١٧، أحسن الفتاوى ٤/ ٦٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۳۱)

مسافر کے پیچھے مقیم کی نماز

سوال [۳۳۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پانچ علماء وفضلاء کرام کی موجودگی میں جو کہ مقیمین ہیں، کسی مسافر آدمی کو امامت کے لئے بلایا جائے عیدین میں جو کہ اس درجہ کا نہیں ہے، آیا اس کے پیچھے مقیمین کی نماز صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتي: محمد انوار حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جی ہاں مسافر کے پیچھے مقیمین کی نماز صحیح ہوجاتی ہے۔

عن عمران بن حصين –رضي الله عنه– قال: غزوت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وشهدت معه الفتح، فأقام بمكة ثماني عشرة ليلة لا يصلي إلا ركعتين، ويقول: يا أهل البلد! صلوا أربعا، فإنا قوم سفر. (سنن أبي

داؤد، الصلاة، أبواب صلاة السفر، باب متی یتم المسافر؟ النسخة الهندیة ۱/ ۱۷۳، دارالسلام، رقم: ۱۲۲۹، المعجم الکبیر للطبراني، داراحیاء التراث العربي ۱۸/ ۲۰۹، رقم: ۵۱۷)

وصح اقتداء المقیم بالمسافر في الوقت وغیره. (الدرالمختار، کتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، کراچی ۲/ ۱۲۹، زکریا ۲/ ۶۱۰-۶۱۱، مصري ۱/ ۷۴۰)

نیز علماء وفضلاء کی نماز کم علم والے کے پیچھے ہوجاتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۴۶۵)

جس شہر کی مسافت شرعی مسافت سے بڑی ہو، اس میں شرعی مسافت کہاں سے بنے گی؟

سوال [۳۳۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض شہروں میں آبادی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ وہاں کے رہنے والے سفر کے ارادہ سے نکلیں اور سفر کی شرعی مسافت بھی پار کر جائیں تب بھی اس شہر کی آبادی ختم نہیں ہوتی؛ بلکہ اور باقی رہتی ہے، تو وہ شرعی مسافر کہاں سے بنیں گے اور نمازوں میں قصر ان پر کہاں سے لازم ہوگا؟

المستفتي: عبدالرؤف قاسمی گنگوہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر اتنا بڑا شہر ہے جس کے ایک طرف سے سفر شروع کیا جائے تو دوسرے کنارے تک پہنچتے پہنچتے مسافت سفر کے قریب مسافت ہوجاتی ہے، تو ایسے شہر کا حکم صراحت کے ساتھ حدیث وفقہ میں ملنا ممکن نہیں ہے؛ اس لئے کہ دور نبوت، دور صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے دور میں اس قدر وسیع ترین شہروں کا تصور بھی نہیں تھا؛ اس لئے اصولی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے شہروں کا حکم عام شہروں کی طرح نہیں ہوگا؛ بلکہ

عام شہروں سے الگ ہوگا، اتنے بڑے شہروں کے متعلق حکم شرعی یہ ہوگا کہ اس کا ہر ایریا اور ہر کارپوریشن سے متعلق علاقے الگ الگ شمار کئے جائیں گے، جیسے دہلی کی آبادی ایک طرف سے غازی آباد سے متصل ہوگئی اور اس کے بالمقابل دوسری طرف صوبہ ہریانہ کے شہر فرید آباد سے مل گئی، گویا دہلی شہر کی آبادی نے صوبہ دہلی سے تجاوز کرکے صوبہ اترپردیش اور صوبہ ہریانہ کے بعض شہروں کو اپنے اندر شامل کرلیا ہے؛ اس لئے غازی آباد کا شخص پورے دہلی کو پار کرکے فرید آباد ہوتے ہوئے متھرا اور آگرہ کے راستہ سے سفر کرے، تو مسافر ہونے کے لئے پورے دہلی کو پار کرکے فرید آباد بھی پیچھے چھوڑنے کے بعد مسافر نہیں ہوگا؛ بلکہ غازی آباد کی اصل حدود کو پار کرتے ہی مسافر شمار ہوجائے گا، اسی طرح نویڈا کا آدمی اسی طرح سفر کرنا چاہے تو حدود نویڈا تجاوز کرنے کے بعد مسافر شمار ہوگا، یہ حکم صرف اسی طرح کے شہروں سے متعلق ہے، عام شہروں سے متعلق نہیں ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت، ص: ۸۱-۸۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/۸/۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۸/۱۴۲۷ھ

ایک شہر میں ۱۸/دن ٹھہرنے کی نیت کی پھر دوسرے میں تین دن گزارے

سوال [۳۳۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں آسام سے بغرض تجارت اپنی اہلیہ کے ساتھ مراد آباد ۱۸/دن ٹھہرنے کے لئے آیا ہوں، اتفاق سے تین دن کے بعد امبالہ جانے کی نوبت پیش آئی، میں انبالہ سے تین دن کے بعد مراد آباد آگیا، معلوم یہ کرنا ہے کہ اب میں مراد آباد میں نماز کا اتمام کروں گا یا قصر؟

المستفتي: عبد الرشید، سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب آپ نے مراد آباد میں اٹھارہ دن قیام کا ارادہ کیا تو مراد آباد سے کہیں دوسری جگہ لمبا سفر کرنے سے پہلے تک آپ یہاں مقیم رہیں گے اور نمازوں

کا اتمام کریں گے۔ اور جب آپ نے انبالہ کا سفر شروع کردیا تو مرادآباد کی اقامت ختم ہوگئی؛ کیوں کہ امبالہ مرادآباد سے لگ بھگ تین سو کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ اور جب امبالہ سے لوٹ کر مرادآباد آگئے ہیں تو مرادآباد میں ازسرنو پندرہ دن یا اس سے زائد کا ارادہ ہو تو مقیم رہیں گے اور نمازوں کا اتمام کریں گے۔ اور اگر پندرہ دن سے کم کا ارادہ ہے، جیسا کہ سوال نامہ سے یہی سمجھ میں آرہا ہے، تو آپ مرادآباد میں اب مقیم نہیں رہے؛ لہٰذا نمازوں کا قصر کرنا لازم ہوگا۔

عن عبدالله بن عمر قال: إذا كنت مسافرا فوطنت نفسك على إقامة خمسة عشر يوما، فأتمم الصلاة، وإن كنت لاتدري فاقصر، قال محمد: وبه نأخذ، وهو قول أبي حنيفة. (كتاب الآثار، للإمام محمد، باب الصلاة في السفر، رحيم اكيڈمى كراچى/ ۲۰۱، رقم: ۱۸۸)

ويبطل وطن الإقامة بمثله، وبالوطن الأصلي، وبإنشاء السفر الخ. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچى ۲/ ۱۳۲، زكريا ۲/ ۶۱۴، نور الإيضاح، باب صلاة المسافر، إمداديه ديوبند، ص: ۱۰۴، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب صلاة المسافر، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۴۲۹)

من خرج من عمارة موضع إقامته ...... قاصدا ...... مسيرة ثلاثة ايام ولياليها ...... صلى الفرض الرباعي ركعتين، حتى يدخل موضع مقامه ...... أو ينوى إقامة نصف شهر بموضع واحد، فيقصر إن نوى الإقامة في أقل منه، أي في نصف شهر. (شامي مع درمختار، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۵۹۹-۶۰۵، كراچى ۲/ ۲۲۱-۲۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رصفر ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲/۲۴/ ۱۴۳۴ھ

نوح سے دہلی آنے والا مسافر نہیں ہے

سوال [۳۳۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں علاقہ میوات نوح کا رہنے والا ہوں، ہمارے یہاں سے دہلی کی حکومتی حد تقریباً پچاس کلومیٹر دور ہے، جب کہ پرانی دہلی کی حد ہمارے یہاں سے مسافت شرعی کے بقدر ہوجاتی ہے؛ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہمارے یہاں سے پرانی دہلی کے ارادے سے سفر کرنے والا شخص مسافر شرعی کہلائے گا یا نہیں؟ وہ شخص دوران سفر قصر کرے گا یا اتمام کرے گا؟

المستفتي: محمد افضل میواتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پرانی دہلی اور نئی دہلی نام کی الگ الگ ہیں اور وجود میں دونوں کا اتصال ایسا ہے کہ ان کو دو نہیں کہا جاسکتا؛ بلکہ دونوں ایک ہیں؛ اس لئے آپ کے یہاں سے پرانی دہلی آنے والے مسافر نہیں ہوں گے؛ بلکہ مقیم ہی ہوں گے، ان کے لئے قصر کرنا درست نہیں ہے، اتمام لازم ہے۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۱/۵۱۴)

والقرية المتصلة بالفناء دون الربض لاتعتبر مجاوزتها على الصحيح كما في شرح المنية. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۲۱، زكريا ۲/ ۶۰۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۵/ ۳۱، هندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱۳۹، جديد ۱/)

وإن كان هناك قرية متصلة بربض المصر فلابد من مجاوزتها على الصحيح، وإن كانت متصلة بفنائه دون ربضه لا تعتبر مجاوزتها على الصحيح. (حلبي كبير، الصلاة، فصل المسافر، أشرفيه ديوبند، ص: ۵۳۷)

ذكر الأسبيجابي: المقيم إذا قصد مصرا من الأمصار، وهو ما دون مسيرة ثلاثة أيام، لا يكون مسافرا. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۲۲۸، کوئٹہ ۲/ ۱۲۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۷/۸ھ

’’ایضاح المسائل‘‘ کے ایک مسئلہ کی وضاحت

سوال [۳۳۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احقر کو اپنی کم فہمی کی بنا پر ’’ایضاح المسائل‘‘ ص: ۲۶ رمسئلہ: ۲ر سے متعلق ایک اشکال ہے، وہ یہ ہے کہ مسئلہ: ۲ر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وطن اصلی متعدد ہوتے ہیں اور وطن اصلی وطن اصلی سے باطل نہیں ہوگا۔ اور فقہ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن اصلی وطن اصلی سے باطل ہوجائے گا، جیسا کہ ’’نور الایضاح‘‘ ص: ۱۰۲ر پر موجود ہے، حضرت سے عاجزانہ التماس ہے کہ ان دونوں عبارتوں میں بظاہر جو تعارض نظر آتا ہے اس کو بالتفصیل حل فرمائیں۔

المستفتي: وسیم احمد غفرلہ مدرسہ عربیہ حسینیہ صدیقۃ العلوم ہریدوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ’’نور الایضاح‘‘ کی عبارت بھی اپنی جگہ صحیح ہے اور ’’ایضاح المسائل‘‘ کی عبارت بھی اپنی جگہ صحیح ہے، شاید تھوڑا سا غور کرنے میں کمی رہ گئی ہے، وطن اصلی دوسرے وطن اصلی سے اس وقت باطل ہوتا ہے جب کہ پہلے وطن اصلی میں رہائش کا ارادہ نہ ہو اور نہ ہی اس کو باقی رکھنے کا ارادہ ہو، یہی ’’نور الایضاح‘‘ کی عبارت کا مطلب ہے؛ لیکن اگر پہلے وطن اصلی کو باقی رکھنے کا ارادہ ہے، پھر مسافت سفر میں دوسرا وطن اصلی بنا

لیتا ہے، دونوں میں سے کسی ایک کوختم کرنے کا ارادہ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں دونوں کو وطن اصلی کہا جائے گا۔ اور دونوں ہی باقی رہیں گے۔ اور وطن تاہل یعنی جہاں بیوی کو رکھ رہا ہے، وہ بھی وطن اصلی کے حکم میں ہوتا ہے، اسی وجہ سے ''ایضاح المسائل'' میں ایک قید خاص طور پر لگائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ مراد آباد وطن اصلی ہے اور اس کو باقی بھی رکھا ہے، اس کے بعد دہلی میں مستقل کاروبار اور اہل وعیال کے ساتھ رہتا ہو۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الاولی ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۷۸۲/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۵/۲۹ھ

بریلی اور ہردوئی آمدورفت کرنے والے کا مسئلہ

سوال [۳۳۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی شخص ہردوئی میں رہتا ہے اور پڑھا رہا ہے بریلی میں، جب وہ ہردوئی میں اپنے گھر گیا، گھر سے پھر بریلی پڑھانے آیا؛ لیکن وہ وہاں ٹھہرا نہیں، گاڑی میں سوار ہے، پھر اس نے ارادہ کرلیا کہ رامپور بھی جانا ہے اور بریلی سے رامپور تک سفر طے کرنے میں مسافر نہیں بنتا ہے، تو کیا رامپور میں قصر پڑھے گا؟ اگر ہردوئی سے ہی ارادہ کیا کہ بریلی سے دو دن کے بعد میں پھر ہردوئی آجاؤں گا، ہردوئی سے بریلی آیا اور گاڑی سے اترنے کے بعد ہی فوراً اس نے ارادہ کیا کہ بریلی سے دہلی بھی جانا ہے، پہلے اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا، جب گاڑی سے بریلی میں اترا تھا تو ظہر کا وقت تھا، تو اب بریلی میں کیا اتمام لازم ہوگا؟

المستفتي: محبوب اناوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ہردوئی اور بریلی کے درمیان میں مسافت سفر کا فاصلہ ہے۔ اور ہردوئی وطن اصلی ہے، اور بریلی وطن اقامت ہے، اب اگر بریلی میں اس نے

اہل وعیال کونہیں رکھا ہے اور نہ اسے وطن اصلی بنایا ہے، تو حکم یہ ہے کہ وہ جب بھی ہردوئی سے بریلی پندرہ روز سے کم قیام کی نیت سے جائے گا تو پورے سفر میں اور بریلی کے دوران قیام میں قصر لازم ہوگا، اس اصولی مسئلہ کے بعد سوال نامہ کے دونوں پہلو کو سمجھنا چاہئے، پہلا پہلو ہردوئی سے صرف بریلی تک سفر کا ارادہ ہے، نیز وہاں پندرہ دن یا اس سے زیادہ قیام کا ارادہ ہے، اب وہ بریلی شہر پہنچ کر مقیم ہوگیا، اس کے بعد رامپور کا ارادہ ہوگیا اور رامپور بریلی کے درمیان مسافت سفر کا فاصلہ نہیں ہے؛ لہٰذا رامپور جاکر بریلی واپس آنے تک کے درمیان قصر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہردوئی سے روانہ ہوتے وقت بریلی میں پندرہ دن سے کم قیام کا ارادہ ہے، پھر وہاں سے دہلی جانے کا بریلی پہنچنے کے بعد یا پہلے ہی ارادہ ہوا، دونوں صورتوں میں ہردوئی سے روانہ ہونے کے بعد سے پھر ہردوئی واپس آنے تک یا بریلی یا کسی جگہ پندرہ دن یا اس سے زائد قیام کے ارادہ کرنے تک مسافر رہے گا۔ اور قصر لازم ہوگا۔

عن أنس بن مالک –رضي الله عنه– قال: صليت الظهر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بالمدينة أربعا، والعصر بذي الحليفة ركعتين. (صحيح البخاري، الصلاة، باب يقصر إذا خرج من موضعه، النسخة الهندية ١/ ١٤٨، رقم: ١٠٧٨، ف: ١٠٨٩)

عن مجاهد قال: كان ابن عمر إذا أجمع على إقامة خمس عشرة، سرح ظهره وصلى أربعا. (المصنف لابن أبي شيبة، الصلاة، من قال: إذا أقام على خمسة عشر أتم، موسسة علوم القرآن ٥/ ٣٨٤، رقم: ٨٣٠١، مصنف عبدالرزاق، باب الرجل يخرج في وقت الصلاة، المجلس العلمي ٢/ ٥٣٤، رقم: ٤٣٤٨)

عن مجاهد، عن عبدالله بن عمر –رضي الله عنهما– قال: إذا كنت مسافرا، فوطنت نفسک على إقامة خمس عشر يوما، فأتمم الصلاة، وإن كنت لا تدري فاقصر، قال محمد: وبه نأخذ، وهو قول أبي حنيفة. (كتاب

الآثار، للإمام محمد، باب الصلاة في السفر، الرحیم اکیڈمی، کراچی، ص: ۲۰۱، رقم: ۱۰۸)

من خرج من عمارة موضع إقامته، قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها، بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة، صلى الفرض الرباعي ركعتين، ولو عاصيا بسفره حتى يدخل موضع مقامه، أو ينوي إقامة نصف شهر بموضع صالح لها. (تنوير الأبصار مع الرد، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۵۹۹-۶۰۵، کراچی ۲/ ۲۲۱-۲۲۵)

وأما وطن الإقامة: فهو الوطن الذي يقصد المسافر الإقامة فيه، وهو صالح لها نصف شهر، وهو ينتقض بواحد من ثلاثة: بالأصلي؛ لأنه فوقه، وبمثله، وبالسفر؛ لأنه ضده. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۲۳۶، کوئٹہ ۲/ ۱۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۸؍شعبان ۱۴۱۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۸۱)	۱۴۱۹/۸/۹ھ

ایک جگہ ۱۵؍دن قیام کا ارادہ مگر دن میں دیگر مقامات کا دورہ کرتا رہے تو کیا حکم؟

سوال [۳۳۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید دہلی کا باشندہ ہے اور مرادآباد میں ۱۵؍دن سے زائد قیام کرنے کا ارادہ ہے، اب وہ مرادآباد میں راستہ بھٹک کر زیرو پوئنٹ کے پاس سے دھوکہ میں ڈائرکٹ رامپور چلا گیا اور رامپور سے رات میں مرادآباد آ گیا۔ اور اس کو اب مرادآباد میں ہی ۱۵؍دن قیام کرنا ہے اور مرادآباد میں رہ کر کے روزانہ دن میں کبھی کانٹھ، کبھی امروہہ، کبھی سنبھل، کبھی چندوسی اور کبھی ٹھاکردوارہ جانا ہے؛ لیکن رات مرادآباد میں ہی آ کر گزارنی ہے، تو ایسی صورت میں مرادآباد میں قیام کے دوران آس پاس جو جانا ہے، ان سب جگہوں میں قصر کرے گا یا اتمام؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید جب تک مرادآباد میں داخل نہیں ہوگا اس وقت تک مسافر رہے گا؛ لہٰذا جب ڈائریکٹ رامپور چلا گیا تو وہاں قصر کرے گا؛ لیکن جب مرادآباد میں آکر پندرہ روز قیام کا ارادہ کرلیا ہے، تو وہ مرادآباد میں شرعی طور پر مقیم ہوگیا ہے، پھر وہاں سے آس پاس مثلاً امروہہ، کانٹھ، سنبھل، چندوسی کا دورہ کرتا رہتا ہے، اور رات مرادآباد ہی میں آکر گذارتا ہے، تو اب زید مرادآباد اور آس پاس کی سب جگہوں پر اتمام کرے گا اس کے لئے قصر جائز نہیں۔

فأما إذا عزم على أن يقيم بالليالى في أحد الموضعين، ويخرج بالنهار إلى موضع آخر، فإن دخل أولا الموضع الذي عزم الإقامة فيه بالنهار لا يصير مقيما، وإن دخل أولا الموضع الذي عزم فيه الإقامة بالليالى يصير مقيما، ثم بالخروج إلى موضع الآخر لا يصير مسافرا؛ لأن موضع إقامة الرجل حيث يبيت فيه. (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ٢/ ٤٩٩، رقم: ٣١٠٧، مبسوط سرخسي، باب صلاة المسافر، دار الكتب العلمية، بيروت ١/ ٢٣٧)

فإن نوى المسافر أن يقيم بالليالي في أحد الموضعين، ويخرج بالنهار إلى الموضع الآخر، فإن دخل أولا الموضع الذي نوى المقام فيه بالنهار لا يصير مقيما، وإن دخل الموضع الذي نوى الإقامة فيه بالليالي يصير مقيما، ثم بالخروج إلى الموضع الآخر لا يصيرا مسافرا؛ لأن موضع إقامة الرجل حيث يبيت فيه. (بدائع الصنائع، صلاة المسافر، فصل في بيان ما يصير المسافر به مقيما، زكريا ١/ ٢٧٠، قديم كراچی ١/ ٩٨)

ولو نوى الإقامة خمسة عشر يوما بقريتين النهار في إحداهما والليل في الأخرى يصير ميقيما إذا دخل التي نوى البيتوتة فيها، هكذا في محيط

السرخسي، ولا يصير مقيما بدخوله أولا في القرية الأخرى، كذا في الخلاصة. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱٤۰، جديد ۱/ ۲۰۰)

وكذا إن نوى خمسة عشر يوما بموضعين لا يصير مقيما إلا إن نوى أن تكون بيتوتته في أحدهما. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، أشرفيه ديو بند/۵۳۹)

ولو نوى الإقامة في موضعين خمسة عشر يوما لا يصير مقيما إلا أن ينوي أن يقيم لياليها في أحدهما وأيامها في أخرى، فإنه يصير مقيما إذا دخل القرية التي نوى الإقامة فيها خمسة عشر ليلة، ولا يصير مقيما بدخوله أولا في القرية الأخرى. (خلاصة الفتاوى، باب صلاة المسافر، اشرفيه ديو بند ۱/ ۱۹۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۲/۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۳۷)

ہرتھلا اور پاکبڑہ مرادآباد میں شامل ہو کر مقام واحد

سوال [۳۳۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں دہلی کا باشندہ ہوں اور کاروبار کے سلسلے میں مرادآباد بار بار آنا ہوتا ہے اور بسا اوقات ۱۵/دن تک بھی قیام رہتا ہے؛ لیکن درمیان میں ایک دو راتوں میں ''ہرتھلا'' اور ''پاکبڑہ'' بھی قیام رہتا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ گذشتہ زمانہ میں دونوں قصبوں کا فاصلہ مرادآباد سے ۱۰/کلومیٹر رہا ہے، جب کہ آج مرادآباد کی آبادی ہرتھلہ سے آگے بڑھ چکی ہے، اورادھر پاکبڑہ تک پہنچ چکی ہے، تو آپ سے سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہرتھلا اور پاکبڑہ مرادآباد میں شامل ہوگا یا نہیں؟ اگر شامل ہے تو مذکورہ صورت میں میرے اوپر اتمام لازم ہوگا

یا نہیں؟ اور اگر شامل نہیں ہے، تو پھر میں مراد آباد کے قیام میں مسافر ہوں اور قصر کرنا لازم ہے؛ لہٰذا بتائیے میں کیا کروں؟

المستفتي: فرقان مہاراشٹری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: جب مراد آباد کی آبادی تسلسل کے ساتھ بڑھتے ہوئے ''پاکبڑہ'' اور ہرتھلا سے متصل ہوگئی تو یہ دونوں جگہ بھی مراد آباد کا جزو بن کر مراد آباد میں شامل ہوگئیں؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں جب آپ نے مراد آباد میں ۱۵/دن قیام کا ارادہ کیا ہے، تو آپ مراد آباد میں مقیم ہوگئے اور اتمام لازم ہے، اگرچہ درمیان میں آپ کو ایک دو رات ہرتھلا اور پاکبڑہ میں بھی قیام کرنا ہو۔ (مستفاد: امداد الفتاوی زکریا ۱/ ۶۶۷، انوار مناسک/ ۴۵۹)

یعتبر مجاوزة عمران المصر لا غیر إلا إذا کان ثمة قریة أو قری متصلة بربض المصر، فحینئذ تعتبر مجاوزة القری. (هندية، کتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زکریا قدیم ۱/ ۱۳۹، جدید ۱/ ۱۹۹، مجمع الأنهر، کتاب الصلاة، باب المسافر، مکتبه فقیه الامت دیوبند ۱/ ۲۳۸، تاتارخانية، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زکریا ۲/ ۴۹۵، برقم: ۳۰۹۸)

إذا کانت قریة أو قری متصلة بربض المصر لا یقصر حتی یجاوزها. (فتح القدیر، کتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، کوئٹه ۲/ ۸، زکریا ۲/ ۳۳)

المسافر إذا خرج من المصر وبقرب من المصر قریة إن کانت القریة متصلة بالمصر لا یقصر الصلاة؛ لأنها من جملة المصر. (الولوالجية، کتاب الطهارة، الفصل الثاني عشر في السفر، دارالایمان سهارنپور ۱/ ۱۳۱، السراجیة، مکتبه اتحاد دیوبند ص: ۷۷) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۷۹)

دو الگ الگ مقاموں کے بلد واحد ہونے کا مدار اتصال پر ہے

سوال [۳۳۶۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسافر کے لئے صحت اقامت کا مدار بلد واحد پر ہے اور بلد واحد ہونے کا مدار اتصال پر ہے، یا پرانی حدود پر؟ واضح فرمادیں عین نوازش ہوگی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دو الگ الگ مقاموں کے بلد واحد ہونے کا مدار اتصال پر ہے، نہ کہ پرانی حدود پر، یعنی جب آبادیاں بڑھتی ہوئی ایک دوسرے سے مل جائیں تو دونوں ایک آبادی کے حکم میں ہوں گی۔

والقريتان المتدانيتان المتصل بناء إحداهما بالأخرى، أو التي يرتفق أهل إحداهما بالأخرى فهما كالقرية الواحد. (الموسوعة الفقهية كيوت ٢٧/ ٢٧٩، المغني دارالفكر بيروت ٢/ ٥٠، الفقه الإسلامي وأدله، صلاة المسافر، شروط القصر، الهدى انٹر نيشنل ديو بند ٢/ ٢٩٦)

المسافر إذا خرج من المصر وبقرب من المصر قرية إن كانت القرية متصلة بالمصر لا يقصر الصلاة؛ لأنها من جملة المصر. (الولوالجية، كتاب الطهارة، الفصل الثاني عشر في السفر، دارالايمان سهارنپور ١/ ١٣١، الفتاوى السراجية اتحاد، ص: ٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۵۰۵/۴۰)

شہر سے متصل باہر کی طرف پھیلی ہوئی آبادی بھی شہر کے حکم میں

سوال [۳۳۶۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: شہر کی آبادی شہر سے باہر کی طرف پھیلتی جارہی ہے، تو جتنی آبادی اتصال کے ساتھ پھیلتی جارہی ہے وہ سب شہر کے حکم میں داخل ہوگی یا شہر سے الگ شمار ہوگی؟

المستفتي: قاسم بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جس شہر کی نئی آبادی شہر سے باہر کی طرف پھیلتی جارہی ہے وہ شہر سے متصل ہوکر تسلسل کے ساتھ جہاں تک آگے کو پہنچ جائے گی وہاں تک پوری کی پوری شہر ہی کے حکم میں شمار ہوگی۔

وإذا كانت قرية أو قرى متصلة بربض المصر لا يقصر حتى يجاوزها. (فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ٢/ ٨، زكريا ٢/ ٣٣)

وإن كانت القرى متصلة بربض المصر، فالمعتبر مجاوزة القرى هو الصحيح. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٢٣٨، سكب الأنهر ١/ ٢٣٨)

بخلاف ما إذا كانت القرى متصلة بربض المصر فحيئنذ تعتبر مجاوزة القرى. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون، زكريا ٢/ ٤٩٥، رقم: ٣٠٩٨)

أشار إلى أنه يشترط مفارقة ما كان من توابع موضع الإقامة كربض المصر، وهو ما حول المدينة من بيوت ومساكن، فإنه في حكم المصر، وكذا القرى المتصلة بالربض في الصحيح. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٥٩٩، كراچی ٢/ ١٢١)

المسافر إذا خرج من المصر وبقرب المصر قرية إن كانت القرية متصلة بالمصر لا يقصر الصلاة؛ لأنها من جملة المصر.

(الولوالجية ۱/ ۱۳۱، البحرالرائق، کتاب الصلاۃ، باب المسافر، کوئٹه ۲/ ۱۲۸، زکریا ۲/ ۲۲۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رمحرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۶۹)

شہر سے متصل ہوجانے والے گاؤں کا حکم

سوال [۳۳۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شہر سے قریب آٹھ دس کلومیٹر پر ایک گاؤں ہے، شہر کی آبادی بڑھتی ہوئی اس سے متصل ہوچکی ہے، اب وہ گاؤں شہر میں شمار ہوگا یا نہیں؟ یعنی قصر نماز شہر سے نکلنے پر کرے گا یا اس گاؤں سے نکلنے پر؟

المستفتي: محمد گجراتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب شہر کی آبادی بڑھتی ہوئی قریب کے گاؤں سے بالکل متصل ہوجائے تو وہ گاؤں شہر میں شمار ہوگا اور اس گاؤں سے نکلنے کے بعد ہی مسافر قصر نماز شروع کرے گا۔

بخلاف ما إذا كانت القرى متصلة بربض المصر، فحينئذ تعتبر مجاوزة القرى. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني و العشرون، زكريا ۲/ ۴۹۵، رقم: ۳۰۹۸)

وإذا كانت قرية أو قرى متصلة بربض المصر لا يقصر حتى يجاوزها. (فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ۲/ ۲/ ۸ زكريا ۲/ ۳۳)

أشار إلى أنه يشترط مفارقة ما كان من توابع موضع الإقامة كربض

الـمـصـر، وهـو ما حول المدينة من بيوت ومساكن، فإنه في حكم المصر، وكـذا القرى المتصلة بالربض في الصحيح. (شـامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٥٩٩، كراچى ٢/ ١٢١)

الـمسـافـر إذا خرج من المصر وبقرب المصر قرية إن كانت القرية متصلة بالمصر لا يقصر الصلاة؛ لأنها من جملة المصر. (الولوالجية ١/ ١٣١)

وإن كـانت القرى متصلة بربض المصر، فالمعتبر مجاوزة القرى هو الصحيح. (مـجـمـع الأنهـر، بـاب صلاة المسافر، دارالكتب العلمية، بيروت ١/ ٢٣٨، سكب الأنهر ١/ ٢٣٨)

أنـه يعتبر مجاوزة عمران المصر لا غير إلا إذا كان ثمة قرية، أو قرى متـصـلة بـربض المصر، فحينئذ تعتبر مجاوزة القرى. (هـندية، الباب الخامس عشر فـي صـلاة الـمسـافـر، زكـريـا قديم ١/ ١٣٩، جديد ١/ ١٩٩، خانية على الهندية، الـصـلاة، بـاب صـلاة المسافر، زكريا ١/ ١٦٥، جديد ١/ ١٠٤، البحرالرائق، باب صلاة المسافر، كوئٹه ٢/ ١٢٨، زكريا ٢/ ٢٢٦)

والـصـحيح ما ذكرنا أنه يعتبر مجاوزة عمران المصر إلا إذا كان ثمة قـرية أو قـرى متصلة بربض المصر، فحينئذ يعتبر مجاوزة القرى. (المحيط البرهاني، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، جديد مجلس علمي ٢/ ٢٨٨، قديم ٢/ ١٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦ رمحرم الحرام ١٤٣٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤٠/ ١١٣٦٩)

ایک ماہ کے قیام کا ارادہ تھا مگر تین دن کے بعد واپسی کا ارادہ ہوگیا تو کیا کرے؟

سوال [٣٣٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید مرادآباد سے دہلی گیا اور ایک ماہ کے قیام کا ارادہ کیا، اب ظاہر ہے کہ وہ اتمام کرے گا اور ۴/رکعت والی نماز میں امامت بھی کرسکتا ہے؛ لیکن ۳/دن کے بعد اس کا ارادہ ہوا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو اب سوال یہ ہے کہ جب تک وہ دہلی میں ہے وہاں سے واپسی تک جو نمازیں پڑھے گا ان میں قصر کرے گا یا اتمام؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید جو دہلی میں ایک ماہ کے قیام کے ارادہ سے گیا؛ لیکن ۳/یوم کے بعد اس کا ارادہ بدل گیا اور ایک ماہ سے قبل ہی اس کا دلی کو چھوڑنے کا ارادہ ہوگیا، تو اب زید وہاں سے جب تک عملی طور پر دلی چھوڑ کر روانہ نہ ہوجائے گا نمازوں کا اتمام ہی کرنا اس پر لازم ہوگا۔

وكذا إذا عاد من سفره إلى مصره لم يتم حتى يدخل العمران، ولا يصير مسافرا بالنية حتى يخرج. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، قديم زكريا ١/ ١٣٩، جديد ١/ ١٩٩)

من تنقل في البلدان، فأقام في بلد نصف شهر مثلا، ثم عاد إليه، قصر الصلاة فيه ما لم ينو الإقامة مجددا نصف شهر؛ لأن وطن الإقامة يبطل حكمه بمثله، وبالسفر عنه، أي بإنشاء السفر منه، كما يبطل بالوطن الأصلي.

(الفقه الإسلامي وأدلته، صلاة المسافر، متى يتم المسافر الصلاة، ومتى يقصر حالة الانتقال عن الوطن، مطبع الهدى انٹر نیشنل دیوبند ٢/ ٣٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۶/۱/۱۴۳۵ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۶۹)

کسی جگہ پندرہ دن کی نیت کے بغیر ۲۸/دن گذاردے تو قصر ہی کرتا رہے گا؟

سوال [۳۳۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک شخص مرادآباد سے دہلی گیا ۳/دن کے قیام کے ارادے سے؛ لیکن ۳/دن کے بعد وہ جماعت والوں کے ہاتھ لگ گیا اور جماعت والوں کے ساتھ ۱۰/دن جماعت میں لگائے، پھر دس دن کے بعد دس دن اور لگا یائے، پھر اس کے بعد ایک ہفتہ اور جماعت میں لگایا، تو دہلی کے اسی ایریہ میں اس نے ۲۸/دن گزار دئے، مگر ایک ساتھ ۱۵/دن کے قیام کا ارادہ نہیں کیا، تو اس عرصہ میں وہ نمازوں میں قصر کرے گا یا اتمام کرے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص کسی جگہ تسلسل کے ساتھ مستقل ۱۵/دن قیام کرنے کی نیت نہ کرے؛ لیکن اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے وہ ۱۵/دن سے زائد اس جگہ قیام کرلے تو وہ قصر ہی کرے گا، اتمام نہیں کرے گا، مثلاً صورت مسئولہ میں شخص مذکور نے دہلی میں صرف ۳/دن کے قیام کا ارادہ کیا تھا؛ لیکن پھر جماعت والوں کے ساتھ اس نے اولاً ۱۰/دن قیام کی نیت سے لگائے، پھر اسی طرح جماعت والوں کے کہنے پر ۱۰/دن اور لگائے، پھر مزید اصرار پر ایک ہفتہ اور لگایا، جس کی وجہ سے دہلی میں اس کا قیام ۲۸/دن سے زائد رہا، مگر مسلسل پندرہ دن قیام کا ارادہ نہیں رہا، تو وہ ان دنوں دلی میں قصر ہی کرتا رہے گا، اتمام نہیں کرے گا۔

عن نافع عن ابن عمر قال: ارتج علینا الثلج، ونحن بآذر بیجان ستة أشهر في غزاة قال: ابن عمر: فكنا نصلی ركعتین. (معرفة السنن والآثار للبیهقي، الصلاة، باب المقام الذي یتم بمثله الصلاة ۲/ ٤٣٦، رقم: ١٦١٠)

المسافر إذا دخل مصرا وهو على عزم أنه متى غرضه یخرج لا یصیر مقیما، وإن مكث فیها سنة. (تاتارخانیة، الصلاة، الباب الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكریا ۲/ ٥٢٥، رقم: ٣٢٠٦)

أما نیة الإقامة فأمر لابد منه عندنا حتى لو دخل مصرا ومكث فیه شهرا، أو أكثر لانتظار القافلة، أو لحاجة أخرى یقول: أخرج الیوم أو غدا ولم ینو الإقامة لا یصیر مقیما. (بدائع الصنائع، باب صلاة المسافر، فصل في بیان ما

يصير المسافر به مقيما زكريا ۱/ ۲٦۸، قديم كراچی ۱/ ۹۷)

إذا قام في بلدة من غير نية الإقامة لا يكون مقيما، وإن طال؛ لأنه لم ينوى الإقامة خمسة عشر يوما. (الولوالجية ۱/ ۱۳٤)

فإن لم يعزم على الإقامة مدة معلومة، ولكنه مكث أياما في المصر، وهو على عزم الخروج، لا يصير مقيما عندنا وإن طال مكثه. (مبسوط سرخسي، باب صلاة المسافر، دارالكتب العلمية، بيروت ۱/ ۲۳۷)

ولو دخل مصرا على عزم أن يخرج غدا أو بعد غد، ولم ينو مدة الإقامة، حتى بقي على ذلک سنين قصر؛ لأن ابن عمر رضي الله عنه أقام بآذربيجان ستة أشهر وكان يقصر، وعن جماعة من الصحابة مثل ذلک. (هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، أشرفي ديوبند ۱/ ۱٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/۱/۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۶۹)

ویزا ختم ہونے کے بعد خفیہ طور پر ۳/ ماہ رہنے کا ارادہ ہو تو قصر کرے یا اتمام؟

سوال [۳۳۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی شخص کا غیر ملک میں ویزا ختم ہونے کے بعد غیر قانونی خفیہ طور پر ۱۵/ دن سے زائد مثلاً ۳/ مہینے رہنے کا ارادہ ہے، مگر رہنے کے لئے قانونی ثبوت اس کے پاس نہیں تو یہ شخص مقیم ہوگا یا نہیں؟

المستفتي: قاسم بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ شخص نمازوں کا قصر کرے گا؛ اس لئے کہ اس شخص

کی حالت اس کے عزم وارادے کے خلاف ہے۔(مستفاد: فتاوی حقانیہ۳/ ۳۶۸-۳۶۹) مگر ویزا یا اقامت کے ساتھ رہنے والے پر اتمام لازم ہے۔

لأن حالهم يخالف عزيمتهم للتردد بين القرار والفرار. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۳، زكريا ۲/ ۲۳۴، تبيين الحقائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، إمداديه ملتان ۱/ ۲۱۲، زكريا ۱/ ۵۱۳-۵۱۴)

والحاصل أن شروط الإتمام ستة: النية، والمدة، واستقلال الرأى، وترك السير، واتحاد الموضع، وصلاحيته. تحته في الشامية: ستة زاد في الحلية شرطا آخر، وهو أن لا تكون حالته منافية لعزيمته. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۰۹، كراچی ۲/ ۱۲۸)

لأنهم بين أن يهزموا فيفروا أو يهزموا، فيفروا وحالهم هذه مبطلة عزيمتهم لترددها في الإقامة، ولا بد في تحقق النية من الجزم. (حلبي كبير، فصل في صلاة المسافر، أشرفيه ديو بند/ ۵۴۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۰۴)

دو راستوں میں سے مقدار مسافت سفر والے میں قصر اور کم والے میں اتمام

سوال [۳۳۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کو مرادآباد سے نور پور جانا ہے جو صرف ۵۵ر کلومیٹر کی دوری پر ہے؛ لیکن نور پور سے مرادآباد واپسی میں وہ چاند پور سے ٹرین پکڑ کر گجرولہ ہوتے ہوئے مرادآباد آئے جس کی مسافت تقریباً ۹۰/ ۹۵ر کلومیٹر ہو جاتی ہے، تو ایسی صورت میں نور پور سے مرادآباد واپسی میں وہ قصر کرے گا یا اتمام؟

المستفتي: شعیب احمد میرٹھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سفر میں جس راستہ کو اختیار کرے گا، اسی کا اعتبار ہوگا؛ لہٰذا صورت مسئولہ میں جب وہ مرادآباد سے نور پور جائے گا جو تقریباً ۵۵؍کلومیٹر کی دوری پر ہے، تو وہ اتمام کرے گا قصر نہیں کرے گا۔ اور جب نور پور سے چاند پور، گجرولہ ہوتے ہوئے مرادآباد آئے گا جس کی مسافت ۹۰؍۹۵؍کلومیٹر ہوجاتی ہے، تو اس صورت میں جب نور پور سے چاند پور ہوکر سفر شروع کرے گا تو نمازوں کی قصر کرتا رہے گا، اتمام جائز نہ ہوگا۔

ولو لموضع طريقان، أحدهما مدة السفر ...... والآخر أقل قصر في الأول لا الثاني. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ٢/ ١٢٣، زكريا ٢/ ٦٠٣)

ولو قصد موضعا له طريقان، أحدهما في البر، والآخر في البحر، وطريق البر يوصله في ثلاثة أيام، وطريق الماء أقل من ذلك، فإنه إذا سافر في البحر يقصر، وإذا سافر في البحر لا يقصر. (تاتارخانية، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ٢/ ٤٩١، رقم: ٣٠٨٨)

وتعتبر المدة من أي طريق أخذ فيه كذا في البحر الرائق، فإذا قصد بلدة وإلى مقصده طريقان أحدهما مسيرة ثلاثة أيام ولياليها، والآخر دونها، فسلك الطريق الأبعد كان مسافر عندنا، وإن سلك الأقصر يتم. (هندية، الباب الخامس عشر، في صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ١٣٨، جديد ١/ ١٩٩، خانية على الهندية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ١/ ١٦٥، جديد ١/ ١٠٤، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، كراچی ٢/ ١٢٩، زكريا ٢/ ٢٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/۱/۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۷۰)

بڑے شہروں کا کس طرح اعتبار کیا جائے؟

سوال [۳۳۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) احقر کا وطن اصلی دہلی میں ہے، گھر (جو دہلی کے ایک محلے میں واقع ہے) سے جائے ملازمت ۹۰ رکلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، جب کہ دہلی کے آخری حصے سے جائے ملازمت ۷۰ رکلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اور گھر سے جائے ملازمت کی طرف جاتے ہوئے گھر اور دہلی کے آخری حصے کے درمیان جنگلات کے ذریعہ فاصلہ بھی ہے، تو اس فاصلے کے ہوتے ہوئے جائے ملازمت پہنچ کر مقیم ہی رہوں گا یا مسافر ہو جاؤں گا؟ اور گھر پہنچنے سے قبل دہلی کے کسی بھی حصے میں قصر کا حکم ہوگا یا اتمام کا؟

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اگر دہلی کے آخری حصے سے جائے ملازمت مسافت سفر شرعی ساڑھے بیاسی کلومیٹر پر واقع ہو تو کیا احقر کو غازی آباد میں جائے ملازمت سے آتے جاتے وقت نماز اتمام کرنی ہوگی؟ اس سوال کی وجہ غازی آباد اور دہلی کی آبادی کا اتصال ہے کہ اتصال آبادی کی بنا پر اتمام ہی کا حکم ہوگا؟ محقق ومدلل جواب سے نوازیں۔

المستفتي: حضرت مولانا محمد ریاست قاسمی، خادم مدرسہ اعزاز العلوم ویٹ غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین اور فقہاء متقدمین ومتأخرین کے زمانہ میں جو شہر ہوا کرتے تھے وہ بہت بڑے نہیں ہوا کرتے تھے؛ بلکہ بڑے سے بڑا شہر اس طرح ہوتا تھا کہ اس شہر کے تمام باشندے شہر کے ہر حصہ سے مانوس ہوا کرتے تھے اور بڑے سے بڑا شہر بھی ۲۵ ر۳۰ رکلومیٹر کے طول وعرض سے زیادہ پھیلا ہوا نہیں ہوتا تھا؛ لیکن آج کے دور میں ایسے شہر بھی وجود میں آگئے ہیں، جنہوں نے آزو بازو کے کئی شہر اور کئی ضلعوں کو اتصال آبادی کے ذریعہ سے اپنے اندر داخل کر لیا ہے، جیسا کہ دہلی سے غازی آباد ۲۵ ر۳۰ رکلومیٹر کے فاصلہ پر تھا، اسی طرح نویڈا بھی اتنے فاصلہ پر تھا، پھر اس کے بالمقابل

فرید آباد بھی کم وبیش اتنے فاصلہ پر رہا اور اسی طرح گڑگاؤں بھی دہلی سے الگ دوسرے صوبہ کا شہر رہا ہے، آج یہ چاروں شہر دہلی سے متصل ہوکر ایک ہی شہر جیسے بن گئے ہیں، ہاں البتہ سرکاری اعتبار سے ان کی میونسپلٹی الگ الگ ہیں، اسی طرح بمبئی نے بھی اپنے آزو باز و کے کئی شہروں کو اتصال آبادی کے ذریعہ سے اپنے اندر داخل کرلیا ہے۔ اور ایسا ہی کلکتہ اور مدراس کا حال بھی ہے کہ اتصال آبادی کے اعتبار سے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک ۸۰ر ۹۰ رکلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلہ ہوجاتا ہے کہ خود ان شہروں کے اتصال آبادی کے اعتبار سے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں مسافت سفر کو طے کرنا پڑ جاتا ہے؛ لہٰذا ایسے شہروں کے بارے میں وہ حکم نہیں ہوسکتا جو فقہاء کے زمانہ میں بڑے شہروں کا حکم ہوا کرتا تھا، کہ اتصال آبادی کے اعتبار سے شہر کے کسی بھی کنارے پہنچ جائیں تو قصر کا حکم ختم ہوجائے؛ بلکہ ان شہروں کا حکم بالکل الگ اور نئے انداز کا ہوگا؛ کیوں کہ قصر صلاۃ کے مسئلہ کا مدار سفر کی مشقت کے ساتھ ساتھ اجنبیت پر بھی ہے اور ایسے بڑے شہروں میں ایک کنارے کے لوگ دوسرے کنارے میں اجنبی ہوجاتے ہیں؛ اس لئے ایسے بڑے شہروں کا حکم اپنے ایریا کے اعتبار سے ہوگا کہ دہلی کا ایریا الگ ہے، غازی آباد کا ایریا الگ اور نوئیڈا کا ایریا الگ اور گڑگاؤں اور فرید آباد کا ایریا اس سے بالکل دوسرا ہے؛ لہٰذا غازی آباد کی طرف سے گڑگاؤں فرید آباد جانے والے لوگ دہلی کی آبادی میں داخل ہونے کے بعد مقیم نہیں ہوں گے؛ بلکہ اس وقت تک مسافر رہیں گے جب تک دہلی سے تجاوز کر کے گڑگاؤں اور فرید آباد کے ایریا میں داخل نہ ہوں گے، اسی طرح فرید آباد اور گڑگاؤں کی طرف سے غازی آباد یا نوئیڈا کے باشندے اس وقت تک مقیم نہیں ہوں گے، جب تک پوری دہلی پار کر کے غازی آباد یا نوئیڈا کے ایریا میں داخل نہ ہوں گے، نیز دہلی کا رہنے والا آدمی فرید آباد، گڑگاؤں، نوئیڈا، غازی آباد وغیرہ میں داخل ہونے سے مقیم نہیں ہوگا، جب تک دہلی کی اصل آبادی میں داخل نہ ہوجائے، اسی طرح کا حکم ان تمام شہروں میں جاری ہوجائے گا جو شہر کئی ضلعوں کو شامل ہیں، اس تفصیل کے بعد دونوں سوالوں کا جواب حسب ذیل ہے:

سوال نامہ کے مطابق سائل دہلی کا رہنے والا ہے اور دہلی سے ۹۰ر کلو میٹر کے فاصلہ پر ملازمت کرتا ہے، اب اگر دہلی کی اصل آبادی کی حد سے جائے ملازمت ساڑھے بیاسی کلو میٹر یا اس سے زیادہ مسافت پر ہے، تو دہلی کی اصل آبادی کی حدود سے تجاوز کرتے ہی مسافر ہوجائے گا۔ اسی طرح واپسی میں غازی آباد یا اس کے مضافات وغیرہ جو دہلی کی آبادی سے متصل ہوچکے ہیں، ان میں پہنچنے سے مقیم نہیں ہوگا؛ بلکہ دہلی کی سرکاری حدود میں داخل ہونے کے بعد ہی مقیم ہوگا، اب اس اعتبار سے سائل دہلی کی پرانی حدود سے اپنی جائے ملازمت کی مسافت کو خود ہی دیکھ لے، اگر ساڑھے بیاسی کلو میٹر یا اس سے زیادہ مسافت ہے، تو اپنے آپ کو مسافر سمجھے گا۔ اور اگر اس سے کم ہے تو اپنے آپ کو مقیم سمجھے۔

فالقرية المتصلة بالفناء دون الربض لا تعتبر مجاوزتها على الصحيح، كما في شرح المنية. (شامي، كتاب الصلاة، باب المسافر، كراچی ۲/ ۱۲۱، زکریا ۲/ ۶۰۰، عالمگیری، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱۳۹، جديد ۱/ ۱۹۹، أحسن الفتاوى ٤/ ٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۱۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۵/ ۱۴۳۴ھ

وطن اقامت اور وطن اصلی کا ایک مسئلہ

سوال [۳۳۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا اصل وطن سہارنپور ہے، بجنور میں تقریباً پچیس سال سے ایک مسجد کا امام ہے، زید اپنی امامت کے مقام پر تنہا ہی رہتا ہے، اہلیہ بچے وغیرہ نہیں رہتے، مسجد کے حجرہ میں ہی مقیم ہے، زید کا اپنا مکان ذاتی یا کرایہ کا بھی نہیں، زید اپنے وطن اصلی سہارنپور جا کر بجنور (وطن اقامت) آیا، اب زید کو دوبارہ بھی سہارنپور جانے کی ضرورت در پیش ہے، تو اس شکل میں پندرہ دن سے پہلے اگر زید بجنور سے واپس ہونے کا ارادہ رکھتا ہو تو بجنور آ کر زید مسافر رہے گا

اور قصر کرے گا یا زید وطن اقامت میں آ کر مقیم ہو جائے گا اور اتمام کرے گا؟

بکر کا اصلی مسکن رڑکی ضلع سہارنپور ہے، بجنور سے بکر سفر کر کے سہارنپور جا رہا ہے، راستہ میں رڑکی کا اسٹیشن پڑتا ہے، وہاں بکر نے نماز رباعی پڑھی ہے، تو رڑکی کے اسٹیشن پر جو بکر کے شہر کا اسٹیشن ہے، نماز کا اتمام کرے یا یہ کہ وہ سفر میں ہے۔ اور سفر سہارنپور تک کا ہے، تو قصر کرے اور سہارنپور پہنچ کر جو کہ رڑکی سے ۲۵ رمیل ہے قصر کرے گا یا اتمام؟

المستفتي: فخر الاسلام شیر کوٹ، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب زید اپنی جائے ملازمت بجنور میں تنہا رہتا ہے اور وہاں بچوں کو ساتھ نہیں رکھا ہے، تو ایسی صورت میں جائے ملازمت بجنور اس کے لئے وطن اصلی کے حکم میں نہیں ہے اور نہ ہی وطن تأہل کے حکم میں ہے؛ بلکہ صرف وطن اقامت ہی کے حکم میں ہوسکتا ہے؛ اس لئے جب زید پندرہ دن سے کم قیام کے ارادہ سے سہارنپور سے بجنور آئے گا، تو اس درمیان میں اس پر نمازوں کا قصر کرنا لازم ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۳/ ۵۰، جدید زکریا ۵/ ۱۶۹-۱۷۰)

ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الإقامة في بلدة أو قرية خمس عشر يوما، أو أكثر. (عالمگیری، الصلاة، الباب الخامس في صلاة المسافر، زکریا قدیم ۱/ ۱۳۹، جدید ۱/ ۱۹۹)

(ب): بکر جب رڑکی اسٹیشن پہنچ جائے گا تو خود بخود مقیم بن جائے گا اور نمازوں کا اتمام واجب ہو جائے گا اور پھر رڑکی سے سہارنپور تک مسافت سفر کی نہیں ہے؛ اس لئے سہارنپور آنے جانے کے درمیان تمام نمازوں کا اتمام لازم ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۳/ ۵۵، جدید زکریا ۵/ ۱۷۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۸/ ۷/ ۱۴۱۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۵۴۲)	۲۸/ ۷/ ۱۴۱۴ھ

جائے ملازمت وطن اصلی ہے یا وطن اقامت

سوال [۳۳۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید جائے ملازمت کو وطن اصلی قرار دیتا ہے اور دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ اگر کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو مجھے یہاں زندگی بھر ملازمت کرنی ہے۔ اور عمر جائے ملازمت کو وطن اقامت قرار دیتا ہے، اور دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ یہ میرا اصلی وطن نہیں، اگر آج کوئی بات ہوگئی تو آج مجھے یہاں سے جانا ہے؛ لہٰذا دونوں میں کس کی بات صحیح ہے؟ اور علمائے کرام جائے ملازمت کو کس کے حکم میں رکھتے ہیں؟

المستفتي: محمد عثمان القاسمی مرکزی دار العلوم محمدیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کتب فقہ کی بعض عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ ہمیشہ کی جائے ملازمت جہاں مع اثاثہ کے رہتا ہے، وہ وطن تأہل کی طرح وطن اصلی کے حکم میں ہے، وہاں سے اگر عارضی سفر کیا جائے اور اپنا اثاثہ وہاں چھوڑ کر واپسی کے ارادہ سے سفر کیا جائے، تو واپسی میں قصر کے بجائے اتمام کرنا چاہئے، اگرچہ نصف ماہ سے قبل دوسرے سفر کا ارادہ رکھتا ہو۔

كوطن الإقامة يبقى ببقاء الثقل، وإن أقام بموضع آخر. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ٢/ ٢٣٩، كوئٹه ٢/ ١٣٦، أحسن الفتاوى ٤/ ١٠٦، ٤/ ١١٠)

اور عام کتب فقہ کی عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ ہمیشہ کی جائے ملازمت وطن اقامت ہی ہے، وہاں سے مسافت سفر کے ارادہ سے اگر سفر کیا جائے اور واپسی میں نصف شہر سے قبل دوبارہ سفر کا ارادہ رکھتا ہے تو سفر اول اور سفر ثانی کے درمیان قیام کے زمانہ میں قصر کرنا لازم ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/ ۳۳۵، جدید زکریا ۳/ ۳۷۹، جدید زکریا مطول ۵/ ۱۷، فتاوی دار العلوم ۴/ ۴۵۴، ۴/ ۴۶۱، امداد الفتاوی ۱/ ۳۷۵)

ويبطل ...... وطن الإقامة بمثله والسفر (تحته في مجمع الأنهر) حتى لو نوى الإقامة في بلد، ثم راح منه، وأقام في بلد آخر، وأتى البلد الأول

قصر ما لم ينو الإقامة ثانيا. (ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دار الكتب العلمية بيروت ١/ ٢٤٣، مصري قديم ١/ ١٦٤)

لہٰذا فصل اول کے اعتبار سے زید کی بات صحیح ہے اور فصل ثانی کے اعتبار سے عمرو کی بات صحیح ہے؛ البتہ اکابر علمائے دیوبند کا عمل بھی عمرو کی بات کی تائید کرتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۱۷۴)

جائے ملازمت وطن اصلی کے حکم میں ہے

سوال [۳۳۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنے اہل وعیال کو لے کر ایک جگہ میں رہتا ہے اور امامت کرتا ہے اور اس جگہ سے اس کا وطن اصلی ڈھائی سو کلومیٹر دور واقع ہے، اس نے حج کا ارادہ کیا اور سب کو لے کر ۳/۴/دنوں کے لئے وطن گیا اور چار پانچ روز رہنے کے بعد اپنے اہل وعیال کو لے کر اسی امامت کی جگہ جہاں اہل وعیال کو لے کر رہتا ہے واپس آیا اور تین روز کے بعد حج کے لئے روانہ ہوگیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ گھر سے واپسی کے بعد جو تین روز حج کے لئے روانگی سے پہلے نماز پڑھائی وہ پوری پڑھانے کا حکم ہے یا قصر اہل وعیال کو وہاں چھوڑ کر حج کو گیا؟

محمد بلال احمد ۲۷/۳/۲۰۰۳ء

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وہ شخص پوری نماز پڑھائے وہ مسافر نہیں؛ بلکہ مقیم ہے، حضرت مولانا قاری رفعت صاحب قاسمی نے اپنی مؤلفہ کتاب ''مکمل ومدلل مسائل سفر'' ص: ۱۲۰/ میں اس قسم کا مسئلہ بیان فرمایا ہے، جو درج ذیل ہے، از روئے فقہ آدمی کے وطن اصلی متعدد ہو سکتے ہیں اور شرعاً وطن اصلی صرف اس جگہ کو نہیں کہتے جہاں پیدا ہوا ہو؛ بلکہ ہر اس جگہ

کو وطن اصلی کا درجہ حاصل ہے جہاں انسان اپنے اثاثہ (سامان تعیش) اور اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام پذیر ہو، مثلاً آدمی کی جائے ملازمت جہاں وہ اپنے اہل وعیال وسامان کے ساتھ رہتا ہو، وہ بھی وطن اصلی کے درجہ میں ہوتا ہے؛ لہٰذا شرعی مسافر ہو کر وہاں پہنچ جائے گا تو نماز قصر نہیں کرے گا؛ بلکہ پوری پڑھنی لازم ہے، خواہ پندرہ دن کے قیام کا ارادہ نہ کیا ہو۔ (ایضاح المسائل/ ۶۶، امداد الاحکام ۱/ ۷۱۸، احسن الفتاوی ۴/ ۱۰۲، البحر الرائق، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ المسافر، زکریا ۲/ ۲۳۹، کوئٹہ ۲/ ۱۳۶، مجمع الانہر، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ المسافر، مصری قدیم ۱/۱۶۴، دار الکتب العلمیہ بیروت جدید ۱/۲۴۳، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، فصل ما یبطل بہ القصر وبیان الوطن الاصلی وغیرہ، دار الفکر ۱/۴۸۰)

دوسری کتابوں میں بھی اسی مسئلہ کی تفصیل ہے، قلت فرصت کی وجہ سے تمام عبارتوں کو نقل کرنے سے قاصر رہا، امید ہے کہ مذکورہ دلیل سے تشفی ہوگی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

یہ جواب درست ہے، ہمارے یہاں سے یہی مسئلہ لکھا جاتا ہے۔

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۴ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۵۹)	۱۴۲۴/۳/۴ھ

کیا وطن اقامت وملازمت وطن اصلی کے حکم میں ہیں؟

سوال [۳۳۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: وطن اقامت یا ملازمت وطن اصلی کے حکم میں ہے یا نہیں؟ وطن اصلی کی کیا کیا شرائط ہیں؟ پاسپورٹ اور راشن کارڈ کے علاوہ اور کوئی جائیداد وغیرہ نہیں ہے تو پاسپورٹ یا راشن کارڈ اور ووٹ کا ثبوت ہونا کافی ہوگا؟

المستفتي: محمد یونس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وطن اقامت اور جائے ملازمت اگر مسافت سفر کی

دوری پر ہے اور بیوی بچے اور اثاثہ بھی ساتھ میں رکھا ہے، تو وہ شرعی طور پر وطن تأہل ہو جاتا ہے، جو شرعی طور پر وطن اصلی کے حکم میں ہے، پاسپورٹ یا راشن کارڈ کا تعلق اس سے نہیں ہے، ہاں البتہ پاسپورٹ اور راشن کارڈ اس کے لئے تائید کے درجہ میں ہیں؛ لیکن ان کارڈوں پر کوئی مدار نہیں، مثلاً کوئی شخص بال بچے اور اثاثہ کے بغیر جائے ملازمت اور وطن اقامت میں رہتا ہے اور وہاں اس کا راشن کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ بھی بن جاتا ہے اور بیوی بچے اور اثاثہ سب دوسری جگہ پر ہیں، تو ایسی صورت میں جائے ملازمت یا وطن اقامت اس کے لئے وطن تأہل نہیں بنے گا، تو معلوم ہوا کہ وطن تأہل جو وطن اصلی کے حکم میں ہے اس کا مدار ان کارڈوں پر نہیں ہے؛ بلکہ اہل وعیال اور اثاثہ پر ہے۔ (مستفاد: امداد الاحکام۲/ ۳۱۰، ایضاح المسائل/۶۶)

إنما كانت وطنا بالأهل لا بالعقار؛ ألا ترى! أنه لو تأهل ببلدة لم يكن له فيها عقار صارت وطنا له، وقيل: تبقى وطنا له؛ لأنها كانت وطنا له بالأهل والدار جميعا، فبزوال أحدهما لا يرتفع الوطن كوطن الإقامة، تبقى ببقاء الثقل وإن أقام بموضع آخر. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٢٣٩، كوئٹه ٢/ ١٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۴۶)	۱۴۲۹/۶/۲۳ھ

جائے ملازمت وطن اصلی کے حکم میں کب ہے؟

سوال [۳۳۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جائے ملازمت وطن اصلی کے درجہ میں ہے، جب اہل وعیال مع اثاثہ کے ہوں؛

البتہ اگر اہل وعیال کے بغیر صرف اثاثہ یعنی ضروری سامان کے ساتھ ہو، تو کیا جائے ملازمت وطن اصلی کے درجہ میں ہوگا؟

المستفتي: محمد سیف اللہ قاسمی، مدرسہ عربیہ دارالسلام مراقی پور بردوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جائے ملازمت کا وطن اصلی کے حکم میں ہونے کے لئے اہل وعیال کا ساتھ میں ہونا لازم ہے، اس کو بالفاظ دیگر وطن تأہل کہا جاتا ہے۔ اور اہل وعیال کے بغیر محض اثاثہ سازوسامان کی وجہ سے وطن تأہل نہیں بنے گا۔

لأنها إنما كانت وطنا بالأهل لا بالعقار. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر زكريا ٢/ ٢٣٩، كوئٹه ٢/ ١٣٦، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب المسافر، دارالكتب العلمية بيروت جديد ١/ ٢٤٣، مصري قديم ١/ ١٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۸۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۷/۸ھ

مدارس کے طلبہ اور سرکاری ملازمین مدرسہ اور جائے ملازمت پر مقیم یا مسافر

سوال [۳۳۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کوئی طالب علم تین سال یا ۵؍سال پڑھنے کے لئے حیدرآباد سے دارالعلوم دیوبند آتا ہے، اسی طرح بعض ملازمین مثلاً سرکل اور D.S.P کی ملازمت ۵؍سال میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بدلتی رہتی ہے، تو ان حضرات کا ۵؍سال رہنے کے ارادہ سے کسی جگہ قیام وطن توطن کہلائے گا یا وطن اقامت؟

(۲) مذکورہ طالب علم اگر دارالعلوم سے مدرسہ شاہی جاتا ہے واپسی پر دارالعلوم میں آٹھ دن رہ کر دہلی جانے کا ارادہ ہے، تو وہ اس آٹھ دن میں قصر کرے گا یا اتمام؟

المستفتي: عبداللہ حیدرآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو طلبہ مسافت سفر سے دوری پر جا کر ۳/سال ۴/سال یا ۵/سال تک تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسی مدرسہ میں قیام کر لیتے ہیں، جیسا کہ سوال نامہ میں ہے، ان کا ارادہ تعلیم پوری کرنے کے بعد وہاں سے واپس چلے جانے کا رہتا ہے، علی سبیل القرار وہاں رہنے کا ارادہ نہیں ہوتا ہے، اسی طرح بعضے سرکاری ملازمین ایک شہر یا قصبہ میں یا کسی اور جگہ اس طرح رہتے ہوں کہ چند سال کے بعد یہاں سے تبادلہ کرا لیتے ہوں، تو ان کے حق میں وہ جگہ علی سبیل القرار قیام کرنے کی نہیں ہوتی، بہر حال ان کا ارادہ وہاں سے کلی طور پر منتقل ہو جانے کا رہتا ہے؛ اس لئے ایسی جگہوں پر پندرہ دن سے زائد قیام کی صورت میں تو وطن اقامت ہو جائے گا، مگر اس سے کم قیام کی صورت میں مسافر ہی رہیں گے اور وہ مقامات ان لوگوں کے لئے وطن توطن نہیں کہلائیں گے اسی سے دوسرے سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا ہے؛ اس لئے کہ وطن توطن کے لئے فقہاء نے یہ قید لگائی ہے کہ اس کا ارادہ وہاں سے منتقل ہونے کا نہ ہو؛ بلکہ تعیش کے طور پر وہاں مستقل رہنے کا ہو یہ شرط ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی ،جیسا کہ شامی اور طحطاوی کے جزئیہ سے واضح ہوتا ہے۔

أو توطنه بأن اتخذها دارا، وليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها وإن لم يتأهل بها. (طحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ١/ ٣٣٦) اور شامی کی عبارت ملاحظہ ہو:

أي عزم على القرار فيه، وعدم الارتحال وإن لم يتأهل. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ٢/ ١٣٣، زكريا ٢/ ٦١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۷/۱۴۲۹ھ

کیا وطن اصلی سے ۲۰؍کلومیٹر کی دوری کی جائے ملازمت وطن اصلی سے ملحق ہے

سوال [۳۳۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ایک عربی مدرسہ کا ملازم (معلم) ہوں اور مدرسہ میری جائے پیدائش (وطن اصلی) سے صرف بیس کلومیٹر دور ہے ہفتہ عشرہ میں گھر جاتا ہوں کبھی کبھی پندرہ بیس روز بھی مدرسہ میں رہ جاتا ہوں، تو وہ جگہ میرے لئے وطن اصلی کا حکم رکھتی ہے یا وطن اقامت کا نیز اگر میں اتنی دور ملازمت کرتا ہوں جو مسافت سفر ہو تو اس کا بھی حکم بیان کریں۔

المستفتي: محمد عثمان القاسمی مرکزی دار العلوم محمدیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافت سفر سے کم (بیس کلومیٹر) کے فاصلے پر جو جائے ملازمت ہے وہ اس وقت تک وطن اصلی سے ملحق رہے گی جب تک وہاں سے ایک دفعہ مسافت سفر کے ارادہ سے سفر نہ کیا جائے اور جب وہاں سے سفر شرعی کی مسافت طے کرنے کے ارادے سے سفر کیا جائے اور واپسی میں نصف ماہ سے کم قیام کے ارادہ سے وہاں قیام کیا جائے تو اکثر کتب فقہ کی عبارات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں قصر کیا جائے گا۔

ویبطل ...... وطن الإقامة بمثله، والسفر، أي يبطل وطن الإقامة به؛ لأنه ضد الإقامة فلا يبقى معه حتى لو نوى الإقامة في بلد، ثم سافر، ثم أتى ذلك البلد قصر ما لم ينوها. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤٣/٦، مصري قديم ١/ ١٦٤)

إنما يصير الوطن وطن الإقامة بشرط أن يتقدمه سفر، ويكون بينه وبين ما صار إليه منه مدة سفر. (حاشية چلپي على الزيلعي، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ١/ ٥١٨، ٥١٩، إمداديه ملتان ١/ ٢١٥، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ٢/ ٢٤٠، كوئٹه ٢/ ١٣٦، فتح القدير، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دارالفكر قديم ٢/ ٤٣، زكريا ٢/ ٤١، كوئٹه ٢/ ١٦)

اوراگر جائے ملازمت مسافت سفر پر ہے تو چونکہ وطن اصلی سے جائے ملازمت تک ایک دفعہ سفر شرعی کا تحقق ہو چکا ہے؛ اس لئے اس میں اگر نصف ماہ سے زائد قیام کا ارادہ کیا جائے تو وہ وطن اقامت ہوگا اور وہاں سے دوسری جگہ اگر سفر شرعی کیا جائے اور واپسی میں پندرہ روز قیام کا ارادہ نہیں ہے، تو بروایت مجمع الانہر اور اکابر مفتیان کرام کے فتاوی کی رو سے قصر لازم ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۱۷۴)

وطن اقامت سے بیس کلومیٹر دوری پر جائے ملازمت پر جانا

سوال [۳۳۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سہیل احمد بسلسلہ ملازمت دہلی میں قیام پذیر ہے اور مکان وغیرہ وطن اصلی فتح پور ضلع بارہ بنکی میں ہے، سہیل احمد ایک کمپنی کے ملازم ہیں، دہلی میں جہاں قیام ہے وہاں سے ۲۰؍ کلومیٹر دوری پر ملازمت کے لئے جاتے ہیں، یہ ملازمت کی جگہ صوبہ اتر پردیش میں شمار ہوتی ہے۔ اور جہاں قیام کرتا ہے وہ دہلی میں ہے، تو شرعاً یہ شخص مقیم ہی شمار ہوگا یا مسافر رہے گا؟

المستفتي: عمران علی خان مدرس مدرسہ ملت قضیارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر سہیل احمد کا ارادہ مستقل دہلی میں رات گذارنے کا ہے اور وطن سے اولاً دہلی آکر ایک رات گذارنے کے بعد دوسرے دن سے ۲۰؍ کلومیٹر دوری پر کمپنی میں کام کرنے کے لئے جانا شروع کر دیا ہے۔ اور روزانہ واپس دہلی آکر رات گذارتا ہے، تو وہ شرعی طور پر مقیم ہے نماز پوری پڑھا کرے گا، غالباً سوال نامہ میں یہی صورت ہے۔

فإن نوى المسافر أن يقيم بالليالي في أحد الموضعين، ويخرج

بالنهار إلى الموضع الآخر ، فإن دخل أولاً الموضع الذي نوى المقام فيه بالنهار، لا يصير مقيما، وإن دخل الموضع الذي نوى الإقامة فيه بالليالي يصير مقيما، ثم بالخروج إلى الموضع الآخر لا يصير مسافرا؛ لأن موضع إقامة الرجل حيث يبيت فيه. (بدائع الصنائع، كتاب الصلاة، فصل في صلاة المسافر ما يصير المسافر به مقيما، زكريا ١/ ٢٧٠، قديم كراچی ١/ ٩٨، ومثله في المبسوط للسرخسي، كتاب الصلاة، فصل في صلاة المسافر، دار الكتب العلمية بيروت ١/ ٢٣٧، البناية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، أشرفيه ٣/ ٣٢، حاشية الطحطاوي على مراقی الفلاح، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دارالكتاب ديوبند، ص: ٤٢٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رشوال ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۰/۲۱ھ

وطن اقامت اور جائے ملازمت میں قصر کرے یا اتمام؟

سوال [۳۳۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید بغرض ملازمت سعودی عرب گیا جہاں دمام شہر میں اس کی پوسٹنگ ہوئی، اس کے قیام وطعام کا وہیں انتظام ہے، وہ روزانہ صبح کو دمام سے تقریباً ۱۰۰ ر سو میل کے فاصلہ پر جہاں پروجیکٹ ورک چل رہا ہے جاتا ہے، دن بھر وہاں رہتا ہے، اور شام کو دمام چلا آتا ہے، رات کو دمام میں قیام کرتا ہے اور پھر صبح کو روانگی، اب سوال یہ ہے کہ زید پروجیکٹ ورک کے مقام پر ظہر اور عصر کی نماز قصر پڑھے گا یا پوری نماز ادا کرے گا؟ اسی طرح رات کو دمام میں عشا کی نماز قصر پڑھے گا یا پوری نماز ادا کرے گا؟

المستفتي: شفیع الزماں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید ایسی صورت میں دمام اور جائے ملازمت دونوں جگہ شرعی مسافر رہے گا اور دونوں جگہ رباعی نمازوں کا قصر کرنا لازم ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/ ۳۳۲، جدید زکریا ۳/ ۳۷۷، جدید زکریا مطول ۵/ ۶۹-۷۰)

وإن لم يكن وطنا أصليا له، فإنه يقصر الصلاة ما لم ينوى الإقامة بها خمسة عشر يوما. (قاضي خان على الهندية، باب صلاة المسافر، زكريا ١/ ١٦٥، جديد ١/ ١٠٤)

والحاصل أن إنشاء السفر يبطل وطن الإقامة إذا كان منه، أما لو أنشأه من غيره، فإن لم يكن فيه مرور على وطن الإقامة أو كان ولكن بعد سير ثلاثة أيام فكذلك. (شامي، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة، كراچى ٢/ ١٣٢، زكريا ديوبند ٢/ ٦١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵/ ۳/ ۱۴۱۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۳۲۳)	۲۳/ ۳/ ۱۴۱۸ھ

صرف بیٹے کے قیام پر وطن تأہل کا حکم

سوال [۳۳۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک گاؤں کا رہنے والا ہے، زمین جائیداد باغات سب وہیں ہیں، مکان اور رہائش بھی وہیں ہے، اب ایک مکان علی گڑھ میں بنوا لیا ہے، جس میں لڑکا رہ رہا ہے، اگر زید کا علی گڑھ جانا ہو مسافت شرعی پر تو علی گڑھ میں قصر کرے گا یا پوری نماز پڑھے گا؟

المستفتي: اکبر بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: علی گڑھ ایسی صورت میں وطن اصلی نہیں ہوگا؛ اس لئے وہاں پندرہ روز سے کم قیام سے مقیم نہ ہوگا، نمازوں کا قصر کرنا ہوگا، جب کہ وہاں ضروریات زندگی کے تمام ساز وسامان یا اہل وعیال کونہیں رکھا ہے۔ اور لڑکے کو وہاں مسافرانہ انداز میں رکھا ہو؛ لیکن اگر علی گڑھ میں مستقل طور پر اپنے یا بال بچوں کے رہنے کا سلسلہ ہو جائے تو علی گڑھ بھی وطن اصلی کے حکم میں ہو جائے گا۔ اور نمازوں کا بھی اتمام کرنا لازم ہوگا۔

لأنها إنما كانت وطنا بالأهل لا بالعقار ؛ ألا ترى! أنه لو تأهل ببلدة لم يكن له فيها عقار صارت وطنا له، وقيل : تبقى وطنا له؛ لأنها كانت وطنا له بالأهل والدار جمعيا، فبزوال أحدهما لا يرتفع الوطن كوطن الإقامة تبقى ببقاء الثقل الخ. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٢٣٩، كوئٹه ٢/ ١٣٦، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٢٤٣، قديم مصري ١/ ١٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۹۰)

تبلیغی جماعت مسافت سفر جانے کے بعد مختلف دیہاتوں کا دورہ کرے تو؟

سوال [۳۳۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک جماعت بمبئی سے عثمان آباد مسافت سفر پر چالیس دن کے لئے گئی عثمان آباد کے ذمہ داروں نے مشورہ کرکے جماعت کو چالیس دن کے لئے شہر کے آس پاس کے دیہاتوں میں تین تین دن کا رخ بنا کر روانہ کر دیا، یہ جماعت تین دن ایک دیہات میں کام کرکے پھر تین دن کے لئے دوسرے دیہات میں جاتی ہے، جو مسافت سفر سے کم پر واقع ہے، اس طرح یہ جماعت اپنا چلہ پورا کرے گی تو یہ جماعت اس ضلع میں مقیم ہوگی یا مسافر؟ جو بھی حکم

شرعی ہو تحریر فرمادیں عین نوازش ہوگی؟

المستفتي: مفتی سمیر عثمان آباد مہاراشٹر، استاذ مدرسہ فلاح دارین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ جماعت پورے چلہ عثمان آباد میں مسافر ہی رہے گی، اس لئے کہ اقامت کی شرائط میں سے ایک شرط ایک جگہ پندرہ دن قیام کرنا ہے جو اس کے حق میں نہیں پایا گیا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۵۹۳، ۵۹۴، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۴/۹۱)

عن عبدالله بن عمر –رضي الله عنهما– قال: إذا كنت مسافرا، فوطنت نفسک علی إقامة خمسة عشر يوما، فأتمم الصلاة، وإن كنت لاتدري، فاقصر. (كتاب الآثار، باب الصلاة، في السفر، الرحيم اكيڈمی، کراچی ص/ ۲۰۱، رقم: ۱۸۸)

ونية الإقامة إنما تؤثر بخمس شرائط إلى قوله: واتحاد الموضع. (هندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱۳۹، جديد ۱/ ۱۹۹، بدائع الصنائع، زكريا ۱/ ۲۶۸، البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ۲/ ۱۳۲، زكريا ۲/ ۲۳۲)

لو نوى الإقامة في موضعين، فإن كان كل منهما أصلا بنفسه نحو مكة ومنى والكوفة والحيرة لا يصير مقيما. (هندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱۴۰، جديد ۱/ ۱۹۹، بدائع الصنائع، فصل في صلاة المسافر زكريا ۱/ ۲۷۰، بحر، كتاب الصلاة، باب المسافر، كوئٹه ۲/ ۱۳۲، زكريا ۲/ ۲۳۲، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دارالكتب العلمية، بيروت جديد ۱/ ۲۴۰، هداية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، أشرفي ۱/ ۱۶۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱/ ۱۱۵۷۵)	۱۴۳۵/۶/۲۲ھ

گرامی قدر حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب مدظلہ العالی مدرسہ شاہی مرادآباد　　سلام مسنون!

سوال [۳۳۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آپ کی کتاب چھوٹے سائز کی ''ایضاح المسائل'' کا صفحہ ۶۶ر سامنے ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ بھی دونوں کی زیروکس منسلک ہے؛ البتہ دارالعلوم کے فتویٰ اور آپ کی کتاب کے فتویٰ میں کافی اختلاف ہے، مسئلہ مذکورہ میں آپ کے نزدیک قصر کی اجازت نہیں، جب کہ دارالعلوم کے فتویٰ کے مطابق قصر لازم ہے، یعنی وہ شخص بحکم مسافر ہی رہتا ہے، دونوں حوالوں کی روشنی میں براہ مہربانی کوئی وضاحت تحریر فرمائیں، ایک مسلک ایک مکتب فکر؛ بلکہ ایک ہی بانی کے دو مدرسہ کے دارالافتاء سے ایک واضح مسئلہ میں بین اختلاف کچھ عجیب سا لگتا ہے، بعینہٖ یہی سوال ہم نے دارالعلوم میں بھی لکھا ہے، کیا اچھا ہوتا آپ حضرات اس سلسلہ میں کوئی متفقہ فتویٰ صادر فرماتے۔ امید کہ وضاحت کے ساتھ مسئلہ کی نوعیت تحریر فرمائیں گے؟

المستفتي: شاکر حسین قاسمی، ہیڈ ماسٹر عربک کالج بیجا پور، کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آج سے پچاس ساٹھ سال قبل حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی نگرانی میں ''امداد الاحکام'' مرتب فرمائی ہے۔ اور پوری کتاب حضرت تھانوی قدس سرہ کی نظر میں رہی ہے، اس میں ''مجمع الانہر'' اور ''البحر الرائق'' کے جزئیہ کو پیش نظر رکھ کر بہت واضح اور مفصل فتویٰ لکھا گیا ہے کہ ہر وہ مقام وطن اصلی کے حکم میں ہے جہاں انسان اپنے اثاثہ اور اہل وعیال کے ساتھ رہتا ہو، جیسا کہ سسرال میں بیوی کو رکھنے کی صورت میں وہ وطن اصلی کے حکم میں ہو جاتا ہے، وہاں پر سب کے نزدیک اتمام واجب ہوتا ہے، اسی طرح ہمیشہ کی جائے ملازمت جس میں آدمی اپنی بیوی اور اثاثہ کے ساتھ رہتا ہے، وہ بھی وطن اصلی کے حکم میں ہو جاتی ہے؛ لہٰذا جب جائے ملازمت میں ضروریات زندگی اور بال بچوں کے ساتھ رہیگا تو اتمام لازم ہوگا۔ اور اگر بال بچے ساتھ نہ ہوں تو قصر کا حکم ہے۔ اور اس حکم کے ثبوت کے لئے (امداد الاحکام

١/ ٦٠٤، احسن الفتاوى ٤/ ١٠١، كتاب الفقه على المذاهب الاربعه، فصل ما يبطل به القصر، وبيان الوطن الأصلي وغيره، دارالفكر ١/ ٤٨٠، مجمع الأنهر، باب صلاة المسافر، مصري قديم ١/ ١٦٤، دارالكتب العلمية بيروت جديد ١/ ٢٤٣، البحرالرائق، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٢٣٩، كوئٹه ٢/ ١٣٦) کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، نیز چند سال قبل اس مسئلہ پر علماء پاکستان کا اجتماع ہوا تھا، اس میں بھی ''امدادالاحکام'' کے مسئلہ پر سب کا اتفاق ہوا ہے؛ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ جائے ملازمت میں ایک دفعہ پندرہ دن سے زائد قیام کر چکا ہو، اس کے بعد ہمیشہ اتمام کرتا رہے گا۔ اور علماء پاکستان کا یہ فیصلہ دارالعلوم کراچی کے ماہنامہ میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ اور آپ نے دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ پیش کیا ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے اور لکھنے کی اہلیت ہمارے اندر نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر:)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍۳؍۱۴۱۵ھ

جائے ملازمت میں اتمام یا قصر؟

[۳۳۸۳]: حضرت الاستاذ مولانا نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے ٹیلیفون پر اس مسئلہ کی تحقیق کے بارے میں حکم فرمایا، اسی وجہ سے فتویٰ اور جواب استفتاء کی شکل میں یہ مسئلہ نہیں لکھا جارہا ہے بلکہ مضمون اور مفصل تحریر کی شکل میں لکھا جارہا ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ جزئیات جمع ہو جائیں۔

نیز حضرت الاستاذ موصوف اس مسئلہ کے بارے میں پہلے ہی سے واقف ہونگے کیونکہ انکی شخصیت دارالعلوم دیوبند میں استاذ الاساتذہ کی حیثیت سے مانی جاتی ہے۔

مسئلہ کی تحقیق اس طرح سے پیش کی جاتی ہے کہ چھ چیزیں الگ الگ عنوانات سے مستقل طور

پر واضح کر کے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔
(۱) وطن اصلی (۲) وطن تأہل (۳) وطن توطن (۴) وطن سفر و وطن اقامت (۵) وطن سکنی (۶) قصر واتمام میں اختلاف واشتباہ واقع ہو جائے، تو کیا حکم ہے؟
(۱) **وطن اصلی**: حضرات فقہاء کرام نے وطن اصلی کی حقیقت کو واضح کرنے میں تین چیزوں کو الگ الگ حیثیت سے بیان فرمایا ہے، امام علاء الدین حصکفیؒ نے الدرالمختار میں حیثیت اور نوعیت کا فرق کر کے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔

”**الوطن الأصلي هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه**“ (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، کراچی ۲/ ۱۳۱، زکریا،۲/٤ ٦١- طحطاوی على الدر، باب صلاة المسافر، کوئٹہ ۱/ ۳۳٦)

اس میں غور کرنے کی نہایت ضرورت ہے کہ حرف أو کے ساتھ تین چیزوں کو الگ الگ کیوں بیان فرمایا ہے، عربی قواعد کے اعتبار سے حرف أو کے ماقبل اور مابعد کے درمیان حقیقت اور نوعیت کے اعتبار سے مغایرت لازم ہوتی ہے، ہاں البتہ حکم میں اتحاد اور موافقت ہوتی ہے، اسی وجہ سے علامہ شامی اور صاحب طحطاوی علی الدر نے تینوں کی حقیقت الگ الگ عبارات میں الگ الگ انداز سے واضح فرمائی ہے، اور وطن اصلی کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ وطن اصلی کو وطن اہلی، وطن فطرت اور وطن قرار وغیرہ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ موطن ولادت سے مراد یہ نہیں ہے کہ جہاں پر رحم مادر سے دنیا میں آیا ہو، وہی جگہ متعین ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے، ورنہ سہارن پور کا آدمی اپنی بیوی کو ولادت کے موقعہ پر میرٹھ ہسپتال لے جاتا ہے اور میرٹھ ہی میں بچہ کی ولادت ہوتی ہے تو اس بچہ کا وطن اصلی میرٹھ ہو جاتا حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اسکا وطن اصلی سہارن پور ہی ہے، اسی طرح مرادآباد کا آدمی ولادت کے موقعہ پر اپنی بیوی کو دلی ہسپتال لے جاتا ہے اور دلی میں ولادت ہو جاتی ہے تو دلی اس بچہ کا وطن اصلی ہو جاتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا وطن اصلی مرادآباد ہی ہے، یا سہارنپور کا آدمی جس کی سسرال میرٹھ میں ہے، قرب ولادت کے زمانہ

میں سہولت کے واسطے بیوی کو میکہ بھیج دیتا ہے اور میکہ ہی میں ولادت ہوجاتی ہے تو اس بچہ کا وطن اصلی میرٹھ بن جاتا، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور دنیا کا کوئی بھی شخص اس طرح کی جائے ولادت کو وطن اصلی نہیں کہتا ہے، بلکہ ''**موطن ولادتہ**'' سے مراد اس کا وہ وطن اصلی ہے جس میں اس کے ماں باپ کی اصلی رہائش ہوتی ہے اور وہ اس میں علی سبیل القرار رہتے آئے ہیں، چنانچہ صاحب بدائع اور صاحب بحر نے بجائے، ''**موطن ولادتہ**'' کے ''**الوطن الأصلي هو وطن الإنسان في بلدته، أو بلدة أخرى اتخذها دارا، وتوطن بها مع أهله وولده**'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں (بدائع فصل في صلاة المسافر، الكلام فى الأوطان، زكريا ١/ ٢٨٠، كراچى ١/ ١٠٣، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، كوئٹه ٢/ ١٣٦، زكريا، ١/ ٢٣٩)

لہٰذا حاصل یہ نکلا کہ موطن ولادت سے اسکے باپ کا وہ حقیقی اور اصلی بلد یا گاؤں مراد ہے، جس کی طرف لوگ اسکو اور اسکے باپ کو منسوب کیا کرتے ہیں، جیسے کہ لوگ کہا کرتے ہیں، سہارنپوری، میرٹھی، لکھنوی، اعظمی، پالن پوری وغیرہ، حالانکہ سہارنپوری نے سہارنپوری کہلاتے ہوئے مستقل رہائش لکھنؤ میں بنالی ہے، اور اعظمی نے اعظمی کہلاتے ہوئے مستقل طور پر رہائش دیوبند میں بنالی ہے وغیرہ وغیرہ، تو ایسی صورت میں پہلے والا حقیقی وطن اصلی ہے اور دوسرا والا وطن اصلی کے حکم میں ہوتا ہے، یہی ہے وطن اصلی کے متعدد ہونے کا مطلب، اور جس طرح وطن اصلی کی حقیقت کو وطن فطرت اور وطن قرار کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس طرح کے الفاظ سے وطن تأہل اور وطن توطن کی حقیقت کو کہیں بھی بیان نہیں کیا گیا، بلکہ وطن تأہل کو وطن اصلی سے الگ کرکے اس کی حقیقت کو الگ سے واضح فرمایا ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے اسی طرح وطن توطن کو بھی وطن اصلی اور وطن تأہل کی حقیقت سے الگ کرکے بالکل دوسرے انداز سے بیان فرمایا، اسلئے ہم پر لازم ہے کہ حضرات فقہاء کی تصریحات کے مطابق تینوں چیزوں کی حقیقت اور تینوں کے حکم کو الگ الگ عنوان کی حیثیت سے سمجھیں اور اس بات کو بھی پہلے ہی سے سمجھ لینا چاہئے کہ تینوں کی حقیقت اور نوعیت بالکل

الگ الگ ہونے کے باوجود، تمام فقہاء کا اتفاق اس بات پر ہے کہ قصر واتمام کے مسئلہ میں تینوں کا حکم یکساں ہے کہ جس طرح وطن اصلی میں اتمام لازم ہوتا ہے، اسی طرح وطن تأہل میں بھی اتمام لازم ہے، اور ایسا ہی وطن توطن میں بھی، اسی وجہ سے تینوں کو حضرات فقہاء کبھی علی الاطلاق وطن اصلی کے الفاظ سے تعبیر فرماتے ہیں، وطن اصلی کی حقیقت واضح ہے، مزید وضاحت کی ضرورت نہیں، مگر اس بات کی وضاحت عام طور پر صاف شفاف طریقے سے نہیں کی جاتی ہے، کہ وطن تأہل کے دائرے میں کون کونسی شکلیں داخل ہیں اور وطن توطن کے دائرے میں کیا کیا شکلیں شامل ہیں، جس کی وجہ سے لوگ قصر واتمام میں شکوک وشبہات اور اشتباہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اشتباہ اور شبہ میں مبتلا ہونے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب حضرات فقہاء وطن تأہل کی وضاحت کرنے لگتے ہیں تو اس میں لفظ ''الـــوطـــن الاصـــلـــی'' استعمال کرتے ہیں حالانکہ فقہاء کا مقصد ایسی جگہ پر یہی ہوتا ہے کہ چونکہ وطن تاہل بھی وطن اصلی کے حکم میں ہوتا ہے، اس لئے لفظ الوطن الاصلی استعمال کرتے ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وطن تأہل بعینہٖ وطن اصلی ہی ہے، اس کی وضاحت بدائع کی اس عبارت سے اچھی طرح ہوسکتی ہے :

''ثم الوطن الأصلي يجوز أن يكون واحداً أو أكثر من ذلک بأن كان له أهل ودار فی بلدتين أو أكثر ولم يكن من نية أهله الخروج منها''

(بدائع، فصل في صلاة المسافر، الكلام في الأوطان، زكريا ۱/ ۲۸۰، قديم كراچی ۱/۱۰۳، بيروت ۱/ ٤٩٨)

اس عبارت پر غور کیا جائے تو یہ بات خود سمجھ میں آجائیگی کہ فقہاء کا مقصد اس طرح کی عبارات سے صرف اس بات کو واضح کرنا ہے کہ جو بھی وطن اصلی کے حکم میں ہوتا ہے وہ متعدد ہوسکتا ہے، چاہے وطنِ تأہل ہو یا وطنِ توطن، ہر ایک میں تعدد ممکن ہے، ورنہ اس عبارت میں '' **بأن كان له أهل ودار فی بلد تين أو أكثر** '' کے الفاظ خود ہی بتارہے ہیں کہ یہاں صرف وطن فطرت کا حکم بیان نہیں کیا جارہا ہے، کیونکہ وطن فطرت

متعدد کبھی نہیں ہوسکتا، بلکہ وطن فطرت، وطن ولادت ایک ہی ہوا کرتا ہے، ورنہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ ایک آدمی کی پیدائش اور پیدائشی وطن دو جگہ کیسے ہو؟ وہ تو ایک ہی ہوسکتا ہے، اس تفصیل سے حقیقی معنی میں جو وطن اصلی ہے اس کی وضاحت ہوگئی ہے، اس کو حضرات فقہاء نے اس نہج سے بیان فرمایا ہے کہ وطن اصلی، وطن اصلی سے باطل ہوجائے گا، جبکہ اپنے ساز وسامان اور بیوی بچے سب کچھ لے کر منتقل ہوجائے اور اگر ساز وسامان اور بیوی بچوں کے ساتھ منتقل نہ ہو اور دوسری جگہ بھی شادی کرکے وطن بنالیا ہے تو اس کا پہلا وطن اصلی باطل نہیں ہوگا، بلکہ اب اس کے وطن اصلی دو ہوجائیں گے، اور دونوں جگہ اتمام لازم ہوجائے گا، اسکو ہندیہ میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

" ویبطل الوطن الأصلي بالوطن الأصلي إذا انتقل عن الأول بأهله وأما إذالم ينتقل بأهله ولكنه استحدث أهلا ببلدة أخرى فلا يبطل وطنه الأول ويتم فيهما". (هنديه، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ١٤٢، جديد ١/ ٢٠٢)

اور بحر میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے،

" وهذا الوطن يبطل بمثله لاغير، وهو أن يتوطن فى بلدة أخرى وينقل الأهل إليها فيخرج الأول من أن يكون وطناً أصلياً حتى لو دخله مسافراً لايتم ." (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ٢/ ٢٣٩، كوئٹه ٢/ ١٣٦)

بحر کے جزئیہ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حقیقی وطن اصلی سے ساز وسامان اور بال بچوں کے ساتھ مکمل طور پر دوسری جگہ منتقل ہوکر وطن بنالیا ہو تو پہلے والے وطن میں اتمام جائز نہیں ہوگا بلکہ قصر لازم ہوگا۔

(۲) **وطن تأهل** : متون میں وطن تأہل کو وطن اصلی کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا ہے:

" الوطن الاصلى هو موطن ولادته أوتأهله أو توطنه."

کہ تأہل کے لفظ سے اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ وطن اصلی کی ایک شکل تأہل کی بھی ہے

اس کامطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے اصلی اور حقیقی وطن اصلی سے دور دراز اجنبی علاقہ میں شادی کرکے بیوی کو وہیں مستقل طور پر رکھ رکھا ہو، تو ایسی صورت میں باتفاق فقہاء یہ سسرال کا مقام بھی اس کے لئے وطن اصلی کے حکم میں ہو جاتا ہے، یہ نہیں ہے کہ بعینہ وطن اصلی بن جاتا ہو بلکہ اسکے حکم میں ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے ”أو تـأهلـه“ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے یعنی لفظ ”أو“ کے مابعد اور ماقبل میں حقیقت کا تعلق نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف حکم کا تعلق ہوتا ہے یعنی وطن تأہل، حکمی وطن اصلی ہوتا ہے، لیکن اگر شادی کرکے بیوی کو وہاں مستقل طور پر نہیں رکھا ہے بلکہ رخصت کرکے اپنے ساتھ لے آیا ہے تو سسرالی جگہ اس کے لئے وطن اصلی کے حکم میں ہوگی یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں علامہ شامی، صاحب صغیری و کبیری اور صاحب فتح القدیر کی ایک عبارت سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف نکاح کرنے کی وجہ سے سسرال میں راجح قول کے مطابق اتمام کیا کرے گا، اگرچہ بیوی کو وہاں مستقل طور پر نہ رکھا ہو، مگر اس عبارت کی گہرائی تک پہنچنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شادی کرکے بیوی کو وہاں سے رخصت کرکے منتقل کرلیا ہو، اسکے بعد سسرال آکر کے اقامت کی نیت نہ کرے تب بھی اتمام کیا کرے گا، بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ شادی کرکے بیوی کو وہاں مستقل طور پر اس طرح رکھ رکھا ہو جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں شادی کرکے بیوی کو وہاں چھوڑ رکھا تھا اور خود مدینہ منورہ میں قیام فرمایا اور جب بھی مکہ مکرمہ تشریف لاتے تھے تو بغیر پندرہ دن کے قیام کے بھی اتمام فرمالیا کرتے تھے جیسا کہ محیط برہانی کے حوالے سے اسکی تفصیل آگے آرہی ہے۔

”كان لعثمان – رضي الله عنه– أهل بمكة وأهل بالمدينة وكان يتم الصلاة بهما جميعاً“. (المحيط البرهانى، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون صلاة السفر، المجلس العلمي ٢/ ٤٠٢، رقم: ٢٠٦٤)

اور خود صاحب کبیری نے **”وهو الأوجه“** کہنے کے ساتھ ساتھ **”لما مر من حديث عثمان رضي الله عنه“** کی قید لگائی ہے جس سے یہی مفہوم واضح ہوتا ہے کہ بیوی کو وہاں

رکھ رکھا ہو جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے رکھا تھا، اور تمام اکابر اہل فتاویٰ نے اسی قید کے ساتھ سسرال میں اتمام کو جائز لکھا ہے، جیسا کہ فتاویٰ دار العلوم ۴/ ۴۸۳، فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۷/ ۴۹۷، امداد الاحکام ۲/ ۳۱۰ وغیرہ)

فقہاء کی عبارت حسب ذیل ہے :

”ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الاقامة به فقيل لايصير مقيما، وقيل : يصير مقيماً وهو الأوجه لما مر من حديث عثمانؓ “. (حلبي كبير، الصلاة، باب صلاة المسافر، پاكستان، ص: ٥٤٤، فتح القدير، الصلاة، باب صلاة المسافر، بيروتي ٢/ ٤٣، زكريا ديو بند ٢/ ٤١، صغيري، الصلاة، باب صلاة المسافر، ص: ٢٧٥، شامي، الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي و وطن الإقالمة، زكريا ٢/ ٦١٤، كراچى ٢/ ١٣١)

اور فتح القدیر و بحر وغیرہ کی عبارت سے سسرال میں اتمام کے لئے اس بات کو شرط کے درجہ میں قرار دیا ہے کہ شادی کر کے بیوی کو وہاں رکھ رکھا ہو، ورنہ سسرال میں نہ اتمام جائز ہے اور نہ ہی سسرال وطن تأہل بنے گا، فتح القدیر کی عبارت حسب ذیل ہے:

” أو موضع تأهل به ومن قصده التعيش به لا الا رتحال“. (فتح القدير، بيروتي ٢/ ٤٣، كوئٹه ٢/ ١٦)

اسکو علامہ چلپی نے حاشیۂ زیلعی میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔

” التى تأهل فيها أى ومن قصده التعيش به لا الارتحال. (حاشيه زيلعى على ها مش التبيين، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ١/ ٥١٧، إمداديه ملتان ١/ ٢١٤)

اور البحر الرائق میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے :

”وليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها“. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، كوئٹه ٢/ ١٣٦، زكريا ٢/ ٢٣٩)

ان تمام جزئیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سسرال کے وطن اصلی کے حکم اور اسکے درجہ میں ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بیوی کو مستقل طور پر وہاں رکھ کر وہیں پر رہائش کا ارادہ کرلیا

ہو۔

وطن تأهل کا تعدد: وطن تأہل کے وطن اصلی کے درجہ میں ہونے کا سارا مدار قیام زوجہ پر ہے جس کی دلیل ماقبل میں گزر چکی ہے، لہٰذا اگر کسی نے جائے پیدائش کے علاوہ دیگر متعدد مقامات میں، متعدد بیویوں کو رکھ رکھا ہے، وہ سب جگہیں اس کے لیے وطن اصلی کے درجہ میں ہو جائیں گی، اور ان مقامات میں سے جس میں بھی پندرہ دن سے کم قیام کے ارادے سے پہنچے گا، نمازوں کا اتمام لازم ہو جائے گا، مثلاً سہارنپور کا رہنے والا آدمی ایک شادی دلی میں کر کے اس کا قیام دلی میں رکھا ہے دوسری شادی لکھنؤ میں کر کے اس کو مستقل طور پر لکھنؤ میں رکھ رکھا ہے تیسری شادی گورکھپور میں کر کے اس کو مستقل طور پر گورکھپور میں رکھ رکھا ہے، چوتھی شادی بنارس میں کر کے اس کو مستقل طور پر بنارس میں رکھ رکھا ہے، اور سہارنپور جو اسکا حقیقی وطن اصلی ہے اسکو بھی ترک نہیں کیا ہے تو ایسی صورت میں سہارنپور اس کا حقیقی وطن اصلی ہوگا، اور دلی، لکھنؤ، گورکھپور، بنارس، یہ چاروں مقام وطن تأہل ہو جائیں گے، اور چاروں کے درمیان میں مسافت سفر کا فاصلہ ہے اور چاروں وطن تأہل قصر و اتمام کے مسئلہ میں سہارنپور کی طرح وطن اصلی کے حکم میں ہو کر کے ہر جگہ ہمیشہ نمازوں کا اتمام کرنا اسکے اوپر لازم ہو جائے گا، اسکو تاتارخانیہ میں اس طرح کے الفاظ سے واضح فرمایا ہے :

”ولو كان أهل في بلدة فاستحدث في بلدة أخرى أهلاً فكل واحد منهما وطن أصلي له“. (تاتارخانيه، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۵۱۱، رقم: ۳۱۴۸، كوئٹه ۲/ ۱۹ قديم)

شامی اور شرح کبیری وغیرہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے :

”ولو كان له أهل ببلدتين فأيتهما دخل صار مقيماً. (شامی، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة، كراچی ۲/ ۱۳۱، زكريا ۲/ ۶۱۴، كبيري، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، لاهور، ص: ۵۴۴)

اور ”کفایہ“ اور ”**المحيط البرهاني**“ وغیرہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ کے

ساتھ ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے :

ولو كان له أهل ببلدة فاستحدث ببلدة أخرى أهلاً فكل واحد منهما وطن أصلي له، وروى أنه كان لعثمان رضى الله عنه أهل بمكة وأهل بالمدينة وكان يتم الصلاة بهما جميعاً. (المحيط البرهاني، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون صلاة السفر، بيروت ٢/ ٤٠٢، رقم: ٢٠٦٤، كفاية مع فتح القدير، الصلاة باب صلاة المسافر، کوئٹہ،٢/ ١٧)

بیوی کا انتقال ہو جائے یا طلاق ہو جائے تو کیا حکم؟

ماقبل کی تفصیل سے یہ بات واضح ہو چکی کہ وطن تأہل باتفاق فقہاء متعدد ہوسکتا ہے، لیکن ساتھ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی دو بیویاں دو جگہ رہتی ہیں، مثلاً ایک کو دلی میں رکھ رکھا ہے اور دوسری کو گورکھپور میں، تو باتفاق فقہا دونوں جگہ اس پر ہمیشہ اتمام لازم ہے، لیکن اگر دلی میں جو بیوی ہے اسکا انتقال ہو گیا یا طلاق بائن ہوگئی، تو ایسی صورت میں دلی اس کے لئے وطن تأہل کے دائرے میں باقی رہی یا دلی سے وطن تأہل ختم ہو گیا؟ تو اس سلسلے میں فقہاء کی دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ وطن تأہل کا مدار قیام زوجہ پر ہے اس لئے اب دلی میں اتمام نہیں کرسکتا، اور دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ اگر دلی میں اس کی جائیداد، رہائشی مکان وغیرہ کچھ بھی باقی نہیں ہے بلکہ سسرال کے گھر میں بیوی کو رکھ رکھا تھا تب تو تأہل بالکلیہ ختم ہو چکا ہے اور اتمام اسکے لئے جائز نہ ہوگا لیکن اگر دلی میں اس کی جائیداد اور رہائشی مکان وغیرہ موجود ہے اور سابقہ طریقہ سے دلی میں آنے جانے کا ارادہ ہے تو ایسی صورت میں بیوی کی موت کے بعد بھی دلی وطن تأہل کی طرح، وطن اصلی کے حکم میں باقی رہے گی، فقہاء کے ان اختلافی جزئیات پر غور کرنے کے بعد یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے کہ دلی اسکے لئے وطن اصلی کے درجہ میں باقی رہے گی، اور سابقہ طریقہ سے اس پر اتمام لازم ہوگا، فقہاء کے اختلافی جزئیات حسب ذیل ہیں: ملاحظہ ہوں :

”لوكان له أهل فى بلدتين فأيتهما دخل صار مقيماً فإن ماتت زوجته فى إحداهما وبقى له فيها دور وعقار قيل لايبقى وطناً له إذالمعتبر الأهل دون الدار كمالوتأهل ببلدة واستقرت سكنا له وليس له فيها دار وقيل تبقى. (شامى، الصلاة باب صلاة المسافر، مطلب في الموطن الأصلي، ووطن الإقامة، زكريا ۲/ ٦١٤، كراچى۲/ ۱۳۱، حلبي كبير، الصلاة، باب صلاة المسافر، لاهور، ص: ٥٤٤، صغيري مجتبائى، الصلاة، باب صلاة المسافر، ص: ۲۷٥)

اورطحاوی علی الدر میں بیوی کی موت کے بعد بھی وطن تأہل کے وطن اصلی کے حکم میں باقی رہنے کوترجیح دی ہے، جوذیل کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

” ولو كان له أهل بالكوفة وأهل بالبصرة فمات أهله بالبصرة وبقى له دور وعقار يبقىٰ وطناً له لأنها كانت وطنا له بالأهل والدار جميعاً فبزوال أحدهما لاير تفع الوطن الأصلى كوطن الإقامة يبقىٰ ببقاء الثقل. وإن أقام بموضع آخر. “ (طحطاوى على الدر، الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ۱/ ۳۳٦)

وطن تأهل کی بنیادی دلیل: حضرات فقہاء نے وطن تأہل کووطن اصلی کے درجہ میں قرار دینے میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر کو بنیاد بنایا ہے کہ یہ بات واضح ہے کہ حضرت عثمانؓ نے وطن اصلی مدینہ منورہ کو بنایا تھا، وہی ان کی جائے ہجرت تھی، اسی وجہ سے جب تک انہوں نے مکہ مکرمہ میں شادی نہیں کی تھی، اس وقت تک مکہ مکرمہ میں قصر فرمایا کرتے تھے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے قصر فرمایا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کومخاطب کرکے فرمایا، کہ اے اہل مکہ تم اپنی نماز مکمل کرلو، ہم دورکعت اس لئے پڑھ رہے ہیں کہ ہم مسافر ہیں، اس کو ابوداؤد شریف میں ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے،

” يا أهل البلد صلوا أربعا فإنا قوم سفر. (أبوداؤد شريف، كتاب الصلاة، باب متى يتم المسافر؟ النسخة الهندية ۱/ ۱۷۳، حديث: ۱۲۲۹)

موطا امام مالک میں ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

”إن عمر بن الخطاب كان إذاقدم مكة صلى بهم ركعتين ثم يقول: يأهل مكة أتموا صلاتكم فإنا قوم سفر. (مؤطا امام مالك، الصلاة، صلاة المسافر إذا كان إماما أو وراء الإمام، ص: ٥٢، حديث: ٣٣٦)

اوردوسرے الفاظ اس طرح ہیں:

إن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– صلى للناس بمكة ركعتين، فلما انصرف، قال: ياأهل مكة! أتموا صلوتكم فإنا قوم سفر، ثم صلى عمر ركعتين بمنى، ولم يبلغنا أنه قال لهم شيئا. (موطاامام مالك، الصلاة، باب صلاة منى، ص: ١٥٧، حديث: ٨٩٥)

چنانچہ حضرت عثمانؓ اپنے دورِ خلافت میں شروع شروع میں جب تک مکہ مکرمہ میں شادی نہیں کی تھی، دو ہی رکعت پڑھا کرتے تھے، اور جب مکہ مکرمہ میں شادی کرلی، تو چار رکعت پڑھنے لگے، اور جب حضرت عثمانؓ چار رکعت پڑھنے لگے تو بعض اجلۂ صحابہ نے حضرت عثمانؓ پر نکیر فرمائی تو اس پر حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ پہلے میں نے شادی نہیں کی تھی، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح دو رکعت پڑھتا رہا، اور جب میں نے مکہ مکرمہ میں شادی کرلی تو اب میرے لئے چار رکعت پڑھنے کا حکم ہو گیا ہے، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں شادی کر کے تأہل اختیار کرلے تو وہ مقیم کی طرح نماز پڑھے، حضرت عثمانؓ کی روایت مسند امام احمد میں ان الفاظ سے مذکور ہے:

”إن عثمان صلى بمنى أربع ركعات فأنكره الناس عليه فقال يا أيها الناس، إني تأهلت بمكة منذ قدمت وإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من تأهل ببلد فليصل صلاة المقيم. (مسند إمام أحمد بن حنبل ١/ ٦٢، حديث: ٤٤٣، اعلاء السنن، الصلاة، باب وجوب القصر في السفر وكراهة الإتمام، كراچی ٧/ ٢٨٥، مطبع بيروت، الصلاة، باب إذا تزوج المسافر فى بلد وله فيه زوجة الخ ٧/ ٣١١)

اور مبسوط سرخسی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی نکیر کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی روایت نقل کی گئی ہے جو اس سے زیادہ مفصل ہے اور وہ ذیل میں درج ہے:

”ولما صلى عثمانؓ بعرفات أربعاً قال ابن مسعود رضي الله عنه: صليت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في هذا المقام ركعتين ومع أبي بكر وعمر رضي الله عنهما ركعتين، ثم اختلفت بكم الطريق فليت حظي من الأربع مثل حظي من الركعتين، فلما بلغ ذلك إلى عثمان قال: إني تأهلت بمكة وسمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من تأهل ببلدة فهو من أهلها. (مبسوط سرخسی، الصلاة، باب صلاة المسافر، بیروت ۱/ ۲۴۰)

اور ”المحیط البرہانی“ میں اس بات کو وضاحت سے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ایک بیوی مکہ میں تھی اور ایک بیوی مدینہ منورہ میں بھی تھی اور اسی وجہ سے وہ دونوں جگہ اتمام فرمایا کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ وطن تأہل کے تأہل بننے کے لئے قیام زوجہ لازم ہے، خود مرد کا مستقل قیام لازم نہیں، ”محیط برہانی“ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

ولو كان له أهل ببلدة فاستحدث ببلدة أخرى أهلاً فكل واحد منهما وطن أصلي له، وروي أنه كان لعثمانؓ أهل بمكة وأهل بالمدينة وكان يتم الصلاة بهما جميعاً. (المحيط البرهاني، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون صلاة المسافر، المجلس العلمي ۲/ ۴۰۲، رقم: ۲۰۶۴)

ان تمام روایات وجزئیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وطن تأہل کو وطن اصلی کہنے کی بنیاد حضرت عثمانؓ کا عمل ہے، اور یہ بات بھی خود واضح ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ہجرت کے بعد حقیقی وطن اصلی مدینہ منورہ تھا اور مکۃ المکرّمہ حقیقی وطن اصلی نہیں تھا، صرف بیوی کو وہاں رکھنے کی وجہ سے اسکو وطن اصلی کا درجہ دیا گیا تھا نہ یہ کہ وہ حقیقی وطن اصلی تھا، اس لئے کہ اگر بیوی کو طلاق دی جاتی یا بیوی کا انتقال ہوجاتا اور وہاں جائیداد بھی نہ ہوتی تو مکہ مکرمہ کے وطن اصلی ہونے کا حکم باقی نہ رہتا لیکن مدینۃ المنورہ میں بیوی کا انتقال ہوجانے کے بعد بھی وہ وطن اصلی ہی

رہتا اس سے معلوم ہوا کہ وطن تأہل بعینہٖ وطن اصلی نہیں ہوتا ہے بلکہ وطنِ اصلی کے حکم اور اس کے درجہ میں ہوتا ہے۔

(۳) **وطن توطن**: علامہ حصکفی علیہ الرحمہ کی عبارت:

" الوطن الأصلي وهو موطن ولادته أو تأهله أوتوطنه."

ماقبل میں اسکی وضاحت آچکی تھی کہ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے وطن اصلی کی تین شکلیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) موطن ولادتہ: اسکی مفصل تفصیل وطن اصلی کی سرخی کے ذیل میں آچکی ہے۔

(۲) وطن تأہل: اسکی بھی مفصل بحث اور تفصیل ماقبل میں آچکی ہے۔

(۳) وطن توطن: جس کی وضاحت یہاں کی جارہی ہے۔

علامہ شامیؒ نے علامہ حصکفیؒ کی عبارت ''أو توطنه" کے لئے الگ سے تفصیلی عنوان قائم فرمایا ہے، چنانچہ اسکے ذیل میں ''**أى عزم على القرار فيه وعدم الارتحال وإن لم يتأهل، الخ.** (شامی، الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة، زکریا ۲/ ٦١٤، کراچی ۲/ ١٣١) سے مفصل نوٹ تحریر فرمایا ہے کہ وطن توطن اسکو کہا جاتا ہے جو نہ اپنی اور باپ دادا کی جائے ولادت اور جائے قرار ہو اور نہ ہی اس جگہ شادی کر رکھی ہو، بلکہ یہ ایک ایسی جگہ ہے جو وطن اصلی اور وطن تأہل سے بالکل جداگانہ ایک تیسری جگہ ہے جو قصر واتمام کے حکم میں بالاتفاق وطن اصلی کی طرح برابر کا حکم رکھتی ہے، لیکن کلمۂ اُو کے ذریعہ سے اسکو الگ سے بیان کرنا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وطن اصلی اور وطن توطن کے درمیان حقیقت کا اختلاف ہے، دونوں کی حقیقت الگ الگ ہے مگر حکم کا اتحاد ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وطن توطن کا مصداق کیا ہے اور اسکے دائرہ میں کیا کیا شکلیں آسکتی ہیں؟ تو ہمارے سامنے اس کی دو شکلیں ہیں:

شکل ۱: جائے ملازمت میں مع اہل وعیال قیام

اگر ہم توطن سے ایسی جائے ملازمت مراد لیتے ہیں جسمیں آدمی بیوی بچے اور ضروریات زندگی کے سازوسامان کے ساتھ رہتا ہے تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ عبارت میں تین قیدیں ہیں، ان تینوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے (۱) عزم علی القرار فیہ، کہ اگر کسی شخص نے جائے ملازمت میں مستقل طور پر رہنے کا ارادہ کرلیا ہے اور اسکا ارادہ وہاں سے ملازمت ترک کرنے کا نہیں ہے۔

(۲) دوسری قید عدم الارتحال، اسکا ارادہ وہاں سے اپنے بال بچے وساز وسامان لے کر مستقل طور پر منتقل ہونے کا نہیں ہے۔

(۳) **وإن لم یتأھل** :اس نے اس جگہ شادی نہیں کی ہے۔

ان تمام قیودات پر غور کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ایسی جائے ملازمت جس جگہ پر آدمی نے شادی نہیں کی ہے مگر بال بچوں اور سازوسامان کے ساتھ تعیش کے طور پر رہتا ہے اور جب وہاں سے کہیں جاتا ہے تو لوٹ کر آنے کے ارادہ سے جاتا ہے اور علامہ شامیؒ نے عدم الارتحال کی جو قید لگائی ہے اس کا یہی مقصد ہے کہ جب بھی وہاں سے دور دراز سفر میں جائے تو ارتحال کے طور پر نہ جائے بلکہ عود کرآنے کے ارادہ سے جائے، تو ایسی صورت میں وہ مقام اسکے لئے وطن توطن ہے جو وطن تأہل کی طرح وطن اصلی کے حکم میں ہوتا ہے اور جب بھی وہاں سے مسافت سفر پر جانے کے ارادے سے سفر شروع کرے گا تو اس کا یہ توطن باطل نہیں ہوگا۔

اسکو علامہ طحطاوی نے اس طرح کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے جو ذیل میں درج ہے:

’’أوتوطنہ أی بأن اتخذ ھا داراً ولیس من قصدہ الارتحال عنھا بل التعیش بھا وإن لم یتأھل بھا.

طحطاوی کی عبارت پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مقصد تعیش اور رہائش ہو اور ارتحال کا ارادہ نہ ہو، اور علامہ طحطاوی نے بھی وان لم یتأہل بہا کی قید لگائی ہے کہ اگرچہ سسرال کا علاقہ نہیں ہے بلکہ کسی دوسری جگہ ضروریات زندگی کے ساتھ رہائش اختیار کرلی ہو۔

تواس مسئلہ کے بارے میں احقر کا شرح صدر ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ جائے ملازمت یا جائے کاروبار میں بیوی بچوں کے ساتھ رہائش اختیار کرلینے سے وطن تأہل کی طرح جائے ملازمت بھی وطن اصلی کے حکم میں ہوجاتی ہے اور اس پر نمازوں کا اتمام کرنا لازم ہوجاتا ہے، اور اگر وہ کسی مسجد کا امام ہے اور دور دراز سفر سے واپسی میں پندرہ دن سے کم قیام کا ارادہ ہے تو بلا تکلف ان ایام میں نمازوں کے اتمام کے ساتھ امامت کرسکتا ہے۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ حضرات فقہا نے بالاتفاق، وطن توطن کو وطن تأہل کی طرح، وطن اصلی کے درجہ اور حکم میں قرار دیا ہے، ایسی جائے ملازمت جس میں علی سبیل القرار بال بچوں کے ساتھ رہائش اختیار کرلی گئی ہے اور وہاں سے مستقل طور پر منتقل ہونے کا ارادہ نہیں کیا ہے تو ایسی جائے ملازمت وطن توطن کے دائرہ سے ہرگز خارج نہیں ہے بلکہ وطن توطن کی پوری تصویر ایسی جائے ملازمت اور جائے کاروبار میں مکمل طور پر ثابت ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ جائے ملازمت وطن تأہل کی طرح وطن اصلی کے حکم میں ہوگی اور وہاں اتمام لازم ہوجائے گا، اکثر فقہا نے اس حکم کو: ''**إذ المعتبر الأهل دون الدار كما لو تأهل ببلدة واستقرت سكناً له، وليس له فيها دار.** (شامی، الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، ووطن الإقامة، زکریا ۲/ ۶۱۴، کراچی ۲/ ۱۳۱، حلبي كبير، الصلاة، باب صلاة المسافر، سهيل اكيڈمی، ص: ۵۴۴) جیسی عبارات سے واضح فرمایا ہے۔

لہٰذا اگر کسی نے دوشہروں میں الگ الگ دو بیویوں کو مستقل طور پر رکھا ہے چاہے وہاں شادی نہ کی ہو۔

اور وہاں سے بیویوں کو منتقل کرنے کا ارادہ نہ کیا ہو تو وہ دونوں جگہ وطن تأہل کی طرح وطن اصلی کے حکم میں ہو جائیں گی، اور جب بھی وہاں پندرہ دن سے کم قیام کے ارادہ سے پہونچے گا نمازوں کا اتمام لازم ہوجائے گا، اس لئے کہ وطن اصلی کے حکم میں ہونے کی اصل وجہ اس جگہ پر شادی کرنا نہیں ہے، بلکہ بیوی بچوں کو ساتھ لے کر مستقل طور پر رہائش کا ارادہ ہے تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ جائے ملازمت میں بیوی بچوں کے ساتھ مستقل

رہائش کر لینا من وجہ وطن تأہل ہے اور من وجہ وطن توطن ہے اور دونوں شکلوں میں اتمام لازم ہوتا ہے چنانچہ اگر دو شہروں میں سے کسی ایک شہر میں بیوی کا انتقال ہو جائے تو فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر فقہاء کے نزدیک جب وہاں سے ساز وسامان کے ساتھ منتقل ہونے کا ارادہ نہیں تو اتمام لازم ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک وہاں کی وطنیت ختم ہو جائے گی، قصر لازم ہو جائے گا، جو فقہاء کی اس طرح کی عبارات سے واضح ہوتا ہے:

ولـو كـان لـه أهل ببلدتين فأيتهما دخل صار مقيماً فإن ماتت زوجته فـي أحـد هما وبقي له فيها دور وعقار قيل: لايبقىٰ وطنا له إذالمعتبر الأهل دون الـدار كـمالـو تأهل ببلدة واستقرت سكنا له وليس له فيها دار وقيل: تبقى. (حلبی کبیر، الصلاة، باب صلاة المسافر، سهيل اكيڈمی ص: ٥٤٤)

اور بدائع کے الفاظ سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے:

وإن كـان هـو يـنتقل من أهل إلى أهل فى السنة حتى إنه لوخرج مسـافـراً إلـى من بلدة فيها أهله، ودخل في أي بلدة من البلاد التي فيها أهـله فيصير مقيماً من غير نية الإقامة. (بـدائع، الصلاة، المسافر إذا دخل مصره صار مقيما، زكريا ١/ ٢٨٠، كراچی ١/ ١٠٤)

شکل ۲: جائے ملازمت یا جائے کاروبار میں تجرد کے ساتھ رہائش

اگر کسی شخص نے جائے ملازمت یا جائے کاروبار میں مستقل طور پر رہائش کا ارادہ کرلیا ہے اور وہاں سے منتقل ہونے کا ارادہ نہیں ہے مگر بیوی بچے بھی ساتھ میں نہیں ہیں تو وہ جب اپنی جگہ سے مسافت سفر پر چلا جائے اور واپسی میں پندرہ دن یا اس سے زائد قیام کا ارادہ نہ ہو بلکہ دو چار دن بعد پھر مسافت سفر پر جانے کا ارادہ ہو اور جب بھی جائے لوٹ کر آنے کے ارادے سے جائے تو ایسی تجرد کی زندگی گزارنے والوں کے بارے میں اب تک احقر کا شرح صدر اس بارے میں یہ رہا ہے کہ جائے ملازمت میں پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں ان کو

قصر کرنا چاہئے اتمام نہیں، لیکن مفتی محمد سلمان صاحب نے اس بارے میں توجہ دلائی اور ''احکام سفر'' کے عنوان پر مفتی محمد طاہر مسعود صاحب مدرسہ مفتاح العلوم سرگودھا پاکستان، کی ایک کتاب پیش فرمائی، اس کتاب میں اس موضوع پر دسیوں مدارس کے مفتیان کرام کے فتاویٰ اور تحقیقی مضامین موجود ہیں، خاص طور پر مجلس تحقیقات اسلامی ملتان کے زیر تحت، مفتی عبدالستار، خیر المدارس ملتان، مفتی عبداللہ مفتی خیر المدارس ملتان، مولانا عبدالقادر، دارالعلوم کبیر والا، مفتی محمد مجاہد جامعہ امدادیہ فیصل آباد، دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی، مفتی عبدالواحد جامعہ مدنیہ لاہور، ان سب حضرات نے اپنی محققانہ تحقیقوں سے یہ ثابت کردیا ہے کہ جائے ملازمت میں تجرد کے ساتھ رہنے والے بھی علی سبیل القرار رہتے ہیں، اس لئے ان کو پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں بھی اتمام کرنا ضروری ہے، لیکن اس مسئلہ میں دارالعلوم حقانیہ اکوڑاختک والوں نے تحقیقی جواب نہیں لکھا ہے بلکہ ان حضرات کی تحقیقات کے صحیح ہونے پر رجحان ظاہر فرمایا ہے، اور جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ حقانیہ سرگودھا، دارالعلوم دیوبند اور مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ کا فتویٰ اول الذکر حضرات کی تحقیق کے خلاف عدم اتمام اور قصر پر ہے، لیکن دونوں طرف کے دلائل پر غور کرنے کے بعد قائلین اتمام کے دلائل درست معلوم ہوتے ہیں، مگر اتمام کو جائز کہنے کی صورت میں اسکو علی الاطلاق وطن اقامت کہنا سمجھ میں نہیں آتا، اس لئے احقر نے اس سلسلے میں فقہ کی جزئیات کی جستجو کی تو ''کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ'' میں ایک جزئیہ ملا، جو اتمام کی تائید میں ہے، مگر ساتھ ساتھ اس بات کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ مستقل طور پر جو جائے ملازمت ہوتی ہے وہ وطن تأہل کی طرح وطن اصلی کے حکم میں ہوتی ہے، انہوں نے وطن اصلی کی تین شکلیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) انسان کی جائے ولادت۔

(۲) وہ مقام جس میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہو۔

(۳) وہ جگہ جس میں آدمی نے اپنے روزگار کے لئے مستقل طور پر کاروبار یا ملازمت کررکھی ہے، نہ وہ اسکی جائے ولادت ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے ہیں، تو دوسری اور

تیسری شکل اگر چہ بعینہ حقیقت میں جائے ولادت کی طرح وطن اصلی نہیں ہے، لیکن وطن اصلی کے حکم میں ہے، اسلئے وہاں اتمام لازم ہوگا، کتاب الفقہ کا جزئیہ حسب ذیل ہے:

وطن أصلي: وهو الذي ولد فيه الإنسان أوله فيه زوج في عصمته، أو قصد أن يرتزق فيه، وإن لم يولد به، ولم يكن له به زوج. (كتاب الفقه على المذاهب الأربعه، مايبطل به القصر، وبيان الوطن الأصلي وغيره، دارالفكر ۱/ ۴۸۰)

اورشامی، ودرمختار کی عبارت سے بھی اس کی تائید ملتی ہے، درمختار میں بھی وطن اصلی کے لئے تین چیزوں کوالگ الگ بیان کیاہے، اورتینوں کی نوعیت بالکل الگ الگ ہے۔

(۱) جائے ولادت (۲) وہ مقام جس میں آدمی نے شادی کرکے بیوی کو وہاں چھوڑ رکھا ہے (۳) کسی جگہ توطن اختیار کرلیا ہے یعنی علی سبیل القرار رہائش اختیار کرلی ہے، اس کے ذیل میں علامہ شامی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، قولہ: "**أو توطنه أي عزم على القرار فيه ،وعدم الارتحال، وإن لم يتأهل**" جائے ولادت کےعلاوہ دوسری جگہ میں بالغ آدمی نے نہ شادی کی ہے اور نہ ہی بیوی بچوں کورکھ رکھا ہے بلکہ صرف علی سبیل القرار عدم ارتحال کے ارادے سے قیام کرلیا ہے، تو وہ اس کے لئے وطن اصلی کے درجہ میں ہوجائے گا، حتی کہ اگرکسی بالغ آدمی کے ماں باپ، جائے ولادت کے علاوہ کسی شہر میں رہتے ہوں اوروہ بالغ آدمی دوسرے شہر میں علی سبیل القرار رہتا ہو، اوراس بالغ آدمی نے نہ ماں باپ کی جگہ پر ماں باپ کی رہائش کے علاقہ میں شادی کی ہے اور نہ ہی اس کی بیوی وہاں رہتی ہے اور نہ ہی وہ شخص علی سبیل القرار وہاں رہتا ہے تو جب ماں باپ سے ملنے جائے گا تو اتمام نہیں کرسکتا اس لئے کہ وہ اس کا وطن نہیں بنا، الا یہ کہ اس نے بھی اس میں علی سبیل القرار رہنے کا ارادہ کرلیا ہو اورتجرد کی حالت میں پہلے جہاں رہتا تھا اسکو ترک کردیا ہو، تب جاکر ماں باپ کی رہائش کا علاقہ اس کے لئے وطن بن سکتا ہے، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تجرد کی حالت میں بھی جائے ولادت کے علاوہ انسان کا وطن دوسری جگہ بن سکتا ہے چاہے وہ جائے ملازمت ہو یا جائے کاروبار ہو، بس صرف علی سبیل القرار رہنے کا ارادہ ہو تو ایسی صورت میں وہ جگہ بھی

اس کے لئے وطن اصلی کے درجہ اور حکم میں ہوجاتی ہے اور اتمام کرنا لازم ہوجاتا ہے، درمختار اورشامی کی عبارت ملاحظہ ہو :

’’ في الدر : الوطن الأصلي هو موطن ولادته، أو تأهله، أو توطنه يبطل بمثله إذا لم يبق له بالأول أهل : فلو بقي لم يبطل، بل يتم فيهما لاغير، وتحته في الشاميه: توطنه: أي عزم على القرار فيه، وعدم الارتحال، وإن لم يتأهل، فلو كان له أبوان ببلد غير مولده، وهو بالغ، ولم يتأهل به، فليس ذلک وطناله إلا إذا عزم على القرار فيه، وترک الوطن الذي كان له قبله.

(درمختار مع الشامي، الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الاصلي، ووطن الإقامة، زكريا ۲/ ٦١٤، كراچی ۲/ ۱۳۱)

طحطاوی علی الدر کے الفاظ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے،عبارت یہ ہے :

’’ أو توطنه أي بأن اتخذ ها داراً، وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها، وإن لم يتأهل بها. (طحطاوی علی الدر، الصلاة، باب صلاة المسافر، کوئٹه ۱/ ۳۳٦)

نوٹ :- لیکن ساتھ میں یہ بھی گزارش ہے کہ اس بارے میں دوسرے محقق علماء ومفتیان کرام سے بھی رجوع کیا جائے، کیونکہ اب تک ہندوستان میں کسی اہم مفتی نے اس پر فتویٰ دیا ہو،احقر کے علم میں نہیں ہے۔

چند شبہات کا ازالہ

یہاں دوطریقے سے شبہ کیا جاسکتا ہے :

پہلا شبہ : ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ پتہ نہیں، ملازمت کب تک باقی رہے، مالکان یا صاحب اقتدار جب چاہیں اپنے اقتدار سے نکال باہر کردیں، تو اس طرح کے شبہ کو بنیاد بنانا اس لئے درست نہیں ہے کہ غیراختیاری طور پر ملازمت کا ختم ہوجانا، ایک ناگہانی حادثہ

کے درجہ میں ہے۔

اوراس طرح غیر اختیاری حادثہ کو بنیاد بنا کر حکم شرعی لاگو نہیں ہوتا ہے جبکہ اپنا خود کا ارادہ وہاں مستقل طور پر رہنے کا ہے، اس لئے یہی سمجھا جائے گا کہ مستقل طور پر جائے ملازمت میں توطن اختیار کرلیا گیا ہے۔

دوسرا شبہ : یہاں یہ شبہ بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ جولوگ دور دراز مسافت سفر پر جائے ملازمت میں بیوی بچوں کے ساتھ مستقل طور پر رہتے ہیں اوپر کی تفصیل کے مطابق ان کے لئے جائے ملازمت کو وطن توطن قرار دیا گیا ہے جو وطن تأہل کی طرح وطن اصلی کے حکم میں ہے، اس میں ہمیشہ نمازوں کا اتمام کیا کریں گے، لیکن جب تعطیل کلاں میں بیوی بچوں کو لے کر وطن اصلی چلے جائیں گے، اسی طرح شادی بیاہ میں بیوی بچوں کو ساتھ لے کر وطن اصلی چلے جاتے ہیں اسکے بعد چند مہینے کے لئے بیوی بچوں کو وہاں چھوڑ دیتے ہیں اور خود جائے ملازمت میں واپس آتے ہیں اسی طرح تعطیل کلاں پوری کرنے کے بعد خود بیوی بچوں کو ساتھ میں نہیں لاتے ہیں چند مہینے کے لئے وہیں چھوڑ کر کے خود جائے ملازمت میں اکیلے آکر رہتے ہیں اور پھر پندرہ دن سے کم قیام کے ارادے سے آتے جاتے رہا کرتے ہیں تو اس درمیان میں بھی نمازوں کا اتمام ہی کیا کریں گے، قصر جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ دوبارہ واپس لوٹ کر آنے کے ارادے سے جانا شریعت کے نزدیک نہ جانے کے حکم میں ہے۔

اس کی دلیل شامی اور بحر وغیرہ میں اس طرح کے جزئیات سے ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی نے یہ قسم کھائی کہ میں فلاں محلّہ یا فلاں علاقہ میں یا فلاں گھر میں نہیں رہونگا، اس کے بعد خود وہاں سے چلا گیا مگر مال ومتاع اور اہل وعیال کو علی حالہ چھوڑ دیا ہے تو ایسی صورت میں وہ شخص حانث ہوجائے گا، اس لئے کہ بقائے ثقل کے ساتھ چلا جانا، شریعت کے نزدیک اس جگہ کو چھوڑ کر چلے جانے میں شمار ہی نہیں ہوتا، اسی طرح اگر صرف مال ومتاع کو چھوڑ کر چلا گیا ہے اور بیوی بچوں کو ساتھ میں لے کر وہاں سے چلا گیا ہے تو اس بارے فقہاء کا اختلاف ہے لیکن راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی حانث ہوجائے گا اس لئے کہ مال ومتاع کو چھوڑ کر جانے کا

مطلب یہ ہے کہ وہ دوبارہ آئے گا ہاں جس دن مال ومتاع سب کو لے کر چلا جائے گا اس دن یہ سمجھا جائے گا کہ اب یہ یہاں سے کلی طور پر چلا گیا ہے اس لئے اکثر فقہاء نے اس طرح جانے کو نہ جانے میں شمار فرمایا ہے، لہٰذا جائے ملازمت کا بھی ایسا ہی حکم ہے کہ بقصد العود ایک دو مہینے کے لئے اہل وعیال کے ساتھ خود چلا جائے یا صرف اہل وعیال کو بھیج دیا جائے اور خود نہ جائے، ان سب صورتوں میں اس کا توطن حسب سابق بدستور باقی رہتا ہے اس لئے جب بھی پندرہ دن سے کم قیام کے ارادے سے آتا جاتا رہے گا، نمازوں کا اتمام لازم ہوگا، کیونکہ بقائے ثقل کے ساتھ بقصد العود جانے کو شریعت نے ارتحال کے دائرہ میں شمار ہی نہیں کیا ہے، اس لئے حکم شرعی علی حالہ حسب سابق باقی رہے گا۔

شامی اور بحر کا جزئیہ ملاحظہ فرمایئے۔

”لأن الحنث يحصل ببقاء أحدهما من غير توقف عليهما، وقوله وأفاد أنه لابد من نقل جميع الأهل والمتاع، وهو في الأصل بالإجماع، والمراد بالأهل زوجته، وأولاده الذين معه، وكل من يأويه لخدمته، والقيام بأمره، كما في البدائع، وأما في الأمتعة ففيه اختلاف، فقال الإمام: المتاع كالأهل حتى لوبقي وتدحنث، لأن السكنى تثبت بالكل فتبقى ببقاء شيئى منه“. (البحرالرائق، كتاب الايمان، باب اليمين في الدخول والخروج الخ، زكريا ٤/ ٥١٦، كوئٹه ٤/ ٣٠٦)

في الدر: حلف لايسكن هذه الدار أو البيت أو المحلة يعني الحارة فخرج وبقي أهله ومتاعه حتى لو بقي وتدحنث، واعتبر محمدؒ نقل ماتقوم به السكنىٰ وهو أرفق وعليه الفتوىٰ، وتحته فى الشامية: وهذاتعميم للمتاع جرياً على قول الإمام بأنه لابد من نقل المتاع كله كالأهل. (درمختار مع الشامي، كتاب الايمان، باب اليمين في الدخول والخروج الخ، كراچی ٣/ ٧٥٠، زكريا ٥/ ٥٣٨)

(۴) **وطن سفر یا وطن اقامت:** فقہاء نے وطن اقامت کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ مسافر جب مسافت سفر یا اس سے زائد کی مسافت پر سفر کرتے ہوئے اثنائے سفر عارضی طور پر پندرہ دن یا اس سے زائد مدت کے لئے کسی جگہ قیام کا ارادہ کرلے اور جس جگہ پر قیام کا ارادہ ہو وہ جگہ قیام کی صلاحیت رکھتی ہو یعنی آبادی ہو، جنگل یا صحراء نہ ہو، تو وہ مسافر جب تک وہاں مقیم رہے گا اس وقت تک نمازوں کا اتمام کرے گا اور جب وہاں سے دوبارہ مسافت سفر کی نیت سے نکلے گا، تو وطن اقامت ختم ہوجائے گا، یا کسی دوسری جگہ منتقل ہوکر پندرہ دن یا اس سے زائد عارضی قیام کا ارادہ کرے گا، تب بھی پہلے والا وطن اقامت ختم ہوجائے گا، جبکہ وہاں پر نہ ضروریات زندگی کا ساز وسامان اکٹھا کررکھا ہو، اور نہ ہی بیوی بچوں کے ساتھ تعیش کا ارادہ ہو بلکہ وہاں سے ارتحال ہی کا ارادہ ہوتا ہے۔

علامہ شامی وعلامہ طحطاوی نے اس کو وطن مستعار اور وطن حادث سے تعبیر فرمایا ہے اس لئے کہ یہ درحقیقت وطن ہی نہیں ہے بلکہ عارضی طور پر چند دن کے واسطے مستعار اور عاریت پر لیا ہوا وطن ہے، جس کو چھوڑ کر جانے کا ہی ارادہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے صاحب محیط برہانی نے اسکو وطن سفر ووطن حادث کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے کہ اثنائے سفر کا وطن ہے اور وطن حادث اس لئے کہا گیا ہے کہ اپنے ارادہ میں پندرہ دن یا اس سے زائد مدت کے بعد اس کو چھوڑ دینے کا ہی ارادہ ہے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرات فقہاء نے اس عارضی وطن کے لئے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ تمام الفاظ اس بات کی طرف مشیر ہیں کہ اس اقامت کے ساتھ ساتھ وہاں سے منتقل ہونے کا بھی ارادہ ہے بس پندرہ دن یا اس سے زائد مدت کے بعد وہاں سے منتقلی کا ارادہ ہے، اس کے برخلاف جس جگہ آدمی نے ہمیشہ کی ملازمت اختیار کرلی ہے، یا ہمیشہ کا کاروبار اختیار کرکے مستقل قیام کا ارادہ کرلیا ہے، کیا اسکو وطن مستعار وطن سفر، وطن حادث سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ کوئی بھی اسکا قائل نہیں ہوگا۔

لہٰذا ایسی جائے ملازمت جس میں اس کا استقلال ہو چکا ہو اور اس کا وہاں سے چھوڑ کر جانے کا ارادہ نہ ہو، اسکو وطن حادث، وطن سفر، وطن مستعار کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اس لئے معنیٰ حقیقی پر غور کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جائے ملازمت کو وطن سفر اور وطن حادث کے مترادف نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ مستقل جائے ملازمت ایک الگ چیز ہے اور وطن سفر اس سے جداگانہ بالکل دوسری چیز ہے، ایسے ہی دونوں کا حکم بھی جداگانہ ہوگا، حضرات فقہاء کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔

”وطن إقامة: وهو المكان الصالح للإقامة فيه خمسة عشر يوما، فأكثر إذا نوى الإقامة. (كتاب الفقه على المذاهب الأربعه، ما يبطل به القصر، و بيان الوطن الأصلي وغيره، دارالفكر ۱/ ۴۸۰)

اور محیط برہانی میں اسکو وطن سفر اور وطن حادث کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

”وطن سفر ويسمى وطناً حادثاً وهو البلد الذى ينوى المسافر الإقامة فيه خمسة عشر يوماً فأكثر.“

اور علامہ شامی اور صاحب طحطاوی علی الدر نے وطن مستعار، وطن حادث سے تعبیر فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

وطن الإقامة ويسمى أيضاً الوطن المستعار والحادث وهو ما خرج إليه بنية إقامة نصف شهر سواء كان بينه وبين الأصلى مسيرة سفر أولا.

(شامي، الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، ووطن الإقامة، زكريا ۲/ ۶۱۴، كراچی ۲/ ۱۳۱، طحطاوى على الدر، الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ۱/ ۳۳۶)

(۵) وطن سکنی: وطن سکنی کا مطلب یہ ہے کہ مسافر اثنائے سفر کسی جگہ پندرہ دن سے کم قیام کا ارادہ کرے تو ایسی صورت میں اس کو ایسا سمجھا جائے گا، جیسا کہ چلتا ہوا مسافر، کہ جس طرح چلتا ہوا مسافر اثنائے سفر چار رکعت والی نمازوں کو دو رکعت پڑھا کرے گا اسی طرح وطن سکنی میں بھی دو ہی رکعت پڑھا کرے گا، اسلئے حضرات فقہاء نے اسکو وطن ہی شمار

نہیں فرمایا ہے۔

ولم یعتبروا وطن السکنی وطناً، وهو الصحیح، وهذا لأن المکان إنما یصیر وطناً بالإقامة فیه، وإذا لم یثبت حکم الإقامة في وطن السکنی، بل حکم السفر فیه باقٍ؛ لما ذکرنا، أن أقل مدة الإقامة خمسة عشر یوماً، ولم یثبت فیه حکم الإقامة، لم یعتبر هو وطناً أصلاً. (المحیط البرهاني، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون صلاة السفر، المجلس العلمي ۲/ ٤۰۲، رقم: ۲۰٦۸)

اورکفایہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

ولم یعتبروا وطن السکنی وطناً، وهو الصحیح، لأنه لم یثبت فیه حکم الإقامة، بل حکم السفر فیه باقٍ. (کفایه مع فتح القدیر، الصلاة، باب صلاة المسافر، کوئٹه ۲/ ۱۸)

(٦) مسئلہ قصر واتمام میں شبہ پیدا ہوجائے تو کیا حکم؟

یہاں یہ مسئلہ بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اگر کسی جگہ اشتباہ پیدا ہوجائے کہ مسافر ہے یا مقیم جس کی وجہ سے یہ مسئلہ اشتباہ کے ساتھ پیش آجائے کہ نمازوں کا قصر کرنا ہے یا اتمام، تو ایسے حالات میں فقہاء نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ نمازوں کا قصر نہیں کیا جائے گا، بلکہ اتمام ہی احوط ہوگا۔

اس کو شامی بحر اور طحطاوی علی الدر وغیرہ میں اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

قال في البحر: وأشار إلی أن النیة لابد أن تکون قبل الصلاة، ولذا قال في التجنیس: إذا افتتح الصلاة في السفینة حال إقامته في طرف البحر، فنقلتها الریح، وهو في السفینة، ونوی السفر یتم صلاة المقیم عند أبي یوسفؒ، خلافا لمحمدؒ؛ لأنه اجتمع في هذه الصلاة مایوجب الأربع، ومایمنع، فرجحنا مایوجب الأربع إحتیاطا. (شامی، الصلاة، باب صلاة المسافر،

زکریا ۲/ ۶۰۱، شامی کراچی ۲/ ۱۲۲، البحرالرائق، کتاب الصلاة، باب المسافر، کراچی ۲/ ۱۲۹، زکریا ۲/ ۲۲۷، حاشیه طحطاوي علی الدر المختار، الصلاة، باب صلاة المسافر، کوئٹه ۱/ ۳۳۰)

اوراس کومحیط برہانی میں اس طرح سے نقل فرمایا ہے کہ اگر کوئی مشترک غلام دونوں مالکوں کے ساتھ سفر میں جائے اوراثناء سفر دونوں مالکوں میں سے ایک اقامت کی نیت کرلے اور دوسرا اقامت کی نیت نہ کرے، توراجح قول کے مطابق غلام، اس مالک کی طرح نمازوں کا اتمام کرے گا جس نے اقامت کی نیت کرلی ہے، محیط برہانی کی عبارت حسب ذیل ہے:

وذکر القاضي الإمام الأجل علاء الدین رحمه اللّٰه تعالیٰ في شرح المختلفات: أن العبد المشترک إذا خرج مع مولییه في السفر، ثم نویٰ أحدهما الإقامة دون الآخر، قال بعض مشا یخنا رحمهم الله تعالیٰ: لا یصیر مقیماً، لأنه تعارضت النیتان، فبقي ماکان علی ماکان، وقال بعضهم: یصیر مقیماً ترجیحا؛ لنیة الإقامة إحتیا طاً. (المحیط البرهاني، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون: صلاة السفر، المجلس العلمي، ۲/ ۳۹۵، رقم: ۲۰۴۷)

ان تمام دلائل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جائے ملازمت میں اہل وعیال کے ساتھ رہنے کی صورت میں اتمام ہی کرنا چاہئے، اور جائے ملازمت میں اتمام سے متعلق جودلائل پیش کئے گئے ہیں دوسرے دلائل اگران کے متعارض مل جائیں، تو مقام اشتباہ میں اتمام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے، اس لئے دوسرے متعارض دلائل کے باوجود جائے ملازمت میں اتمام ہی کرنا چاہئے۔ فقط والسلام

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	(مفتی) جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی
۱۴۲۹/۵/۵ھ	۲۹ / ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ

فیملی کے ساتھ رہنے والے ملازم مقیم ہیں یا مسافر؟

سوال [۳۳۸۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جومدرسین اوراسکول کے سرکاری ماسٹراور بینک کے ملازمین اپنی جائے ملازمت پرکرایہ کا کمرہ لےکراپنے بچوں کورکھ لیتے ہیں، اورکچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب تبادلہ ہوجائے یا کب مدرسہ اورمسجد سے اہل محلّہ چھٹی کردیں،ان حالات میں یہ مذکورہ حضرات اپنی جائے ملازمت پروطن اصلی کے درجہ میں رہیں گے یاوطن اقامت کے؟

المستفتي: عبدالرشیدقاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مدارس کے مدرسین ہوں یااسکول کے سرکاری ماسٹرہوں، یا سرکاری دیگر ملازمین ہوں، سب کے لئے شرعی حکم یہ ہے کہ اگر جائے ملازمت میں بیوی، بچوں اوراثاثے کے ساتھ نہیں رہتا ہے؛ بلکہ تنہا رہتا ہے، تو پندرہ دن سے کم قیام کرکے مسافت سفر پرآنے جانے سے اورپھردرمیان میں پندرہ دن سے کم قیام کرنے میں قصر کرنا لازم ہوگا۔اوراگرجائے ملازمت میں بیوی، بچوں اوراثاثے کےساتھ رہتا ہےاوروہاں سے مسافت سفر پرآتا جاتا ہےاوردرمیان میں جائے ملازمت میں بچوں کےساتھ پندرہ دن سے کم قیام کرتا ہے،تو قصرنہیں کرے گا؛ بلکہ اتمام کرنا لازم ہوگا؛اس لئے کہ جائے ملازمت میں بیوی،بچوں کےساتھ رہنےکی صورت میں ’’وطن تأہل‘‘ بن جاتا ہے۔اوروطن تأہل وطن اصلی کے درجہ میں ہوتاہے۔اورجائے ملازمت میں چاہےاپنے ذاتی مکان میں رہتاہو یاکرایہ کے مکان میں رہتا ہو، یاکسی کے دیئے ہوئے عارضی مکان میں رہتا ہو،سب صورتوں میں حکم یکساں ہے۔اوریہ شبہ کرنا کہ کب تبادلہ ہوجائے،کب ملازمت چھوٹ جائے یامدرسہ اورمسجد والےکب چھٹی کردیں،اس کی ضرورت نہیں؛اس مسئلہ کو’’امدادالاحکام‘‘میں کافی تفصیل سے لکھا گیاہے۔ (مستفاد: امدادالاحکام ۲/ ۳۱۰،ایضاح المسائل/ ٦٦،احسن الفتاوی ۴/ ۱۰۱)

إذا المعتبر الأهل دون الدار، كما لو تأهل ببلدة و استقرت سكنا له، وليس له فيها دار. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر،

کراچی ۲/ ۱۳۳، زکریا ۲/ ٤ ٦١، وكذا في الحلبي الكبير، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، اشرفيه/ ٥٤٤)

لو خرج مسافرا من بلدة فيها أهله، ودخل في أي بلدة من البلاد التي فيها أهله، فيصير مقيما من غير نية الإقامة. (بدائع الصنائع، فصل في صلاة المسافر، الكلام في الأوطان، كراچی ۱/ ١٠٤، زكريا ١/ ٢٨٠)

وفي المجتبى: نقل القولين فيما إذا نقل أهله ومتاعه، وبقي له دور وعقار، ثم قال: وهذا جواب واقعة ابتلينا، وكثير من المسلمين المتوطنين فى البلاد، ولهم دور وعقار في القرى البعيدة منها يصيفون بها بأهلهم ومتاعهم، فلابد من حفظها أنهما وطنان له لا يبطل أحدهما بالآخر. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، زكريا ٢/ ٢٣٩، كوئٹه ٢/ ١٣٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۲۰ھ

جائے تجارت میں اتمام یا قصر؟

سوال [۳۳۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص پردیس میں منتقل ہوکر مع اپنے اہل وعیال رہتا ہے، پردیس میں رہ کر تجارت کرتا ہے؛ لیکن دل میں پندرہ روز رہنے کا مستقل مزاج نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک دن یا دو روز کے بعد پھر جاتا ہے اور جاتے ہی رہتا ہے، اس حالت میں جہاں مستقل رہنے کا مستقل بندوبست کر رکھا ہے وہاں قصر نماز ادا کرے یا پوری نماز ادا کرے؟

المستفتي: سراج الحق شریف گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جہاں مستقل رہنے کا بندوبست کررکھا ہے، اگر اس کو وطن اصلی نہیں بنایا ہے۔ اور وہاں سے کسی وقت منتقل ہونے کا ارادہ ہے تو وہاں پندرہ روز سے کم قیام کے ارادہ سے حاضر ہونے میں قصر کرنا واجب رہے گا۔

وأما وطن الإقامة، فينتقض بوطن إقامة آخر، وإن لم يكن بينهما مدة سفر، وكذا ينتقض بالسفر. (كبيري، كتاب الصلاة، فصل في صلاة التراويح، قديم ٥٠٦، جديد أشرفيه ديو بند ٥٤٤)

ومن حكم وطن السفر أنه ...... ينتقض بوطن السفر؛ لأنه مثله، وينتقض بإنشاء السفر؛ لأنه ضده. (الفتاوى التاتارخانية، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ٢/ ٥١١، رقم: ٣١٥٠)

ووطن الإقامة يبطل بوطن الإقامة، وبإنشاء السفر، وبالوطن الأصلي هكذا في التبيين. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ١٤٢، جديد ١/ ٢٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۰۷/۸/۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر:)

جائے ملازمت کا حکم

سوال [۳۳۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (ا) بعض مہتممین ومدرسین وملازمین حضرات، مدارس میں بغیر اہل وعیال کے قیام پذیر ہوتے ہیں اور وہاں سے دور دراز شہر کا دورہ کرتے رہتے ہیں اور واپسی کی صورت میں پندرہ دن سے کم قیام کی نیت کریں، تو ایسی صورت میں ان حضرات کے بارے میں قصر واتمام سے متعلق کیا حکم ہے؟ مدلل ومفصل تحریر فرمائیں۔

(۲) مذکورہ حضرات اگر مع اہل وعیال کے قیام کریں تو قصر واتمام سے متعلق کیا حکم ہوگا۔

(۳) مذکورہ حضرات میں سے بعض حضرات کبھی ایسا کرتے ہیں کہ شروع سال میں مع اہل وعیال کے قیام کرتے ہیں، مثلاً تین ماہ اور تین ماہ بغیر اہل وعیال کے پھر تین ماہ اہل وعیال کے اور تین ماہ بغیر اہل وعیال کے، اسی طرح سے پورے سال قیام کرتے ہیں، ان کے بارے میں قصر واتمام کا کیا حکم ہوگا؟ مدلل ومفصل تحریر فرمائیں۔ فقط والسلام

المستفتي: عبداللہ حال مقیم مرادآباد، یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جو مہتممین ومدرسین وملازمین مدرسہ میں بغیر اہل وعیال اور بغیر بال بچوں کے تجرد کی حالت میں ملازمت پر قائم ہیں اور ان کا ارادہ وہاں سے ملازمت ترک کرکے منتقل ہوجانے کا نہیں ہے؛ بلکہ ان کی نیت علی سبیل القرار اپنی ملازمت پر قائم رہنے کی ہے، مگر بیوی بچے ان کے ساتھ میں نہیں ہیں، جب وہ اپنی جگہ سے مسافت سفر پر چلے جائیں اور واپسی میں پندرہ دن یا اس سے زائد قیام کا ارادہ نہ ہو؛ بلکہ دو چار دن کے بعد پھر مسافت سفر پر جانے کا ارادہ ہو اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جب بھی وہ مسافت سفر پر جاتے ہیں، لوٹ کر واپس آنے کے ارادے سے جاتے ہیں، ایسوں کے بارے میں اب تک احقر کا شرح صدر اس بارے میں یہ رہا ہے کہ جائے ملازمت میں پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں ان کو قصر کرنا چاہئے؛ لیکن مفتی محمد سلمان صاحب نے اس بارے میں توجہ دلائی اور ''احکام سفر'' کے عنوان پر مفتی محمد طاہر مسعود صاحب مدرسہ مفتاح العلوم سرگودھا پاکستان کی ایک کتاب پیش فرمائی، اس کتاب میں اس موضوع پر دسیوں مدارس کے مفتیان کرام کے فتاوی اور تحقیقی مضامین موجود ہیں، خاص طور پر مجلس تحقیقات اسلامی ملتان کے زیر تحت مفتی عبدالستار، خیر المدارس ملتان، مفتی عبداللہ، مفتی خیر المدارس ملتان، مولانا عبدالقادر دارالعلوم کبیر والا، مفتی محمد مجاہد، جامعہ امدادیہ فیصل آباد، دارالافتاء

جامعہ فاروقیہ کراچی، مفتی عبدالواحد جامعہ مدنیہ لاہور، ان سب حضرات نے اپنی محققانہ تحقیقوں سے یہ ثابت کردیا ہے کہ جائے ملازمت میں تجرد کے ساتھ رہنے والے بھی علی سبیل القرار رہتے ہیں؛ اس لئے ان کو پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں بھی اتمام کرنا ضروری ہے؛ لیکن اس مسئلہ میں دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ اختک والوں نے تحقیقی جواب نہیں لکھا ہے؛ بلکہ ان حضرات کی تحقیقات کے صحیح ہونے پر رجحان ظاہر فرمایا ہے۔ اور جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ حقانیہ سرگودھا، دارالعلوم دیوبند اور مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ کا فتویٰ اول الذکر حضرات کی تحقیق کے خلاف عدم اتمام اور قصر پر ہے؛ لیکن دونوں طرف کے دلائل پر غور کرنے کے بعد قائلین اتمام کے دلائل درست معلوم ہوتے ہیں، مگر اتمام کو جائز کہنے کی صورت میں اس کو علی الاطلاق وطن اقامت کہنا سمجھ میں نہیں آتا؛ اس لئے احقر نے اس سلسلے میں فقہ کی جزئیات کی جستجو کی، تو ''کتاب الفقه على المذاهب الأربعة'' میں ایک جزئیہ ملا جو اتمام کی تائید میں ہے، مگر ساتھ ساتھ اس بات کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ مستقل طور پر جو جائے ملازمت ہوتی ہے وہ وطن تأہل کی طرح وطن اصلی کے حکم میں ہوتی ہے، انہوں نے وطن اصلی کی تین شکلیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) انسان کی جائے ولادت۔

(۲) وہ مقام جس میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہو۔

(۳) وہ جگہ جس میں آدمی اپنے روزگار کے لئے مستقل طور پر کاروبار یا ملازمت کررکھی ہے، نہ وہ اس کی جائے ولادت ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے ہوں، تو دوسری اور تیسری شکل اگرچہ بعینہٖ حقیقت میں جائے ولادت کی طرح وطن اصلی نہیں ہے؛ لیکن وطن اصلی کے حکم میں ہے؛ اس لئے وہاں اتمام لازم ہوگا۔ ''کتاب الفقہ'' کا جزئیہ حسب ذیل ہے:

وطن أصلي: وهو الذي ولد فيه الإنسان، أو له فيه زوج في عصمته، أو قصد أن يرتزق فيه، وإن لم يولد به، ولم يكن له به زوج. (كتاب الفقه على

المذاهب الأربعة، مباحث قصر الصلاة الرباعية ما يبطل به القصر وبيان الوطن الأصلى وغيره، دارالفكر، بيروت ۱/ ۴۸۰)

اور''شامی''اور''درمختار''کی عبارت سے بھی اس کی تائید ملتی ہے۔''درمختار''میں بھی وطن اصلی کے لئے تین چیزوں کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ اور تینوں کی نوعیت بالکل الگ الگ ہے: (۱) جائے ولادت (۲) وہ مقام جس میں آدمی نے شادی کر کے بیوی کو وہاں چھوڑ رکھا ہے (۳) کسی جگہ توطن اختیار کرلیا ہے، یعنی علی سبیل القرار رہائش اختیار کرلی ہے، اس کے ذیل میں علامہ شامیؒ نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

قوله: "أو توطنه" أى عزم على القرار فيه، وعدم الارتحال وإن لم يتأهل.

جائے ولادت کے علاوہ دوسری جگہ میں بالغ آدمی نے نہ شادی کی ہے اور نہ ہی بیوی بچوں کو رکھ رکھا ہے؛ بلکہ صرف علی سبیل القرار، عدم ارتحال کے ارادے سے قیام کرلیا ہے، تو وہ اس کے لئے وطن اصلی کے درجہ میں ہوجائے گا، حتی کہ اگر کسی بالغ آدمی کے ماں باپ جائے ولادت کے علاوہ کسی شہر میں رہتے ہوں اور وہ بالغ آدمی کسی دوسرے شہر میں علی سبیل القرار رہتا ہو۔ اور اس بالغ آدمی نے نہ ماں باپ کی جگہ پر ماں باپ کی رہائش کے علاقہ میں شادی کی ہے اور نہ ہی اس کی بیوی وہاں رہتی ہے اور نہ ہی وہ شخص وہاں علی سبیل القرار رہتا ہے، تو جب ماں باپ سے ملنے جائے گا، تو اتمام نہیں کرسکتا؛ اس لئے کہ وہ اس کا وطن نہیں بنا، الا یہ کہ اس نے بھی اس میں علی سبیل القرار رہنے کا ارادہ کرلیا ہو اور تجرد کے ساتھ پہلے جہاں رہتا تھا، اس کو ترک کردیا ہو، تب جاکر کے ماں باپ کی رہائش کا علاقہ اس کے لئے وطن بن سکتا ہے، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تجرد کی حالت میں بھی جائے ولادت کے علاوہ انسان کا وطن دوسری جگہ بن سکتا ہے، چاہے وہ جائے ملازمت ہو یا جائے کاروبار ہو، بس صرف علی سبیل القرار رہنے کا ارادہ ہو، تو ایسی صورت میں وہ جگہ بھی اس کے لئے وطن اصلی کے درجہ اور حکم میں ہوجاتی ہے۔ اور اتمام کرنا لازم ہوجاتا ہے۔

''درمختار''اور''شامی''کی عبارت ملاحظہ ہو:

في الدرالمختار: الوطن الأصلي هو موطن ولادته، أو تأهله، أو توطنه يبطل بمثله إذا لم يبق له بالأول أهل، فلو بقي لم يبطل، بل يتم فيهما لا غير. وتحته في الشامية: توطنه، أي عزم على القرار فيه وعدم الارتحال، وإن لم يتأهل، فلو كان له أبوان ببلد غير مولده، وهو بالغ ولم يتأهل به، فليس ذلک وطنا له إلا إذا عزم على القرار فيه، وترک الوطن الذی کان له قبله. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، ووطن الإقامة، زكريا ٢/ ٦١٤، كراچی ٢/ ١٣١)

''طحطاوی علی الدر'' کے الفاظ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، عبارت یہ ہے:

أو توطنه، أی بأن اتخذها دارا، وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها، وإن لم يتأهل بها. (طحطاوي على الدر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ١/ ٣٣٦)

نوٹ:- لیکن ساتھ میں یہ بھی گزارش ہے کہ اس بارے میں دوسرے محقق علماء ومفتیان کرام سے بھی رجوع کیا جائے، کیونکہ اب تک ہندوستان میں کسی اہم مفتی نے اس پر فتویٰ دیا ہو، احقر کے علم میں نہیں ہے۔

(۲) مہتممین ومدرسین وملازمین جب جائے ملازمت میں بیوی بچوں کے ساتھ رہائش اختیار کرلیں، چاہے رہائشی مکان ذاتی ہو یا کرایہ کا، تو اس سلسلے میں احقر کا شرح صدر ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ ان حضرات پر جائے ملازمت میں ہر حالت میں اتمام لازم ہے؛ لہٰذا جو ائمہ حضرات بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، وہ بلا تکلف جائے امامت میں اتمام کیا کریں گے، جب بھی مسافت سفر سے واپس جائے ملازمت میں پندرہ دن سے کم قیام کے ارادے سے آتے جاتے رہیں گے، اتمام کیا کریں گے، اس کے لئے کتب فقہ میں شرعی دلائل کا ذخیرہ موجود ہے اور تقریباً ۲۲؍سال سے مدرسہ شاہی کے دارالافتاء سے مسلسل یہی فتوی جاری ہوتا رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے بالاتفاق وطن تأہل کو وطن اصلی کا

درجہ دیا ہے۔ اور وطن تأہل اس کو کہا جاتا ہے، جس میں شادی کرنے کے بعد بیوی کو مستقل طور پر سسرال میں رکھ رکھا ہو۔ اور اگر بیوی کو سسرال سے اپنے ساتھ منتقل کرلیا ہو تو وہ وطن تأہل نہیں بنتا ہے؛ اس لئے حضرات فقہاء نے صاف الفاظ میں یہ بات نقل کی ہے کہ جائے ولادت اور جائے فطرت کے علاوہ دوسری جگہ جب آدمی علی السبیل القرار رہائش اختیار کر لے اور اس میں اپنے بیوی بچوں کو ساتھ میں رکھے تو وہ وطن تأہل ہی بن جاتا ہے؛ اس لئے کہ اس وطن کا سارا مدار بیوی کو ساتھ رکھنے پر ہے، چاہے سسرال میں رکھے اور چاہے جائے ملازمت میں رکھے، دونوں برابر درجے میں وطن اصلی اور وطن فطرت کے حکم میں ہو جائیں گے؛ لہٰذا ان پر ہر حال میں اتمام کرنا لازم ہوگا۔

''إذالمعتبر الأهل دون الدار كما لو تأهل ببلدة واستقرت سكناً له، وليس له فيها دار. (شامی، الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، ووطن الإقامة، زکریا ۲/ ۶۱٤، کراچی ۲/ ۱۳۱)

اس کو فقہاء نے یوں ارشاد فرمایا ہے کہ چونکہ اعتبار بیوی کی رہائش کا ہے، شادی کا نہیں؛ لہٰذا اگر دو شہروں میں الگ الگ دو بیویوں کو رکھ رکھا ہے، تو دونوں جگہ اس کے لئے وطن اصلی کے درجہ میں ہیں، اس لئے جہاں بیوی کو ساتھ میں رکھے اور مستقل قیام کا ارادہ ہو، تو وہ وطن تأہل، وطن اصلی کے حکم میں ہوگا؛ لہٰذا اگر دو جگہ دو بیویوں کو رکھ رکھا ہے، ان میں سے ایک بیوی کا انتقال ہو جائے اور زمین وجائیداد بھی وہاں موجود ہو، تو بعض فقہاء نے اس کی وطنیت باطل ہونے کو کہا ہے۔ اور بعض بقائے وطن کے قائل ہیں؛ لہٰذا بیوی ساتھ میں ہونے کی صورت میں جائے ملازمت کے وطن اصلی کے حکم میں ہونے میں کسی قسم کے شکوک وشبہات نہیں رہنے چاہئیں، فقہاء کی عبارات ملاحظہ ہوں:

ولو كان له أهل ببلدتين فأيتهما دخل صار مقيماً فإن ماتت زوجته في أحد هما وبقي له فيها دور وعقار قيل : لايبقىٰ وطنا له إذالمعتبر الأهل دون الدار كمالو تأهل ببلدة واستقرت سكنا له وليس له فيها دار وقيل:

تبقى. (حلبي كبير، كتاب الصلاة، فصل في المسافر، سهيل أشرفيه ديو بند ص : ٥٤٤)

(۳) جس شخص نے اپنے وطن اصلی سے مسافت سفر پر دور دراز علاقہ میں رہائش اختیار کر رکھی ہے اور وہ سال کے درمیان میں عید و بقرعید میں اپنے اہل وعیال کو جائے ملازمت اور جائے کاروبار سے دو ایک مہینہ کے لئے وطن اصلی یا دوسری جگہ بھیج دے اور ساتھ میں خود بھی کبھی کبھی چلا جائے، یا اہل وعیال کو دو چار مہینے کے لئے بھیج دے اور خود جائے ملازمت میں مقیم رہے، تو اس طرح اہل وعیال کے آنے جانے کی وجہ سے جائے ملازمت وطن اصلی کے حکم میں باقی رہنے میں متأثر نہیں ہوگا، وہ علی حالہ وطن اصلی کے حکم میں باقی رہے گا، اس کی دلیل شامی اور بحر وغیرہ کے اس جزئیہ سے ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص نے یہ قسم کھائی ہے کہ میں فلاں محلّہ یا فلاں گھر میں نہیں رہوں گا، اس کے بعد خود وہاں سے چلا گیا اور مال ومتاع اور اہل وعیال کو وہاں چھوڑ دیا تو وہ حانث ہوجائے گا؛ اس لئے کہ بقائے ثقل کے ساتھ چلے جانا، شریعت کے نزدیک اس جگہ کو چھوڑ کر چلے جانے میں شمار ہی نہیں ہوتا، اسی طرح اگر صرف مال ومتاع کو چھوڑ کر چلا گیا ہے اور بیوی بچوں کو ساتھ میں لے کر وہاں سے چلا گیا ہے تو اس بارے فقہاء کا اختلاف ہے لیکن راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی حانث ہوجائے گا اس لئے کہ مال ومتاع کو چھوڑ کر جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوبارہ آئے گا ہاں جس دن مال ومتاع سب کو لے کر چلا جائے گا، اس دن یہ سمجھا جائے گا کہ اب یہ یہاں سے کلی طور پر چلا گیا ہے اس لئے اکثر فقہاء نے اس طرح جانے کو نہ جانے میں شمار فرمایا ہے، لہٰذا جائے ملازمت کا بھی ایسا ہی حکم ہے کہ بقصد العود ایک دو مہینے کے لئے اہل وعیال کے ساتھ خود چلا جائے یا صرف اہل وعیال کو بھیج دیا جائے اور خود نہ جائے، ان سب صورتوں میں اس کا توطن حسب سابق بدستور باقی رہتا ہے اس لئے جب بھی پندرہ دن سے کم قیام کے ارادے سے آتا جاتا رہے گا، نمازوں کا اتمام لازم ہوگا، کیونکہ بقائے ثقل کے ساتھ بقصد العود جانے کو شریعت نے ارتحال کے دائرہ میں شمار ہی نہیں کیا ہے، اس لئے حکم شرعی علی حالہ حسب سابق باقی رہے گا۔

شامی اور بحر کا جزئیہ ملاحظہ فرمایئے۔

”لأن الحنث يحصل ببقاء أحدهما من غير توقف عليهما، وقوله وأفاد أنه لابد من نقل جميع الأهل والمتاع، وهو في الأصل بالإجماع، والمراد بالأهل زوجته، وأولاده الذين معه، وكل من كان يأويه لخدمته، والقيام بأمره، كما في البدائع، وأما في الأمتعة ففيه اختلاف، فقال الإمام: المتاع كالأهل حتى لوبقى وتدحنث، لأن السكنى تثبت بالكل فتبقى ببقاء شيئى منه“. (البحرالرائق، كتاب الايمان، باب اليمين في الدخول والخروج الخ، زكريا ٤/ ٥١٦، كوئٹه ٤/ ٣٠٦)

وفي الدر : حلف لايسكن هذه الدار أو البيت أو المحلة يعنى الحارة فخرج وبقى أهله ومتاعه حتى لو بقى وتدحنث، واعتبر محمدؒ نقل ماتقوم به السكنىٰ وهو أرفق وعليه الفتوىٰ، وتحته فى الشامية : وهذاتعميم للمتاع جرياً على قول الإمام بأنه لابد من نقل المتاع كله كالأهل. (درمختار مع الشامي، كتاب الايمان، باب اليمين في الدخول والخروج الخ، كراچی ٣/ ٧٥٠، زكريا ٥/ ٥٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۵۷۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۲۱ھ

جائے ملازمت میں اتمام یا قصر؟

سوال [۳۳۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں ملازم ہے، مدرسہ اور زید کے گھر کے درمیان کے مسافت کی دوری مسافت سفر کے بقدر ہے اور زید ہر جمعرات کو اپنے گھر چلے جاتے ہیں

اور سنیچر کی صبح مدرسہ میں حاضر ہوجاتے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید مدرسہ میں اتمام کرے گا یا قصر؟

المستفتي: شہاب الدین اعظمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: زید اپنے مدرسہ میں تمام نمازوں میں اتمام کرے گا بشرطیکہ زید مدرسہ مذکورہ میں علی سبیل القرار رہتا ہو اور اس جگہ کو چھوڑ کر جانے کا فی الحال ارادہ نہ ہو۔ (مستفاد: جائے ملازمت میں اتمام یا قصر ۷-۸، احکام السفر ۷۵-۱۵۸، احسن الفتاوی ۴/ ۱۰۷)

وطن أصلي: وهو الذي ولد فيه الإنسان، أو له فيه زوج في عصمته، أو قصد أن يرتزق فيه، وإن لم يولد به، ولم يكن له به زوج. (كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، مباحث قصر الصلاة الرباعية ما يبطل به القصر وبيان الوطن الأصلى وغيره، دارالفكر، بيروت ١/ ٤٨٠)

أو توطنه، أى بأن اتخذها دارا، وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها، وإن لم يتأهل بها، كما هو قضية العطف. (حاشية الطحطاوي على الدر، الصلاة، باب صلاة المسافر، کوئٹہ ١/ ٣٣٦)

والوطن الأصلي هو الذى ولد فيه الإنسان، أو تزوج فيه، أو لم يتزوج، ولم يولد فيه، ولكن قصد التعيش لا الارتحال عنه. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، الصلاة، باب المسافر، دارالكتاب ديوبند جديد ١/ ٤٢٩)

وطن أصلي، وهو وطن الإنسان في بلدته أو بلدة أخرى اتخذها دارا، وتوطن بها مع أهله وولده، وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها. (بدائع الصنائع، فصل في صلاة المسافر، الكلام في الأوطان، زكريا ١/ ٢٨٠، کراچی ١/ ١٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۴/۱۷ھ

جائے ملازمت میں جب بیوی بچوں کے ساتھ رہے تو قصر جائز نہیں

سوال [۳۳۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جائے ملازمت میں کوئی شخص بیوی کے ساتھ رہتا ہے اور وہاں پندرہ دن سے کم قیام کا ارادہ ہے، تو یہ قصر کرے گا یا اتمام؟

المستفتي: عبید اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کوئی شخص جائے ملازمت میں اپنی بیوی اور اہل وعیال کے ساتھ رہتا ہے، تو ایسی صورت میں وہ وہاں پہنچتے ہی مقیم ہوجائے گا اور اتمام کرے گا، خواہ پندرہ دن سے کم ہی قیام کی نیت کیوں نہ ہو۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/۶۶)

وأما إذا لم ينتقل بأهله ولكنه استحدث أهلا ببلدة أخرى فلا يبطل وطنه الأول، ويتم فيهما. (هندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ١٤٢، جديد ١/ ٢٠٢)

وإن تأهل بهما كان كل واحد من الموضعين وطنا أصليا. (تاتارخانية، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ٢/ ٤٩٩، رقم: ٣١٠٨)

لو كان له أهل بالكوفة، وأهل بالبصرة، فمات أهله بالبصرة، وبقي له دور وعقار بالبصرة، قيل: البصرة لا تبقي وطنا له؛ لأنه إنما كانت وطنا له بالأهل لا بالعقار، ألا ترى! أنه لو تأهل ببلدة ولم يكن له عقار صارت له وطنا. (مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، مصري قديم ١/ ١٦٤،

دارالکتب العلمية بيروت، جديد ١/ ٢٣٩، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٢٣٩، كراچی ٢/ ١٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۲۸)

جائے ملازمت کتنی دوری پر ہو تو قصر لازم ہے؟

سوال [۳۳۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید اپنے وطن اصلی سے اسی کلومیٹر کی دوری پر مستقل ملازمت کے سلسلہ میں رہتا ہے، جو باعتبار راجح قول فقہاء ۴۸ر میل (تقریباً ۸۸ر کلومیٹر) بحوالہ ایضاح المسائل/ ۶۸ کے مسافر نہیں ہوتا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید اگر اس ملازمت والی جگہ سے آٹھ دس کلو میٹر آگے سفر کرتا ہے، تو مسافر ہوگا یا نہیں؟

(۲) ماہنامہ ''ندائے شاہی'' مارچ ۲۰۰۷ء نماز مسافر کے تحت ص: ۶۰ ر پر مستقل ملازمت یا کاروباری سلسلہ میں رہنے والوں کے لئے جائے اقامت کو وطن اصلی کا درجہ بتایا گیا ہے، تو کیا جائے اقامت سے آگے سفر اس جگہ سے مانا جائے گا، یا وطن اصلی جائے پیدائش سے؟ نیز کیا سفر سے جائے اقامت منسوخ ہوگی یا نہیں؟ اور جہاں سے مستقل جائے اقامت سے سفر کیا ہے، وہاں واپس ہونے پر مقیم ہوگا یا نہیں؟

المستفتي: مستقیم احمد جمال القرآن، نجیب آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ''ایضاح المسائل'' میں فقہاء کے بیان کردہ چار اقوال لکھے گئے ہیں: (۱) ۴۵ر میل شرعی (۲) ۴۸ر میل شرعی (۳) ۵۴ر میل شرعی (۴) ۶۳ر میل شرعی۔ جس کو فقہاء نے ۱۵ر فرسخ، ۱۶ر فرسخ، ۱۸ر فرسخ اور ۲۱ر فرسخ سے تعبیر کیا ہے۔ اور

ایک فرسخ تین میل شرعی کے برابر ہوتا ہے،اس حساب سے یہ چار اقوال ہمارے سامنے ہیں، ان میں سب سے چھوٹی مسافت ۱۵ر فرسخ کی ہے،جس میں ۴۵ر میل شرعی ہوتے ہیں،جس میں ۸۲رکلومیٹر ۲۹۶ر میٹر ہوتے ہیں، یہ فقہاء کے چار اقوال میں سے سب سے مختصر مسافت والا قول ہے،اس سے کم مسافت میں ہم نمازوں کا قصر مشروع نہیں سمجھتے ،اگر آپ کے وطن اصلی سے جائے ملازمت کی مسافت اس سے بھی کم ہے اور وطن سے چلتے وقت جائے ملازمت ہی میں رکھنے کا ارادہ تھا، پھر جائے ملازمت میں پہنچنے کے بعد کسی اور جگہ جانے کا ارادہ بنا ہے،تو وہاں سے سوا بیاسی کلومیٹر سے زیادہ کا سفر ہو تو قصر کرنا لازم ہوگا، کم ہو تو قصر جائز نہیں ہوگا اور اگر وطن اصلی سے چلتے وقت جائے ملازمت میں ۱۵ر دن سے کم رک کر آگے کا ارادہ بھی ہے جہاں سے وطن اصلی کی مسافت سوا بیاسی کلومیٹر سے زیادہ ہے،تو قصر کرنا ضروری ہوگا، بشرطیکہ جائے ملازمت میں بال بچہ اور آشائش کے بغیر رہائش ہو اور اگر جائے ملازمت میں بیوی بچوں کے ساتھ رہائش ہے تو جائے ملازمت وطن تأہل ہو جائے گا جو وطن اصلی کے حکم میں ہو جاتا ہے۔اور''ندائے شاہی''میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ومن طاف الدنيا بلا قصد لم يقصر. (درمختار) وفي الشامي: بأن قصد بلدة بينه وبينها يومان للإقامة بها، فلما بلغها بدا له أن يذهب إلى بلدة بينه وبينها يومان وهلم جرا. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۲۲، زكريا ۲/ ۶۰۱، مستفاد: إيضاح المسائل/۶۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۸/۳/۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۸/ ۹۲۱۷)

ڈرائیور سفر میں نماز پوری پڑھے یا قصر کرے؟

سوال [۳۳۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زیدٹرین کا ڈرائیور ہے، وہ ہر دودن بعد یا روزانہ گاڑی لے کرے۴۸؍میل سے زیادہ کی مسافت طے کرتا ہے، اوروہ اس پیشے سے منسلک ہے، کیا وہ راستے میں قصر کی نماز پڑھے گا یا پوری چار رکعت ہی ادا کرے گا؟ والسلام

المستفتي: محمد یٰسین ریلوے ڈرائیور، محلّہ سرائے شیخ محمود، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسافت سفر سے زیادہ کے ارادہ سے جب ڈرائیور شہر کی آبادی سے باہر گاڑی لے کر نکلے گا، تو اس وقت سے واپس آبادی میں داخل ہونے تک چار رکعت والی نمازوں کو دو رکعت پڑھا کرے گا، چار رکعت پڑھنا جائز نہیں ہے۔

عن ابن عمر –رضي الله عنهما– أنه كان يقصر الصلاة حين يخرج من بيوت المدينة، ويقصر إذا رجع حتى يدخل. (مصنف عبدالرزاق، باب المسافر، متى يقصر إذا خرج مسافرا، المجلس العلمي ۲/ ۵۳۰، رقم: ۴۳۲۳)

عن عبدالله بن عمر– رضي الله عنهما– قال: إذا كنت مسافرا، فوطنت نفسک علي إقامة خمسة عشر يوما، فأتمم الصلاة، وإن كنت لا تدري فاقصر. قال محمد: وبه نأخذ، وهو قول أبي حنيفة. (كتاب الآثار، باب الصلاة في السفر، الرحيم اکیڈمی کراچی، ص: ۲۰۱، رقم: ۱۸۸)

ثم المعتبرة المجاوزة من الجانب الذي خرج منه، حتى لو جاوز عمران المصر قصر. (عالمگيری، الباب الخامس عشر فی صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱۳۹، جديد ۱/ ۱۹۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۱۶۳)

امام یا ملازم باپ کے پاس تعلیم کے لئے باہر گئے بیٹے مقیم ہوں گے یا مسافر؟

سوال [۳۳۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: امام یا ملازم وطن اصلی یا وطن اقامت کے حکم میں داخل ہوگیا تو اس کی وہ اولاد جو وطن سے باہر رہتی ہے کاروبار کی لائن سے یا تعلیم وتعلم کے لئے، تو اس اولاد کے لئے کیا حکم ہے؟ جب کہ ان کا علیحدہ کوئی ریکارڈ نہیں، اپنے باپ کے پاس پہنچ کر ان کو اتمام کرنا ہوگا یا قصر؟

المستفتي: محمد یونس، یکم جمادی الاخری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو باپ امام یا ملازم ہے اور وہ اہل وعیال اور اثاثہ کے ساتھ جائے ملازمت میں رہتا ہے، تو جائے ملازمت اس کے لئے وطن تاہل ہے جو وطن اصلی کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور اولاد باپ کے تابع ہوتی ہے؛ لہٰذا جو اولاد تعلیم وتعلم یا ملازمت کے لئے دوسری جگہ رہتی ہے اور وہ باپ کی فیملی میں رہتی ہے، وہ جب باپ کے پاس آئے گی تو نمازوں کا اتمام کرے گی؛ اس لئے کہ جو اولاد باپ کی فیملی میں ہوتی ہے، وہ کہیں بھی رہے باپ کے تابع رہتی ہے، ہاں البتہ جو بالغ لڑکے اپنی جائے ملازمت میں بیوی بچوں کو ساتھ رکھیں اور باپ سے الگ تھلگ ان کی فیملی جدا گانہ رہے تو وہ لڑکے باپ کی جائے ملازمت میں باپ کے تابع نہیں ہیں، ان کو قصر کرنا پڑے گا، یا بالغ لڑکے چاہے غیر شادی شدہ ہوں، مگر باپ سے الگ تھلگ رہتے ہوں اور باپ کی جائے ملازمت میں باپ کے تابع ہوکر رہنے کا ارادہ نہیں ہے، وہ بھی باپ کی جائے ملازمت میں مسافر رہیں گے، اسی طرح جو لڑکیاں شادی ہوکر شوہر کے پاس رہنے لگیں وہ بھی شوہر کے تابع ہوتی ہیں، باپ کے تابع نہیں ہوتی ہیں۔

وتعتبر نية الإقامة والسفر من الأصل كالزوج، والمولى، والأمير دون التبع، كالمرأة، والعبد، والجندي. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،

باب صلاۃ المسافر، دارالکتاب دیوبند ص: ٤٢٤، قدیم، ص: ٢٣١)

وتعتبر نية الإقامة والسفر من الأصل دون التبع، كالمرأة. (كنز الدقائق، كتاب الصلاة، باب المسافر، مكتبه مجتبائي ديوبند ١ / ٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۴۶/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۲۳ھ

دو چار دن جائے ملازمت میں قیام کی صورت میں قصر کریں یا اتمام؟

سوال [۳۳۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ امامت بھی کرتا ہے، وہ یہاں سے مسافت سفر شرعی طے کرتا ہے، پھر واپسی میں یہاں دو چار دن ٹھہر کر مسافت سفر شرعی کا ارادہ رکھتا ہے، نیز وہ اہل وعیال والا ہے، مگر جائے ملازمت میں اہل وعیال کو نہیں رکھتا ہے، تو کیا اس حالت میں یعنی ان دو چار دنوں میں قصر کرے گا؟ بایں طور کہ وہ مسافر ہے، یا اتمام کرے گا، بایں طور کہ وہ مقیم ہے؟ مذکورہ سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔

المستفتي: محمد صابر مدرسہ دار العلوم فرقانیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آدمی کی جائے ملازمت وطن تأہل کے مرادف ہے، جو وطن اصلی کے حکم میں ہوتا ہے؛ لہٰذا وہ شخص ان چار دنوں میں اتمام کرے گا، اگرچہ پندرہ روز قیام کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ (مستفاد: امداد الاحکام ۲/۳۱۰، ایضاح المسائل/۶۶)

إذا دخل المسافر بلدة له فيها أهل صار مقيما نوى الإقامة أو لا.

(فتاوى سراجية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، مكتبه اتحاد ديوبند ١/ ٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍شعبان ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۶۷)

جس بستی میں آئندہ رہنے کا ارادہ ہو اس میں قصر واتمام کا حکم

سوال [۳۳۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک گاؤں میں پیدا ہوا، نورانی قاعدہ حفظ قرآن کریم تک اپنے گاؤں کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، پھر ایک بستی کے مدرسہ میں عربی سال ششم تک پڑھا، اس کے بعد مشکوۃ شریف ودورۂ حدیث شریف کے لئے ایک قصبہ میں رہا، فراغت کے بعد تین سال سے میں ایک مدرسہ میں پڑھانے کے کام پر لگا ہوا ہوں، میری ابھی شادی نہیں ہوئی ۲۲؍سال عمر ہے، گھر کی ملکیت زمین جائیداد وغیرہ سب میرے دادا یا والد صاحبان کے نام ہے، میرے والدین، بہن بھائی، دادا سب حیات ہیں، گھر کوئی ملکیت میری نہیں ہے، پندرہ بیس دن اور کبھی ماہ میں والدین وغیرہ سے ملنے خیر خبر کے لئے ایک دوشب گذارنے گھر جاتا ہوں، میں جس مدرسہ میں مقیم ہوں اس سے کچھ فاصلہ پر جنگل میں ایک بستی آباد ہونا شروع ہوئی ہے، میں نے پختہ ارادہ کیا ہے کہ شادی ہونے کے کچھ دن بعد اہل خانہ سے الگ اس نئی بستی میں پلاٹ خرید کر مستقل طور پر اپنی رہائش گاہ بناؤں گا، سردست میرے پاس اتنی رقم نہیں کہ جس سے پلاٹ خرید سکوں، ہاں وسعت ہونے پر آئندہ خریدنے کا عزم پختہ ہے، اب ضروری سوال یہ ہے کہ سفر شرعی سے واپس ہونے پر اس نئی بستی میں پہنچنے کے بعد مسافر ہی رہوں گا یا مقیم ہوجاؤں گا؟ اہل خانہ سے ایک روپیہ کا بھی سوال یا امید نہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمت، نہ ملے مضائقہ نہیں کسی وجہ سے مدرسہ میں بھی رہائش میری نہیں رہتی تب بھی میں یہیں رہوں گا، کرایہ کے مکان میں رہوں گا، امید کہ حکم شرع سے مجھے آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

المستفتي: میرزاہد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شادی ہونے کے بعد مستقل طور پر رہنے کا پختہ ارادہ ہے اس کی تکمیل شادی کے بعد ہی ہوسکتی ہے اور ابھی شادی سے قبل آبائی وطن کا ترک نہیں ہوا ہے؛ اس لئے آئندہ کی رہائش کا ارادہ کافی نہیں؛ بلکہ ارادہ پر عمل بھی لازم ہے؛ لہٰذا جب شادی کے بعد وہاں مستقل رہائش شروع کردیں گے، تب وہ آپ کا وطن شمار ہوسکتا ہے، اس سے قبل نہیں؛ اس لئے فی الحال آپ وہاں نصف شہر سے کم قیام کی صورت میں مسافر ہی شمار ہوں گے۔

إذا المعتبر الأهل دون الدار كما لو تأهل ببلدة واستقرت سكنا له، وليس له فيها دار، وقوله: فلو كان له أبوان ببلد غير مولده، وهو بالغ ولم يتأهل به، فليس ذلك وطنا له إلا إذا عزم على القرار فيه، وترک الوطن الذي كان له قبله. (شامي، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، ووطن الإقامة، زكريا ٢/ ٦١٤، كراچی ٢/ ١٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۳/۹/۱۴۱۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۸۷)	۲۳/۹/۱۴۱۹ھ

وطن تأہل میں قصر واتمام کا حکم

سوال [۳۳۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کی شادی دہلی میں ہوئی وہ خود لکھنو کا رہنے والا ہے اور دہلی میں بیوی کا ذاتی مکان ہے۔ اور زید نے اس بیوی کو دہلی ہی میں رکھ رکھا ہے، مگر زید کا قیام دہلی میں مستقل نہیں ہے اور بیوی کا قیام دہلی میں مستقل ہے۔ اور زید مہینہ میں یا پندرہ دن میں بیوی کے پاس دو تین دن کے لئے جاتا ہے، اس کے بعد لکھنو چلا جاتا ہے اور لکھنو دہلی کے درمیان

تقریباً پانچ سوکلومیٹر کا فاصلہ ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زید اپنی بیوی کے پاس تین دن کے لئے جائے گا، تو اس دوران نمازوں کی قصر کرے گا یا اتمام؟

(۲) اگر زید نے بیوی کو دہلی میں نہیں رکھا؛ بلکہ رخصت کر کے اپنے گھر لکھنو میں لے آیا اور بیوی کی رہائش مستقل زید کے ساتھ لکھنو میں ہوگی، اس کے بعد زید کبھی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ یا تنہا سسرال دہلی پہنچتا ہے اور دو تین دن قیام کرتا ہے، تو ایسی صورت میں دوران قیام زید قصر کرے گا یا اتمام؟

(۳) حدیث پاک ''من تأهل ببلدة فهو منها'' کا مطلب کیا ہے؟ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ میں اتمام کیوں فرماتے تھے؟ حدیث فقہ کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

المستفتي: محمد قمر عالم بجنوری، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نمازوں کے اتمام اور قصر کا مدار وطن کے اعتبار سے ایک اصول پر ہے، اصول یہ ہے کہ وطن تأہل کا وطن اصلی کے حکم میں ہونا بیوی کی مستقل رہائش پر موقوف ہے، مرد نے جہاں شادی کی ہے، اگر بیوی کو شادی کے بعد مستقل وہاں رکھ چھوڑا ہے اور وقتاً فوقتاً بیوی کے پاس پندرہ دن سے کم کے لئے پہنچتا ہے، تو شوہر کے لئے نمازوں کا اتمام کرنا لازم اور واجب ہے؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں جب زید لکھنو سے دو تین دن کے لئے بیوی کے پاس دہلی میں قیام کرے گا تو دوران قیام زید پر نمازوں کا اتمام کرنا لازم اور ضروری ہے؛ اس لئے کہ زید کی بیوی کا مستقل قیام دہلی ہی میں ہے، اسی طرح اگر زید نے ایک شادی دہلی میں کر کے بیوی کو مستقل طور پر دہلی میں رکھ چھوڑا اور دوسری شادی بنارس میں کر کے اس کو مستقل بنارس ہی میں رکھ چھوڑا اور اس کا خود اپنا قیام لکھنو میں ہے اور لکھنو سے دونوں بیویوں کے پاس جاتا رہتا ہے، تو ایسی صورت میں زید پر دونوں جگہ اتمام کرنا لازم ہوگا۔

(مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/ ۴۸۲، ۴۶۶، امداد الفتاوی ۱/ ۵۶۳، بہشتی زیور ص: ۵۰، مسئلہ: ۲۱، فتاوی محمودیہ

۲/ ۲۷۰، ۱۴/ ۲۲۸، فتاوی رحیمیہ ۵/ ۱۰۱، ایضاح المسائل/ ۶۸، امداد الاحکام ۲/ ۳۰۸)

وإن كان ذلك وطنا أصليا بأن كان مولده، وسكن فيه أو لم يكن مولده، ولكنه تأهل به وجعله دارا يصير مقيما بمجرد العزم إلى الوطن؛ لأنه رفض سفره قبل الاستحكام حيث لم يسر ثلاثة أيام ولياليها، فيعود مقيما يتم صلاته إلى الوطن. (خانية على الهندية، الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۱/ ۱٦٥، جديد ۱/ ۱۰٤، هكذا في البحر، الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ۲/ ۱۳٦، زكريا ۲/ ۲۳۹، تاتار خانيه، الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۵۱۱، رقم: ۳۱۵۲، قديم ۲/ ۱۹، شامي، الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچى ۲/ ۱۳۲-۱۳۱، زكريا ۲/ ٦۱٤)

ولو كان ببلدتين فأيتهما دخل صار مقيما. (حواله بالا)

(۲) اور اگر شادی کرنے کے بعد بیوی کو وہاں نہیں چھوڑا؛ بلکہ رخصت کر کے اپنے ساتھ لے آیا اس کے بعد پندرہ دن سے کم کے لئے جب بیوی کے ساتھ یا تنہا سسرال جائے گا تو وہاں اتمام جائز نہ ہوگا؛ بلکہ قصر کرنا لازم ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۴/ ۴۸۲، امداد الاحکام ۲/ ۳۰۸-۳۱۱)

حتى إذا انتقل من البلد الذي تأهله به أهله وعياله، وتوطن ببلدة أخرى لا يبقى البلد المنتقل عنه وطنا له. (البحر الرائق، الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ۲/ ۱۳٦، زكريا ۲/ ۲۳۹، تاتارخانية، الصلاة باب صلاة السفر ۲/ ۵۱۱، رقم: ۳۱٤۹، قديم ۲/ ۱۹، طحطاوي على المراقي، الصلاة، باب صلا المسافر، مكتبه أشرفيه/ ٤۲۹)

(۳) حدیث پاک میں "**من تأهل ببلدة فهو منها**" الحدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے کسی شہر یا دیار میں شادی کر کے بیوی کو وہاں رکھ چھوڑا، اسی طرح کسی شہر و دیار میں ملازمت یا کسی اور غرض سے اہل وعیال کے ساتھ رہائش اختیار کر لی ہے، تو وہ شہر و دیار اس شخص کے حق میں وطن اصلی کا حکم رکھتا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں مکۃ المکرّمہ میں ایک شادی کر کے بیوی کو چوں کہ وہیں رکھ چھوڑا تھا اور بیوی کی

مستقل رہائش مکہ ہی میں باقی رکھی تھی؛ اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مکہ پہنچتے تھے تو نمازوں کا اتمام فرمایا کرتے تھے گرچہ ان کا ارادہ مدت اقامت سے کم قیام کا رہا ہو، ایسا نہیں ہے کہ صرف شادی کی ہو اور بیوی کو وہاں مستقل نہ رکھنے کے باوجود اتمام کیا ہو، اس موضوع پر مبسوط فتویٰ ''امداد الاحکام'' -۱/۳۱۱ پر ہے:

حدثنا عبدالله، حدثنى أبي، حدثني أبو سعيد يعنى مولى بني هاشم، حدثنا عكرمة بن إبراهيم الباهلي، حدثنا عبدالله بن عبدالرحمن بن أبي ذباب عن أبيه أن عثمان بن عفان –رضي الله عنهما– صلى بمنى أربع ركعات، فأنكره الناس عليه،فقال: يا أيها الناس! إني تأهلت بمكة منذ قدمت، وإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من تأهل ببلدة، فليصل صلاة المقيم. (مسند أحمد ١/ ٦٢، مجمع الزوائد، الصلاة، باب فيمن سافر، فتأهل في بلد، بيروت ٢/ ١٥٦، إعلاء السنن، الصلاة، باب إذا تزوج المسافر في بلد وله فيه زوجة الخ، بيروت ٧/ ٣١١، زاد المعاد ١/ ٤٧٠)

وفي زاد المعاد: أنه قد تأهل بمنى أو بمكة والمسافر إذا أقام في موضع، وتزوج فيه، أو كان له به زوجة أتم. (زاد المعاد، الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئته ١/ ٤٧٠، هكذا في إعلاء السنن ٧/ ٣١١، الصلاة، باب إذا تزوج المسافر في بلد وله فيه زوجة الخ، بيروت)

وفي كفاية على هامش فتح القدير: روى أنه كان لعثمان أهل بمكة وأهل بالمدينة، وكان يتم الصلاة بهما جمعيا. (كفاية كوئته ٢/ ١٦)

وهذا أصل فى هذه المسئلة. وفي البحر: روى أن عثمان –رضى الله عنه) كان حاجا يصلي بعرفات أربعا فاتبعوه فاعتذر، وقال: تأهلت بمكة، وقال النبي صلى الله عليه وسلم: من تأهل ببلدة فهو منها. (البحر الرائق، الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئته، ٢/ ١٣٦، زكريا ٢/ ٢٣٩)

وفي إعلاء السنن: أن موطن التأهل ملتحق بالوطن الأصلي كما ورد

التصريح به في لفظ أبي يعلى، ونصه إذا تأهل المسافر في بلد فهو من أهله.
(الصلاة، باب إذا تزوج المسافر في بلد وله فيه زوجة، بيروت، ص: ۳۱۲)

وفي المحيط: إنما كانت وطنا بالأهل لا بالعقار. (البحر الرائق، الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۲۳۹، كوئٹه ۲/ ۱۳٦، تاتارخانية، الصلاة، باب صلاة السفر، زكريا ۲/ ۵۱۱، رقم: ۳۱٤۹، ۲/ ۱۹، شامي، الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۱، زكريا ۲/ ٦۱٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الاولی ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۶/ ۱۴۲۲ھ

سسرال کو وطن اصلی میں شامل کرنے کی تخصیص

سوال [۳۳۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سسرال کو وطن اصلی شمار کیا گیا ہے، مگر اس وقت جب کہ بیوی کو وہاں رکھے تو سوال یہ ہے کہ اس میں سسرال کی تخصیص کیا ہے؛ کیوں کہ بیوی جس جگہ بھی رکھی جائے تو وہ وطن اصلی بن جائے گا، پھر سسرال کو وطن اصلی میں شمار کرنے کی کیا وجہ ہے؟

المستفتي: محمد حسیب سمدھن فرخ آباد

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بات وہی ہے جو آپ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح ہمیشہ کے لئے بیوی کو سسرال میں رکھنے کی وجہ سے سسرال وطن اصلی کے حکم میں ہوجاتا ہے، اسی طرح کسی دوسری جگہ بیوی کے ساتھ مستقل طور پر قیام کر لینے کی وجہ سے وہ بھی وطن اصلی کے حکم میں ہوجاتا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ٦٦، امداد الاحکام ۱/ ۵۰۴)

والوطن الأصلي هو الذي ولد فيه الإنسان، أو تزوج فيه، أو لم

يتزوج ولم يولد فيه، ولكن قصد التعيش لا الارتحال عنه. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، دارالكتاب ديوبند، ص: ۴۲۹)

والوطن الأصلي هو موطن ولادته، أو تأهله أو توطنه. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۱۴، كراچی ۲/ ۱۳۱، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، مصري قديم ۱/ ۱۶۴، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۴۲، ۲۴۳، بدائع الصنائع، فصل في صلاة المسافر، الكلام في الأوطان، زكريا ۱/ ۲۸۰، كراچی ۱/ ۱۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍شوال ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۴۸۴)

وطن تأہل جاتے ہی اتمام کرے گا

سوال [۳۳۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مسافر ہے اور حالت مسافرت میں اس پر قصر لازم ہے اور وہ کسی مسجد کا امام ہے، وہ گھر سے جب آتا ہے، تو مسافر ہوجاتا ہے اور وہاں آنے کے بعد اس کو بمبئی سفر پر جانا ہے۔ اور اتنی مدت بھی نہیں کہ اقامت کی نیت کرسکے، مثلاً ایک ہفتہ کے بعد اس کو بمبئی جانا ہے اور پھر بمبئی سے آنے کے بعد اس کو گھر واپس جانا ہے اور وہ اپنی زبان سے کہتا ہے کہ مجھے ۵؍ یا دس دن میں گھر جانا ہے، ایسے کہتے کہتے ۱۵؍ یا بیس دن گذر جاتے ہیں اور وہ اس مدت میں عشاء، ظہر اور عصر کی نماز چار رکعت پڑھتا ہے، تو کیا یہ نماز صحیح ہوگی یا اس کا لوٹانا واجب ہوگا؟ مقتدی اور امام دونوں پر یا صرف مقتدی پر یا صرف امام پر؟ صحیح جواب سے نوازیں۔

المستفتي: محمد یاسین، مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر شخص مذکور بمبئی میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے، تو اگر بمبئی صرف ایک یوم کے لئے آتا ہے، تب بھی نماز پوری پڑھنا لازم ہوگا اور امام بن کر چار رکعت پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور اگر بلا بیوی کے تنہا رہتا ہے، تو پندرہ روز سے کم قیام کا ارادہ ہوتو بمبئی میں قصر کرنا ہوگا۔ (مستفاد: امداد الاحکام ۲/ ۳۳۷)

عن عبدالرحمن بن أبي ذباب أن عثمان بن عفان صلی بمنی أربع ركعات، فأنكره الناس عليه، فقال: يا أيها الناس! إني تأهلت بمكة منذ قدمت وإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من تأهل في بلد فليصل صلاة المقيم. (مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۶۲، رقم: ۴۴۳)

وكذا إذا دخل وطنه الأصلي أو مصرا صار وطنا له، بأن كان اتخذ فيه أهلا صار مقيما، وإن لم ينو الإقامة. (الفتاوى التاتارخانية، الصلاة، الفصل الثاني والعشرون، زكريا ۲/ ۵۱۰، رقم: ۳۱۴۳)

والوطن الأصلي: هو موطن ولادته، أو تأهله أو توطنه. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۱۴، كراچی ۲/ ۱۳۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
یکم ذیقعدہ ۱۴۱۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۱۵)	۱۴۱۹/۱۱/۱ھ

متعدد شہروں میں شادی کر رکھی ہو تو ہر بیوی کے یہاں اتمام لازم

سوال [۳۳۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید سرمایہ دار آدمی ہے، مرادآباد کا رہنے والا ہے، اس نے ایک شادی سہارن پور میں کی اور بیوی کو ایک مکان خرید کر دیا اور اس کو وہیں رکھا، دوسری شادی دلی میں کی اور وہاں ایک مکان لیکر بیوی کو وہیں رکھا، تیسری شادی ممبئی میں کی اور فلیٹ لے کر بیوی کو وہیں رکھا،

چوتھی کلکتہ میں کی اور وہاں مکان لے کر اس بیوی کو وہیں رکھا اور ہر بیوی کے پاس آتا جاتا رہتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ زید جو بیویوں کا دورہ کرتا ہے اور کسی کے پاس پندرہ یا اس سے زائد دن قیام نہیں کرتا ہے، تو وہ ان مقامات پر قصر کرے گا یا اتمام؟

المستفتي: محمد شعیب میرٹھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زید جو سرمایہ دار اور مرادآباد کا رہنے والا ہے اور سہارنپور، دہلی، ممبئی اور کلکتہ میں شادیاں کر کے مکان لے کر اپنی بیویوں کو ان ہی مذکورہ مقامات میں رکھ رکھا ہے، تو وہ جب بھی اپنی کسی بیوی کے پاس جائے گا تو وہ اتمام کرے گا، خواہ پندرہ دن سے کم قیام کا ارادہ ہو؛ اس لئے کہ یہ سب مذکورہ مقامات اس کے لئے وطن تأہل ہیں، جو وطن اصلی کے درجہ میں ہوتے ہیں۔

إذا دخل المسافر بلدة له فيها أهل صار مقيما نوى الإقامة أولا.

(سراجية، مكتبه اتحاد ديوبند ۱/ ۷۹)

وإن تأهل بهما كان كل واحد من الموضعين وطنا أصليا. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ۲/ ٤۹۹، رقم: ۳۱۰۸)

ولو كان له أهل في بلدتين، فأيتهما دخلها صار مقيما. (شامي، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، ووطن الإقامة، كراچى ۲/ ۱۳۱، زكريا ۲/ ٦۱٤، حلبي كبير، الصلاة، باب صلاة المسافر، أشرفيه ديوبند: ٥٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۲۸)

سنگاپور، امریکہ وغیرہ کی ہر بیوی کے پاس اتمام

سوال [۳۳۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید ایک سرمایہ دار اور قومی تاجر ہے، سنگاپور جاتا رہتا ہے، اس نے وہاں ایک شادی کرلی اور بیوی کو وہیں رکھا، جرمنی جاتا رہتا ہے، ایک شادی وہاں کرلی، اس کو وہیں پر رکھ رکھا ہے، امریکہ جاتا رہتا ہے، ایک شادی وہاں کرلی اس کو وہیں رکھ رکھا ہے، ہانگ کانگ جاتا ہے، ایک شادی وہاں کرلی اور اسے وہیں رکھ رکھا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جب یہ اپنی بیویوں کے پاس آتا جاتا رہے گا اور پندرہ دن سے کم قیام کرے گا، تو یہ قصر کرے گا یا اتمام؟

المستفتي: قاسم بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زید مذکورہ چاروں مقامات پر اتمام کرے گا، خواہ پندرہ دن سے کم قیام کی نیت ہو؛ اس لئے کہ چاروں مقامات اس کے لئے وطن تأہل ہیں اور وطن تأہل وطن اصلی کے درجہ میں ہوتا ہے؛ لہٰذا اس پر اتمام لازم ہوگا۔

إذا دخل المسافر بلدة له فيها أهل صار مقيما نوى الإقامة أولا.

(سراجية، مكتبه اتحاد ديوبند ١/ ٧٩)

وإن تأهل بهما كان كل واحد من الموضعين وطنا أصليا. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ٢/ ٤٩٩، رقم: ٣١٠٨)

ولو كان له أهل في بلدتين، فأيتهما دخلها صار مقيما. (شامي، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، ووطن الإقامة، كراچى ٢/ ١٣١، زكريا ٢/ ٦١٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۲۸)

داماد سسرال میں قصر کرے گا یا اتمام؟

سوال [۳۳۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: بعض کتب میں آیا ہے کہ داماد کو سسرال میں قصر کرنا ہے اور بعض مفتیان کرام کا کہنا ہے کہ اتمام کرے گا، صحیح مسئلہ کیا ہے؟ واضح کریں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داماد اپنی سسرال میں قصر کرے گا، الا یہ کہ پندرہ یا اس سے زائد دنوں کا قیام کا ارادہ ہو۔ اور بعض کتب میں جو لکھا ہے کہ اتمام کرے گا یہ اس وقت ہے جب کہ لڑکی ہمیشہ اپنے میکے ہی میں رہتی ہو، تو ایسی صورت میں داماد اپنی سسرال میں اتمام کرے گا؛ کیوں کہ اب سسرال کا علاقہ اس کے لئے وطن تأہل بن گیا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل/ ٦٧، فتاوی محمودیہ ڈابھیل/ ۷ ۴۹۷، میرٹھ۱۱/ ۲۱۱)

من خرج عمارة موضع إقامته قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها صلى الفرض الرباعي ركعتين، حتى يدخل موضع مقامه، أو ينوي إقامة نصف شهر، فيقصر إن نوى في أقل منه، أي في نصف شهر. (شامي كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ٢/ ١٢١، زكريا ٢/ ٥٩٩- ٦٠٠)

الوطن الأصلي: هو وطن الإنسان في بلدته أو بلدة أخرى اتخذها دارا وتوطن بها مع أهله وولده، وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها، وهذا الوطن يبطل بمثله لا غير. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٢٣٩، كراچی ٢/ ١٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ صفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۳۷)

بیوی میکے میں قصر کرے گی یا اتمام؟

سوال [۳۴۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: سسرال میں اگر بیوی نہ ہو اور ساز وسامان نہ ہو تو جب شوہر وہاں مسافر ہوکر جائے گا، تو قصر کرنا لازم ہوگا؛ لیکن بیوی اپنے ماں باپ کے گھر جا کر قصر کرسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتي: ابوالکلام آزاد صدر مدرس مدرسہ اولیاء بھنگنا راوی، پوسٹ چولیا کاٹا، ضلع برپٹا (آسام)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب بیوی میکے سے رخصت ہوکر شوہر کے یہاں چلی گئی ہے اور شوہر کے ساتھ شوہر کے وطن میں مستقل رہنے کا ارادہ ہے، تو جب اتفاقاً پندرہ روز سے کم مدت کے لئے میکے جائے گی تو قصر کرنا اس پر لازم ہوگا؛ اس لئے کہ وطن مولودی کی وطن تأہلی کی وجہ سے اصلیت باطل ہوگئی اور اصلیت وطن تأہلی میں منتقل ہوگئی ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/ ۳۸۸، بہشتی زیور ۲/ ۵۰)

الوطن الأصلي هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه يبطل بمثله. (الدرالمختار، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، ووطن الإقامة، زكريا ٢/ ٦١٤، كراچی ٢/ ١٣١)

وطن أصلي وهو مولد الرجل أو البلد الذي تأهل به، ويبطل الوطن الأصلي بالوطن الأصلي. (هندية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ١٤٣، جديد ١/ ٢٠٢)

وطن أصلي: وهو مولد الرجل، والبلد الذي تأهله به ...... ومن حكم الوطن الأصلي أن ينتقض بالوطن الأصلي؛ لأنه مثله، والشيء ينتقض بما هو مثله. (الفتاوى التاتارخانية، الصلاة، الفصل الثاني و العشرون، في صلاة السفر، زكريا ٢/ ٥١٠، رقم: ٣١٤٤، ٣١٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ صفر ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۱۲ھ

لڑکی میکے میں قصر کرے گی یا اتمام؟

سوال [۳۴۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد (جو حیدرآباد کا مقیم ہے) کا نکاح ممبئ کی لڑکی سے ہوا، لڑکی جب اپنے والدین سے ملنے کے لئے میکے جاتی ہے اور مدت قیام ۱۵/دن سے کم ہو تو قصر کرے گی یا مکمل ۴/ رکعت پڑھے گی۔ بینوا توجروا۔

المستفتي: محمد نذیرالدین حیدرآباد، تلگانہ اسٹیٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ممبئ کی لڑکی کا نکاح حیدرآباد میں خالد کے ساتھ ہوا ہے، تو اب لڑکی کے ماں باپ کا گھر اس کا اپنا گھر شمار نہ ہوگا، بلکہ اب اس کا وطن اصلی شوہر کے تابع ہوکر شوہر کا گھر ہوگا، اس لئے جب لڑکی حیدرآباد سے ممبئ ۱۵/ دن سے کم قیام کے ارادہ سے آئے گی تو اس پر قصر لازم ہوگا، یعنی چار رکعت والی نماز کو چار رکعت پڑھنا درست نہیں ہوگا۔

ومن حکم الوطن الأصلي أن ینتقض بالوطن الأصلي، وشيء ینتقض بما هو مثله. (تاتارخانية، زکریا ۲/ ۵۱۰، رقم: ۳۱۴۵، بهشتی زیور ۲/ ۵۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۸۶۸/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۳۶/۴/۱ھ

دولہن پہلی رات سسرال میں قصر کرے گی یا اتمام

سوال [۳۴۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: لڑکی کی شادی مسافت سفر پر ہوئی، پہلی رات گزارنے کے بعد اسے میکہ آنا ہے، تو یہ لڑکی شوہر کے گھر پر قصر کرے گی یا اتمام؟

المستفتي: شعیب احمد میرٹھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ صورت میں جس لڑکی کی شادی مسافت سفر پر ہوئی، پھر اس کو شوہر کے یہاں رات گزار کر میکہ آنا ہے، تو یہ لڑکی اس رات اتمام کرے گی؛ کیوں کہ اسے جوکل جانا ہے، وہ رسماً جارہی ہے، آئندہ اس کو ہمیشہ شوہر کے تابع ہوکر سسرال ہی میں رہنا ہے۔

وتعتبر نية الإقامة والسفر من الأصل كالزوج، والمولى، والأمير دون التبع كالمرأة والعبد والجندي، فالنية في السفر والإقامة نية من يليه كالمرأة مع زوجها. (فتاوی قاضی خان علی الهندية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ١/ ١٦٦، جديد ١/ ١٠٤)

وكل من كان تبعا لغيره يلزمه طاعته يصير مقيما بإقامته ومسافرا بنيته، وخروجه إلى السفر. (هندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ١/ ١٤١، جديد ١/ ٢٠١)

ولا ينتقض الوطن الأصلي بوطن الإقامة، ولا بوطن السكنى؛ لأنهما دونه، والشيء لا ينسخ بما هو دونه. (بدائع الصنائع، صلاة المسافر، الكلام في الأوطان، قديم كراچی ١/ ١٠٤، زكريا ١/ ٢٨٠)

يبطل الوطن الأصلي بمثله لا السفر. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ٢/ ١٣٦، زكريا ٢/ ٢٣٩)

ولا ينتقض هذا الوطن بوطن السفر، ولا بوطن السكنى؛ لأن كل واحد منهما دونه، والشيء لا ينتقض بما هو دونه، وكذلك لا ينتقض بإنشاء السفر. (التاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون، في صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٥١١، رقم: ٣١٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۲/۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۴۶)

شوہر سسرال میں اتمام کرے گا یا قصر؟

سوال [۳۴۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسافر اگر اپنی سسرال جائے تو نماز پوری پڑھے گا یا قصر کرے، جب کہ سسرال ۴۸ رمیل سے زیادہ پر ہے، یعنی شرعی طور پر مسافر ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتي: محمد تحسین سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر سسرال میں رہائش اختیار کرتا ہے اور بیوی کو مستقل وہاں رکھتا ہے، تو بالاتفاق سسرال میں قصر نہیں کرے گا۔ اور اگر بیوی کو سسرال میں نہیں رکھتا ہے؛ بلکہ اپنے وطن ہی میں بیوی کو لے آیا ہے اور وطن میں ہی مستقل رہائش کا ارادہ ہے، تو نصف ماہ سے کم کے ارادہ سے سسرال میں جانے کی صورت میں فقہاء واکابر اہل فتاوی کے درمیان اختلاف ہے، صاحب قاضی خان وصاحب غنیۃ المستملی شرح کبیری اور حضرت تھانوی علیہ الرحمہ اور صاحب فتاوی رحیمیہ کی رائے یہ ہے کہ شوہر پر قصر کرنا لازم ہوگا۔
علامہ شامی صاحب درمختار صاحب ''مجمع الانہر'' اور حضرت مفتی اعظم مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ''فتاوی دار العلوم'' کی رائے یہ ہے کہ سسرال میں ہر حال میں قصر ہی کرے گا۔
اسی کو شامی اور درمختار میں زیادہ راجح قرار دیا ہے۔ اور بعد میں کبیری اور رافعی نے بھی اسی کو اوجہ نقل فرمایا ہے۔ (امداد الفتاوی ۱/ ۳۷۶، فتاوی رحیمیہ ۵/ ۱۰، فتاوی محمودیہ ۲/ ۲۶۹)

أو موضع تأهل به، ومن قصده التعيش لا الارتحال عنه. (كبيري، الصلاة، صلاة المسافر، سهيل اكيڈمی / ٥٤٤، مكتبه رحيميه قديم: ص: ٥٠٥)

تأهل به وجعله دارا يصير مقيما. (فتاوى قاضي خان، الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ١/ ١٦٥، جديد ١/ ١٠٤)

تزوج المسافر ببلد صار مقيما على الأوجه، وفي الشامي: أي بنفس التزوج وإن لم يتخذه وطنا أو لم ينوى الإقامة خمسة عشر يوما. (الدرالمختار مع الشامي، الصلاة، باب صلاة المسافر، قبيل باب الجمعة، زكريا ٢/ ٦١٩، كراچی ٢/ ١٣٥، رافعي، الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ١١٠، كراچی ٢/ ١١٠، مجمع الأنهر، الصلاة، باب صلاة المسافر، بيروت ١/ ٢٣٤، كبيري، الصلاة، باب صلاة المسافر، سهيل اكيڈمی/ ٥٤٤، ٥٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۲۱۰)

مسافر کے لئے جمعہ کی امامت

سوال [۳۴۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا مسافر حالت سفر میں نماز جمعہ کی امامت کرسکتا ہے؟

المستفتي: حافظ رضوان صاحب، امام وخطیب مسجد اسلام پورہ عثمان آباد، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تین قسم کی نمازوں میں سفر اور حضر کی وجہ سے کسی قسم کا فرق نہیں آتا ہے: فجر کی نماز، مغرب کی نماز اور جمعہ کی نماز۔ یہ تین نمازیں مسافر اور مقیم دونوں قسم کے لوگوں کے حق میں یکساں اور برابر رہتی ہیں؛ اس لئے ان تین قسم کی نمازوں میں مسافر امام بن کر کے نماز پڑھا سکتا ہے؛ لہٰذا جمعہ کی نماز میں مسافر کے لئے امامت کرنا بلاشبہ جائز ہے اور اس کے پیچھے مسافر ومقیم ہر طرح کے لوگ اقتداء کر سکتے ہیں، ہاں البتہ چار رکعت والی نماز میں مسافر اگر امام بنے تو مقیم مقتدیوں پر لازم ہوجاتا ہے کہ اپنی بقیہ نماز

لاحق کی طرح بغیر قراءت کے مکمل کریں۔

یجوز للمسافر والعبد والمریض أن یؤموا في الجمعة کذا في القدوري. (هندیة، کتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زکریا قدیم ۱/ ۱٤۸، جدید ۱/ ۲۰۹)

ولا قراء ة علی المقتدي في بقیة صلاته إذا کان مدرکا، أي لا یجب علیه؛ لأنه شفع أخیر في حقه. (بدائع الصنائع، کتاب الصلاة، اقتداء المقیم بالمسافر، کراچی قدیم ۱/ ۱۰۲، زکریا ۱/ ۲۷۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ شعبان ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۶/۵ھ

مسافر کا جمعہ کی امامت کرنا

سوال [۳۴۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسافر پر جمعہ کی نماز واجب نہیں، اگر کوئی مسافر جمعہ کی امامت کرلے، تو مقیم کی نماز ادا ہوجاتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

المستفتي: عبدالرحیم بن محمود رنگون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافر کے لئے جمعہ ترک کرنے کی رخصت ہے اور پڑھنا عزیمت ہے، اس کو ترک جمعہ کی اجازت ورخصت اس لئے دی گئی ہے، تاکہ پریشانی میں نہ پڑے؛ لیکن اس نے خود عزیمت پر عمل کرکے جمعہ پڑھ لیا، تو اس کی نماز صحیح ہوگئی۔ اور جب خود اس کی نماز صحیح ہوگئی ہے، تو اس کی امامت بھی صحیح ہوجائے گی، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال جمعہ کی نماز پڑھائی ہے، حالانکہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم

مسافر تھے۔

عن عمران بن حصين -رضي الله عنه- قال: غزوت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، وشهدت معه الفتح، فأقام بمكة ثماني عشرة ليلة لا يصلي إلا ركعتين يقول: يا أهل البلد! صلوا أربعا، فإنا قوم سفر. (سنن أبي داؤد، الصلاة، باب متى يتم المسافر، النسخة الهندية ۱/ ...... دارالسلام، رقم: ۱۲۲۹، مسند أحمد بن حنبل ۴/ ۴۳۰، رقم: ۲۰۱۰۵، ۴/ ۴۳۲، رقم: ۲۰۱۱۹)

ولنا ما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه صلى الجمعة بالناس عام فتح مكة وكان مسافرا. (بدائع الصنائع، فصل في بيان شرائط الجمعة، كراچی ۱/ ۲۶۲، ۱/ ۵۸۸، فتاوي عالمگيری، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ۱/ ۱۴۵، جديد ۱/ ۲۰۹، شامي، كتاب الصلاة، باب الجمعة كراچی ۲/ ۱۵۵، زكريا ۳/ ۳۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۷/ ۲۰۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۸/۱۴۱۹ھ

مسافر کے چار رکعت والی نماز پڑھانے کا حکم

سوال [۳۴۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے سابق امام صاحب جو ضلع بجنور میں کسی جگہ کے رہنے والے ہیں، جو فی الحال دہلی میں رہتے ہیں، جب کہ ان کے بیوی بچے ضلع بجنور میں ہی مقیم ہیں۔ حضرت امام صاحب ہفتہ یا دو ہفتہ میں دہلی سے مرآباد تشریف لاکر ہماری مسجد میں نماز جمعہ پڑھاتے ہیں، اور اگر ایک دن یا دو دن مرادآباد ٹھہرتے ہیں تو چار رکعت نماز عصر وعشاء وغیرہ بھی پڑھا دیتے ہیں، جب کہ مسجد میں موجود امام صاحب بھی موجود رہتے ہیں، آیا مذکورہ صورت میں

امام صاحب مقیم ہوں گے یا مسافر؟ اوران کے لئے نماز جمعہ پڑھانا اور چار رکعت والی نماز پڑھانا کیسا ہے؟ واضح ہو کہ امام صاحب مراد آباد میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن ٹھہرنے کی نیت نہیں کرتے، ایک دن یا دو دن میں دہلی واپس ہوجاتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں تسلی بخش جواب دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

المستفتي: ازمصلیان مسجد احمدی محلّہ مقبرہ باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جس سابق امام صاحب کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اگر شہر بجنور کا رہنے والا ہے، تو شہر بجنور مراد آباد سے مسافت شرعی کی دوری پر ہے یا ضلع بجنور میں ایسی جگہ کا رہنے والا ہے جو جگہ شہر مراد آباد سے ۸۲/ یا ساڑھے ۸۲/کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اور وہاں سے مراد آباد ایک دو دن کے لئے آکر چار رکعت والی نماز پڑھاتا ہے اور چار ہی رکعت پڑھاتا ہے، تو اس امام صاحب کے لئے چار رکعت والی نماز کی امامت جائز نہیں ہے، ایسی صورت میں سب لوگوں پر نماز کا اعادہ لازم ہوجائے گا اور یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس امام کو مراد آباد سے بجنور ہی واپس ہونا ہوا ور اگر بجنور سے دہلی جانے کا ارادہ ہو اور درمیان میں چند روز یا پندرہ دن سے کم مراد آباد میں رکنے کا ارادہ ہو تو ضلع بجنور کے کسی بھی خطہ کا رہنے والا کیوں نہ ہو، چاہے مراد آباد سے ۳۰/۴۰/کلومیٹر کے فاصلہ سے دہلی کے لئے روانہ ہوا ہو تو اس کے لئے مراد آباد میں پندرہ دن سے کم قیام کے ارادہ سے ٹھہرنے کی صورت میں چار رکعت والی نماز کی امامت چار رکعت کے ساتھ کرنا جائز نہیں ہے، تمام مقتدیوں کی نماز فاسد ہوجائے گی اور امام کی نماز واجب الاعادہ ہوجائے گی، اسی طرح اگر دہلی سے بجنور کے ارادہ سے سفر کے دوران مراد آباد میں دو چار دن کے لئے ٹھہرنا ہو تب بھی چار رکعت والی نماز کی امامت جائز نہیں، ہاں البتہ جمعہ کی امامت اور مغرب وفجر کی امامت بلا کراہت جائز و درست ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۴/۲۶۴، فتاوی دار العلوم ۴/۴۵۱)

فلو أتم المقيمون صلاتهم معه، فسدت؛ لأنه اقتداء المفترض بالمنتقل. (شامي، كتاب الصلاة، باب المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۰، زكريا ۲/ ۶۱۲)

هذا إذا قام إلى الثالثة على ظن أنه مقيم، أما إذا قام قاصدا، فإنه يجب عليه القضاء. (تقريرات رافعي ملحقه شامي زكريا ۲/ ۱۰۸)

ويجوز للمسافر والعبد والمريض أن يؤموا في الجمعة. (عالمگیری، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، زكريا قديم ۱/ ۱۴۸، جديد ۱/ ۲۰۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ شعبان ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۶۷۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۸/۱۹ھ

مسافر امام نے مقیم مقتدیوں کو چار رکعت پڑھادی

سوال [۳۴۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مسافر تھا، اس کو امام بنا دیا گیا، اس نے دو رکعت پڑھانے کے بجائے چار رکعت پڑھا دی، تو ایسی صورت میں مقیم مقتدیوں کا کیا حکم ہے؟ اور مسافر مقتدیوں کا کیا حکم ہے؟

المستفتي: یعقوب غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زید نے مسافر ہونے کی حالت میں امام بن کر دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھادی اور مقتدیوں میں بعض مسافر اور بعض مقیم ہیں، تو زید اور مسافر مقتدیوں کا فرض ادا ہو گیا؛ لیکن تاخیر واجب کی وجہ سے سجدۂ سہو لازم ہے، اگر سجدہ سہو نہ کیا تو وقت کے اندر اعادہ لازم ہوگا اور وقت کے بعد اعادہ کا حکم نہ ہوگا؛ البتہ مقیم مقتدیوں کی نماز

باطل ہوگئی؛ کیوں کہ آخری دورکعتوں میں اقتداء المفترض بالمتنفل لازم آرہا ہے، جو کہ وجہ فساد ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمود یہ ڈابھیل ۷/۵۱۱)

فلو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت؛ لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل، أي إذا قصدوا متابعته. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۰، زكريا ۲/ ۶۱۲، منحة الخالق، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۲۳۸، كوئٹه ۲/ ۱۳۵)

والوجوب مقيد بما إذا كان الوقت صالحا حتى أن من عليه السهو في صلاة الصبح إذا لم يسجد حتى طلعت الشمس بعد السلام الأول يسقط عنه السجود. (هندية، الباب الثالث عشر في سجود السهو ۱/ ۱۲۵، جديد ۱/ ۱۸۵، التاتارخانية، الفصل الثاني والعشرون في صلاة السفر، زكريا ۲/ ۴۲۳، رقم: ۲۸۵۵)

إذا صلى المسافر أربع ركعات ولم يقعد في الأوليين فسدت صلاته؛ لأنه ترك الفرض، فإن قعد قدر التشهد تمت صلاته وقد أساء بتأخير السلام عن محله. (الولوالجية ۱/ ۱۳۳)

فإن صلى أربعا وقعد في الثانية قدر التشهد أجزأته، والأخريان نافلة ويصير مسيئا لتأخير السلام، وإن لم يقعد في الثانية قدرها بطلت. (هندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱۳۹، جديد ۱/ ۱۹۹)

فلو أتم المسافر بأن صلى أربعا إن قعد في آخر الركعة الثانية قدر التشهد صحت فريضته، والزائد نفل، كالفجر وأساء؛ لأن فرضه ثنتان، والقعدة الأولى فرض عليه؛ لأنها آخر صلاته، فإذا وجدت يتم فرضه، ولكنه أساء لتأخير السلام. (مجمع الأنهر، باب صلاة المسافر، مكتبه فقيه الأمت ديوبند ۱/ ۲۳۹- ۲۴۰)

إذا صلى المسافر أربع ركعات ولم يقعد في الأوليين فسدت صلاته؛ لأنه ترك الفرض، فإن قعد قدر التشهد تمت صلاته، وقد أساء

بتأخير السلام عن محله. (الولوالجية، كتاب الطهارة، الفصل الثاني عشر في السفر و سجدة التلاوة، مكتبه دارالإيمان سهارنپور ۱/ ۱۳۳)

وإن أتم فإن قعد في الثانية قدر التشهد أجزأته، والأخريان نافلة له، ويصير مسيئا لتأخير السلام. (غنية المستملي، فصل في صلاة المسافر، أشرفيه ديو بند ۵۳۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶رمحرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۸۴)

مسافر امام نے چار رکعت پڑھادی

سوال [۳۴۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مسافر تھا، اس کو امام بنا دیا گیا، اس نے دو رکعت کے بجائے چار رکعت نماز پڑھادی اور اس کی اقتداء کرنے والے لوگ مقیم تھے، تو ایسی صورت میں کیا حکم ہے؟ واضح فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید نے حالت سفر میں چار رکعت نماز پڑھادی اور مقتدی مقیم تھے، تو زید کا فرض ادا تو ہوگیا؛ لیکن تاخیر واجب کی وجہ سے سجدہ سہو واجب ہے، اگر سجدہ سہو نہ کیا تو گنہگار ہوگا اور مکافات کے لئے وقت کے اندر اعادہ لازم ہے۔ اور وقت گذر جانے کے بعد اعادہ کا حکم ختم ہوجاتا ہے۔ اور مقیم مقتدیوں کی نماز باطل ہوگئی؛ کیوں کہ آخری دو رکعت میں "اقتداء المفترض بالمتنفل" لازم آرہا ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ، ڈابھیل ۷/ ۵۱۱)

فلو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت، لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل، أي إذا قصدوا متابعته. (شامي، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۰، زكريا ۲/ ۶۱۲)

فلو أتم مسافر إن قعد في القعدة الأولى تم فرضه لكنه أساء لو عامدا لتأخير السلام. (شامي، باب صلاة المسافر، کراچی ۲/ ۱۲۸، زکریا ۲/ ۶۰۹)

والوجوب مقيد بما إذا كان الوقت صالحا حتى أن من عليه السهو في صلاة الصبح إذا لم يسجد حتى طلعت الشمس بعد السلام الأول يسقط عنه السجود. (هندية، الباب الثالث عشر في سجود السهو، زكريا قديم ۱/ ۱۲۵، جديد ۱/ ۱۸۵)

فرض المسافر في كل صلاة رباعية ركعتان لا تجوز له الزيادة عليهما عمدا، ويجب سجود السهو إن كان سهوا، فإن أتم الرباعية وصلى أربعا، وقد قعد في الركعة الثانية مقدار التشهد أجزأته الركعتان عن فرضه وكانت الركعتان الأخريان له نافلة، ويكون مسيئا. (الفقه الإسلامي وأدلته، صلاة المسافر، حكم القصر أو هل القصر رخصة أو عزيمة، مطبع هدی انٹر نیشنل دیوبند ۲/ ۲۸٤)

فلو أتم المسافر بأن صلى أربعا إن قعد في آخر الركعة الثانية قدر التشهد صحت فريضته، والزائد نفل كالفجر وأساء؛ لأن فرضه ثنتان، والقعدة الأولى فرض عليه؛ لأنها آخر صلاته، فإذا وجدت يتم فرضه، ولكنه أساء لتأخير السلام. (الولوالجية ۱/ ۱۳۳، مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر جديد دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۳۹-۲٤۰)

فإذا أتم الرباعية والحال أنه قعد القعود الأول قدر التشهد صحت صلاته لوجود الفرض في محله، وهو الجلوس على الركعتين، وتصير الأخريان نافلة له مع الكراهة لتأخير الواجب، وهو السلام عن محله إن كان عامدا، وإن كان ساهيا يسجد للسهو. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب صلاة المسافر، دارالکتاب دیوبند ٤۲۵، فیصل ۱٦٤)

وإن أتم فإن قعد في الثانية قدر التشهد أجزأته، والأخريان نافلة له، ويصير مسيئا لتأخير السلام. (غنية المستملي، كتاب الصلاة، فصل في صلاة

التراویح، أشرفیه دیوبند ۵۳۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۸۴)

مسافر امام کا مقیم مقتدیوں کو رباعی نمازیں پڑھانا

سوال [۳۴۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسافر امام مقیم مقتدیوں کو متعدد رباعی نمازیں پڑھا چکا ہے، آیا وہ واجب الاعادہ ہیں یا ہوگئیں؟ نیز اگر عمداً پڑھائے یا نسیاناً پڑھائے، دونوں کا حکم ایک ہوگا یا جدا جدا؟

المستفتي: مولانا عبدالناصر مدرس مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مذکورہ میں امام کی نمازیں کراہت تحریمی کے ساتھ صحیح ہوگئیں وقت کے اندر اندر اعادہ کرنا لازم تھا، وقت گذر جانے کے بعد اعادہ لازم نہیں، جتنی رباعی نمازوں میں مقیم مقتدیوں نے اس امام کے پیچھے اقتداء کی ہے وہ تمام نمازیں ان مقیم مقتدیوں کی فاسد ہوگئیں اوران مقتدیوں پر پڑھی گئیں تمام رباعی نمازیں لوٹانا واجب ہے۔ اور امام پر لازم ہے کہ معلوم ہونے کے بعد مقتدیوں میں نمازوں کے اعادہ کا اعلان کردے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۴/ ۴۸۱)

لو اقتدى مقيمون بمسافر وأتم بهم بلا نية إقامة وتابعوه فسدت صلاتهم؛ لكونه متنفلا في الأخريين. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإقامة، قبيل مطلب في الألثغ، زكريا ۲/ ۳۲۷، كراچی ۱/ ۵۸۱)

فلو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت؛ لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۱۲، كراچی

۲/ ۱۳۰، منحة الخالق على البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كوئٹه ۲/ ۱۳۵، زكريا ۲/ ۲۳۸)

كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها، والمختار أنه جابر للأول؛ لأن الفرض لا يتكرر. (درمختار مع الشامي، الصلاة، باب صفة الصلاة، مطلب كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها، زكريا ۲/ ۱٤۸، كراچی ۱/ ٤٤٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رمحرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۲۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۱/۱۶ھ

مسافر کا مقیمین کو نماز عشاء چار رکعت پڑھانے کا حکم

سوال [۳۴۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک امام کو بات طے کئے بغیر لایا گیا اور وہ مسافر تھا، ان کا تین روز سے زیادہ قیام کا ارادہ بھی نہیں تھا، انہوں نے عشاء کی نماز چار رکعت پڑھائی، نماز ہوگئی یا نہیں؟ اور وتر بھی ہوگئی یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافر امام کی اقتداء میں اگر مقتدیوں نے عشاء کی چار رکعت نماز پڑھ لی تو مقتدیوں کی نماز فاسد ہوگئی اور اس کا اعادہ لازم ہے۔ اور امام کی دو رکعت نماز فرض کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہوگئی، بشرطیکہ وہ قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بقدر بیٹھا ہو۔ امام اور مقتدی سب کی وتر کی نماز صحیح ہوگئی؛ کیوں کہ وتر مستقل نماز ہے۔

وفي الشامي تحت قوله: لم يصر مقيما، فلو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت؛ لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة

المسافر، زکریا ۲/ ۶۱۲، کراچی ۲/ ۱۳۰، منحة الخالق، کتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، کوئٹه ۲/ ۱۳۵، زکریا ۲/ ۲۳۸)

لو اقتدى مقيمون بمسافر، وأتم بهم بلا نية إقامة وتابعوه فسدت صلاتهم؛ لكونه متنفلا في الأخريين. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإقامة، قبيل مطلب في الألثغ، کراچی ۱/ ۵۸۱، زکریا ۲/ ۳۲۷)

لو صلى العشاء بلا وضوء والوتر والسنة به يعيد العشاء والسنة لا الوتر؛ لأنه أداه ناسيا أن العشاء في ذمته، فسقط الترتيب. (شامي، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، کراچی ۲/ ۶۸، زکریا ۲/ ۵۲۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۶۳)

مسافر کا ظہر چار رکعت ادا کرنا

سوال [۳۴۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی مسافر ظہر کی نماز چار رکعت کی نیت سے ادا کر رہا ہو؛ لیکن پھر تیسری رکعت میں قصر کرنا یاد آیا، یا چوتھی رکعت میں یاد آیا تو اب وہ کیا کرے گا؟

المستفتي: محمد راشد بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مسافر شخص نے دو رکعت پر قعدہ کرلیا ہے اور پھر اس کے بعد تیسری رکعت پڑھنے کے دوران یاد آیا کہ مجھے قصر کرنا تھا، تو فوراً قعدہ کی طرف لوٹ آئے اور سجدہ سہو کے ذریعہ سلام پھیر دے اور اگر چوتھی رکعت میں یاد آیا ہے، تو ایسی صورت میں چوتھی رکعت مکمل کرے اور قعدۂ اخیرہ میں سجدۂ سہو بھی کرلے تو نماز درست ہوجائے گی،

دورکعت فرض اور دورکعت اضطراری طور پر نفل میں شمار ہوگی۔

الذخیرۃ: مسافر تشهد بعد ما صلى ركعتين من الظهر، ثم قام يريد أن يصلي ركعتين تمام أربع ركعات فنوى بهما التطوع، فركع ثم بدت له الإقامة، قال: ينبغي أن يجلس فيعود إلى الحالة التي كان عليها قبل أن يقوم للتطوع؛ لأن التحريمة الأولى باقية، وقد انعقدت قابلة للتغير لوجود المغير، وقد وجد فتغيرت، فيعود إلى الحالة التي كان عليها قبل أن يقوم للتطوع ليؤدي على الوجه الذي لزمته في الابتداء، ثم يقوم، فإن شاء قرأها، وإن شاء لم يقرأ؛ لأنه قرأ في الأوليين، ثم يركع. الخ (تاتارخانية، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والعشرون صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۵۱۸، ۵۱۹، رقم: ۳۱۷۵)

ولو أتم مسافر إن قعد في القعدة الأولى، تم فرضه، ولكنه أساء. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۰۹، كراچی ۲/ ۱۲۸)

فإن صلى أربعا وقعد في الثانية قدر التشهد أجزأته، والأخريان نافلة له، ويصير مسيئا لتأخير السلام. (هندية، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، زكريا قديم ۱/ ۱۳۹، جديد ۱/ ۱۹۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۲۲ھ

دوران سفر نماز عصر چار رکعت ادا کرنا

سوال [۳۴۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مسافر ہے، حالت سفر میں عصر کی نماز دورکعت کے بجائے چار رکعت پڑھ لی اور دو رکعت پر قعدہ بھی کرلیا ہے اور آخر میں سجدہ سہو کرکے نماز پوری کرلی، تو یہ بات معلوم

ہے کہ اگر مسافر نے دورکعت کے بجائے چار رکعت پڑھ لی ہے اور دورکعت پر قعدہ بھی کرلیا ہے، تو سجدہ سہو کے ساتھ اس کی نماز مکمل ہوگئی اور اخیر کی دورکعت اس کے حق میں نفل ہوجائے گی ، یہاں پرسوال یہ ہے کہ عصر کے بعد نفل مکروہ ہے،تو سجدہ سہو کے ساتھ اس مسافر کی آخری دورکعت جو نفل ہوئی ہے،تو یہ کراہت کے ساتھ ہوئی یا بلا کراہت درست ہوگئی ؟واضح فرمائیں۔

المستفتي: مفتی عبدالجلیل صاحب ناظم اوقاف مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافر نے جو عصر کی نماز دورکعت کے بجائے چار رکعت پڑھ لی ہے اور دورکعت پر قعدہ بھی کرلیا ہے اور سجدہ سہو کر کے نماز پوری کرلی ہے تو اس کی نماز درست ہوگئی ہے، اب رہی یہ بات کہ عصر کی فرض نماز کے بعد نفل نماز مکروہ ہے، یہ اس وقت مکروہ ہوتی ہے جب کہ بالقصد پڑھی جائے اور بھول ونسیان اور بلا قصد پڑھنے میں مکروہ نہیں ؛اس لئے مسافر مذکور کی نماز بلا کراہت درست ہوگئی۔اسی طرح فجر کی فرض نماز کے بعد نفل پڑھنا سب کے نزدیک مکروہ ہے؛ لیکن اگر کسی شخص نے بھول ونسیان میں فجر کی نماز دورکعت کے بجائے چار رکعت پڑھ لی اور درمیان میں قعدہ کرلیا ہے،تو اس کی پہلی دورکعت فرض ہوگئی اور اخیر کی دورکعت نفل ہوگئی اور اس کی یہ نماز بلا ارادہ بھول ونسیان کی وجہ سے بلا کراہت درست ہوگئی، جو حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

وضم إليها سادسة لو في العصر، وتحته في الشامية: أشار إلى أنه لا فرق في مشروعية الضم بين الأوقات المكروهة وغيرها، لما مر أن التنفل فيها إنما يكره لو عن قصد وإلا فلا وهو الصحيح، وعليه الفتوى، وإلى أنه كما لا يكره في العصر لا يكره في الفجر. (شامي، زكريا ديوبند، باب سجود السهو ۲/ ۵۵۳، کراچی ۲/ ۸۷)

ویکره التنفل بعد صلاة الفجر أي قصدا. (طحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، فصل في الأوقات المكروهة، دارالكتاب ديو بند/۱۸۸)

فلو أتم مسافر إن قعد في القعدة الأولى تم فرضه، ولكنه أساء لو عامدا لتأخير السلام. (درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، زكريا ۲/ ۶۰۹، كراچی ۲/ ۱۲۸)

وإن صلى أربعا وقعد قدر التشهد أجزأته الأوليان عن الفرض، والأخريان له نافلة اعتبارا بالفجر. وفي البناية: يعني إذا صلى الفجر أربعا بعد القعدة الأولى تجزئه صلاته. (البناية، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، مكتبه أشرفيه ۳/ ۱٤)

فلو أتم المسافر بأن صلى أربعا إن قعد في آخر الركعة الثانية قدر التشهد صحت فرضه، والزائد نفل كالفجر. (الدرالمنتقى، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، جديد دارالكتب العلمية ۱/ ۲۳۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۱۸۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۲/۹ھ

مسافر شخص نے عشاء کی نماز میں مقیم حضرات کی امامت کی تو کیا حکم ہے؟

سوال [۳۴۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مسافر تھا اور اس نے عشاء کی نماز پڑھائی، ان کے پیچھے مقیم اور دیگر حضرات نے نماز پڑھی اور اس نے پوری چار رکعت پڑھائی، بعدہ اس نے ظہر کی نماز میں اعلان کیا کہ میں نے مسافرت کی حالت میں نماز پڑھائی تھی؛ لہٰذا جو حضرات

میرے پیچھے نماز پڑھے ہیں وہ لوگ اپنی نماز لوٹا لیں، تو کیا عشاء کی نماز لوٹانی ہوگی یانہیں؟ یا پھر وتر کو بھی لوٹانا پڑے گا؟

المستفتي: نسیم احمد دمکوی، متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافر امام جس کے پیچھے مقیم مقتدی ہوں اور وہ قعدہ اولیٰ کے بعد تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہوگیا اور مقیم مقتدیوں نے بعد میں ان دو رکعتوں میں امام کی اقتداء کی نیت ختم کرلی ،تو امام کی دو رکعت فرض اور دو رکعت نفل اور مقتدیوں کی چار رکعتیں فرض ادا ہوجائیں گی؛ لیکن اگر مقتدیوں نے امام سے الگ ہونے کی نیت نہیں کی؛ بلکہ امام کی متابعت ہی میں چار رکعت مکمل پڑھی تو مقیم مقتدیوں کی نماز فاسد ہوجائے گی، اور اعادہ بھی لازم ہے، وتر فرض کے تابع نہ ہونے کی وجہ سے اس کا اعادہ لازم نہیں ہے۔

فلو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت؛ لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل، ظهيريه: أي إذا قصدوا متابعته، أما لو نووا مفارقته ووافقوه صورة فلا فساد، أفاده الخير الرملي. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۶۱۲، كراچی ۲/ ۱۳۰، منحة الخالق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ۲/ ۲۳۸، كوئٹه ۱۳۵) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۱؍ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۷۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۴/ ۱۴۱۷ھ

جب مسافر امام رباعی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دے تو مقتدی لوگ بقیہ دو رکعت کس طرح پوری کریں؟

سوال [۳۴۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر مقیم مقتدی مسافر امام کے پیچھے چار رکعت والی نماز میں اقتداء کرے، تو امام مسافر کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی مقیم باقی رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھے گا یا نہیں؟

المستفتي: محمد عبداللہ مقیم حال مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مقیم مقتدی مسافر امام کے پیچھے نماز پڑھے تو مسافر امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقیم مقتدی باقی دو رکعت میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھے گا؛ بلکہ اتنی ہی دیر کھڑے ہو کر رکوع سجدہ کرے گا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۲/ ۲۷۱)

وصح اقتداء المقيم بالمسافر في الوقت وبعده، فإذا أقام المقيم إلى الإتمام لا يقرأ ولا يسجد للسهو في الأصح؛ لأنه كاللاحق.

(درمختار مع الشامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، کراچی ۲/ ۱۲۹، زکریا ۲/ ۶۱۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۴۱)

مقیم کا مسافر کی اقتداء کرنا

سوال [۳۴۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی مقیم مقتدی مسافر امام کی اقتداء کرے اور مسافر امام قعدہ اولیٰ کے بعد بھول کر

کھڑا ہو جائے تو مقتدی کیا کرے، کیا امام کی اقتداء کرے یا نہیں؟

المستفتي: محمد سلیم مظفرنگری، امام مکی مسجد، غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافر امام چار رکعت والی نماز میں قعدہ اولیٰ کے بعد بھول کر کھڑا ہو جائے تو مقتدی امام کے لوٹنے کا انتظار کرے گا، اگر امام تیسری رکعت کے سجدہ سے پہلے واپس آجائے تو اس کے ساتھ سجدہ سہو کرے اور اس کے سلام کے بعد باقی نماز ادا کرے۔ اور اگر امام نے تیسری رکعت کا سجدہ کرلیا تو مقیم مقتدی مسافر امام کی اقتداء نہ کرے؛ بلکہ اپنی بقیہ رکعتیں اسی طریقہ سے پوری کرے جس طریقہ سے مسافر امام کے سلام پھیرنے کے بعد بغیر قرأت کے رکوع وسجدہ سے پوری کی جاتی ہیں؛ اس لئے کہ تیسری اور چوتھی رکعت مسافر امام کے حق میں نفل ہے اور مقیم مقتدی کے حق میں فرض ہے۔ اور نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی اقتداء درست نہیں ہے۔

فلو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت؛ لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل، أي إذا قصدوا متابعته، أما لو نووا مفارقته ووافقوه صورة فلا فساد. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٦١٢، كراچی ٢/ ١٣٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶؍ ۴؍ ۱۴۲۷ھ

مسافر مقیمین کو رباعی نماز پڑھادے

سوال [۳۴۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ایک مسجد میں مرادآباد میں امام ہوں، ۲۷؍ مئی بروز بدھ کو دہلی گیا تھا، وہاں چند روز

رہ کر ۲/ جون پیر کو واپس ہوا، وہیں سے ارادہ تھا کہ اپنے گھر بدایوں جاؤں گا، یہاں ایک ہفتہ رہ کر ۸/ جون اتوار کو بدایوں تبلیغی اجتماع میں شریک ہونے کے لئے بدایوں چلا گیا، ۲/ جون تا ۷/ جون جو نمازیں پڑھائیں پوری نمازیں پڑھائیں، گزارش ہے کہ بتائیں کیا ہمیں مرادآباد میں قصر کرنا چاہئے تھا یا اتمام؟ اگر قصر کرنا چاہئے تھا تو جو نمازیں ہم نے پڑھادی ہیں، ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتي: بارق محمود، مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مرادآباد میں صرف ۲/ جون سے ۷/ جون تک قیام کا ارادہ پہلے ہی سے تھا اور اسی کے مطابق عمل بھی ہوگیا، تو اس درمیان رباعی نمازیں جو پڑھائی گئیں اور ان میں دو رکعت پر قعدہ بھی کرلیا ہے، تو امام مسافر کی نمازیں لوٹانے کی ضرورت نہیں، اور بعد کی دو رکعتیں امام کے حق میں نفل ہیں اور مقتدی کے حق میں چاروں فرض ہیں، تو بعد کی دو رکعتوں میں فرض پڑھنے والوں نے نفل پڑھنے والے کے پیچھے اقتداء کی ہے؛ اس لئے مقتدیوں کی نمازیں فاسد ہوگئی ہیں، سب پر ان نمازوں کا لوٹانا لازم ہوگا۔

فلو أتم مسافر إن قعد في القعدة الأولی، تم فرضه، ولکنه أساء لو عامدا لتأخیر السلام. (درمختار، کتاب الصلاة، باب الإقامة، قبیل مطلب في الألثغ، زکریا دیوبند ۲/ ۶۰۹، کراچی ۲/ ۱۲۸)

فلو أتم المقیمون صلاتهم معه فسدت؛ لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل. (شامي، کتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زکریا دیوبند ۲/ ۶۱۲، کراچی ۲/ ۱۳۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۳/ ۱۴۱۸ھ

مقیم مقتدی کی رباعی نماز مسافر کے پیچھے پڑھی گئی کب تک اعادہ کی گنجائش ہے؟

سوال [۳۴۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عشاء کی نماز ادا کی گئی بعد میں معلوم ہوا کہ امام صاحب ۱۰۰ رکلومیٹر باہر سے آئے ہوئے مہمان ہیں نماز نہیں ہوئی، بعد میں نماز دہرائی گئی، کیا جماعت میں وہ لوگ شامل ہوسکتے ہیں، جنہوں نے نماز میں شرکت نہیں کی تھی، دوسری بات کیا وتر اور سنتیں بھی دہرانی چاہئے؟

المستفتي: لئیق احمد تمباکو والان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافر امام نے مقیم مقتدیوں کو جب چار رکعت نماز پڑھادی اور مقیم مقتدیوں نے اس کی اقتداء بھی کرلی تو ان مقتدیوں کی نماز فاسد ہوگئی؛ لہٰذا اب دوبارہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں وہ لوگ بھی شرکت کرسکتے ہیں، جنہوں نے فسادصلاۃ سے پہلے اقتداء نہیں کی تھی، نیز فرض کے بعد کی سنت وقت کے اندر اندر دہرائی جائے گی۔ اور وتر صحیح قول کے مطابق فرض کے تابع نہیں ہے؛ اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں اور وقت نکلنے کے بعد سنتوں کی قضاء نہیں ہے۔

قال الشامي: فلو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت؛ لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ۲/ ۱۳۰، زكريا ۲/ ٦١٢)

والمختار أن المعادة لترك واجب نفل جابر، والفرض سقط بالأولى. (طحطاوي على المراقي، كتاب الصلاة، فصل في بيان واجب الصلاة، جديد دارالكتاب ديوبند ٢٤٨، قديم ١٣٤)

وأما الأربع قبل الظهر إذا فاتته وجدها بأن شرع في صلاة الإمام ولم

يشتغل بالأربع فعامتهم على أنه يقضيها بعد الفراغ من الظهر مادام الوقت باقيا وهو الصحيح. (عالمگيری، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل زكريا قديم ١/ ١١٢، جديد ١/ ١٧١)

لو تبين أن العشاء صلاها بلا طهارة دون التراويح والوتر أعاد التراويح مع العشاء دون الوتر؛ لأنها تبع للعشاء، هذا عند أبي حنيفة، فإن الوتر غير تابع للعشاء فى الوقت عنده الخ. (هندية، كوئٹه ١/ ١١٥، جديد ١/ ١٧٥، هكذا في المبسوط ١/ ١٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ ر رجب ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۱۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۷/۱۴۲۴ھ

امام کے پیچھے پڑھی گئی عصر کی فاسد نماز دوسرے دن صاحب ترتیب اور مسافر کس طرح قضا کریں؟

سوال [۳۴۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: امام نے عصر کی نماز پڑھا دی، نماز میں فساد یا ابطال پیدا ہوگیا، جس کی بنا پر امام صاحب کل آئندہ کہہ رہے ہیں کہ کل جن لوگوں نے عصر کی نماز پڑھی تھی وہ دوبارہ اپنی نماز کی قضا کرلیں، اب بات یہ پیش آجاتی ہے کہ اس عصر کی نماز میں مسافر اور صاحب ترتیب بھی موجود تھے، تو یہ حضرات اپنی نماز کس طریقہ پر قضاء کریں؟ اور فساد اور ابطال کی وضاحت فرمادیں۔

المستفتي: عبد الغفار ۱۳ ر رجب ۲۴ھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کل گذشتہ کی عصر کی نماز جب فاسد ہوگئی تو صاحب ترتیب پر صرف عصر ہی کی نماز قضا کرنا لازم اور ضروری ہے؛ کیوں کہ بھول کی صورت میں

ترتیب کی رعایت لازم نہیں ہوتی ہے۔ اور مسافر پر عصر کی صرف دو رکعت قضاء کرنا لازم ہے، چار رکعت قضاء کرنا ضروری نہیں ہے۔

لو صلى الظهر على ظن أنه متوضي، ثم توضأ وصلى العصر، ثم تبين يعيد الظهر خاصة؛ لأنه بمنزلة الناسي في حق الظهر فلم يلزمه مراعاة الترتيب. (البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، زكريا ٢/ ١٤٩، كوئٹه ٢/ ٨٤)

وأما اقتداء المسافر بالمقيم فيصح في الوقت ويتم، تحته في الشامية: وهو الوقت ولو أفسده صلى ركعتين لزوال المغير. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ٢/ ١٣٠، زكريا ٢/ ٦١٢)

عن الحسن قال: إذا نسي صلاة في الحضر، فذكرها في السفر صلى صلاة الحضر، وإذا نسي صلاة في السفر، فذكرها في الحضر صلى صلاة السفر. (المصنف لابن أبي شيبة، الرجل ينسى الصلوات في الحضر، فيذكرها في السفر، موسسة علوم القرآن ٣/ ٥٢٦، رقم: ٤٨١١، مصنف عبدالرزاق، باب من نسي صلاة الحضر، المجلس العلمي ٢/ ٥٤٣، رقم: ٤٣٨٩)

جمہور فقہاء کے نزدیک عبادت میں فساد اور ابطال کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے؛ بلکہ دونوں لفظ مترادف ہیں؛ کیوں کہ فساد کی تعریف یہ ہے کہ عبادت عبادت ہونے سے خارج ہوجائے، کسی فرض کے فوت ہوجانے کی وجہ سے۔

أما الحنفية، فإنهم على المشهور عندهم وهو المعتمد يوافقون الجمهور في أن البطلان والفساد مترادفان بالنسبة للعبادات. (الموسوعة الفقهية ٨/ ١١٠)

الفساد والبطلان في العبادات سواء؛ لأن المراد بهما خرج العبادات عن كونها عبادة بسبب فوات بعض الفرائض. (شامي، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة و ما يكره فيها، كراچی ١/ ٦١٣، زكريا ٢/ ٣٧٠)

الفساد والبطلان في العبادات بمعنى واحد، وهو عدم الصحة، وهي عند الفقهاء اندفاع وجوب القضاء بالإتيان بالشرائط. (البحرالرائق، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسد؟ زكريا ٢/ ٤٧٢، كوئٹه ٢/ ٢٧٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٩ ؍رجب ١٤٢٤ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/ ٨١٣٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٩/٧/١٤٢٤ھ

ٹرین پر کس طرح نماز پڑھیں؟

سوال [٣٤١٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید سواری پر سوار محو سفر ہے، اس کو یہ اختیار نہیں کہ سواری کو رکوا کر نماز ادا کر سکے، نماز کا وقت ختم ہونے کے قریب ہوجائے، تو ایسی حالت میں زید کیا کرے؟ آیا نماز قضاء ہوجانے دے یا اشارہ سے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے؟ اس کے علاوہ جو بھی حکم ہو مدلل بیان فرمائیں۔

امید ہے کہ مدلل جواب سے نوازیں گے۔ **جزاكم الله احسن الجزاء.**

المستفتي: محمد عبداللہ ساکن ڈھکیا ضلع امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر ایسی سواری پر سفر ہو رہا ہے کہ اس سواری پر باضابطہ رکوع، سجدہ کے ساتھ نماز پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے، جیسا کہ بس کا سفر ہوتا ہے، تو اس وقت اشارے سے نماز پڑھ لے اور بعد میں اس کی قضا بھی کرلے۔ اور اگر ٹرین کا سفر ہو رہا ہے، تو ٹرین میں اشارہ سے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ ٹرین میں رکوع وسجدہ کے ساتھ

نماز پڑھنے کی گنجائش ہوتی ہے،ہاں البتہ کسی ٹرین میں ازدحام اور بھیڑ کی وجہ سے رکوع وسجدہ سے نماز پڑھنے کی کوئی شکل نہ بنے تو اس میں بھی اشارہ سے نماز پڑھ لے اور بعد میں قضاء کرلے۔(مستفاد:فتاوی محمودیہ جدید ۷/۵۳۲)

في الدر المختار: يتشبه بالمصلين وجوبا، فيركع ويسجد إن وجد مكانا يابسا، وإلا يومئ قائما، ثم يعيد، وتحته في الشامية: الصحيح على هذا القول أنه يومئ كيفما كان. (درمختار مع الشامي، كتاب الطهارة، باب التيمم، كراچی ۱/ ۲۵۲، زكريا ۱/ ۴۲۳، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الطهارة، باب التيمم، دارالكتاب ديوبند، ص/ ۱۱۷، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲/ ۱۹۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲رصفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۴۷۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۱۲ھ

ٹرین میں بیٹھ کر نماز پڑھنا

سوال [۳۴۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اور بکر ٹرین میں سفر کرتے ہیں، دوران سفر ٹرین میں نماز کا وقت ہو جاتا ہے، زید کہتا ہے کہ چلتی ٹرین میں اگر کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کا موقع نہ ملے، تو اپنی سیٹ پر بیٹھ کر فرض نماز ادا کرنا ہے، بکر کہتا ہے کہ فرض نماز کھڑے ہوکر پڑھنا چاہئے، اگر کھڑے ہوکر پڑھنے کا موقع نہ ملے تو بیٹھ کر نماز نہ پڑھے؛ بلکہ قضاء کر دینا چاہئے، سفر دو روز سے طویل کیوں نہ ہو بعد میں قضاء پڑھے، تو کیا زید اپنے قول میں صحیح ہے یا بکر تفصیل سے جواب دیں؟

المستفتي: احقر محمد عابد سٹھلوی، مدرسہ دعوۃ القرآن صدر بازار، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چلتی ٹرین میں فرض اور واجب نمازیں کھڑے ہوکر پڑھنا فرض ہے، بلا عذر بیٹھ کر پڑھنے سے نماز فرض ادا نہ ہوگی، اگر سخت بھیڑ کی وجہ سے کھڑے ہوکر پڑھنے کا موقع نہ ہو تو بھی قیام کا فریضہ ساقط نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ عذر بندوں کی طرف سے آیا ہے، جس کی وجہ سے ترک قیام کی رخصت نہیں دی جاسکتی؛ لہٰذا ایسی صورت میں جس طرح بھی ہوسکے بیٹھ کر یا اشارہ سے نمازیوں کی مشابہت اختیار کرے اور پھر بعد میں اس کی قضاء کرے؛ لہٰذا زید اور بکر دونوں کو مضمون بالا کا خیال رکھنا چاہئے۔

ذهب جمهور الفقهاء إلى أنه لا يجوز لمن يصلي الفريضة في السفينة ترك القيام مع القدرة، كما لو كان في البر. (الموسوعة الفقهية ٢٥/ ٧٥)

فعلم منه أن العذر إن كان من قبل الله تعالى لا تجب الإعادة، وإن كان من قبل العبد وجبت الإعادة. (البحرالرائق، كتاب الطهارة، باب التيمم، زكريا ١/ ٢٤٨، كوئٹه ١/ ١٤٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍رجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/۷/۱۴۲۳ھ

ٹرین میں مجبوری کے وقت فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا

سوال [۳۴۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سفر کے دوران ریل گاڑی کبھی ایسے رخ پر چلنے لگتی ہے کہ اس وقت قبلہ کی جہت رخ کرکے کھڑے ہوکر نماز پڑھنا ناممکن ہوجاتا ہے اور تاخیر کرنے سے نماز کے وقت کے نکل جانے کا اندیشہ رہتا ہے، تو کیا ایسی مجبوری کی صورت میں فرض نماز بیٹھ کر ادا کی جاسکتی ہے؟ یا کھڑے ہوکر ہی غیر قبلہ کی طرف پڑھ لی جائے، یا حکم کچھ اور ہے؟

المستفتي: عبدالرؤف قاسمی گونڈی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹرین میں کھڑے ہوکر قبلہ رخ ہوکر آسانی کے ساتھ نماز پڑھی جاسکتی ہے، اس لئے جو عذر پیش کیا گیا ہے وہ ایسا عذر نہیں ہے جس کی وجہ سے استقبال قبلہ اور قیام جیسے فرض اور رکن صلاۃ کو ترک کردیا جائے، ٹرین کے بیچ میں ہر دو سیٹوں کے درمیان ایک آدمی آسانی سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور دونوں طرف کے بیت الخلاء کے پاس بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے؛ اس لئے مذکورہ عذر کی وجہ سے استقبال قبلہ اور قیام کی فرضیت ساقط نہ ہوگی۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهُ. [البقرة: ١٤٤]

عن عمران بن حصين –رضي الله عنه– قال: كانت بي بواسير، فسألت النبي صلى الله عليه وسلم عن الصلاة، فقال: صل قائما، فإن لم تستطع فقاعدا، فإن لم تستطع فعلى جنب. (صحيح البخاري، الصلاة، باب إذا لم يطق قاعدا صلى على جنب، النسخة الهندية ١/ ١٥٠، رقم: ١١٠٦، ف: ١١١٧)

ومنها: القيام، لقادر عليه. (درمختار) وفي الشامية: فلو عجز حقيقة وهو ظاهر أو حكما كما لو حصل له به ألم شديد، أو خاف زيادة المرض ...... فإنه يسقط. (شامي، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، كراچی ١/ ٤٤٤، ٤٤٥، زكريا ٢/ ١٣١، ١٣٣) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۱۷ھ

دوران سفر بس یا ریل میں نماز کا حکم

سوال [۳۴۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: سفر میں نماز کی ادائیگی کے متعلق چند دشواریاں پیش آتی ہیں، جن سے نمازوں کی ادائیگی مشکل ہو جاتی ہے، اپنی سواری میں تو آدمی خود مختار رہے، کہیں بھی روک کر نماز ادا کر لے، مگر بس کے سفر میں آدمی مجبور محض ہوتا ہے، ڈرائیور اپنی مرضی یا ضرورت پر روکتا ہے، ایسی صورت میں مسافر کیا بس میں سیٹ پر ہی بیٹھے بیٹھے اشارہ سے نماز ادا کر سکتا ہے؟ اور وضو کی جگہ تیمّم کر سکتا ہے؟ بس میں چاہے پانی بھی ساتھ ہو، مگر وضو کیسے کیا جاوے، ٹرین میں بھی آج کل بغیر ریزرویشن کے اکثر بھیڑ ہی ہوتی ہے، مگر بعض مرتبہ تو کھڑکی پر جگہ مل جاتی ہے، مگر بصورت دیگر کیا سیٹ پر بیٹھ کر ہی نماز ادا کر لی جاوے یا کس طرح کیا جاوے؟ نیز سمت قبلہ بھی بمشکل ہی موافق ہوتا ہے، بس میں بھی سمت قبلہ بمشکل موافق ہوتا ہے، تو کیا کیا جاوے؟ جہاز کا سفر تو اتفاقیہ ہی پیش آتا ہے، اس میں نماز کیسے ادا کی جائے؟

المستفتي: محمد یونس جامع مسجد احمد گڑھ، پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بس کے سفر میں اگر نماز کا وقت ختم ہونے کا خطرہ ہے، تو اس بات کی گنجائش ہے کہ جس حالت میں بھی ہو اشارہ سے نمازی کی صورت بنالے۔ اور یہ بات بھی واضح رہے کہ بس میں آلۂ تیمّم نہیں ہوتا اور پانی بھی نہیں ہوتا؛ اس لئے مصلی کی صورت بنالے، پھر جہاں جا کر اتر جائے وہاں پر باضابطہ وضو کے بعد نماز کی قضاء کر لینا لازم ہے۔ اور ٹرین میں پانی کا انتظام ہوتا ہے، اس کے پانی سے وضو کر کے نماز پڑھی جاسکتی ہے، نیز ٹرین میں کسی طرح رکوع سجدہ کے ساتھ بھیڑ میں بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے؛ اس لئے وہاں پر بس کی طرح شکل اختیار کرنے کی گنجائش نہ ہوگی، ہاں البتہ سخت مجبوری کی حالت میں بس کی طرح شکل اختیار کرنے کی گنجائش ہے کہ جب کہ ٹرین میں پانی بھی نہ ہو اور ٹرین رک بھی نہ رہی ہو۔ اور ہوائی جہاز میں پانی بھی ہوتا ہے اور ہوائی جہاز کے آگے یا پیچھے نماز پڑھنے کے بقدر جگہ بھی ہوتی ہے؛ اس لئے اشارہ سے پڑھنے کی گنجائش نہ ہوگی۔ اور سعودی ایرلائنز میں

باقاعدہ پانچ سات افراد کے ایک ساتھ نماز پڑھنے کے لئے جگہ ہوتی ہے۔ (مستفاد: حاشیہ امدادالفتاوی ١/ ٥٨٦)

فعلم منه أن العذر إن كان من قبل الله تعالى لا تجب الإعادة، وإن كان من قبل العبد وجبت الإعادة. (البحرالرائق، كتاب الطهارة، باب التيمم، زكريا ١/ ٢٤٨، كوئٹه ١/ ١٤٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٢/ شعبان ١٤٢٨ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٨/ ٩٣٩٤)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٨/٨/١٤ھ

بس پر نماز کا طریقہ اور قصر کہاں سے کرنا درست ہے؟

سوال [٣٤٢٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بس پر نماز کس طرح پڑھوں، نیز دہلی میں مقیم ہوں، اب گورکھپور جا رہا ہوں، تو قصر کب سے کروں گا؟ اسٹیشن سے یا دہلی کے باہر شاہ راہ سے نکل کر واضح فرمائیں؟

المستفتي: عظیم اللہ بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بس ٹھہری ہو تو نماز نیچے اتر کر پڑھنی چاہئے اور چلتی ہو تو کھڑے ہو کر قبلہ رخ پڑھنی چاہئے، گرنے کا خطر ہو تو ٹیک لگائی جاسکتی ہے۔ اور اگر استقبال قبلہ قیام یا رکوع وسجدہ نہ ہو سکے تو جس طرح اشارہ وغیرہ سے ممکن ہو پڑھ لی جائے۔ اور بعد میں اعادہ ضروری ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ٤/ ١٨٨، امداد الفتاوی ١/ ٥٨٦، دارالعلوم ٢/ ٦، محمودیہ قدیم ١٤/ ٢٢٣، جدید ڈابھیل ١٧/ ٥٣٢)

ولو كان على الدابة يخاف النزول للطين والردغة يستقبل، قال في الظهيرية: وعندي هذا إذا كانت واقفة، فإن كانت سائرة يصلي حيث شاء.

(فتح القدير، كتاب الصلاة، باب شروط التي تتقدمها، زكريا ١/ ٢٧٦، كوئٹه ١/ ٢٣٦، دارالفكر مصري ١/ ٢٧٠)

فعلم منه أن العذر إن كان من قبل الله تعالى لا تجب الإعادة، وإن كان من قبل العبد وجبت الإعادة. (البحرالرائق، كتاب الطهارة، باب التيمم، زكريا ١/ ٢٤٨، كوئٹه ١/ ١٤٢)

اورقصراس وقت کی جاتی ہے جب کہ بارادۂ مسافتِ قصرآبادی سے باہر ہوجائے اور دہلی کا اسٹیشن چونکہ آبادی کے اندر ہے؛ اس لئے دہلی کی آبادی سے نکل کر قصر کی جائے گی۔(مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۴/ ۲۲۸، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۵۲۲، دارالعلوم ۴/ ۴۵۹)

من خرج من عمارة موضع إقامته قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها، صلى الفرض الرباعي ركعتين. (شامي، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، كراچی ٢/ ١٢٣، زكريا ٢/ ٥٩٩، البحرالرائق، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، زكريا ٢/ ٢٢٦، كوئٹه ٢/ ١٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۲/۱/۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/۶ھ